صاحبزادہ سیّد خورشید گیلانی کی فکر انگیز تحریروں کا مجموعہ

قلم برداشتہ

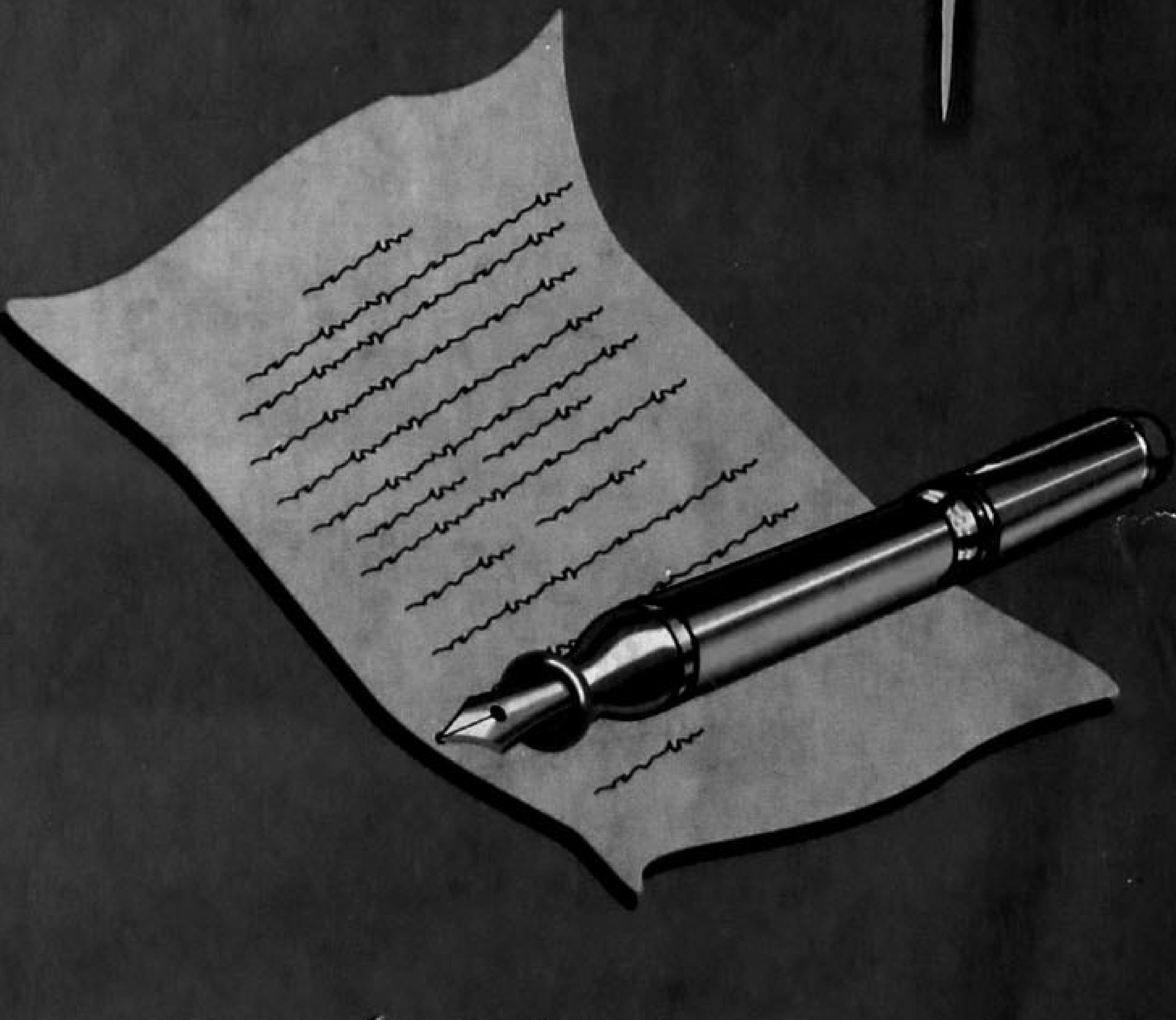

صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی

Marfat.com

ملنے کے پتے

☆ خزینہ علم وادب' الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور۔

☆ ضیاء القرآن پبلی کیشنز' دربار روڈ' لاہور۔

☆ مکتبہ علم وعرفان' اردو بازار لاہور۔

☆ فرید بک سٹال' اردو بازار لاہور۔

☆ مکتبہ تعمیر انسانیت' اردو بازار لاہور۔

☆ سعد پبلی کیشنز' پہلی منزل میاں مارکیٹ' اردو بازار لاہور۔

☆ مکتبہ جمال کرم' 9 مرکز الاویس' دربار مارکیٹ اردو بازار' لاہور۔

Marfat.com

وابستہ رہو دامن اولادِ مہر سیال سے
محشر میں اسی در سے امیدِ وفا ہے
غلام مہر سیال ہے

قلم برداشتہ

صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی

خورشید گیلانی ٹرسٹ

22-H مرغزار آفیسرز کالونی ملتان روڈ لاہور

فون: 5412005

Marfat.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب .... قلم برداشتہ

مصنف .... صاحبزادہ سیّد خورشید احمد گیلانی

ایڈیشن .... دوم 2002ء

قیمت .... =/ 250

مطبع .... اے این اے پریس

ناشر .... سیّد احسان گیلانی

پیر خواجہ محمد اجمال

صاحبزادہ محمد ظہیر الدین معظمی صاحب

ناظم قمر العلوم گجرات

عکس ترتیب

متعلم قمر العلوم جامعہ منظیمہ قمر سیالوی کوٹ گجرات

1۔	پیش گفتار ---- ارشاد احمد حقانی	11
2۔	حرف تحسین -------- عبد القادر حسن	15
3۔	غلبہ اسلام --- تین امکانات	17
4۔	نعت اور لحہ موجود	20
5۔	دعا	26
6۔	ٹیم کا انتخاب	34
7۔	پاکستان اور جاپان --- ایک موازنہ	37
8۔	نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں	40
9۔	تو کائنات حسن ہے یا حسن کائنات	43
10۔	ایک سفر جو حاصل حیات بن گیا	49
11۔	گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں	56
12۔	سوچ اور ذوق کا ماتم	59
13۔	جیویں عمر نبھی ہے شاگردی ہک منٹ نبھا پتہ لگ ویندے	62
14۔	حضرت انسان	65
15۔	فریب خوردہ شاہین	68

Marfat.com

16.	اے خدا "شہناز گل" سی بیٹیاں پیدا نہ ہوں	71
17.	مشرق کے آخری قلعے پر مغرب کی یلغار	74
18.	غلبۂ اسلام	78
19.	سامری کے گئو سالے	81
20.	ذہانت اور دیانت	84
21.	خوف و حزن	87
22.	یوں ہوتا تو کیا ہوتا	90
23.	اللہ بے نیاز ہی نہیں بہت بندہ نواز بھی ہے	93
24.	مطالعہ	96
25.	یقین	99
26.	رنگیلا شاہی شوق	102
27.	علم، عقل، یقین	104
28.	میں بلالی ہوں	107
29.	اولیاء اللہ	109
30.	تمیز رنگ و بو برما حرام است	112
31.	توازن و اعتدال	115
32.	خدا انحصاری	118
33.	اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے	121
34.	چھوٹے نہ گنہ مجھ سے چھوڑا نہ کرم اس نے	123
35.	عذاب دانش عصر	128
36.	ایک اچھوتا تخیل	131
37.	میزان عدل	134
38.	بصیرت، عزم، اخلاص	137

Marfat.com

39۔	فطرت کی آواز	140
40۔	میرا حسین ابھی کربلا نہیں پہنچا	143
41۔	حسن	145
42۔	جناب وزیراعظم ! کیا آپ نے سوچ لیا ہے؟	148
43۔	جس روز سب راز فاش ہو جائیں گے	152
44۔	میڈے شکوے دا اعتبار نہ کر چلو آپ ڈسامیڈا کیارہ گے	155
45۔	سیاسی انحطاط کا مرثیہ	157
46۔	اور زمین اپنے سب بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی	160
47۔	اے خیال یار اس دنیا میں پہنچا دے مجھے	163
48۔	ایک یہ حکمران ہیں ایک وہ حکمران تھے۔	166
49۔	اپنی بستی پہ نہ اترائے کوئی کوہ غرور	168
50۔	ایمان اور زندگی	170
51۔	پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں	173
52۔	خود انحصاری سے پہلے خود اعتمادی	176
53۔	اختلاف رائے کا سلیقہ	180
54۔	انداز حکومت	183
55۔	نگاہ روبرو' باادب باملاحظہ ہوشیار	186
56۔	مثالی حکمران	189
57۔	نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے	192
58۔	حکمران کا انداز معاشرت	195
59۔	اعلیٰ دماغ اور غنی مزاج رہنما کی ضرورت	198
60۔	بت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے	201
61۔	بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو	205

62۔	ملک تو بن گیا' قوم نہ بن سکی	210
63۔	لمحہ موجود کا "محمود غزنوی" اور وائٹ کالر کرائمز	213
64۔	مومن--- دھوکہ دیتا ہے اور نہ دھوکہ کھاتا ہے	216
65۔	دو دن کو اے جوانی' دے دے ادھار بچپن	219
66۔	جیویں دل آکھی ودا کر سرور میڈے پیار تے پر الزام نہ ڈے	222
67۔	اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے۔	225
68۔	قانون سازی یا انسان سازی	228
69۔	عوام کے نام کھلا خط	233
70۔	ہائے اس زود پشیمان کا پشیمان ہونا	237
71۔	شیخ میخانے میں آنے کو مسلمان آیا	241
72۔	بدلنا ہے تو مے بدلو' نظام میکشی بدلو	245
73۔	ضروریات اور فضولیات	248
74۔	غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ------	250
75۔	کروڑ پتی	253
76۔	رائے عامہ	256
77۔	اصل مطالعہ	259
78۔	چشم بدور----- یہ ہیں رہنمایان قوم	263
79۔	جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی نہ تھی	266
80۔	اکیسویں صدی کا چیلنج--------- دہشت گردی	269
81۔	ڈالر فوبیا	273
82۔	ملکی اثاثے نہیں سرکاری بنگلے بیچیں	276
83۔	نہ تم بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی	278
84۔	کرپشن--- عوام اور حکمرانوں کا مختلف نقطۂ نظر	281

Marfat.com

85. مرگ آرزو	284
86. فردا امروز نہیں مرد فردا	288
87. نہ شیخ شہر' نہ شاعر' نہ خرقہ پوش اقبال	290
88. کیا مذہبی جماعتیں ناکام ہیں؟ واقعات و حقائق کی روشنی میں	295
89. قائد اعظم کیسا پاکستان چاہتے تھے؟	302
90. اسلام اور بنیادی انسانی حقوق	306
91. نہ ہر کہ چاہئے بنو شد ابو الکلام شود	315
92. قحط الرجال---واقعہ یا واہمہ؟	319
93. غیر معمولی حالات----غیر معمولی اقدامات	323
94. جامعیت کبریٰ	328
95. ہم ابرو باد کا موسم تھے گرد باد ہوئے	333
96. ان پڑھ اور غریب ماں کی یاد میں	337
97. حج وحدت و مرکزیت کا مظہر	342
98. اتحاد بین المسلمین اور عاشورۂ محرم	348
99. کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا بارہ آنے	351
100. خود کشی	354
101. آواز خلق	357
102. غیر سے دوستی کرو لیکن	360
103. ظلم رہے اور امن بھی ہو	363
104. عرض نیازِ عشق	366
105. مارچ میں اسلامی نظام نافذ ہو جائے گا	369
106. غالب "ندیم دوست" سے آتی ہے بوئے دوست	371
107. گردابِ بلا	376

Marfat.com

108۔ امریکہ ان ٹربل	379
109۔ سر دلبراں ----- لیکن ---- در حدیث دیگراں	382
110۔ شہید محبت	285
111۔ دوپٹہ اتارو مہم	389
112۔ تواضع زگردن فرازاں نکوست	392
113۔ اے گرفتارِ ابوبکر و علی ہشیار باش!	395
114۔ ہماری صحافت اور شکوہ ارباب وفا	399
115۔ ہم نے جو طرز سخن کی تھی نفس میں ایجاد	403
116۔ تبدیلی نظام	406
117۔ فرزندان قوم "حقیقی ماں" کی تلاش	410
118۔ بیا تا کار ایں امت بسازیم	413
119۔ اتاترک' سوئیکارنو' خمینی یا عمر بن عبدالعزیز	419
120۔ دل بدست آور کہ حج اکبر است	424
121۔ پاکستانی سیاستدان ایسا نہیں کرسکتے؟	427

Marfat.com

پیش گفتار

سیّد خورشید احمد گیلانی سے ملاقات گاہے ماہے ہوتی رہتی تھی کبھی کسی پریس کانفرنس میں' کبھی کسی بریفنگ میں' کبھی احباب کے کھانے کی محفل میں' اور ان کا علمی اور ادبی کالم ''قلم برداشتہ'' بھی اکثر نظر نواز ہوتا رہتا تھا لیکن ہمارے درمیان بہت حد تک فکری' نظری اور مزاجی مناسبت اور ہم آہنگی ہونے کے باوجود ہم بہت زیادہ ایک دوسرے کے قریب نہ تھے حالانکہ ان سے قرب اور موانست کا ایک حوالہ ان کے برادرِ محترم سیّد ارشاد عارف بھی تھے جو روزنامہ ''جنگ'' میں کئی سال تک میرے رفیق کار رہے۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ڈاکٹر کلیم صدیقی کے مسلم انسٹی ٹیوٹ (لندن) نے اپنے ایک سیمینار میں شرکت کے لیے جن پاکستانی مہمانوں کو مدعو کیا صاحبزادہ خورشید گیلانی اور راقم الحروف ان میں شامل تھے' یوں گیلانی صاحب کے ساتھ سفر کرنے اور کئی روز تک اکٹھے رہنے کا مجھے شرف حاصل ہوا۔ خلیفہ ثانی سیّدنا عمر فاروقؓ کے سامنے جب ایک شخص نے کسی آدمی کی تعریف کی تو آپ نے اس سے دریافت فرمایا: ''تو نے کبھی اس شخص کے ساتھ سفر کیا ہے؟ تو نے کبھی اس کے ساتھ کاروباری لین دین کیا ہے؟''

اس آدمی نے جواب دیا امیر المومنین! مجھے اس کا تو موقع نہیں ملا۔ آپ نے فرمایا جب تک تجھے اس کا موقع نہ ملے اس کے بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھ۔ عمر فاروقؓ کی یہ تلقین فطرت انسانی کے کسی بہت بڑے ماہر ہی کی طرف سے کی جا سکتی تھی۔ سفر اور حضر میں جب تک کسی

Marfat.com

کا ساتھ نہ رہے اس کی شخصیت کی بہت سی پرتیں پردۂ اخفا میں رہتی ہیں۔ خورشید گیلانی سے قریب رہ کر میں نے انہیں ایک انتہائی سنجیدہ، متین، صاحب فکر اور متواضع انسان پایا اور ان کی شخصی خوبیاں مجھ پر واضح ہوئیں اور یہ چیز ان کے ساتھ اُنس اور محبت کا تعلق پیدا کرنے کا باعث بنی۔ گیلانی صاحب کے کالم میں اکثر دیکھتا تو دو چیزیں مجھے متاثر کرتیں۔ ان کی سلیس اور خوبصورت نثر اور ان کا توازن فکری، ان کے قلم میں بلا کی روانی ہے اور ان کی تحریر سے الفاظ کے در و بست پر ان کا عبور مترشح ہوتا ہے۔ آیئے میں آپ کو نمونہ مشتے از خروارے کے مصداق ان کی قدرتِ کلام کی چند جھلکیاں دکھاؤں۔ نعت کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''نعت سے دماغ روشنی، قلم پاکیزگی، افکار تازگی، خیالات توانائی، الفاظ رنگینی اور لہجے رعنائی پاتے ہیں، نعت مضمون کو عزت، عنوان کو شہرت، اسلوب کو ندرت، بیان کو وسعت، اور کلام کو قوت عطا کرتی ہے۔

نعت تخیل کے نازک آبگینے، عشق کے بے بہا خزینے، حرف و لفظ کے رواں دواں سفینے اور اظہار و بیان کے خوبصورت قرینے کا دوسرا نام ہے۔

یوں کہیے کہ انسانی ذہانت جب عروج پر پہنچتی ہے تو وہ نعت بن جاتی ہے، صبح سعادت جب طلوع ہوتی ہے تو نعت بن جاتی ہے، اسلامی ثقافت جب ثمر بار ہوتی ہے تو نعت بن جاتی ہے، فکری صداقت جب نصیب ہو جاتی ہے تو نعت بن جاتی ہے، خفتہ قسمت جب جاگ اٹھتی ہے تو نعت بن جاتی ہے، طلب صادق جب موج بن کر کروٹ لیتی ہے تو نعت بن جاتی ہے اور شاعری جب پیکر التجا میں ڈھلتی ہے تو نعت بن جاتی ہے۔

نعت درحقیقت حسن کا خراج اور حسن نظر کی معراج ہے، نعت آہوؤں کی صدا اور آنسوؤں کی دعا ہے، اور نعت حسن و عشق اور علم و عرفان کا نقطۂ اتصال ہے۔

جب حضرت بلالؓ کی اٹوٹ نسبت، حضرت حسانؓ کی شاہکار بلاغت، کعب بن زہیرؓ کی لسانی طلاقت، رومیؒ کی دانش و حکمت، سعدیؒ کی لافانی فصاحت، جامیؒ کی سچی عقیدت، قدسیؒ کی بے آمیز محبت، بوصیریؒ کی روحانی حلاوت، مرزا بیدل کی فلسفیانہ حیرت، اقبال

Marfat.com

کی شہرہ آفاق عبقریت' امیر مینائی کی طویل ریاضت' غالب کی معنی آفرین ادبیت' فاضل بریلویؒ کی غیر مشروط محبت' شبلیؒ کی پاکیزہ روایت' سلیمان ندویؒ کی عالمانہ متانت' بیدم وارثی کی ادائے فنائیت' محمد علی جوہر کی سکہ بند خطابت' حضرت موہانی کی فنی مہارت' بہادر یار جنگ کی ایمانی حرارت' ظفر علی خاں کی بے پناہ جرأت' نعیم صدیقی کی فکری طہارت' جوش ملیح آبادی کی ادبی سطوت' عبدالعزیز خالد کی مسلمہ علمیت اور حفیظ تائب کی عاشقانہ بصیرت شاعری کے قالب میں اترتی ہے تو نعت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔''

ایک اور جگہ دعا کی حقیقت کس موثر انداز میں بیان کی ہے' لکھتے ہیں:

''رحمت رب کو پیسہ یا حوالہ درکار نہیں ہوتا بس ایک حیلہ مطلوب ہوتا ہے' اس لیے جہاں دعا کا ساتھ لفظ چھوڑ جاتے ہیں' جملے پیچھے رہ جاتے ہیں اور حرف جواب دے جاتے ہیں' وہاں کوئی حیلہ کام آ جاتا ہے' خواہ وہ دل کی تیز دھڑکن ہو' جسم کی کپکپی ہو' روح کی بیقراری ہو' آنکھوں کی اشکباری ہو' دامن کا بے ساختہ پھیلاؤ ہو' ہاتھوں کا گدایانہ ارتعاش ہو' لہجے کا اضطراب ہو اور کچھ بھی میسر نہ ہو تو گناہوں کا اعتراف ہی قبولیت دعا کا زینہ بن جاتا ہے' بندہ بے صبرا نہ ہو' لمحوں میں قطع منازل کا اسے لپکا نہ ہو' ذرا لذتِ انتظار کا آشنا ہو' پھر دیکھئے کہ عرش اور فرش کا فاصلہ کیسے گھٹتا ہے' افلاک اور خاک کا کیسے ملاپ ہوتا ہے' اور آقا و بندہ کیسے ہمکلام ہوتے ہیں؟''

سیاسی امور میں اپنی غیر جانبداری کی تصویر کس خوبصورت علمی انداز میں کھینچتے ہیں:

''ہم گوشہ نشین نہ کسی کے حلیف سخن ساز اور نہ حریف دشنام طراز' ہم کسی کے جانے پر ٹسوے بہانے اور کسی کے آنے پر شادیانے بجانے والے بھی نہیں' یہ کام انہیں مبارک جن کا رزق اس سے وابستہ ہے کہ وہ جانے والے کے عیب چنتے اور آنے والے کے لیے سر دھنتے ہیں' ہم ان ''جیالوں'' میں بھی نہیں جو رخصت ہونے والے پر الزام تراشی اور تشریف لانے والے کی راہ میں گل پاشی کرنے کو اپنا ''فرض منصبی'' اور اپنی کامیاب ''حکمت عملی'' سمجھتے ہیں' بحمد اللہ ہمارے قلم نے نہ کسی حکام کی ''رحلت'' پر ''مرثیہ'' لکھا اور نہ کسی کی ''ولادت'' کا قصیدہ پڑھا' نہ کبھی دارا و سکندر کی ''منقبت'' پڑھی اور نہ کبھی بابر و اکبر کی حکایت لکھی' نوک قلم بس ایک جگہ اٹکی رہی' کہ یہ

Marfat.com

زمین خدا کی ہے اور اس نے کسی کو پٹے پر نہیں دے رکھی' نہ اس پر کسی کلنٹن کا اجارہ ہے اور نہ یلسن کا پہرہ' نہ بھٹو کے نام گروی ہوئی ہے اور نہ شریف فیملی کے نام رجسٹری' حاکم صرف خدا ہے باقی سب خادم' جو ''حاکمیت'' اور ''خدمت'' کا فرق بھول جاتا ہے اس کی مہلت ختم کر دی جاتی ہے۔ اور یہی سنت الٰہی ہے' حاکم بدلتے رہیں گے' ایوانِ حکومت سجتے اور بگڑتے رہیں گے' آئین بنتے اور ٹوٹتے رہیں گے' نظام ابھرتے اور ڈوبتے رہیں گے' تخت بچھتے اور الٹتے رہیں گے' تاج ادلتے اور بدلتے رہیں گے' محل اٹھتے اور گرتے رہیں گے' فرامین شاہی چلتے اور مٹتے رہیں گے' اور سلطنتوں کے کنارے پھیلتے اور سمٹتے رہیں گے لیکن نہ خدا بدلے گا اور نہ اس کی سنت تبدیل ہوگی۔

یبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام اور ''لاتبدیل لکلماتِ اللّٰہ''

خورشید گیلانی ایک سچے اور کھرے مسلمان ہیں۔ بنیاد پرستی کے طعنوں سے خائف نہ ہونے والے لیکن وہ کٹھ ملا بھی نہیں ہیں۔ وہ عصر حاضر کے تقاضوں سے آگاہ رہنے' ان کو ملحوظ رکھنے اور اقبالؔ کی علمی روایت کی پیروی میں اسلام اور جدیدیت کے ایک حسین امتزاج کی ضرورت کو بھی خوب سمجھتے ہیں۔ وہ عالم اسلام کی حالت پر دل گرفتہ ہیں۔ شخصی' خاندانی اور آمرانہ حکومتوں کے دشمن ہیں اور روحانی جمہوریت کو تعلیمات اسلام کے قریب تر سمجھتے ہیں۔ وہ بندہ و مولا' آقا اور غلام' محمود و ایاز کے فرق کے مخالف ہیں اور اسلام کی عدل واحسان کی تعلیم پر دل کی گہرائیوں سے ایمان رکھتے ہیں۔ میں اگر کہوں کہ وہ ایک ایسے روشن خیال مسلمان' صاحب قلم ہیں جو دور حاضر کی روح سے بھی آشنا ہے اور اسلامی تعلیمات اور اسلامی اقدار کا بھرپور ادراک بھی رکھتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ خورشید گیلانی صاحب کے کالموں کے اس مجموعے کو تعلیم یافتہ پاکستانیوں میں بھرپور پذیرائی حاصل ہوگی اور ان کی وجہ سے معاشرے میں بہت سے خورشید گیلانی اور پیدا ہوں گے۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

ارشاد احمد حقانی

29 مارچ 2001ء

حرفِ تحسین

خورشید گیلانی صاحب سے میرا تعارف ان کی تحریروں سے ہوا۔ انہوں نے اخبارات میں کالم نگاروں کے ایک ہجوم میں کالم لکھنا شروع کیا۔ اہم اردو اخبارات کی زیادہ تعداد اور ہر اخبار میں کالموں کی بھرمار قارئین کو پریشان رکھتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کالم چھپتے تو بہت ہیں مگر ان میں سے پڑھے کم جاتے ہیں اور اس میں قارئین کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ اچھی خاصی قیمت خرچ کر کے اخبار حاصل کرتے ہیں مگر ان میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ سب کالم پڑھ سکیں۔ یہ کالم نویس کی ہمت ہے کہ وہ قارئین کو اپنا کالم پڑھنے پر مجبور کر سکے۔ خورشید گیلانی صاحب نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ان کی تحریریں پڑھتا رہوں۔ مجھے یہ تو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ میرے عزیز دوست ارشاد عارف کے بھائی ہیں لیکن اس سے بہت پہلے وہ میرے کالم نویس بھائی بن چکے تھے۔ خورشید صاحب سے روبرو ملاقات بھی بہت بعد میں ہوئی وہ اپنی تصویر سے زیادہ خوبصورت اور ملوک ہیں۔ میں نے ایسے بہت کم لوگ دیکھے ہیں جن کے چہرے پر داڑھی اس قدر سجتی ہو۔ یہ ان کے دلکش خط وخال کا ایک حصہ بن گئی ہے۔

میرے ان کے ساتھ اخباری اور کالمانہ تعلق کی بہت بڑی اور بنیادی وجہ ان کی نظریاتی پختگی ہے اور یہ میرے لیے حسن اتفاق ہے کہ ہم ایک ہی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں اور مجھے ان کی تحریر اپنی تحریر دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنے موقف اور نظریات کو جس زبان میں بیان کرتے ہیں

Marfat.com

اس میں ایک خاص چاشنی ہوتی ہے۔ ورنہ اس قسم کی تحریر بھی کسی مولوی صاحب کا وعظ بن جاتی ہے جس کے اختتام کا نمازی بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ میں نے کئی بار سوچا کہ ان سے بے تکلفی سے کہہ دوں کہ خدا نے آپ کے چہرے اور قلم دونوں کو خاص رونق اور جاذبیت عطا کی ہے۔

میں نے مختصراً جو کچھ عرض کیا ہے' کتاب آپ کے سامنے ہے آپ میری تصدیق کریں گے بلکہ ہو سکتا ہے شکایت بھی کریں کہ ان کی تحریر کے حسن کا حق ادا نہ کر سکا۔

عبدالقادر حسن

Marfat.com

غلبۂ اسلام--- تین امکانات

اسلام--- دین فطرت بھی ہے اور دین انسانیت بھی فطرت کا کوئی جائز تقاضا ایسا نہیں جو اسلام پورا نہ کرتا ہو اور انسان کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو اسلام حل نہ کرتا ہو۔ اسلام انسان کے خارج کا دین نہیں بلکہ اس کے داخل اور باطن کا داعیہ ہے' جو انسان بن کر رہنا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ مسلمان بن کر رہے جو فطرت چاہتی ہے اسلام وہی دیتا ہے' آخر اسلام میں وہ کیا چیز ہے جس سے انسان گریز کرے؟

زندگی گزارنے کا سلیقہ' فطری جذبات کی تسکین کا قرینہ' حقوق العباد کا خیال' علم و شعور کی پرورش' نازک احساسات کا لحاظ' مرد اور عورت کے میلانات میں توازن' ذاتی و معاشرتی تقاضوں کا پاس' شخصی و مالی معاملات میں راہنمائی' تخلیق کائنات سے آگہی اور تسخیر کائنات کی حوصلہ افزائی ہر نوع کی فکری و ذہنی' معاشی و سیاسی اور مذہبی و تمدنی آزادی' غرضیکہ فطرت اور اسلام ہم آغوش اور باہم پیوست نظر آتے ہیں' اور اس کی سب سے سہل اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ فطرت کی تخلیق اور اسلامی اصولوں کی تشکیل ایک ہی ذات نے کی ہے یعنی اللہ تعالیٰ' اس لئے Work of God اور Word of God میں کوئی تناقض ہے نہ تضاد' تخالف ہے نہ تصادم اور فرق ہے نہ فاصلہ۔

جب غلبۂ اسلام کی بات ہوتی ہے تو اس کا مطلب ہے کائنات کو اس کے خالق' دنیا کو اس کے مالک اور انسان کو اس کے رازق کی مرضی کے محض ماتحت نہیں' بلکہ اس کے مطابق کر دیا جائے۔ اور یہ خواہش بے جا اور مطالبہ ناروا نہیں'

اگر اسلام کو اللہ تعالیٰ کی حکمت اور پیغمبر اسلامؐ کی سنت کے ذریعے جانا اور سمجھا جائے تو کوئی مشکل پیش نہیں آتی' مشکل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب یا تو انسان خود خدا بن کر اپنا قانون بنانے اور اسے چلانے کا تہیہ کر لے یا پھر خود سر بن کر خدا کے قانون سے جان چھڑانے کا ارادہ کر لے' دونوں صورتوں میں یا تضاد ابھرے گا یا فساد اٹھے گا' غلبۂ اسلام کوئی سیاسی مطالبہ نہیں اساسی تقاضہ ہے' ایک ملک کے لئے نہیں پورے روئے زمین کے لئے' یہ مذہبی جماعتوں کا مسئلہ نہیں الٰہی

Marfat.com

تقاضوں کے اختیار کرنے کا معاملہ ہے' اس لئے دینی راہنماؤں اور عوام دونوں کو غور کرنا چاہئے'

غلبۂ اسلام کی جدوجہد صدیوں سے برپا ہے اور کئی ملکوں میں جاری ہے' ایک قول رسولؐ کے مطابق اسلام کو بہرحال دنیا پر حاوی اور غالب ہونا ہے پیرس اور لندن جیسے جگمگاتے شہروں سے لے کر چراغ کی لو سے ٹمٹاتے خیموں تک اسلام بہرحال پہنچے گا' آٹھ آٹھ رویہ شاہراہوں سے لے کر لق و دق صحراؤں تک اسلام سفر کرے گا' بلند و بالا پلازوں اور شاہی ایوانوں سے لے کر ساحلوں اور کوہستانوں تک اسلام کی آواز جائے گی' یہ بہرحال طے ہے' دیکھنا یہ ہے کہ اس کی صورت کیا بنے گی؟ یہ موضوع ولولہ خیز بھی ہے' فکر انگیز بھی ہے' دل آویز بھی ہے اور حکمت آمیز بھی'

غلبۂ اسلام کسی سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں ہو گا؟ اس کے لئے دعوتی اسلوب موزوں ہے؟ یا یہ مقصد عسکری پیش رفت سے حاصل ہو گا؟ یہ ایک وسیع موضوع ہے جو بیک وقت جذبۂ فکر' علم اور حکمت کا متقاضی ہے' ان تینوں میں سے کوئی ایک بروئے کار آجائے تو قول رسولؐ کی تصدیق اور تکمیل ہو جائے گی۔

- ایک امکان یہ ہے کہ سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آجائے اور اسلامی اخلاق و قوانین ہر شعبۂ زندگی میں رائج اور نافذ ہو جائیں' اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل پا جائے جہاں انسان کے بجائے خدا کی حکمرانی ہو' نیکی کرنا آسان اور برائی کے راستے پر چلنا دشوار ہو جائے' دنیا کے کاموں میں انہماک کے باوجود آخرت میں سرخروئی کا ہدف ہر انسان کے سامنے ہو علیٰ ہذا القیاس' اور یوں غلبۂ اسلام کی بشارت پوری ہو جائے۔
- دوسری صورت یہ ہے کہ دنیا میں کسی ایک مسلم ریاست کو سیاسی و دفاعی اور اقتصادی و تہذیبی ایسا مقام اور منصب حاصل ہو جائے کہ وہ فی الواقع دنیا کی Super Power بن جائے' دنیا کے سیاسی فیصلے اس کی رضامندی سے ہوں' اقتصاد و معاش کا ہر چشمہ اس کی سرزمین سے پھوٹے' صلح و جنگ کے تمام معاہدے اس کی موجودگی میں ہوں اور نئے تہذیبی رویے اس کی پیروی میں تشکیل پائیں اگر ایسا ہو جائے تو غلبۂ اسلام کی ایک یہ بھی تعبیر ہو سکتی ہے۔
- تیسرا راستہ یہ بنتا ہے کہ دنیا رفتہ رفتہ اپنے اندر وہ تبدیلیاں لائے جو اسلام کو مطلوب ہیں' قوانین میں' اخلاق میں' فکر میں' اقدامات میں اور مزاج میں' بظاہر دنیا کلمہ گو نہ بھی ہو'

Marfat.com

لیکن شرک کے مظاہر مٹ جائیں مذہبی و سیاسی اور معاشی و جسمانی غلامی کا خاتمہ ہو جائے' قانون کی بالاتری ایک معمول قرار پا جائے' رنگ' نسل' وطن' اور زبان کے جملہ امتیازات غیر آئینی بنا دیئے جائیں' مساوات انسانی اور رواداری کو اصول کا درجہ مل جائے اور ہر نوع کے استحصال کا قلع قمع ہو جائے وغیرہ اگر یہ اصلاحات دنیا میں برپا اور عام ہو جائیں' تو گویا انسان اسلام کی طرف لوٹ آیا کیوں کہ اسلام بھی ایک ایسا نظام چاہتا ہے جس میں یہ اوصاف ہوں' اگر اس طرح کا کلچر اور نظام دنیا کا مشترکہ نظام بن جائے تو اس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام غالب آگیا ہے' "حتماً" کچھ کہنا تو مشکل ہے لیکن ان تینوں امکانات پر غور کر کے اسلامی تحریکات اور علمائے اجتماعیات ایک حکمت عملی وضع کر سکتے ہیں۔

البتہ مثالی اور رشک آمیز نقشہ تو یہی ہے کہ پوری نوع انسانی اعتقادی طور پر بھی مسلمان ہو اور سیاسی و معاشرتی طور پر بھی! یعنی ہر شخص کلمہ گو بھی ہو اور عملی مسلمان بھی' اس کا ذہن بھی مسلمان ہو اور اخلاق بھی اسلامی۔

تاہم دنیا کے تیز رفتار تمدنی ارتقاء اور انسان کی قیادت خیز ذہنی نشوونما سے اب یہ اجازت لینا اور توقع رکھنا ممنوع نہیں کہ وہ قرون وسطیٰ کے یورپ میں پادریوں کی اجارہ داری جیسے ماحول اور مسلم تاریخ کے عباسی و عثمانی خلافت جیسے نظام کو ---- اسلام ---- سمجھ کر قبول کر لے' اور غلبۂ اسلام کے آرزو مند لوگ اس پر قناعت کر لیں' قطعاً نہیں' ہرگز نہیں' غلبۂ اسلام کے نصب العین اور روح عصر کے مابین مطابقت ناگریز ہے۔

(3 اپریل 1999ء)

Marfat.com

نعت اور لمحۂ موجود

نعت صدیوں سے کہی جا رہی ہے، لکھی جا رہی ہے، پڑھی جا رہی ہے اور سنی جا رہی ہے۔ کہنے والوں نے زبان مشک و عنبر سے دھو کر نعت کہی، لکھنے والوں نے شہپر جبریلؑ کو قلم بنا کر نعت لکھی۔ پڑھنے والوں نے لحن داؤدیؑ مستعار لے کر نعت پڑھی اور سننے والوں نے نوائے سروش سمجھ کر نعت سنی،

ع خدا مجھے نفس جبرائیل دے تو کہوں

نعت لکھنے والوں کے ارمان ہنوز تشنہ ہیں۔

ع بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

نعت پڑھنے والوں کا سرمایۂ فن خرچ ہو چکا مگر خود ہی کہتے ہیں۔

ع حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اور نعت سننے والوں کے شوق کا اب بھی یہ عالم ہے کہ

ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

نعت دراصل مومن کا وظیفۂ حیات، ادیب کا سرمایۂ فن، دانشور کی آبروئے فکر، اہل دل کا سامان شوق، شب زندہ دار کی آخری پہر کی بانگ بلالؓ، پروانے کا سوز، بلبل کا ساز، قلب کا گداز، آئینۂ روح کی تاب، آبشارِ محبت کا ترنم، قلزم عشق کی موج، منزل سعادت کا چراغ، کتاب زیست کا عنوان، حیاتِ عشق کی گرمی، سینۂ کائنات کا راز، دیدۂ نمناک کا موتی، خاک حجاز کی مہک، فضائے طیبہ کی نکہت، ازل کی صبح، ابد کی شام اور شاعر کے رتجگوں کا حاصل ہے، نعت سے غنچۂ روح کھلتا، چشمۂ جاں اُبلتا، گلشن ایماں مہکتا، بحر شوق امڈتا، افق فکر چمکتا، سینۂ ذوق مچلتا، قلب کون و مکاں دھڑکتا، حسن زندگی نکھرتا اور قد شعر و فن ابھرتا ہے۔

نعت سے دماغ روشنی، قلم پاکیزگی، افکار تازگی، خیالات توانائی، الفاظ رنگینی اور لہجے رعنائی پاتے ہیں، نعت مضمون کو عزت، عنوان کو شہرت، اسلوب کو ندرت، بیان کو وسعت، اور کلام کو

قوت عطا کرتی ہے۔

نعت تخیل کے نازک آبگینے، عشق کے بے بہا خزینے، حرف و لفظ کے رواں دواں سفینے اور اظہار و بیان کے خوبصورت قرینے کا دوسرا نام ہے۔

یوں کہیے کہ انسانی ذہانت جب عروج پر پہنچتی ہے تو وہ نعت بن جاتی ہے، صبح سعادت جب طلوع ہوتی ہے۔ تو نعت بن جاتی ہے، اسلامی ثقافت جب ثمربار ہوتی ہے تو نعت بن جاتی ہے، فکری صداقت جب نصیب ہو جاتی ہے تو نعت بن جاتی ہے، خفتہ قسمت جب جاگ اٹھتی ہے تو نعت بن جاتی ہے، طلب صادق جب موج بن کر کروٹ لیتی ہے تو نعت بن جاتی ہے اور شاعری جب پیکر التجا میں ڈھلتی ہے تو نعت بن جای ہے۔

نعت در حقیقت حسن کا خراج اور حسن نظر کی معراج ہے، نعت آہوؤں کی صدا اور آنسوؤں کی دعا ہے، اور نعت حسن و عشق اور علم و عرفان کا نقطۂ اتصال ہے۔

جب حضرت بلالؓ کی اٹوٹ نسبت، حضرت حسانؓ کی شاہکار بلاغت، کعب بن زہیر کی لسانی طلاقت رومیؒ کی دانش و حکمت، سعدیؒ کی لافانی فصاحت، جامیؒ کی سچی عقیدت، قدسیؒ کی بے آمیز محبت، بوصیریؒ کی روحانی حلاوت، مرزا بیدل کی فلسفیانہ حیرت، اقبال کی شہرہ آفاق عبقریت امیر مینائی کی طویل ریاضت، غالب کی معنی آفرین ادبیت، فاضل بریلویؒ کی غیر مشروط محبت، شبلیؒ کی پاکیزہ روایت، سلیمان ندویؒ کی عالمانہ متانت، بیدم وارثی کی ادائے فنائیت، محمد علی جوہر کی سکہ بند خطابت، حسرت موہانی کی فنی مہارت، بہادر یار جنگ کی ایمانی حرارت، ظفر علی خاں کی بے پناہ جرأت، نعیم صدیقی کی فکری طہارت، جوش ملیح آبادی کی ادبی سطوت، عبدالعزیز خالد کی مسلمہ علمیت اور حفیظ تائب کی عاشقانہ بصیرت شاعری کے قالب میں اترتی ہے تو نعت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

نعت کیا ہے؟ بجائے اس کہ میں اس کی وضاحت اپنی کج بیانی سے کروں کیوں نہ وادی نعت کے حوصلہ مند سیاح جناب ریاض چودھری کا لہجہ مستعار لوں، جنہوں نے نعت کی تعریف اس انداز میں کی کہ شاعری کو ساحری میں بدل دیا، وہ کہتے ہیں۔

نعت کیا ہے؟ عشق کے ساگر میں غرقابی کا نام
نعت کیا ہے؟ میرے ہر جذبے کی سیرابی کا نام
نعت کیا ہے؟ ہجر میں سانسوں کی بے تابی کا نام

Marfat.com

نعت کیا ہے؟ گنبد خضرا کی شادابی کا نام

نعت ہے بے آب صحراؤں میں پانی کی سبیل

نعت ہے اسم محمدؐ ہی کا اِک نقش جمیل

نعت کیا ہے؟ قریہ ٔ نخوت کی ویرانی کا نام

نعت کیا ہے؟ ملت بیضاء کی سلطانی کا نام

نعت کیا ہے؟ دست بستہ ان کی دربانی کا نام

نعت کیا ہے؟ روضہ ٔ اقدس پہ حیرانی کا نام

نعت کہنے کے لئے دل پاک ہونا چاہیے

غرق الفت دیدۂ نمناک ہونا چاہیے

نعت کیا ہے؟ وادی شعر و سخن کا افتخار

نعت کیا ہے؟ خوشبوؤں کا صحن گلشن میں فشار

نعت کیا ہے؟ رات کے پچھلے پہر کا انکسار

نعت کیا ہے؟ اک عکائے رحمت پروردگار

دل کی ہر دھڑکن کہے یا مصطفیؐ تو نعت ہو

حکم دے میرے قلم کو جب خدا تو نعت ہو

بہرکیف نعت کا موضوع تو وہ حکایت لذیذ ہے جو دراز تر بھی ہو تو مختصر لگتا ہے۔ اور بہ تکرار بھی ہو تو ایک بار محسوس ہوتا ہے' جس طرح ہر دور میں زاویے اور لہجے بدل بدل کر نعت کہی گئی' کہیں رنگ تغزل ابھرا' کہیں حسن نظم نکھرا' کہیں مسدس کے قالب میں اتری اور کہیں رباعی کے پیکر میں ڈھلی' گلشن نعت کے ہر پھول کا رنگ دل آویز اور بو عطربیز ہے' عہد جدید بھی دولت نعت سے مالا مال ہے' ہر زبان میں نعت کہی جا رہی ہے' نئے عنوانات اور جدید اسالیب سامنے آ رہے ہیں' اور یہ سارے منظر بہت خوش رنگ اور نور آہنگ ہیں' عصر حاضر کے ذہن اور تقاضوں' اور لمحہ ٔ موجود کے تناظر اور اطراف کو مدنظر رکھ کر نعت کہنے کی ضرورت اور اہمیت بڑھتی جا رہی ہے' فضائل و شمائل سر آنکھوں پر مگر اب مسائل میں جھانک کر اسلوب تخلیق کرنا چاہیئے' اور ماشاء اللہ اس باب میں ہمارے متعدد شعراء دادِ سخن دے رہے ہیں' یہ انداز آج کی نسل کے لئے بہت Relevant اور Appealing ہے۔

Marfat.com

حضور ﷺ کے شخصی محاسن اور محامد کی کوئی حد نہیں' اور آپ کا وجودِ گرامی بذاتِ خود ایک آیۂ الٰہی اور معجزۂ ربانی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ کی فکر' جدوجہد اور تعلیمات کے نتیجے میں جو انقلاب برپا ہوا اور انسانیت کو ایک نیا وجدان اور شعور ملا اس کا معلوم انسانی تاریخ میں کوئی جواب اور بدل نہیں۔ آج دنیا میں جن باتوں پر سب سے زیادہ زور دے رہی ہے' مثلاً شرف انسانی' مساوات' بنیادی حقوق اور عظمت بشر وغیرہ یہ سب کچھ انقلاب محمدی ﷺ کا ثمر ہے وہ آپؐ ہی ہیں جنھوں نے انسان کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل فرمایا' بنی آدم کو رنگ و نسل اور علاقہ و زبان کے تعصبات سے آزاد کیا۔ احترام آدمیت اور مساوات انسانی کی تعلیم دی' ہر نوع کی ذہنی و فکری اور سماجی و سیاسی اور معاشی و معاشرتی غلامی سے نجات عطا کی' تمیز بندہ و آقا کا فلسفہ رد کیا اور شعور و آگہی کا درس دیا' انہی تعلیمات کا نتیجہ ہے کہ آج انسان اپنے آپ کو' اپنے حقوق کو' اور اپنے شرف کو پہچانتا ہے ورنہ یہی انسان صدیوں تک مختلف قسم کی غلامی کا اسیر رہا اور اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کر برداشت کرتا رہا آج بھی تفرقے ہیں' امتیازات ہیں اور مظالم ہیں لیکن بہ زور اور جبر' انہیں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی جائز اور قانونی نہیں سمجھتا اور نہ انہیں کسی معاملے سے کوئی تقدس حاصل ہے۔ آج نعت کے ذریعے انہی باتوں کے ابلاغ کی ضرورت ہے اور سیرت نبوی ﷺ کے اس انقلابی پہلو کو عصری اسلوب میں پیش کرنا چاہیے' کیونکہ یہ روح عصر اور فرمان امروز ہے' متعدد شعراء اب اس رخ کو نکھار رہے ہیں' اور اس زاویے کو ابھار رہے ہیں' یہ بہت حوصلہ افزا علامت اور بہت ہی نیک شگون ہے' تاکہ نعت کے ذریعے تبدیلی کی لہر مزید زور پکڑے اور شعور انسانی اپنا سفر جلد مکمل کر لے۔

یہ آہنگ ہمیں جوش ملیح آبادی' احمد ندیم قاسمی' نعیم صدیقی' ضمیر جعفری' حفیظ تائب' ماہر القادری' صبا متھراوی' حفیظ الرحمٰن احسن اور نظر زیدی کے ہاں بہت نمایاں نظر آتا ہے' اسے اور واضح کرنے کی ضرورت ہے۔

جوش کہتے ہیں۔

تیرے قدم پہ جبہ سا روم و عجم کی نخوتیں
تیرے حضور سجدہ ریز چین و عرب کی خود سری
تیرے کرم نے ڈال دی طرح خلوص و بندگی
تیری پیمبری کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے

تو نے گدائے راہ کو بخشا شکوہ قیصری
تجھ پہ نثار جان و مال مڑ کے ذرا یہ دیکھ لے
دیکھ رہی ہے کس طرح ہم کو نگاہ کافری

احمد ندیم قاسمی کچھ اس طرح بات کرتے ہیں۔

ے اب بھی ظلمات فروشوں کو گلہ ہے تجھ سے
رات باقی تھی کہ سورج نکل آیا تیرا
تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا ہزاروں کا سہی
اب جو تاحشر کا فروا ہے وہ تنہا تیرا
ایک بار اور بھی یثرب سے فلسطین میں آیا
راستہ دیکھتی ہے مسجد اقصیٰ تیرا

صبا متھراوی کی ایک نعت کے چند اشعار

ے کہا انسانیت نے یہ مرے چہرے کی رونق ہے
کہا تہذیب نے یہ ہے عروج علم و فن میرا
تمدن نے کہا یہ زندگی ہے زندگی میری
معیشت بول اٹھی یہ ہے نقش جان و تن میرا
عبادت نے کہا اس سے بڑھی ہے آبرو میری
سیاست نے کہا یہ ہے نظام انجمن میرا

مرحوم سید ضمیر جعفری کا آہنگ ملاحظہ ہو

ے تمدن کو شائستگی تو نے بخشی
محبت، کرم، دوستی، نام تیرا
شب زندگی کو سحر کرنے والے
ہر اک دور کی روشنی نام تیرا
اسی سے فروزاں خیالوں کے رستے
خبر، آگہی، زندگی، نام میرا

جناب نعیم صدیقی کا ایک شعر نذر ہے

Marfat.com

؎ وہ جو تو نے خم سے مرے لئے کوئی چاندنی سی انڈیل دی
ہے کئی صدی کا یہ واقعہ' مرے جام میں ہے ابھی چمک

محترم حفیظ تائب اپنا اور امت کا درد یوں بیان کرتے ہیں

؎ دے تبسم کی خیرات ماحول کو ہم کو درکار ہے روشنی یا نبیؐ
ایک شیریں جھلک' ایک نوریں ڈلک' تلخ و تاریک ہے زندگی یا نبیؐ
روح ویران ہے' آنکھ حیران ہے' ایک بحران تھا' ایک بحران ہے
گلشنوں' شہروں' قریوں پہ ہے پرفشاں' ایک گمبھیر افسردگی یا نبیؐ

اور یہ ہیں سید نظر زیدی۔

؎ مرے آقاؐ نکھارا ہے جمال زندگی تو نے
عطا کی ہے رخ تہذیب کو تابندگی تو نے
اب انساں پہ کوئی انساں حکومت کر نہیں سکتا
عطا فرمائی علم و عقل کی وہ روشنی تو نے
عطا کردی حکومت کی وجاہت زیر دستوں کو
غلاموں کے سروں پر رکھ دیا تاج شہی تو نے
صدا آتی ہے زیدی' اب بھی التمتش کے مرقد سے
غلاموں کو عطا کی سروری تو نے

یہ مختلف نعتیہ اشعار لحۂ موجود کے تقاضوں کی درست نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں' انہیں پڑھ اور سن کر ایک ولولۂ تازہ نصیب ہوتا اور دامن اپنے نبیؐ کے بہت قریب ہو جاتا ہے' وہ حضورؐ ہی ہیں جنھوں نے جہل کے مقابلے میں عقل' ذہنی غلامی کے مقابلے میں آگہی' محکومی کے مقابلے میں خودی' اور جاہلی غرور کے مقابلے میں انسانی شعور کو فوقیت دی' اور اپنی فکر اور عمل سے اس رجحان کو پروان چڑھایا' آج بھی دنیا ادھر ادھر دستک دینے کے بجائے سیدھی درِ رسولؐ کی خیرات مانگے' تو سارے طاغوتی فتنے اور جاہلی حربے دم توڑ جائیں گے' نور مجسم سے صدقہ نور لینے کا وقت ہے۔

؎ چاہتے ہو تم اگر' نکھرا ہوا فردا کا رنگ
سارے عالم پر چھڑک دو' گنبد خضرا کا رنگ

(24 دسمبر 1999ء)

Marfat.com

دُعا

دعا بظاہر ایک دینی اصطلاح ہے' اور اہل دنیا اسے نیکوں' غازیوں' صوفیوں اور مولویوں کا وظیفہ گردانتے ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ غریب' محتاج' سائل اور کمزور لوگوں کا نفسیاتی سہارا' یہ بلاشبہ پاکبازوں اور صوفیوں کا وظیفہ ہے اور محتاج اور بے وسیلہ لوگوں کی روحانی ڈھارس' لیکن بات یہاں آکر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ دعا وہ وظیفہ ہے جو بندے کو احساس بندگی دلاتا ہے اور رحمت حق کو مہمیز دیتا ہے۔ دعا وہ نقطہ اتصال ہے جو بندے کی تمنا اور اللہ کی عطا کو ایک جگہ جمع کر دیتا ہے' دعا وہ حالت ہے جب بندہ اللہ سے سرگوشی کرتا ہے تو اس کی رحمت بڑی دیر تک کان لگائے رہتی ہے' بندہ جو باتیں کسی انسان سے نہیں کہہ پاتا وہ بے تکلف اپنے مالک و مولا سے بیان کر دیتا ہے' بعض اوقات کوئی ضرورتمند' کوئی محتاج' کوئی کارگہ حیات میں بچھڑ جانے والا' کوئی غریب' کوئی مسکین' اور کوئی سفید پوش اپنے جیسے یا اپنے سے بڑھ کر کسی دولت مند' اور کسی خوشحال شخص سے اپنی ضرورت بیان کر بھی دے تو دونوں صورتوں میں اس کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے' خواہ اسے جھڑک یا ٹال دیا جائے یا اسے کچھ عطا کر دیا جائے' ٹالے جانے کی صورت میں تو وہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا اور عطا کئے جانے کی شکل میں وہ سر بھکانے پر مجبور ہو جاتا ہے' مگر بارگاہ ایزدی سے نہ تو کبھی ڈانٹ پڑتی ہے نہ کسی کو جھڑک دیا جاتا ہے اور حسب تمنا عطا کر دینے پر بھی بندے کو پشیمان نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا دراصل مان بڑھایا جاتا ہے کہ بندہ اپنے رب پر مان نہ کرے تو کس پر کرے؟ اس کو عطائے ذاتِ لم یزل پر ناز نہ ہو تو کس پر ہو؟ اس کی حجت دربارِ خداوندی سے پوری نہ ہو گی تو اور کہاں ہو گی؟

ے
اور جتنے بھی سہارے ہیں سبک کرتے ہیں
عزت نفس بڑھاتا ہے سہارا تیرا

بسا اوقات رشتہ دار ضروریات پوری کر دیتے ہیں' احباب آڑے وقت میں کام آجاتے ہیں۔ محلے دار ڈھال بن جاتے ہیں' دفتری رفقاء مدد کر دیتے ہیں' رحم کھانے والے بھی ہاتھ تھام

لیتے ہیں۔ سخی لوگ ہاتھ کی میل سمجھ کر کچھ دے دیتے ہیں۔ خدا ترس بندے بھی ہاتھ بٹا دیتے ہیں۔ آخر اسباب کی دنیا ہے کوئی نہ کوئی حیلہ بروئے کار آجاتا ہے مگران میں سے ہر ایک کبھی نہ کبھی عنوان بدل بدل کر احسان جتاتا اور اپنا آپ دکھاتا ہے رہ گئی ذاتِ باری تعالیٰ وہ دیتی بھی ہے اور بندے پر خوش بھی ہوتی ہے کہ اس نے مجھے پکارا' اس نے مجھے یاد کیا' اس نے مجھ سے مانگا اس کے ہاں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

؎
آتا ہے فقیروں پہ اسے پیار کچھ ایسا
خود بھیک دے اور خود کہے منگتے کا بھلا ہو

اس مفہوم کی ایک حدیث بھی ہے۔ "اللہ اس بندے سے ناراض ہوتا ہے جو اس سے نہ مانگے۔" یعنی لوگ مانگنے پر منہ بناتے اور اکتاتے ہیں جبکہ خدا مانگنے پر خوش' دست سوال دراز کرنے پر مسرور اور دعا کرنے پر راضی ہوتا ہے' کسی سائل و محتاج کے سوال اور اظہار مدعا پر وہ فرشتوں کی مجلس میں بندے کی عزت نفس کا مذاق نہیں اڑاتا بلکہ انہیں گواہ بنا کر کہتا ہے "فرشتو! میرے بندے نے مجھ سے سوال کیا میں نے اس سے بہت خوش ہوں جاؤ اسے خوشخبری دے دو کہ جو کچھ اس نے مانگا وہ بھی اسے دے دیا گیا۔ اور جو وہ بھولے سے مانگ نہیں پایا وہ بھی عطا کر دیا گیا۔"

ہر شخص کو یہ احساس ہے کہ دنیا میں کسی سے کچھ مانگنا کس قدر اذیت ناک اور تکلیف دہ ہوتا ہے' آدمی گلے تک زمین میں گڑ گڑ جاتا ہے۔ پیشانی پر پشیمانی پر کتنے بڑے بڑے گومڑ نکل آتے ہیں۔ زبان کس قدر ہکلاتی اور تھتھلاتی ہے۔ کانوں کی لویں شرم سے تپ جاتی ہیں۔ آنکھوں کی پتلیاں کس بے بسی سے گردش کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ سانس کے ساتھ آواز بھی بے ترتیب ہو جاتی ہے۔ دل کی دھک دھک سے سینہ پھٹنے کو آتا ہے' ماتھے کا عرق انفعال ڈوبنے کو کافی ہوتا ہے۔ بولتے ہوئے ہونٹوں کا کھنچنا اور بھنچنا قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ خدا کسی کو کسی کا محتاج نہ کرے۔

؎
شالا مسافر کوئی نہ تھیوے گھ جنھاں تیں بھارے ہو

لیکن وہی محتاج انسان جب خدمت الٰہی میں حاضر ہوتا ہے' کھل کر روتا ہے مگر شرمندہ نہیں ہوتا الٹا دل کا غبار دھل جاتا ہے' گڑگڑاتا ہے مگر ہچکچاتا نہیں' بندہ دھاڑیں مار کر روتا ہے مگر مہربان رب اس کا داغ ندامت ہمیشہ کے لئے دھو دیتا ہے' وہ کہنیاں زمین پر رگڑتا ہے مگر خدا اس کا مان رکھتا ہے' وہ عاجزی سے گال زمین پر ٹیکتا ہے غفور و رحیم خدا اسے حقارت سے نہیں بہت پیار

Marfat.com

سے دیکھتا ہے، وہ جس قدر بے بسی سے ہاتھ پھیلاتا ہے رؤف و کریم بڑی تیزی سے اس کے قریب آجاتا ہے، اس کے جناب سے ملتا تو ہے ہی پر مرحلۂ دعا اس عطا سے کہیں بڑھ کر کیف آگیں اور روح افزا ہوتا ہے۔

کیسے مزے کے دن تھے کہ راتوں کو صبح تک
میں تھا تری جناب تھی، دست سوال تھا

بعض اوقات اللہ تعالیٰ بندے کا ذوق طلب بڑھانے اور آتش شوق بھڑکانے کے لئے دعا کی قبولیت میں تاخیر کر دیتا ہے، یہ بندے کے لئے تعزیر نہیں اس کی دعا کو اکسیر بنانے کے لئے ہوتی ہے، مالک الملک یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ بندہ واقعی مجھے سب کچھ سمجھتا ہے یا ابھی کسی اور سے بھی آس لگائے بیٹھا ہے، محض میری رحمت کو ٹٹولنے آیا ہو، ایک فرمان رسول کے مطابق تین بار تو اللہ تعالیٰ اپنا رخ رحمت ادھر ادھر کرتا ہے مگر چوتھی بار اس کا کرم چھلک پڑتا ہے اور بندے کی کشت زار آرزو کو سیراب کر دیتا ہے، بعض بندے بڑے عجلت پسند اور تھڑدلے ہوتے ہیں، اپنی اس ادا سے وہ رحمت حق کو تو نہیں البتہ خود کو آزمائش میں ڈال لیتے ہیں، ورنہ اللہ تو سیاہ راتوں میں چکنے اور سیاہ پتھر میں بسیرا کرنے والے حقیر کیڑے کو بھی سنتا رہتا ہے بھلا وہ اشرف المخلوقات انسان کو کیوں نہ سنے؟ انسان خواہ سیہ کار ہو یا نیکوکار، تہجد گزار ہو یا نانجار، پرہیز گار ہو یا سودائے روزگار، خوش اطوار ہو یا بدکردار، دینے والا منہ دیکھ کر نہیں دیتا، اپنی شان کرم دیکھتا ہے اسی لئے تو حضرت علیؓ اپنی دعامیں کہتے ہیں۔

"الٰہی تو میرے ساتھ وہ معاملہ فرما جو تیرے شایان شان ہے وہ نہ کر جس کا میں حقدار ہوں۔" مانگنے کی یہ ادا ہو تو دعا اشارۂ ابرو سے آگے نہیں بڑھ پاتی اس سے پہلے قبول ہو جاتی ہے۔ بندے پر لازم ہے کہ وہ جلدی نہ دکھائے اپنی دردمندی ظاہر کرے، وہ عجلت افروزی سے زیادہ دلسوزی پر زور دے، وہ آشفتہ سر نہ بنے صحیح معنوں میں گداگر بن کر رہے، وہ ساعتیں شمار نہ کرے، ابر کرم کے برسنے کا انتظار کرے، شیخ سعدی نے ایک حکایت کے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ کسی شخص کو شوق چرایا کہ وہ ولی اور مجذوب بن کر مرجع خلائق کہلائے اور یہ سب کچھ چند دنوں میں ہو جائے، ڈنڈا ڈیرا اٹھایا اور پہاڑ کی کھوہ کو چل دیا، دو چار روز عالم استغراق میں رہا، کچھ وظیفہ کیا، چند دعائیں پڑھیں اور بیٹھ گیا، فتوحات کے انتظار میں بھلا ہفتے بھر میں کیا ہوتا تھا؟ اس کا تو

خیال تھا کہ بس کوئی دن ہو گا لوگ کھنچے چلے آئیں گے' ڈالیاں دوڑتی اور قابیں اچھلتی آئیں گی' دودھ کے مٹکے پہنچ جائیں گے اور آب یخ کی صراحیاں لبالب دھری ہوں گی' بھلا کبھی فقر بھی اس مکر سے ہاتھ آیا ہے؟ اور کوئی فقیر اس تدبیر سے بنا ہے؟ وہ شخص طالب جاہ تھا بھوک پیاس سے نباہ نہ کر سکا وہ خواستگارِ آسائش تھا۔ آزمائش میں نہ پڑ سکا' فوراً اٹھا پوستین گلے میں حمائل کی' ہاتھ میں کشکول تھا' اور قریب کی بستی میں جا نکلا' پہلے ہی در پر صدا دی تھی کہ ایک خونخوار کتے سے پالا پڑ گیا' یہ بدکتا جا رہا تھا۔ اور کتا لپکتا آ رہا تھا' یہ پیچھے کو سرکتا کتا آگے کو مچلتا' تنگ آ کر نام نہاد فقیر نے کتے سے پوچھا کہ میں بے نوا بھکاری ہوں تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ نہ تمہیں جھڑکا' نہ ڈھیلا مارا' نہ ڈانگ اٹھائی' تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ شیخ سعدیؒ لکھتے ہیں اس موقع پر قدرت نے کتے کو قوت گویائی بخشی اور وہ بولا' ارے کم ظرف' تم تو گئے تھے آستان رب پر بیٹھنے' اس سے ملنے اور اس سے مانگنے کیا کہا کہ چار دن میں جی بھر گیا' اور آ گئے ہو غیر اللہ کے در پر' مجھے دیکھو کئی سالوں سے اپنے مالک کی ڈیوڑھی میں بندھا ہوں' کچھ ڈال دیتا ہے تو کھا لیتا ہوں' نہیں ڈالتا تو اسے بھونکتا نہیں ہوں کئی دن فاقے بھی کاٹتا ہوں' مگر مالک کا در چھوڑ کر کسی دوسرے کی چوپڑی روٹی پر طمع کی نگاہ نہیں ڈالی' اپنے مالک کی چچوڑی ہڈی پر گزارا کیا ہے' جا یہاں سے چلا جا ورنہ تجھے پھاڑ کھاؤں گا' تب اس ملمع ساز کی آنکھ کھلی اور چلتا بنا' رب کے حضور حاجات کا پیش کرنا یا دعا مانگنا کمیت نہیں ایک کیفیت ہے' مانگنے کے لئے ضروری نہیں کہ کوئی عربی ادب کا لبید و جاحظ ہو' فارسی لٹریچر کا رومی و سعدی ہو' انگریزی ادبیات کا ملٹن اور آسکر وائلڈ ہو' اردو کا غالب و ابو الکلام ہو' نہیں کیفیت ایک نابلد محض کی بھی ہو سکتی ہے' گونگا بھی اپنے انداز میں رب کریم کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا سکتا ہے' ہکلانے والا شخص بھی اپنا دل کھول کر رکھ سکتا ہے' کج مج بیان بھی سادگی سے اپنا مدعا پیش کر سکتا ہے رب کی رحمت محض رازیؒ و غزالیؒ کے لئے نہیں اور نہ ہی اس پر جنیدؒ و بایزیدؒ کا اجارہ ہے' یہ لوگ ہزار مقبول بارگاہ الٰہی سہی' اگر خدا صرف ان کی سنتا رہا تو ہم جیسے خاطی و عاصی کس در پہ جائیں گے؟ جبکہ مریض سب سے زیادہ حاذق حکیم کی طرف لپکتا ہے اور طبیب کا سارا سامان طب مریض کے لئے ہوتا ہے' سخی کا دروازہ خوشحالوں کے لئے

Marfat.com

نہیں ہمیشہ بدحالوں کے لئے کھلتا ہے' ماں کا دریائے شفقت ہنستے کھیلتے بچے کے لئے نہیں روتے بلبلاتے بچے کے لئے جوش مارتا ہے' جس طرح ماں کو پتہ ہوتا ہے کہ اس کے بچے کی جائے پناہ اس کی گود ہے اس کا مرکز شفقت اس کا سینہ ہے اور اس کا واحد سہارا اس کی بانہیں ہیں چنانچہ ماں بھی بچے کے لئے وقف ہوتی ہے۔ اور بچہ بھی دائیں بائیں نہیں جھانکتا لپک کر سیدھا ماں کی جھولی میں آگرتا ہے یہی کیفیت اگر بندے کی ہو' رب کو یقین ہو کہ میرے بندے کا اس کے علاوہ کوئی سہارا نہیں اور بندے کا بھی پختہ اعتقاد ہو کہ رب کے علاوہ کوئی لائق بھروسا نہیں' تو پھر وہ کچھ رونما ہوتا ہے جسے قرآن معجزہ کہتا ہے' ایک بچہ جب اپنے باپ سے فرمائش کرتا ہے کہ وہ سکول جاتے ہوئے تھک جاتا ہے' گرمی اسے ستاتی ہے' دوست اسے طعنے دیتے ہیں' اور یہ جانے بغیر کہ اس کے باپ کے پاس وسائل ہیں یا نہیں سائیکل کی مانگ کر بیٹھتا ہے' پہلے دن باپ اسے نرمی سے سمجھاتا ہے کہ بیٹا پیسے ہوتے تو ضرور سائیکل لے کر دیتا۔ دوسرے دن کی طلب پر ذرا جھڑکنے کے انداز میں کہتا ہے' جان من! مجھے علم ہے تمہیں تکلیف ہوتی ہے مگر میری تکلیف اور مجبوری کا بھی خیال کرو' اس سے اگلے دن اکتاہٹ کے انداز میں باپ ڈانٹتے ہوئے بتاتا ہے کہ کیا تمہاری سائیکل کے لئے کسی کی جیب کاٹوں؟ کسی کی دیوار پھلانگوں؟ کسی سے بھیک مانگوں؟ لیکن جب بچہ بول اٹھتا ہے' ابا جان! میری فرمائش بے جا سہی اور آپ کی مشکل بجا سہی' مگر کیا کروں مجھے جب بھی کچھ کہنا ہے آپ سے کہنا ہے اور جو مانگنا ہے آپ سے مانگنا ہے کوئی اور باپ کہاں سے لاؤں کہ اس سے فرمائش کروں؟ یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں باپ اپنا دل سینے سے باہر ابلتا ہوا محسوس کرتا ہے پھر وہ اپنی روز مرہ ضروریات کی پروا نہ کرتے ہوئے بیٹے کی دلجوئی کا سامان کرتا ہے' یہی کیفیت دراصل بندے کے لئے مطلوب ہے کہ وہ اللہ کی رحمت کو اپنی عاجزی' مسکینی' بے بسی' بندگی' حاجت طلبی' اشک ریزی' اور خود سپردگی کے باعث ایسے موڑ پر لے آئے تو پھر رحمت خداوندی چھلک چھلک پڑتی ہے اور لہک لہک اٹھتی ہے بندہ پہلے اظہار بندگی تو کرے پھر شان خداوندی کا نظارہ کرے۔

یہ کیا کہ جھٹ مانگا اور پٹ انتظار میں بیٹھ گیا' دعا جب تک کیفیت نہ بنے' لذت کے

Marfat.com

سانچے میں نہ بیٹھے اور تمنا کے پیکر میں نہ ڈھلے' پھر وہ دعا نہ ہوئی محض مدعا بن گیا اور وہ بھی بے رنگ اور بے کیف! بندہ جب اپنے ہاتھوں کو مجسم سوال بنا لیتا' اور دامن کو کشکول میں بدل دیتا ہے تو پھر ایک آہ سرد اور ایک قطرۂ اشک گرم اس کے سب سے بڑے سفارشی اور قبولیت کے ضامن بن جاتے ہیں' دعا لفظوں کے تکرار کا نہیں بندگی کے اظہار کا نام ہے' جب انسان یہ کہنے پر آجائے تو پھر خدا عرش علیٰ سے اتر کر آسمان دنیا پر آجاتا ہے اور اپنے بندے کی دعا سنتا ہے' حضرت علیؓ کے یہ الفاظ کس قدر وجد انگیز' ذوق آفریں اور روح پرور ہیں کہ۔ اللّٰھم اغفر لمن لا یملک الا الدعا "اے اللہ اس شخص کو بخش دے جس کے پاس دعا کے علاوہ کوئی سرمایہ نہیں۔"

پیارے قارئین! خود ہی سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے بتایئے کہ اللہ کو ماننے اور اس کی توجہ پانے کے لئے اس سے بہتر ذریعۂ اظہار کیا ہو سکتا ہے جو پیرایہ باب مدینۃ العلم نے اختیار کیا ہے۔

بندہ مال و زر پر اترائے' خانوادہ کا رعب جمائے' عہدہ و منصب کی جھلک دکھائے' قبیلہ و برادری کا حوالہ سنائے اور اپنے نوافل و اذکار پر سینہ پھیلائے اور پھر کہے مولا! میری بھی سن' یہ عرض گزاری تو نہ ہوئی دنیا داری ہوئی' اللہ کی منشاء یہ ہے کہ میرے بندے تو میرے لئے سب رشتے توڑ کر آ' ساری دنیا تیرے ساتھ نہ جوڑ دوں تو پھر کہنا' تو کاسۂ دل ہر تمنا سے خالی کر کے آ' تیرے دل کو شاہ و والی نہ بنا دوں تو پھر کہنا' تو اپنی گردن نیچی کر کے آ' تیری ٹوپی جہاں بھر میں اونچی نہ کر دوں تو پھر کہنا' تو خواہشوں کے آنگن میں جھاڑو پھیر کے آ' میں اس میں بے نیازی کا چاند نہ اتار دوں تو پھر کہنا' تو ایک بار پلکیں بھگو کے آ' تیرے سارے دھونے نہ دھو دوں تو پھر کہنا' تو رشتہ و پیوند کو بھول کے آ' میں تجھے کونین میں ارجمند نہ کروں تو پھر کہنا' اور تو ایک بار صرف میرا بن کر آ راحت و عظمت دارین تیرے نام نہ کروں تو پھر کہنا!

رحمت رب کو پیسہ یا حوالہ درکار نہیں ہوتا بس ایک حیلہ مطلوب ہوتا ہے' اس لیے جہاں دعا کا ساتھ لفظ چھوڑ جاتے ہیں' جملے پیچھے رہ جاتے ہیں اور حرف جواب دے جاتے ہیں' وہاں کوئی حیلہ کام آجاتا ہے' خواہ وہ دل کی تیز دھڑکن ہو' جسم کی کپکپی ہو'

Marfat.com

روح کی بیقراری ہو' آنکھوں کی آشکباری ہو' دامن کا بے ساختہ پھیلاؤ ہو' ہاتھوں کا گدایانہ ارتعاش ہو' لہجے کا اضطراب ہو اور کچھ بھی میسر نہ ہو تو گناہوں کا اعتراف ہی قبولیت دعا کا زینہ بن جاتا ہے' بندہ بے صبرا نہ ہو' لمحوں میں قطع منازل کا اسے لپکانہ ہو' ذرا لذتِ انتظار کا آشنا ہو' پھر دیکھے کہ عرش اور فرش کا فاصلہ کیسے گھٹتا ہے' افلاک اور خاک کا کیسے ملاپ ہوتا ہے' اور آقا و بندہ کیسے ہمکلام ہوتے ہیں؟ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جو کچھ کرتے کماتے ہیں' سب کچھ بچوں کے لئے ہوتا ہے ان کی سہولت ان کی خاطرداری اور ان کے مستقبل کے لئے ہم گھر میں مٹھائی اور پھلوں کا ٹوکرا لے آتے ہیں' بچوں کے لئے لاتے ہیں مگر جب مانگتے ہیں تو سب کچھ انہیں نہیں دے دیتے اس لئے نہیں کہ ان کے لئے نہیں لائے' بلکہ ان کے لئے جتنا ضروری اور مناسب ہے وہ دیتے ہیں' جیب میں ہزاروں روپے ہوتے ہیں' لیکن بچوں کو خرچی کے لئے پانچ دس روپے ملتے ہیں کیوں؟ کیا یہ سب کچھ بچوں کے لئے نہیں؟ بلاشبہ ان کے لئے ہے لیکن دیا اتنا جائے گا جتنا ان کے لئے موزوں ہے اسی طرح بلا تشبیہہ و مثال' جو کچھ کائنات میں ہے سب کچھ بندوں کے لئے ہے' اللہ نے یہ سب کچھ اپنی سہولت کے لئے نہیں جوڑ رکھا' انواع و اقسام کے کھانے' شیریں اور یخ پانی' متنوع ملبوسات' نرم بستر' اونچے بنگلے' میٹھی نیند' ذائقے دار پھل' نظرنواز مناظر جنت نظیر باغات' گنگناتی آبشاریں' ہفت رنگ قوس قزح' کاروبار' تجارت' پیسہ' دولت' برادری' منصب' عہدہ' تاج و کلاہ' لشکر و سپاہ' سریر و تخت' حریر و زربفت' یہ سب چیزیں بندوں کے لئے ہیں' اللہ ان سب سے بے نیاز ہے' بندہ ان میں کچھ بھی مانگے تو ضروری نہیں ہر چیز فی الفور مل جائے' بندوں کے لئے جو ضروری ہے وہی دیا جائے گا' جس نے یہ حکمت ربانی پالی گویا اس نے جیتے جی اپنی زندگی جنت بنالی' قرآن مجید میں ہے کہ کئی چیزیں تمہیں بے حد مرغوب ہیں مگر دراصل تمہارے لئے موزوں نہیں اور کئی باتیں جنہیں تم اپنے لئے مکروہ جانتے ہو فی الحقیقت تمہارے حق میں بہتر ہیں۔" یہ فلسفہ انسان کو وہ شان عطا کر دیتا ہے۔ کہ پھر

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی

والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے' ورنہ خدا دینے پہ آئے تو اس نے بندوں کو کیا نہیں دیا؟

Marfat.com

اور کیا نہیں دے سکتا؟ فرعون کو چار سو سال کی عمر بھی دی اور بادشاہت بھی! قارون کو دولت بھی دی اور رعونت بھی، سکندر کے قدموں میں تین چوتھائی دنیا ڈال دی، قیصر کو روم جیسی سلطنت بخش دی اور کسریٰ کو تاج ایران عطا کر دیا، کیا یہ باتیں ان کے حق میں گئیں؟ نہیں، ان کے مقابلے میں انبیاء کرام دکھوں میں گھرے رہے۔ حضرت نوحؑ کو عمر بھر قوم کی مزاحمت کا سامنا رہا، حضرت لوطؑ اپنی بیوی کے ہاتھوں تنگ رہے، حضرت یوسفؑ کی سر بازار بولی لگی، حضرت یعقوبؑ ہجر یوسفؑ میں آنکھوں کا نور کھو بیٹھے، حضرت زکریاؑ آرے کی زد میں آئے، ساری کائنات میں اللہ کے سب سے پیارے انسان حضرت محمد رسول اللہ ﷺ طائف اور صحن کعبہ میں لہولہان ہوئے، تین سال شعب ابی طالب میں محصور رہے، تین سو میل سنگلاخ پہاڑیوں کا سفر کیا جب مکے سے مدینہ کو ہجرت ہوئی، نواسہ رسول حسینؓ کو میدان کربلا میں حرف برملا کہنے پر جام شہادت نوش کرنا پڑا کیا یہ لوگ گھاٹے میں رہے؟ ہرگز نہیں! یہ لوگ دراصل راز الٰہی پانے والے لوگ ہیں تبھی تو اپنی مراد پا گئے، دعا درحقیقت راز الٰہی پانے کی تمنا ہے، جس پر یہ راز کھل گیا اس پر کشاد و فلاح کے سارے دروازے کھل گئے، وہ شخص راز پا گیا۔ جسے معلوم ہوا کہ میں کچھ نہیں سب کچھ میرا پروردگار ہے، پھر سب کچھ اسی کا ہو جاتا ہے، ارض بھی، سما بھی، بندے بھی اور خدا بھی!

دعا یہی سلیقہ سکھاتی ہے، آیئے ہم سب اللہ کے حضور التجا کریں، بار الہا، ہم بھی تیرے، یہ کائنات بھی تیری یہ وسائل رزق بھی تیرے، یہ ذرائع علم بھی تیرے یہ کیفیات قلب و دماغ بھی تیری اور یہ ملک بھی تیرے نام کا صدقہ ہے، تو ہمیں اپنا بنا لے، کائنات کو ہمارے لئے موم کر دے، وسائل رزق کو سب کے لئے عام کر دے، ذرائع علم سے ہر ایک کو فیض پہنچا، اور اس ملک کی لاج اپنے نام کے صدقے رکھ لے اسے کسی کا محتاج نہ بنا، اس کو وجود بخشا ہے تو اسے شناخت بھی عطا فرما آمین۔

ے
تشنہ لب چڑیا کے منہ میں گرمی آجائے گی
تیرے دریائے کرم میں کیا کمی آجائے گی

(25 اگست 1998ء)

ٹیم کا انتخاب

حضرت علیؓ سے بعض لوگوں نے پوچھا "اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ کا دور حکومت مسلسل بحران اور انتشار کا شکار ہے جب کہ شیخین یعنی حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کا عہد اقتدار استحکام کا آئینہ دار تھا؟"

آپ نے جواب میں بہت ہی بلیغ اور فکر انگیز جملہ ارشاد فرمایا "اس کا سبب بالکل واضح ہے ان حضرات کے مشیر میرے جیسے لوگ تھے اور میرے مشیر تم جیسے لوگ ہیں۔"

ہر حکمران کا یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے کیسی ٹیم کا انتخاب کرے کام اور مشاورت کے لئے اچھے لوگ خدا کی نعمت ہوتے ہیں اور ان کی مشاورت میں خدائی برکت شامل ہوتی ہے اگر مشیر جاہ پرست' موقع شناس' اور ہرجائی ہوں تو ان کا کچھ بگڑے نہ بگڑے حکمران اور اس کے اقتدار کو لے ڈوبتے ہیں' ایک مشیر اور ساتھی تو وہ ہوتے ہیں۔ جو باقاعدہ نظر آتے ہیں جن کے عہدوں کا نوٹیفیکیشن جاری ہوتا ہے اور دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو غیر رسمی مگر فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں جنہیں عرف عام میں "کچن کیبنٹ" کہا جاتا ہے۔ یہی لوگ دراصل حکمران کی آنکھ' کان اور دماغ ہوتے ہیں اور یہ ہر دور میں ہوتا ہے۔ ایوب خان ہو' یحیٰی خان ہو' بھٹو ہو' ضیاء الحق ہو' بے نظیر ہو' یا میاں نواز شریف' کچن کیبنٹ کے ارکان غیر معمولی دسترس' اور اثر رسوخ رکھتے ہیں' یوں تو دنیا کو دکھانے کے لئے باقاعدہ کابینہ بھی ہوتی ہے' مشیر بھی مقرر ہوتے ہیں' پرنسپل سیکرٹری اور سپیشل اسسٹنٹ بھی رکھے جاتے ہیں' مگر پالیسی سازی' سمت کے تعین' اور معاملات کی گہرائی تک بہت کم لوگوں کو رسائی حاصل ہوتی ہے' اور جن کی رسائی ہو وہی "غیر رسمی مشیر" اور ہر معاملے میں دخیل ہوتے ہیں' موجودہ حکومت جن ارمانوں اور امیدوں کے ساتھ قائم ہوئی ہے' بدقسمتی سے بہت تھوڑے عرصے میں محبوبیت کے مقام سے نیچے آ گئی ہے۔ کہنے کو تو اسے عوام کا بے صبرا پن کہا جا سکتا ہے' اسے مخالفوں کا نفسیاتی پراپیگنڈہ قرار دیا جا سکتا ہے' اسے شوشہ بازی کی مہم کا نام دیا جا سکتا ہے' یا اسے حالات کی انتہائی بگاڑ سے موسوم کیا جا سکتا ہے' کہ چند ماہ میں اس کا سدھار

ممکن نہیں وجہ خواہ کچھ کیوں نہ ہو' لوگوں کا جوش عقیدت نسبتاً نہیں بہت زیادہ سرد پڑ گیا ہے' اس عرصے میں جو اقدامات ہوئے عوام کے خیال میں یہ حکمران طبقے کے لئے مفید ہوں تو ہوں عوامی ترجیحات سے میل نہیں کھاتے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ حکومت نے اپنے خصوصی مشیروں کے انتخاب میں ٹھوکر کھائی ہو؟ شائد حکومتی ٹیم عوامی جذبات اور ترجیحات کو پوری طرح Observe نہ کر سکی ہو؟

بعض اوقات مشیروں کی ایک ٹیم حکمران کے اقتدار پر کافی عرصے تک براجمان رہنے میں معاون ثابت ہوتی ہے کبھی فوراً ہی دھڑن تختہ کر دیتی ہے اور کچھ ملی جلی ٹیم ہوتی ہے۔ اس کا ایک حصہ معاون اور دوسرا مزاحم ثابت ہوتا ہے اور کامیابیوں کے ساتھ ساتھ ناکامیوں کے پہلو بھی سامنے آتے رہتے ہیں' اس طرح کہ ملغوبہ ٹیم بھی بہرحال تشکیل پا جاتی ہے۔ جنرل ضیا الحق کی مثال ہمارے سامنے ہے سب سے طویل عرصہ اقتدار پر رہنے کا ریکارڈ انہوں نے قائم کیا بعض انمٹ نقوش چھوڑے اور بعض اقدامات محض بلبلے جو ایک ہی پھونک سے پھٹ گئے' ہم اپنی طرف سے کوئی تجزیہ پیش کرنے کے بجائے جنرل کے ایم عارف کی ایک روایت کا سہارا لیتے ہیں' جو انہوں نے اپنی کتاب "ضیاء الحق کے ساتھ" میں بیان کی ہے۔ انہوں نے مرحوم ضیاء الحق کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر محمود درانی کا حوالہ دیا ہے۔ جو تین سال تک مرحوم جنرل کے ساتھ وابستہ رہے' جنرل عارف لکھتے ہیں۔

"درانی سے سوال کیا گیا کہ ایسے تین لوگوں کے نام بتائیں جنہوں نے ضیاء کی شخصیت کو سب سے زیادہ ضعف پہنچایا۔ تو انہوں نے مسٹر محمد اسلم خٹک' لیفٹیننٹ جنرل رفاقت اور جنرل حمید گل کا نام لیا اسی طرح ان سے یہ بھی پوچھا گیا کہ ایسے تین اشخاص کی نشاندہی کریں جنہوں نے ان کے دور اقتدار کو طول دینے میں نمایاں کردار ادا کیا سب سے پہلے انہوں نے مسٹر غلام اسحاق خاں کا نام لیا جنہوں نے ملک کی مالی اور اقتصادی پالیسیاں وضع کیں اور ضیاء کی بھرپور تائید و حمایت کی' دوسرا نام جنرل غلام جیلانی کا تھا۔ جنہوں نے ۸۰ء کے وسط سے ملک کے سب سے بڑے صوبے (پنجاب) کا نظم و نسق خوش اسلوبی سے چلایا اور جب رخصت ہوئے تو ہر طرف امن و امان کا دور دورہ تھا۔ اور تیسرا نام جو انہوں نے بتایا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اسے حذف کر دیا جائے۔"

یہ تیسرا نام ہمارے خیال میں خود جنرل عارف کا ہے جنہیں اس دور کا "ڈی فیکٹو وزیر اعظم" کہا جاتا تھا۔

آج یہ افواہیں گردش کر رہی ہیں اور یہ تبصرے چھپ رہے ہیں کہ حکومت ایوان صدر کو بے دست وپا اور تنہا کرنے کا سوچ رہی ہے' حکومت عدلیہ سے بھی چنداں خوش نہیں' اسی طرح جماعت اسلامی کو مسلم لیگ پہلے ہی اپنا حریف بنا چکی ہے' اور ایم کیو ایم کو حلیف بنا کر کراچی کو دوبارہ اسی موڑ پر پہنچا دیا ہے جہاں کچھ برس پہلے تھے بعض معاملات میں اے این پی کو بہت زیادہ سہولیات مہیا کی جا رہی ہیں' آخر یہ سارے معاملات کسی کی مشاورت سے طے پا رہے ہوں گے' اکیلے میاں صاحب تو فیصلے نہیں کر رہے' اب اعجاز الحق کی سیاسی پالیسی بھی کچھ نئے اشارے دے رہی ہے' احتسابی عمل کی سست روی اور نیم دلی بھی چنداں خوش کن نہیں ابھی تک سارا زور سابق حکومت کے ملازمین پر ہے سیاستدان سب کے سب پاک صاف نظر آ رہے ہیں آخر کیوں؟

ملک کے تیرہ کروڑ عوام کے مقابلے میں سابق وزیر اعظم جناب نواز شریف کو سب سے زیادہ اس حقیقت کا ادراک ہو گا کہ ان کی کامیابی کی صورت میں ان کی پوری ٹیم شریک تصور ہو گی لیکن ناکامی کی شکل میں اس کے نتائج وہ تنہا بھگتیں گے' کیونکہ یہی تاریخ کا سبق اور زمانے کا دستور ہے' کرپشن کے خاتمے' قانون کی بالادستی شفاف انداز حکمرانی اور بے لاگ احتسابی عمل کے لئے ضروری ہے کہ قصۂ زمین بر سر زمین والا طریقہ اپنایا جائے ورنہ وعدوں کا سبز باغ برسوں سے آباد ہے۔ جسے موسلادھار بیانات کی بارش ہمیشہ شاداب و سیراب رکھتی ہے'

(29 جولائی 1997ء)

پاکستان اور جاپان-----ایک موازنہ

جس زمانے میں پاکستان کے قیام کی تحریک اپنے عروج پر تھی انہی دنوں جاپان اپنی تاریخ کی بدترین شکست و ریخت سے دوچار تھا' برصغیر میں پاکستان کا جھنڈا الہرانے کی آرزو ایک قومی آرزو بن چکی تھی اور جاپان کا جھنڈا سرنگوں ہو رہا تھا' پاکستان تخلیق کے مرحلے میں تھا اور جاپان تخریب کی لپیٹ میں' برصغیر میں ایک نیا ملک جنم لینے والا تھا اور مشرق بعید میں ایک ملک ملیامیٹ ہو رہا تھا' دوسری جنگ عظیم جاپان کو مٹارہی تھی اور دوسرے کئی ممالک کو آزادی کی راہ دکھارہی تھی' جن دِنوں ہیروشیما اور ناگاساکی تباہ کن بموں کی زد میں تھے لاہور اور پشاور آزادی کے نعروں سے سرمست تھے' ۴۵ء میں جاپان آخری ہچکی لے رہا تھا اور ۴۷ء میں پاکستان پہلی انگڑائی لے رہا تھا' لیکن آج یہ کیا منظر ہے کہ کھنڈروں میں دب جانے والا جاپان صنعت و معیشت کے میدان میں صف اول میں نظر آتا ہے۔ مگر میدانوں' دریاؤں' پہاڑوں اور سمندروں کا مالک پاکستان "مرد بیمار" دکھائی دیتا ہے۔

جس مشینری پر جاپان کی مہر لگی ہو اس کے لئے کوئی سند مانگنے کی ضرور نہیں لیکن جس چیز پر پاکستان کا لیبل لگا ہو اس کی بین الاقوامی منڈی میں کوئی کھپت نہیں' جنگ اور وہ بھی جنگ عظیم اس سے بڑھ کر کسی ہولناک آفت کا تصور نہیں کیا جاسکتا' ایسی جنگ کو جاپان نے دیکھا ہی نہیں پوری طرح چکھا اور بھگتا ہے' جنگ جہاں لڑی گئی ہو اس پورے علاقے کو لرزا کر رکھ دیتی ہے۔ جس ملک پر مسلط کی گئی ہو اس پر آکاس بیل کی طرح لپٹ جاتی ہے اور اس کا سارا ہرا سوکھا کر دیتی ہے' جنگ پوری قوم کی اقتصاد کی ہڈی پسلی چٹخا دیتی ہے' یہ دوسری جنگ عظیم ہی تو تھی جس نے جیتنے والے برطانیہ کو بھی اندر سے ہلا کر رکھ دیا' وہ برطانیہ جس کے عروج و کمال کا سورج کہیں غروب نہیں ہوتا تھا اسے جنگ عظیم نے گرہن لگادیا' رفتہ رفتہ وہ گرہن اس قدر بڑھا کہ آج بھارت جو کبھی برطانیہ کا محکوم باجگزار تھا۔ اسی بھارت کا وزیراعظم گجرال ملکہ برطانیہ کے دورۂ بھارت کے موقع پر ایک ایسا فقرہ بولتا ہے جو آدابِ مہمانداری کے سراسر خلاف تو ہے مگر برطانیہ کے زوال پر معنی خیز تبصرہ ہے'

Marfat.com

ملکہ نے مسئلہ کشمیر پر ثالثی کی اپنی پیشکش دہرائی تو بھارتی وزیراعظم نے کہا "برطانیہ ایک تیسرے درجے کا ملک اور زوال پذیر قوت ہے اس کی ثالثی سے کیا حاصل؟"

برطانیہ کو اس زوال تک لے جانے میں جنگ عظیم دوم کا سب سے زیادہ حصہ ہے، لیکن یہی جنگ جاپان کی جسمانی قوت کی تباہی کا سامان تو کرتی ہے مگر اس کے اندر معنوی زندگی کا احساس اجاگر کر دیتی ہے۔

پاکستان اور جاپان کا حرف دو شعبوں ---- تعلیم اور معیشت ---- میں موازنہ کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کہ ان دونوں میں انیس بیس کا نہیں دن رات کا فرق ہے۔ جاپان میں شرح خواندگی ۱۰۰% ہے جبکہ جاپان کی فی کس آمدنی ۲۵۲۷۳ ڈالر ہے جبکہ پاکستان میں فی کس آمدنی ۴۳۶ ڈالر ہے۔

گہری سوچ بچار اور بڑی مغزماری کرنے کے بعد بھی یہ واضح نہیں ہوتا کہ آخر جاپان کے ہاتھ میں وہ کون سی سونے کی چڑیا لگی تھی اور پاکستان کے ہاتھ سے وہ کس دن اڑی تھی، جاپانی لوگ کوئی زیادہ طویل القامت اور قوی الجثہ بھی نہیں، قدرتی موسموں کی کوئی سازگاری بھی انہیں میسر نہیں، زرعی اجناس کی بوقلمونی بھی ان کے ہاں نہیں، معدنی ذخائر کا چرچا بھی دنیا کے پریس میں نہیں آیا، جاپان کی یہ ساری خوشحالی اور پیش رفت بیرونی قرضوں کی فیاضی کا نتیجہ بھی نہیں، تو آخر فرق کیا ہے۔ کہ ایک ہی وقت میں اجڑنے اور ابھرنے والے دو ملک ---- جاپان اور پاکستان ----- اپنے حالات کے برعکس سفر کر رہے ہیں۔ اجڑنے والا ملک سنورنے کے عمل سے گزر رہا ہے اور ابھرنے والا خطہ بگڑنے کی راہ پر چل رہا ہے، سیاست سے لے کر معیشت تک، تعلیم سے لے کر معاشرت تک اور افراد سے لے کر اداروں تک ہر چیز آمادہ زوال ہے، ہمارے یہاں کے لوگوں کی ایک عادت سی بن گئی ہے کہ وہ دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں کی کمزوریوں کو تو حوالے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، ان کی خوبیوں کو اپنے لئے دلیل راہ نہیں بناتے، اگر کہیں جاپان کی بات چل نکلے تو محفل میں کوئی نہ کوئی ضرور بول اٹھے گا، کہ وہاں بھی تو کرپشن ہے کئی حکومتیں اسی وجہ سے برطرف ہوئی ہیں یہ درست ہے لیکن یہ بھی تو ہوا ہے کہ کرپٹ، وزیراعظم لوگوں کی نفرت اور عدالت کے کٹہرے کا مستحق ٹھہرا ہماری طرح ہر بار ہر کرپٹ لیڈر کو جھاڑ پونچھ اور چوم چاٹ کر "بھگوان" بنانے کا وہاں رواج نہیں، جاپان کی ترقی اور پاکستان کی تنزلی کی بے شمار وجوہ ہوں گی مگر سب سے بڑی وجہ ---- قیادت ---- کا فرق ہے۔ قیادت روشن دماغ، عالی فکر، دیانت دار، اور باکردار ہو تو

کیمیا کا اثر رکھتی ہے۔ مٹی کا ڈھیلا ہاتھ میں لے تو اسے سونے کی ڈلی بنا دیتی ہے۔ اگر قیادت کوڑھ مغز، سطحی اور پست ہو، دیانت دشمن اور نمائش پسند ہو تو پھر قدرت کا اٹل اصول ہے۔ کہ خدا ایسے لوگوں کے فیصلوں سے برکت اٹھالیتا ہے، ان کے دن راتوں کی طرح مٹیالے اور ان کے دل جرموں کی طرح کالے بنا دیتا ہے، ان کے دماغ بنجر، ان کی آنکھیں بے نور، اور ان کے کان سماعت سے محروم کر دیتا ہے، خدا نے جب کسی کو قدرت کے انتقام کا نشانہ بنایا ہے یہ نہیں کہ دن کی روشنی میں کسی کے سر پر "ڈانگ" مار دی ہو، بلکہ وہ کرتا یہ ہے کہ سب کچھ ہوتے سوتے اس کی "مت" مار دیتا ہے۔

(23 اکتوبر 1997ء)

Marfat.com

نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں

لوگ خواہ مخواہ دانشوروں کی باتیں سنتے ہیں' واعظوں کی تلقین پر کان دھرتے ہیں' فلسفیوں کو اہمیت دیتے ہیں' اور فرزانوں کو سرچڑھاتے ہیں' جب کہ یہ لوگ بزم زندگی کو بے کیف بنانے کے ذمہ دار ہیں' اصل داد اور تحسین کے مستحق وہ "دیوانے" اور "مست الست" ہیں جو پل بھر میں غم کا نور اور اندیشے دور کر دیتے ہیں' شرط صرف ترنگ میں آنے کی ہے' آپ خود ہی انصاف کیجئے' شریعت بل نے لوگوں کو کتنا پریشان کر رکھا تھا' بعض ڈر رہے تھے' کچھ کانپ رہے تھے' چند ایک ہانپ رہے تھے اور کئی لوگ بے چین ہو رہے تھے' نجانے شریعت کے آنے سے کیا ہو جائے گا؟ لیکن ڈرنے والے مطمئن ہو جائیں' کانپنے والے ٹھہر جائیں' ہانپنے والے رک جائیں اور بے چین ہونے والے سکھ کا سانس لیں اس لئے کہ سچ کہنے کی جو توفیق ملک بھر کے ہزاروں "فرزانوں" کو نصیب نہ ہو سکی' اور لوگوں کا ڈر دور کرنے کی جو ہمت "مصلحت بین فقیہوں" کو نہ مل سکی وہ ایک "دیوانے" کو عطا ہو گئی' اور وہ دیوانہ بھی معمولی کوچہ گرد نہیں بلکہ ملک کے سب سے بڑے قانون ساز ادارے قومی اسمبلی کا سپیکر ہے' فضیلت مآب جناب الحاج الٰہی بخش سومرو بالقابہ ان کے ایک جملے نے دل کے غنچے کھلا اور امیدوں کے بجھتے چراغ جلا دیئے ہیں' ان کا یہ جملہ کس قدر شاعرانہ اور دلبرانہ ہے کہ "شریعت بل کسی کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔ جو چل رہا ہے یوں ہی چلتا رہے گا۔" اور سب سے زیادہ لطف آمیز بات یہ ہے کہ انہوں نے پندرھویں شعبان کی رات یعنی شب برات کو گریجوایٹ ایوارڈ کی تقریب میں معزز خواتین و حضرات فنکاروں کو اعزازات دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا' پندرہ شعبان کی شب اور پندرھویں آئینی ترمیم (شریعت بل) پر تبصرہ کیا حسین سنگم اور کس قدر شبھ گھڑی ہے؟ طوالت کے بوجھل پن کا مجھے احساس ہے لیکن آں موصوف کے ارشادات کا ایک ایک لفظ اس قدر قابل توجہ ہے کہ ان سے صرف نظر بہت بڑی محرومی ہو گی' کسی "سرپھرے مولوی" کی بات سننا اور کسی حسد کے مارے حزب اختلاف کے رکن کی تہمت پر کان دھرنا تو وقت کا ضیاع ہے مگر حکومت کے ایک اہم رکن اور نیشنل اسمبلی

Marfat.com

کے سپیکر کے فرمودات پر دھیان نہ دینا پرلے درجے کی حماقت اور غفلت ہے۔ ان کی "تقریر دلپذیر" کا ایک اقتباس یہ بھی ہے۔

"پاکستان میں آج کل یہ تاثر ہے کہ شریعت بل کے پاس ہونے سے معاشرے میں گھٹن ہو جائے گی' خاص طور پر خواتین میں اس معاملے پر خاصی بے چینی پائی جاتی ہے انہوں نے کہا کہ خود میری بیگم نے مجھ سے جھگڑا کیا کہ میں نے قومی اسمبلی میں کیسا بل پاس کر دیا ہے جب کہ میرے بال کاٹنے والا کہتا ہے کہ وہ ملک چھوڑ کر جا رہا ہے کیوں کہ شریعت میں مرد کسی عورت کے بال نہیں کاٹ سکتا میں نے کہا ایسی کوئی بات نہیں یہ بل بنتے رہیں گے' اور سرکاری کاغذوں میں جمع ہوتے رہیں گے۔ اور ہم اس طرح خوش و خرم آزاد شہریوں کی زندگی گزارتے رہیں گے گزشتہ پچاس سال میں کئی بل کاغذوں میں پاس ہونے کے بعد کسی کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے۔ اسی طرح شریعت بل بھی فنکاروں اور خواتین کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔" طویل اقتباس پیش کرنے پر معذرت۔

میری ایک تجویز ہے کہ پاکستان کے جملہ خواتین و حضرات کی طرف سے حکومت بالخصوص وزیراعظم کے خلاف ہائی کورٹ میں ایک رٹ دائر کرنی چاہیے' جس کا مضمون یہ ہو۔

"ہم خوش و خرم اور بے ضرر خواتین و حضرات عدالت عالیہ میں درخواست پیش کرتے ہیں کہ حکومت اور وزیراعظم نے چند ماہ سے ہمیں خوف و ہراس میں مبتلا کیے رکھا' اور یہ حرکت "دہشت گردی" کے زمرے میں آتی ہے ہم میں سے بعض کا بلڈ پریشر ہائی ہوا' کچھ دل کی تیز دھڑکن کے مریض ہوئے' ہزاروں بے خوابی کا شکار ہوئے' لاکھوں دہشت کے باعث ذہنی توازن کے بگاڑ میں مبتلا ہوئے اور اس کا واحد سبب شریعت بل کی تشہیر اور قومی اسمبلی سے اس کے پاس ہونا تھا' لہٰذا قانون کے مطابق کارروائی کر کے خوف و دہشت پھیلانے والوں کا محاسبہ کیا جائے۔"

اور ساتھ ہی ایک "امن ایوارڈ" جنابِ سومرو کی خدمات کی نذر کرنا چاہیے جن کی ایک تقریر نے کئی ماہ کی آسیب زدگی کو خوشی کی لہر میں بدل دیا' اور خوف کی گھٹا ٹوپ آندھی اور دہشت کی گہری دھند کو دور کر دیا۔

ویسے پہلو بہ پہلو اس بات کا انکشاف بھی ہو گیا کہ حکومتی بل کیا قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ اور قومی اسمبلی انہیں پاس کر دے تو ان کی کیا وقعت ہوتی ہے؟ یہ ہم نہیں کہتے

Marfat.com

کیونکہ ہمیں استحقاق کمیٹی میں بلائے جانے کا ڈر ہے۔ جناب سومرو فرما رہے ہیں۔ جو بہت تجربہ کار پارلیمنٹرین اور پارلیمنٹ کے سربراہ ہیں' ان سے زیادہ اس راز سے کون آگاہ ہو سکتا ہے۔

شریعت سے خوف کھانے کی بظاہر تو کوئی وجہ نہیں البتہ حکومت سے ڈرنا الگ بات ہے کہ وہ شریعت کا غلط استعمال نہ کرے' لیکن شریعت سے اس لئے بدکنا کہ اس کے نفاذ سے کوئی مرد کسی خاتون کے بال نہیں تراش سکے گا' کوئی خاتون اپنا جسم تھرکا کر لوگوں کو محظوظ نہیں کر سکے گی' کوئی بی بی کھلے عام اپنے فن کا مظاہرہ نہیں کر سکے گی' اور کوئی فنکارہ بے خوف و خطر اچھل کود کا مظاہرہ نہیں فرما سکے گی' عجیب ذہنیت کی علامت ہے۔

ہاں اگر شریعت کے آنے سے خواتین کے معاذ اللہ بے آبرو ہونے کا اندیشہ ہو' ڈاکے بڑھ جانے کا خوف ہو' قتل و غارت میں اضافے کا خدشہ ہو' اور چوری چکاری زیادہ ہونے کا ڈر ہو تو ایسی شریعت سے ضرور خوفزدہ ہونا چاہیے' آخر اس خوف کا کیا جواز ہے کہ "مقابلۂ حسن" بند ہو جائے گا فن کے پردے میں کئی کاروبار ٹھپ ہو جائیں گے' اور عورت کے "شو پیس" بننے کی راہ میں رکاوٹ کھڑی ہو جائے گی' یہ راست فکری نہیں کج فہمی ہے اور اعلیٰ دماغی نہیں بد مزاجی ہے' جناب سومرو کے خطاب لاجواب سے یہ بھی احساس اور اندازہ ہوتا ہے۔ کہ وہ شریعت سے زیادہ اپنی بیگم سے خوفزدہ ہیں وہ اپنی جواب طلبی پر آمنے سامنے تو کچھ نہ کہہ سکے ایک تقریب کو آڑ بنا کر اپنی صفائی پیش کرنے کا نادر موقع حاصل کر لیا۔

میں سپیکر صاحب کی خدمت میں کالم کے ذریعے اس گستاخی کا مرتکب نہ ہوتا اگر انکی طرف سے کوئی ترجمان اس اخباری رپورٹ کی تردید کر دیتا' چونکہ ایسا نہیں ہوا اس لئے کچھ عرض کرنا پڑا' وہ اگر شریعت بل کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ "فرض" کرنے میں بے باک ہیں تو ہمیں بھی کچھ "عرض" کرنے میں آزاد ہونا چاہیے۔

(15 دسمبر 1998ء)

Marfat.com

تو کائناتِ حسن ہے یا حسن کائنات

شعر گوئی بذات خود ایک نعمت ہے اور ایک ایسی اظہاری کیفیت کا نام ہے جسے بلا تکلف الہام یا القاء سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ خالصتاً خداداد ملکہ ہے جس میں کسی اور وراثت کو بہت کم دخل ہے۔ بلکہ یہ ایسا فطری داعیہ ہے جو قلب شاعر میں ابھرتا ہے اور نوک زبان پر اترتا ہے، علم و ادب کی تاریخ میں بے شمار شاعر ایسے ملتے ہیں۔ جو حرف و لفظ کی تلاش میں مکتب و دبستان کی محض ہوا پھانکتے گئے۔ مگر سرزمین شعر کے بادشاہ مانے گئے، خود تو دو چار درجے پاس کیے مگر ان کا کلام سمجھنے اور سمجھانے پر دانشگاہوں کے کہنہ مشق اساتذہ کو اپنا پورا دماغ نچوڑنا اور فن تدریس صرف کرنا پڑا۔

شعر کے اجزائے حسن میں نادر تخیل، عمدہ تمثیل، خوبصورت لفظ، انوکھی ترکیب، جاندار مضمون، ہموار زمین، نفیس پیرایہ، منتخب الفاظ، دلکش ابلاغ، دلنشین کنایہ، اور لطیف استعارہ شامل ہیں، یہ ساری چیزیں شعر کو "سحر حلال" بنا دیتی ہے، ہر لفظ اپنا آپ بولتا اور ہر حرف اپنا آپ کھولتا ہے، بلاشبہ نثر اگر سلیس اور بلیغ ہو، اس کا اسلوب رواں اور لہجہ مؤثر ہو تو دماغ میں جوار بھاٹا لے آتی ہے۔ مگر شعر تو دنیائے دل میں ایک حشر اٹھا دیتا ہے، ایک مصرع پوری کتاب پر حاوی اور ایک شعر پوری داستان حیات کا نقیب نظر آتا ہے، کتنے مصرعے ایسے ہیں جو ضرب المثل اور محاورے بن کر زندگی کا الف و نثر مرتب کر گئے۔

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

تو کائناتِ حسن ہے یا حسن کائنات

اس طرح کے بے شمار مصرعے ضخیم کتابوں پر بھاری ہیں ان میں بلا کا ابلاغ اور غضب کا تاثر ہے۔ روانی اور برجستگی اس پر مستزاد!

شاعری کی دنیا میں اساتذہ فن نے اتنے اونچے مضامین باندھے اور اعلیٰ پائے کے شعر کہے ہیں کہ شعر اور شاعر دونوں لازوال اور لافانی بن گئے، بعض شعر ایسے ہیں جنہیں سن کر "سجدہ تعظیم" واجب ہو جاتا ہے۔ مثلاً استاد نوح ناروی کا یہ شعر

ے نسبت جو مجھے ہے ترے کوچے کی زمیں سے
میں دفن کہیں ہوں مگر اٹھوں گا وہیں سے

کچھ شعروں پر "سحر حلال" کا گمان گزرتا ہے۔ جیسے نظیر اکبر آبادی کا انداز ہے۔

ے وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے
یہ مری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

بعض اشعار کے سامنے غزل کی اباحیت شرما سی جاتی ہے۔ عزیز الحسن مجذوب کا رنگ ملاحظہ ہو۔

ے ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا، اب تو خلوت ہو گئی

کچھ اشعار ایک بار پڑھے مگر عمر بھر یاد رکھے جاتے ہیں۔ کیف مراد آبادی کا یہ شعر اسی پائے کا ہے۔

ے بقا کی فکر کرو خود ہی زندگی کے لئے
زمانہ کچھ نہیں کرتا کبھی کسی کے لئے

کئی ایک اشعار وہ بھی ہوتے ہیں جنہیں سن یا پڑھ کر وجدان درود پڑھنے لگتا ہے۔

ے چھوٹے نہ گنہ مجھ سے، چھوڑا نہ کرم اس نے
بندہ ہو تو ایسا ہو مولا ہو تو ایسا ہو

ایسے بھی شعر کہے گئے ہیں جنہیں دیکھ کر قلب و دماغ اور روح وجد میں آجاتے ہیں، حفیظ ہوشیاری پوری کی ندرتِ تخیل اور بلند پایہ تصور کا عمدہ اور خوبصورت اظہار دیکھئے۔

ے بات آتی ہے لب پہ دل سے حفیظ

بات دل میں کہاں سے آتی ہے؟

چند اشعار وہ بھی ہیں جو اسی بحر اُسی زمین اور اسی رنگ میں پہلے اور آخری شعر کا مقام رکھتے ہیں۔ یعنی "فاتح باب" بھی خود اور "خاتم باب" بھی خود نہ ان پر کوئی حاشیہ چڑھا سکا اور نہ ان میں اضافہ کر سکا۔

میرے نزدیک نعت محض ایک صنف شاعری نہیں بلکہ وہ ذاتِ مصطفےٰ ﷺ کے جمالیاتی تسلسل کا عنوان اور اظہار ہے' اور سیرت نبویؐ کا کاغذی پیرہن' غور طلب اور ذوق آفرین بات یہ ہے کہ جس ذات کا کاغذی پیرہن اس قدر جاذبِ نظر ہے اس کا اپنا سراپا کس درجہ دلنواز اور دلفریب ہو گا؟ نعت صدیوں سے کہی اور لکھی جا رہی ہے' عہد نبوت سے زمانۂ حال تک کتنے لاکھ نعتیہ اشعار اور کتنے ہزار مجموعے لکھے اور چھاپے جا چکے ہیں' مگر اس ذائقے سے نہ آج تک کام و دہن تلخ ہوئے اور نہ جی بھرا ہے' صدیاں حباب کی طرح نعت کے محیط میں ابھرتی اور مٹتی رہیں لیکن یہ دریا ہمیشہ چڑھا ہی رہا کسی نے اس کا پاتال نہیں دیکھا۔ شاعری خواہ کسی کی ہو' نظم ہو یا غزل' طربیہ ہو' رزمیہ ہو یا مرثیہ' اس میں اعلیٰ تخیل سے جان پڑتی ہے' خوبصورت استعارے سے وہ اٹھی ہے' لطیف کنائے سے وہ نکھرتی ہے' موزوں الفاظ اسے حسن دیتے ہیں' چست اور انوکھی ترکیب اسے منفرد بناتی ہے' اچھی بحر اس میں نغمگی بھر دیتی ہے' اور جاندار قافیہ اسے چڑھی کمان بنا دیتا ہے' لیکن نعت بذاتِ خود تخیل کو عمدگی اور پاکیزگی بخشتی ہے' استعارے کو حسین بناتی ہے' کنائے میں رنگ بھرتی ہے' الفاظ اس سے منسوب ہو کر تکریم پاتے ہیں' ترکیب اس میں استعمال ہو کر حسن مرکب بنتی ہے' بحر اپنے آپ کو پیش کر کے بیش قیمت ٹھہرتی ہے اور قافیہ نعت کے صدقے اپنی شان بڑھاتا ہے' غزل پر تو عروج و زوال کے سائے پڑے اور نظم پر مد و جزر کے لمحے آئے ہیں۔ مگر حدیقۂ نعت کا ایک بھی پھول نہ کبھی کملایا ہے اور نہ مرجھایا ہے' جس طرح بہار رسالت خزاں نا آشنا ہے اسی طرح موسم نعت بھی ہمیشہ ترو تازہ رہا ہے۔

شعر کی جان اگر عمدہ تخیل ہے تو اس صنف شاعری کے کیا کہنے جس کا مرکزی خیال ذاتِ نبیؐ ہو' خوبصورت تمثیل سے اگر شعر کا چہرہ نکھرتا ہے تو سیرتِ مصطفےٰ سے بہتر حسین مثال کیا ہو سکتی ہے؟ لفظ کا لباس اگر شعری پیکر کو جاذبِ نگاہ بناتا ہے' تو لفظ و حرف کی قبا کو راست آنے کے لئے قامت رسولؐ سے زیادہ موزوں اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟ اگر نفیس پیرایہ شعر کی آبرو بنتا ہے تو حضورؐ کے سراپا سے زیادہ نفیس کون سا پیرایہ تخلیق ہوا ہے؟ اگر دلنشین ابلاغ شعر کو پر لگا دیتا ہے تو حسن

Marfat.com

ابلاغ کے لئے سید عالم ﷺ کے وصف سے زیادہ کون ساشاندار موضوع ہو سکتا ہے؟

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو لکھتے ہیں تو حضورؐ کا قصیدہ لکھتے اور کہتے ہیں تو حضورؐ کی نعت کہتے ہیں، نعت کہنے والے ہزاروں اور سننے والے کروڑوں گزرے ہیں اور ہر شریک محفل نے بزم دوست کی نئی خبر سنائی ہے نہ کوئی لکھ کر اکتایا اور نہ کوئی سن کر پچھتایا، ایک ہی مضمون ہزار رنگ میں باندھا گیا۔ اس کے باوجود غالب کو کہنا پڑا۔

؎ غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزا شتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دان محمدؐ است

کتنے اونچے اور بڑے نام ہیں جنہوں نے اپنی پوری متاع فن کوچہ نعت میں لٹادی، یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ایک زمانہ سلام کرتا ہے، اس کے ذہن کی بلندی کا یہ عالم ہے کہ ایک ساعت میں سدرہ سے خبر لے آتے ہیں، ان کی نزاکت فن احساسات کو زبان عطا کر دیتی ہے ان کی پختگی ہنر ہرلفظ کو شہ پارہ بنا دیتی ہے۔ ان کی روانئ قلم کے سامنے اُمڈتے سیلاب پناہ مانگتے ہیں، ان کے شکوہ الفاظ کا لغت ساتھ نہیں دے پاتی، اور ان کی صحت لفظی بات کو آیات کا درجہ دے دیتی ہے ان لوگوں میں حسان بن ثابتؓ جیسے "صاحب حضوری" امام بوصیریؒ جیسے وارفتہ واز خود رفتہ اور رومیؒ جیسے پرگو اور برجستہ شاعر شامل ہیں، اس بارگاہ میں حاجیؒ نے اپنی حلاوت، سعدیؒ نے اپنی دانش و ذہانت، خسروؒ نے اپنی فنی نزاکت، قدسیؒ نے اپنی انفرادیت، غالب نے اپنی معنویت، اقبالؒ نے اپنی آفاقیت اور فاضل بریلویؒ نے اپنی علمیت، نچھاور کردی، پھر بھی بات یہاں تک پہنچ پائی۔

؎ تیرے اوصاف کا اِک باب بھی پورا نہ ہوا

نظم و غزل میں بڑے لافانی اور یادگار اشعار کہے گئے لیکن نعت میں وہ وہ عمدہ مثالیں قائم ہوئی ہیں۔ کہ دل بول اٹھتا ہے ہو نہ ہو شاعر کو روح القدس کی تائید حاصل ہے، ورنہ اتنا نادر تخیل اور اتنی اونچی بات ذہن انسانی کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتی، اقبالؒ کا یہ آہنگ کون نظرانداز کر سکتا ہے؟

؎ تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

جوش ایسے پرگو اور پرشکوہ شاعر نے نظم و غزل میں کس کس فنی و فکری رفعت و وسعت کو نہیں چھوا، لیکن جب میدان نعت میں اترا ہے تو یوں محسوس ہوا کہ آسمان فکر و فن سے تارے

Marfat.com

اتار لایا ہے۔

؎ تیری پیمبری کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے
تو نے گدائے راہ کو بخشا شکوہ قیصری

اور اس کا یہ شعر تو پورے ذخیرۂ نعت کی آبرو ہے۔

؎ الٰہی گدا ہوں مجھے شاہ کر دے
ضمیر محمدؐ سے آگاہ کر دے

مولانا احمد رضا خان فاضل بریلویؒ نے دو اشعار ایسے کہے ہیں جنہیں پڑھ کر یوں خیال آتا ہے کہ انہوں نے یہ اشعار بریلی میں بیٹھ کر نہیں سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ کر کہے ہیں اور ہاتھ میں قلم نہیں شہپر جبریل تھا' اور نوک زبان پر لفظ نہیں جنت کے پھول اُگ آئے ہیں۔

؎ جس کی دو بوند ہیں کوثر و سلسبیل
ہے وہ رحمت کا دریا ہمارا نبیؐ
جس کے تلووں کا دھوون ہے آبِ حیات
ہے وہ جان مسیحا ہمارا نبیؐ

اور ان کا یہ شعر ان کی فنی پختگی اور فکری پاکیزگی کا کتنا عمدہ نمونہ ہے۔

؎ عرش سے مژدہ بلقیس شفاعت لایا
طائر سدرہ نشیں مرغ سلیمان عرب

نعت میں الفاظ کے غلو کی حاجت نہیں ہوتی تخیل کا علو درکار ہوتا ہے' اربابِ سخن نے بہر حال یہ معیار قائم رکھا ہے' احمد ندیم قاسمی کا لہجہ ملاحظہ کیجئے ایک ایک لفظ ہیرے کی طرح ترشا ہوا اور ایک ایک شوشہ بامعنی اور فکر انگیز۔

؎ اب بھی ظلمات فروشوں کو گلہ ہے تجھ سے
رات باقی تھی کہ سورج نکل آیا تیرا
تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا ہزاروں کا سہی
اب جو تاحشر کا فروا ہے وہ تنہا تیرا

بعض تنگ نظر مذہبی حلقوں میں حضورؐ کی ذاتِ اقدس کے حوالے سے ایک طرح کی بحث و تکرار کا رنگ جھلکتا ہے۔ جب کہ آپ کی ذات تکرار کے لئے نہیں پیار کے لئے تخلیق ہوئی ہے'

Marfat.com

محبت کے آخری نقطے کا نام ذاتِ محمد ﷺ ہے' فرق صرف زاویۂ نظر کا ہے وہ نصیب ہو جائے تو سارا منظر بدل جاتا ہے' نور و بشر کے ضمن میں مکتب و مدرسہ میں کیا کیا مناظرے برپا نہیں ہوتے' لیکن کوئی سخن فہم اور صاحب ذوق ہو تو بات کو فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیتا ہے' اور ساری خشونت کافور ہو جاتی ہے' کوثر نیازی کا شعر ہے۔

ان کی عظمت کی جھلک دیکھ کے معراج کی شب
کب سے جبریلؑ کی خواہش ہے بشر ہو جائے

اودھ کی شام بہت سہانی سہی' صبح بنارس کا حسن بہت دلآویز سہی' ساون کی گھٹا کا سحر' اور قوس و قزح کے رنگوں کا بہت شہرہ سہی' آبشار کا ترنم بجا اور افق میں ڈوبتے چاند کا منظر خوب سہی مگر حفیظ تائب کے ان نعتیہ اشعار کا کیا جواب کہ انہیں پڑھتے ہوئے دماغ میں ایک باغ مہک اٹھتا منہ میں رس بھر جاتا ہے۔

جب چھڑے بات نطق حضرت کی
غنچۂ فن چٹک چٹک جائے
ماہ طیبہ کا جب خیال آئے
شب ہجراں چمک چمک جائے
فیض چشم حضورؐ کیا کہنا
ساغر دل چھلک چھلک جائے
نام پاک ان کا ہو لبوں سے ادا
شہد گویا ٹپک ٹپک جائے

(12-13 نومبر 1998ء)

Marfat.com

ایک سفر، جو حاصل حیات بن گیا

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تمہاری عمر کتنی ہے؟ تو میں بے تکلف کہہ دوں گا "صرف دس دن" پوچھنے اور میرا سراپا دیکھنے والے کو یقیناً حیرت ہو گی کہ یہ کیا؟ میں اس کی حیرت بھانپ کر وضاحت کروں گا۔ کہ دس دن کا مطلب یہ ہے کہ ۲۱ نومبر ۹۵ء سے ۳۰ نومبر ۹۵ء کے وہ شب و روز میرے حاصل حیات ہیں جو میں نے خانہء خدا کے صحن اور روضہء رسولؐ کے سائے میں بسر کئے ہیں، باقی کے ایام عمر بس کٹ گئے ہیں جن کا حساب رکھنا میں ضروری نہیں سمجھتا، عمر عزیز کے چالیس سال کچھ بچپن کی نذر ہوئے، کچھ لڑکپن میں صرف ہوئے، کچھ عنفوان شباب میں کھپ گئے، کچھ کالے حرف پڑھنے میں بسر ہوئے، کچھ باتیں کرنے میں ضائع ہوئے، کچھ قلم چلانے میں استعمال ہوئے، کچھ حصول رزق کا حصہ بنے، کچھ نیند نے اچک لئے، کچھ سفر نے ضائع کر دیئے، کچھ غم دوراں نے ہڑپ کر لئے اور کچھ غم جاناں نے کشید کر لئے لے دے کے یہی دس روز ہیں جن کی مہک روح میں رچی ہوئی، اور جن کی چمک آنکھوں میں سجی ہوئی ہے، جن کی یاد سے دل بہلاتا اور جن کے تصور سے لطف اٹھاتا ہوں۔

آنکھوں میں کیا خواب سجا کر سرزمین مکہ پر پہلا قدم رکھا اور سینے میں کیا جذبات چھپا کر شہرمدینہ کی خاک بوسی کی، نہ وہ خواب نوک زبان پر آسکتے ہیں اور نہ وہ جذبات نوک قلم پر! شہر مکہ! جس کے سینے پر خدا کا پہلا گھر ایستادہ ہے، جس گھر کا گارا ذبیح اللہؑ نے اٹھایا اور جس کی اینٹیں خلیل اللہؑ نے لگائیں، یہ شہر کئی انبیاء کا مسکن، مرقد اور مدفن ہے، اس شہر کے کوچہ و بازار کو رحمت کے فرشتے اپنے پروں سے ڈھانپے رکھتے ہیں، اسی شہر کے نواح میں وہ جبل رحمت ہے جہاں آدمؑ کی توبہ قبول ہوئی، اس کے پہلو میں جبل نور ہے جہاں غارِ حرا ہے جس پر ہدایت کی ندا اتری، اسی شہر کے عین قلب میں راحت قلب و جاں، سید و سرور کون و مکاں، سرچشمہء عشق و ایماں، منبع اذعان و ایقاں، رمز کن فکاں، سیاح لا مکاں، زینت عالم امکاں، مخدوم ہر دو جہاں، محورِ نگاہ قدسیاں، سرورِ سینہء عاشقاں، امام رسولاں، جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے جنم لیا، اور مکے کے ہر ذرہء خاک کو رشک افلاک بنا دیا۔

شہر مکہ! جو روئے زمین پر بہترین شہر اور ارض خاک پر خطہء پاک ہے، اسی شہر میں شراب الابرار (زمزم) اور مصلائے اخیار (حطیم) ہے یہ شہر معزز، مہبط وحی، یہ شہر مکرم منبع قرآن

Marfat.com

اور یہ شہر معظم مرکز اسلام ہے' اس شہر مبارک کا کونا کونا عقیدت سے چھانا جا چکا ہے' اس کا گوشہ گوشہ محبت سے گھوما جا چکا ہے' اس کا کوچہ کوچہ نگاہ عشق سے دیکھا جا چکا ہے اور اس کا ذرہ ذرہ چوما جا چکا ہے' اس کی گلیوں میں اولیاء نے ڈیرے لگائے اور اس کے بازاروں میں صلحاء نے بستر لگائے ہیں' اس شہر کے در و دیوار کو کروڑوں آنکھوں نے چاہت سے دیکھا اور اس کے کوچہ و بازار کو کروڑوں پلکوں نے اپنائیت سے چھوا ہے' اس کا ہر موڑ نشان ہدایت اور ہر چوک داستان عزیمت ہے۔

شہر مکہ! یہ سیدہ آمنہ امینہؓ کا شہر ہے جنہوں نے خدا کی امانت اس کے بندوں کے سپرد کی' یہ سیدہ خدیجہ کا شہر ہے جن کی رفاقت نے رسول خداؐ کو راحت بخشی' یہ حضرت ابو بکرؓ کا شہر ہے جن کی صداقت نے اسلام کی حقانیت ثابت کی' یہ حضرت عمرؓ کا شہر ہے جن کی عدالت نے اسلام کو عزت دی' یہ حضرت عثمانؓ کا شہر ہے جن کی سخاوت نے اسلام کو وسعت کی' اور یہ حضرت علیؓ کا شہر ہے جن کی دانش و حکمت نے اسلام کو نئی جہت ارزاں کی' اس شہر میں بلالؓ اٹھا جو افق اسلام پر ہلال بن کر چمکا' اس شہر کا ایک باسی عمارؓ تھا جو کاروان عزیمت کا سالار بنا' اسی خاک سے ابو عبیدہؓ نکلا' جسے زبان نبوت سے۔ "امین الامتہ" کا لقب ملا' اس شہر کے سینے میں ایمان' یقین وفا' ایثار' اخلاص' کی ہزار ہا داستانیں محفوظ ہیں۔

اسی شہر میں مقدس میں کعبہ ہے جس پر لپٹا ہوا کالا غلاف بندوں کے گناہوں کی کالک دھونے کا وسیلہ ہے' اس میں لگا ہوا سیاہ پتھر (حجر اسود) سیاہ کاروں کا مقدر اجال دیتا ہے' اس کا دروازہ "بابِ ملتزم" کہلاتا ہے جہاں سے بڑے سے بڑا ملزم بھی بری ہو کر پلٹتا ہے' اس کی چھت پر میزابِ رحمت ہے جس سے گرنے والا ہر قطرۂ آب گنہگاروں کے لئے ابر شفاعت ہے' اس گھر میں لگے ہوئے پتھر اگرچہ ان گھڑ اور ٹیڑھے ہیں لیکن اپنے زائر کو سگھڑ اور سیدھا بنا دیتے ہیں' یہ گھر بظاہر چھپن فٹ اونچا ہے۔ مگر اس کی چوٹی عرش معلیٰ سے گھستی ہے' اور اگرچہ یہ گھر زمین پر تعمیر ہوا ہے لیکن عرش بریں کا حصہ معلوم ہوتا ہے' میں شب ۲ بجے مکہ مکرمہ پہنچا اور بیت اللہ اس وقت حاضر ہوا جب فضا پہ ایک سکون تھا' پورے دیارِ مکہ پر نور کی ایک چادر چھائی ہوئی تھی' اور موسم میں ایک عجیب سا کیف بسا ہوا تھا' نہ پوچھئے کہ بیت اللہ پر پہلی نظر کس طرح پڑی اور کیا محسوس ہوا؟ کاش ایسا کیمرہ ہوتا جو وجدان و احساس کی تصویر اتار لیتا' کاش کوئی مصور ہوتا تو اس منظر کا نقشہ کھینچ لیتا' اور کاش کوئی ترجمان ہوتا جو دل کا احوال بیان کر سکتا۔

ہدایت نبویؐ کے مطابق میں حدودِ حرم میں سر اور نظر جھکا کر داخل ہوا تاکہ حرم کی سیڑھیوں پر پہنچ کر اچانک نگاہ اٹھاؤں اور بھرپور انداز میں کعبے پر ڈالوں اور سارا نور دل میں

اُتارلوں، سچ کہتا ہوں کہ میں زندگی میں ہر حسین نظارہ بھول سکتا ہوں، رنج و راحت کی ہر ساعت فراموش کر سکتا ہوں، دل لوٹنے اور نظر لبھانے والی ہر کیفیت ذہن سے محو کر سکتا ہوں، اور ہر دلآویز اور ذوق پرور نقش دل سے مٹا سکتا ہوں، لیکن وہ لمحے قبر تک یاد رہیں گے کہ جب میرا ساکت وصامت جسم تھا، ایک جگہ ہر جمی ہوئی آنکھوں کی پتلیاں تھیں، مجسم عجز و نیاز ہاتھ تھے، سینے سے باہر ابلتا ہوا دل تھا، پیش نظر بیت اللہ اور لبوں پر حرف دعا۔

میں تھا تری جناب تھی، دست سوال تھا

عمرہ کے مراسم ادا کرتے ہوئے تسبیح و تہلیل کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی سوچتا رہتا تھا۔ کہ آخر کعبے میں وہ کیا کشش ہے جو ہر نسل، ہر رنگ، ہر زبان اور ہر علاقے کے ہزاروں لاکھوں لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے، صدیاں گزر گئیں، شاہی خانوادے اجڑ گئے، قصر و ایوان ویران ہو گئے، امراء کی حویلیاں خاک اڑانے لگیں، رؤسا کے بنگلے بے رونق ہو گئے، سلاطین کے دربار قصہ پارینہ بن گئے، حکمرانوں کی کچہریاں بھولی بسری داستان بن گئیں، مہ رخوں کی محفلیں الٹ گئیں، پری وشوں کی مجلسیں درہم برہم ہو گئیں، معشوقوں کی شمعیں بجھ گئیں اور تاج و تخت والوں کی آخری نشانیاں تک مٹ گئیں، مگر بیت اللہ کا نکھار اپنے جوبن پر رہا، اس در پر لوگ پیدل بھی آتے رہے اور اونٹوں پر بھی، اکیلے بھی آتے رہے اور قافلے بنا کر بھی، سمندر بھی عبور کرکے آتے رہے اور پہاڑوں کے سنگلاخ راستے پاٹ کر بھی پہنچتے رہے، افریقہ کے ریگزاروں سے بھی اہل عشق یہاں پہنچے اور ملایا اور انڈونیشیا کے جزیروں سے بھی، ایشیا کے میدانوں کے بھی اہل ایمان یہاں حاضر ہوئے اور مشرق وسطیٰ کے صحراؤں سے بھی، نہ مسافت آڑے آئی۔ نہ سفر کی کلفت رکاوٹ بنی اور نہ کسی کی غربت حائل ہوئی، آتش عشق برابر سلگتی رہی اور شعلہ شوق دم بدم بھڑکتا رہا۔

میں نے محسوس کیا کہ زائرین جب ملتزم سے لپٹتے ہیں اور جس طرح بلکتے ہیں یوں لگتا ہے کہ برسوں کا بچھڑا بچہ ماں کی گود میں آگیا ہے اور شائقین یوں حجر اسود سے چمٹتے اور اسے اس طرح چومتے ہیں، کہ کوئی باپ اکلوتی اولاد سے بھی یوں نہیں لپٹا ہو گا، پروانوں کا شمع کے گرد طواف تو ایک استعارہ ہے حقیقی نظارہ تو مطاف کعبہ میں دکھائی پڑتا ہے۔

صفا مروہ کی سعی بھی ایک داستان محبت و عقیدت کی یادگار ہے جسے قدرت نے قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا ہے میں غارِ حرا پر بھی حاضر ہوا، اگرچہ دور سے زیارت کی، لیکن یہ حیرت رہی، کہ انسانیت کا غمخوار نبیؐ انسان کی ہدایت کے لئے کتنی صعوبت برداشت کرتا رہا، اس غار تک پہنچنا ایک امتحان ہے کجا کہ اس میں کئی دن اور راتوں کی گزران!

اہل قلب و نظر نے غارِ حرا کے متعلق کتنی عرفان آمیز اور وجدان انگیز بات کی ہے کہ

Marfat.com

جس شخص کو اس غار میں پہنچنے کی سعادت مل جائے اسے چاہیے کہ وہ اس میں ڈوب جائے' اس میں کھو جائے اس لئے کہ مکہ اور مضافاتِ مکہ کا ہر گوشہ تغیر زمانہ کی زد میں آیا ہے۔ جھونپڑیوں کی جگہ محل' پگڈنڈیوں کی جگہ کولتار سڑکیں' کوچوں کی جگہ بازار' خیموں کی جگہ پلازے اور پہاڑیوں کی جگہ شاپنگ سنٹر بن چکے ہیں' مگر غارِ حرا کا اندرون آج بھی وہی ہے اور اتنا ہے اور ویسا ہے جیسا عہد رسالت مآب ﷺ میں تھا' غارِ حرا کا کوئی حصہ ایسا نہیں جس پر وجودِ نبوت کا لمس نہ ہو' خواہ اس کا فرش ہو' چھت یا دیوار ہیں' نگاہیں بیناہوں تو وہ منظر آج بھی دیکھ سکتی ہیں کان بیدار ہوں تو آوازِ نبوت سن سکتے ہیں' مشام حس رکھتے ہوں تو خوشبوئے پیکر رسالت سونگھ سکتے ہیں اور وجدان زندہ ہو تو چودہ صدیاں قبل کا سارا کیف کشید کر سکتا ہے' میں ۲۱ نومبر منگل کو مکہ مکرمہ پہنچا تھا' ۲۵ نومبر ۹۵ء بروز ہفتہ شہر نبیؐ حاضری کا عزم تھا۔

نماز عصر سے کچھ پہلے جب مضافاتِ مدینہ پہنچے اور دور سے گنبد خضر نظر آیا' تو دل کی دھڑکن دفعتہ تیز ہو گئی' پتلیاں جم کر رہ گئیں اور لبوں پر نغمۂ درود جاری ہو گیا' صدیوں کے ذہنی روحانی سفر کا حاصل آنکھوں کے سامنے تھا۔

پاکستان ہاؤس میں سامان رکھا اور مغرب کے وقت دربارِ نبوت میں حاضری دی' سرزمین مدینہ پر قدم رکھتے ہی پہلا احساس یہ ہوا کہ یہ محض خطۂ زمین نہیں سجدہ گاہ عشاق ہے' یہی وہ شہر ہے جس کے ذرے ذرے میں عشق و مستی کے خزینے مستور ہیں' اس شہر کو مکہ معظمہ کے بعد دنیا کے تمام شہروں پر فضیلت حاصل ہے' اس شہر کا اصل مکین وہ ہے جس کی پابوسی کا شرف عرش بریں بھی حاصل کرنا چاہتا ہے' یہ شہر اپنے مقدر پر جتنا بھی ناز کرے اتنا کم ہے کہ اس کی آغوش میں تا قیامت رسول خدا ﷺ آرام فرما رہیں گے۔

یہ شہر اس سے پہلے ---- یثرب---- تھا' بیماریوں اور وباؤں کا مرکز' لیکن پیغمبر امن و سلامتی اور نبی رحمتؐ نے اسے ---- مدینہ طیبہ---- بنا دیا' اور اسی شہر کا ایک گوشہ وہ ہے جہاں درگاہ نبیؐ ہے' جہاں قبتہ الخضراء ہے' اور جہاں روضۂ رسولؐ ہے۔ اس دربار میں کتنے کجکلاہ حاضر ہوئے مگر گدا بن کر' اور کتنے صلحاء آئے مگر خاک پاء ہو کر' یہاں تعظیم کی خاطر آنکھیں بے اختیار جھک اور گردنیں بے ساختہ خم ہو جاتی ہیں' یہی وہ دربار ہے جس کے حاضر باشوں میں کبھی ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمان و علیؓ تھے' وہ کیا منظر ہوتا ہو گا جب اس شہر کے در و دیوار آوازِ رسالت سے گونجتے اور کوچہ و بازار خوشبوئے نبوت سے مہکتے ہوں گے' جب اس شہر کی مسجد کے مصلیٰ پر امام کائنات ﷺ کھڑے ہوتے ہوں گے اور مقتدیوں میں خلفاء راشدین' بلالؓ و خالدؓ' عثمان بن مظعونؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ شامل ہوتے ہوں گے۔

جب میں دربار مصطفیٰ ﷺ میں حاضر ہوا تو یقین جانئے سانس گھٹ کر اور دل کی

Marfat.com

دھڑکن بے نام ہو کر رہ گئی۔ میں نے ایوان صدر بھی دیکھا ہے' وزیراعظم ہاؤس بھی گیا ہوں' گورنر ہاؤس میں چائے بھی پی ہے' وزیراعلیٰ ہاؤس میں بیٹھ کر گپ شپ بھی کی ہے' رضا شاہ پہلوی کے قصر سعد آباد (تہران) میں بھی گھوما پھرا ہوں' لندن کا بکنگھم پیلس بھی وزٹ کیا ہے' مجھے ظاہر شاہ (افغانستان) کا محل دیکھنے کا موقع بھی ملا ہے' مگر ان تمام جگہوں کو حیرت سے تو دیکھا ہے عقیدت سے نہیں' حسرت سے تو دیکھا ہے محبت سے نہیں' یہ بہت عالی شان سہی لیکن ان کی عظمت اس جگہ جتنی بھی نہیں جہاں حضور ﷺ اپنے مبارک نعلین اتارا کرتے تھے' ان محلات کے بیش قیمت قالین اس بوسیدہ چٹائی کے ایک تنکے کے برابر بھی نہیں جس پر وائی کونینؐ تشریف رکھتے تھے' ان شاہی بنگلوں میں آویزاں فانوسوں میں وہ چمک کہاں جو جاروب کشی کے دوران جمع ہونے والے صحن حرم نبویؐ کے ذراتِ خاک میں دکھائی دیتی ہے' سلاطین کی ان حویلیوں کی نظافت و نفاست اپنی جگہ لیکن ان میں وہ پاکیزگی کہاں جو نعلین نبی کے تلووں پر لگی ہوئی خاک میں تھی' مواجہ شریف میں حاضری کے وقت میری آنکھوں کے سامنے امام مالکؒ گھوم رہے تھے جنہوں نے بیس برس روضہ اقدس کی چھاؤں میں بیٹھ کر درس حدیث دیا مگر کتاب کا ورق اس آہستگی سے پلٹتے تھے کہ آواز نہ آتی مبادا کہ حضورؐ کے آرام میں خلل آجائے' میں جتنی بار مواجہ شریف میں حاضر ہوا اس وقت بھی اور آج تک یہی احساس ہے کہ ایک سہانا خواب تھا جو میں نے دیکھا' مجھے اپنے آپ پر' اپنے وجود پر' اپنی حاضری پر اعتبار نہیں آرہا تھا کہ فی الواقع میں اس وقت وہاں حاضر ہوں جہاں مجھ جیسا روسیاہ حاضری کی آرزو تو کر سکتا ہے لیکن وہاں کی موجودگی پر یقین نہیں کر سکتا' کہاں میں اور کہاں درِ نبوتؐ؟ یہی تو وہ جگہ ہے جو عرش سے نازک تر ہے اور جہاں جنیدؒ و بایزیدؒ دم کشیدہ حاضر ہوتے ہیں' میں جتنی دیر وہاں رہا گم رہا' نہ اپنی خبر نہ گردوپیش کی خبر' ایک سکتے کا عالم تھا جو طاری رہا' رویا اس لئے نہیں مبادا سسکی نکل جائے اور آواز اٹھ جائے' اور کیا دھرا کارت چلا جائے' جھولی بھی نہیں پھیلائی کہ یہاں بن مانگے سب کچھ مل جاتا ہے' صدا بھی نہیں لگائی اس لئے کہ درِ حضورؐ پر پلکوں سے دستک دے رہا تھا' یہ کیفیت کتنی دیر رہی؟ لمحوں کا حساب تو نہیں رکھا البتہ اسے زندگانی کا حاصل ضرور سمجھا ہے۔

اس سفر سعادت کے دوران میں نے مسجد قبا' مسجد ذوالقبلتین' مساجد سبعہ اور شہدائے احد کے ہاں بھی حاضری دی' جنت البقیع میں مدفون پاک روحوں کو بھی ایصال ثواب کیا' جس جگہ بھی گیا' یہ احساس دماغ پر غالب رہا کہ حضور ﷺ کی ذات بھی کیا باکمال ہستی ہے جس جگہ قدم رکھا اسے یادگار بنا دیا' جس چیز کو ہاتھ لگایا اسے زیارت گاہ بنا دیا' جس پر نظر ڈالی اسے مرکز نگاہ عشاق بنا دیا' جس کے بارے میں کچھ ارشاد فرمایا اسے تاریخ کا معتبر اور مقدس حوالہ بنا دیا'

Marfat.com

اور جس شئے کو اپنی طرف نسبت دے دی اسے لازوال شرف بخش دیا۔

اس تاثر کا اظہار بہرحال ضروری سمجھتا ہوں کہ سعودی حکومت نے جس بھی بے محل جوش' اور غیر ضروری مصلحت کے تحت مقدس اور تاریخی آثار مٹائے ہیں نہ تو روحانی شعور کا مظاہرہ کیا ہے' نہ اپنی دانش کا کوئی اچھا نمونہ پیش کیا ہے اور نہ ہی تاریخ کے ارتقائی سفر کے ساتھ انصاف کیا ہے' بلاشبہ مقدس مقامات کے معاملہ میں لوگوں نے مبالغے سے کام لیا مگر اسکا علاج یہ نہیں تھا جو کیا گیا' لوگوں کی جہالت کا ازالہ بڑی حکمت کے ساتھ کیا جاتا نہ کہ اس سے بڑی حماقت کا مظاہرہ کیا جاتا' آج دنیا اربوں ڈالر صرف اس پر خرچ کر رہی ہے کہ وہ کھنڈرات کو کھود کر تاریخ و تہذیب کے آثار برآمد کرے تاکہ تمدنی ارتقاء کے مدارج معلوم اور اپنی قوم کے منزل بہ منزل سفر کا مطالعہ کر سکے' رہن سہن کا جائزہ لے اور علمی و فکری' اور ذہنی تہذیبی حوالے ڈھونڈھ سکے' مگر یہ کیا کہ اہل عرب نے اپنی اصلی اور واقعی شکل میں موجود وہ آثار مٹا دیئے جو عرب کی حیاتِ نو اور تاریخ کے جلیل القدر سفر کی مستند نشانیاں تھیں' جزیرۃ العرب سے اگر کعبہ' منیٰ' صفا و مروہ' مزدلفہ' عرفات' دارِ ارقم' جبل رحمت' جبل نور' غارِ حرا' غارِ ثور' میدان بدر و اُحد' مسجد قبا' حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا گھر' جنت البقیع' مسجد نبویؐ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روضۂ رسول ﷺ نکال دیا جائے تو اس کے پاس باقی کیا کچھ رہ جاتا ہے جس پر وہ ناز کر سکے' اور جس سے وہ اقوام عالم میں اپنی شناخت کرا سکے' جزیرۃ العرب اور اہل عرب کی ساری شان تو انہی آثار کے دم قدم سے ہے' ورنہ کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ ملکوں ملکوں سے احرام باندھ کر یہاں پہنچے؟ یہ اماکن و آثار نہ ہوں تو کیا کوئی عرب کی ریگزاروں کی صرف ریگ و خاک پھانکنے کے لئے ادھر مار کر آئے گا؟

ع محمدؐ عربی سے ہے عالم عربی

جب تک حضورؐ نہیں آئے تھے' مکہ بتوں کا شہر تھا' ظالموں کا مسکن تھا' ابولہبوں اور ابو جہلوں کا نگر تھا' اور توہمات و خرافات کا مرکز تھا' آپؐ نے کعبے کو اس کی عظمت رفتہ لوٹائی' اور اسے دوبارہ خدا کے گھر کی شان بخشی' اور اس گھر کو خدائی بندگی کے لئے پاک اور خالص بنا دیا' اسی طرح ارد گرد کے غار محض مہیب اور خوفناک کھوہیں تھیں' اور پہاڑوں کی چوٹیاں محض ٹیلے' مشرکین مراسم حج ادا کرتے تھے مگر اظہارِ بندگی کے لئے نہیں محض قبائلی رواج کے طور پر' کوئی تقدس ان کے ذہن میں ہوتا تو کعبہ بتوں سے بھرا ہوا نہ ہوتا' قربانی کے جانوروں کا خون دیوار اور غلاف کعبہ پر نہ لتھیڑا جاتا' ننگ دھڑنگ ہو کر طواف نہ کیا جاتا' سرداروں کے مزدلفہ میں قیام کو کسر شان نہ سمجھا جاتا' یہ سید عالم ﷺ میں ہیں جن کی ولادت' بعثت' دعوت اور استقامت نے شہر مکہ کو ایمان و نور کا بعقہ بنا دیا' اور اب یہ قیامت تک ایسا ہی رہے گا' یہی

Marfat.com

حال مدینے اور اس کے گرد و نواح کا ہے' یثرب کو مدینۃ المنورہ کس نے بنایا؟

ظاہر ہے حضورؐ کے وہاں نزول اجلال سے ایسا ہوا' ورنہ اس سے پہلے مدینے کو کون جانتا تھا؟ اور کسی کو جاننے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ کوہ احد صدیوں سے وہیں ایستادہ تھا مگر پہچان سے محروم! میدان بدر بھی برسوں سے موجود مگر شناخت نابود!

کروڑوں درود و سلام اس رسول السلامؐ پر جس نے مدینے کو ایک مقدس مقام عطا کر دیا' شہرمدینہ اور ساکنان مدینہ ہزار بار جنم لے کر بھی اپنے محسن اعظمؐ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے' جس کے قدوم ممینت لزوم نے ایک قریۂ بے نام کو بقائے دوام اور شہرت تمام بخش دی۔

کاش میں عرب کا حکمران ہوتا تو میں شہیر مکہ اور شہیرمدینہ دونوں کو ان کی اصلی حالت میں محفوظ کرلیتا اور ان کے ارد گرد مضبوط اور بلند و بالا فصل کھڑی کر دیتا' اور دونوں شہروں کے باسیوں کے لئے متبادل اور خوبصورت مکانات مہیا کر دیتا یہ سب کچھ اس لئے کرتا کہ دنیا اپنی آنکھوں دیکھ پاتی کہ ایک عالم کی تقدیر بدلنے والی شخصیت نے کتنی چھوٹی اور کچی جگہ جنم لیا تھا' حجرۂ عائشہؓ بھی محفوظ ہو جاتا تاکہ لوگ شاہ شرق و غرب ﷺ اور دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی حکومت کے سربراہ کی بود و باش کا اندازہ کر سکتے' وہ گلیاں' وہ بازار' وہ کوچے' وہ روشیں سب کچھ محفوظ کرلیتا' جن میں کبھی حضورؐ کا گزر ہوا' جہاں سے آپ نے کچھ خریدا' جن میں کبھی آپ تشریف لے گئے اور جن پر کبھی آپ چلے' وہ مسجد نبویؐ بھی اپنی اصل حالت میں رہتی' جس کی چھت کھجور کے چھالوں کی تھی' جس کی دیواریں کچی تھیں اور جس کے فرش بارش کے دوران کیچڑ سے اٹ جاتے تھے' مگر اسی مسجد میں جبریل امینؑ کا نزول و ورود ہوتا' اسی مسجد میں مخدوم کون و مکاںؐ سجدہ ریز ہوئے' اسی مسجد میں بیٹھ کر کسریٰ کی سلطنت کے پرزے اڑنے کی زبان نبوتؐ سے خبر دی گئی' اور یہی مسجد ساٹھ لاکھ مربع میل پر محیط اسلامی ریاست کا مرکز قرار پائی' کاش' میں ایسا کر سکتا۔

(یکم نومبر 1998ء)

Marfat.com

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں

کوئی دن جاتا ہے کہ ہر طرف سے نظام کی تبدیلی کی بات ہوتی ہے۔ حالانکہ یہی بات ایک عرصے سے ہم جیسے بے نوا کرتے چلے آرہے ہیں' اس پر توجہ اس لئے نہ دی گئی کہ نہ ہم نظام حاضر کے بڑے مضبوط "تھم" تھے اور نہ معروف "اہل قلم" نہ کسی "پاور کلب" کے ممبر تھے اور نہ کسی تحریک کے رہبر' ایک سوچ تھی جسے بآسانی "پوچ" کہہ کر رد کر دیا جاتا تھا' ایک خیال تھا جسے "امر محال" قرار دے کر ٹھکرا دیا جاتا تھا' ایک وژن تھا جسے "بے وزن" سمجھ کر نظرانداز کر دیا جاتا تھا' ایک عرض تمنا تھی جسے "مرض لادوا" جان کر ناقابل التفات ٹھہرا دیا جاتا تھا' اور ایک "پرسیپشن" تھا جسے ایک ہی جست میں "ڈپریشن" کا نام دے کر منہ پھیر لیا جاتا تھا' اب اور تو اور خود وزیراعظم تک درجنوں بار کہہ چکے ہیں کہ یہ نظام فرسودہ ہو چکا ہے' گل سڑ چکا ہے' اپاہج ہو چکا ہے' مفلوج ہو چکا ہے' اور ناقابل اصلاح ہو چکا ہے' حالانکہ یہی وہ نظام ہے جس کے صدقے ہمارے سیاستدان اچھل کود رہے ہیں' ہمارے حکمران اپنا اپنا حصہ پا رہے ہیں' باری باری برسر اقتدار آرہے ہیں' اور پورا پورا لطف اٹھا رہے ہیں' اگر کوئی غریب نظام کی تبدیلی کی بات کرے وہ ٹھہرا بھوک کا مارا اور اگر کوئی محروم یہی نعرہ لگائے تو اس کا جیون قرار پایا مسائل کا پٹارا' آخر حکمران کلاس کو کون سی مشکل تنگ کر رہی ہے؟ دو تہائی اکثریت ان کے پاس' سروسز چیف کو بٹھانے اور اتارنے کا اختیار انہیں حاصل' ملکی خزانوں پر ان کی دسترس' ایٹم بم کا بٹن ان کی انگلیوں میں' خیبر سے کراچی تک پورا ملک ان کی جولان گاہ' موٹروے ان کی گاڑی کے پہیوں تلے' ہوائی جہاز ان کے لئے سٹینڈ بائی' ناشتے' ظہرانے' عصرانے اور عشائیے ان کے منتظر' غیر ملکی دوروں کے دعوت نامے ان کی جیب میں' نزلے زکام کے علاج کے لئے امریکہ اور برطانیہ کے تمام سہولتوں سے آراستہ ہسپتال ان کی ایک زقند کے فاصلے پر' ہیلی کاپٹر ان کے گھر کے لان میں حاضر باش' اور ان کے جوہر خطابت دکھانے کے لئے ٹیلی ویژن ہمہ وقت آمادہ و مستعد! اس کے باوجود وہ بھی کہتے ہیں نظام بدلنا چاہئے' اس پر قیاس کیجئے کہ موجودہ نظام عام آدمی کے ساتھ کیا کچھ کر رہا ہے۔ کہ اب اس نظام کے ناز پالے اور لاڈلے بھی اس کا بوجھ اٹھانے سے قاصر دکھائی دے رہے ہیں' اس سے پہلے ہم جیسے

Marfat.com

بے وسیلہ لوگ جو یہ بات کرتے تھے تو بات ہی کرتے تھے۔ کون سا پھاوڑا اور کدال لے کر ہر چیز کھودنے پر اتر آئے تھے یا توپیں لے کر میدان میں نکل آئے تھے؟ بات صرف اتنی تھی کہ نظام جمہوری رہے' غربت اور جہالت کے باعث عوام کی "مجبوری" کا استحصال نہ کیا جائے' جمہوریت کا کون منکر ہے مگر اسے "طاقت اور دولت" کا یرغمال نہ بننے دیا جائے' آئین بڑی مشکلوں سے بنا ہے خدا را اس کی "توہین" نہ کی جائے' وفاق پاکستان ایک بڑی نعمت ہے' اس کے درمیان "اتفاق" کو اولین ترجیح قرار دیا جائے' اور پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے اسے "مہماتی" سیاست کا اکھاڑا نہ بنایا جائے' ان میں سے کون سی بات ہے جو ناروا ہو؟ وزیراعظم کے نزدیک "نئے نظام" کا کیا مفہوم اور خاکہ ہے؟ بہتر ہے کہ وہ خود اس کی قابل قبول اور معقول وضاحت کر دیں' ایسا نہ ہو کہ ان کے سامنے پارلیمانی کی جگہ صدارتی نظام ہو' اداروں کی جگہ ارتکازِ اختیارات کا نقشہ ہو' اور احتساب کا نظام احباب کو سپرد کرنا مقصود ہو' جہاں تک ہمارے مطالبے یا خواہش کا تعلق ہے وہ بس اس قدر ہے کہ اس ملک کا ایک واضح نصب العین اور ہدف طے کیا جائے کہ اس کا نظام اسلامی ہو گا یا برطانیہ کی طرح آزاد جمہوری پارلیمانی سسٹم؟ اس کی معیشت چند افراد کے ہاتھوں میں رہے گی یا وسائل کی تقسیم منصفانہ ہو گی؟ اس کی سیاست پر ایک خاص قسم کی کلاس مسلط رہے گی یا اس میں انقلابی اصلاحات کے ذریعے جوہری تبدیلیاں لائی جائیں گی؟ یہاں کا نظام قانون اور تعلیم مختلف طبقات کے لئے الگ الگ ہو گا ہر ایک کے لئے یکساں ہو گا؟ اس کا نظام مالیات امریکہ اور عالمی مالیاتی اداروں سے مستقل طور پر منسلک رہے گا یا اسے خود کفالت اور خود انحصاری کی منزل سے آشنا کیا جائے گا؟ پاکستان کو ہمیشہ کے لئے چار قومیتی ملک کے طور پر چلایا جائے گا یا ایک قومی رویہ اپنایا جائے گا؟ (یہ بات انتظامی حوالے سے نہیں فکری پس منظر میں کہی جا رہی ہے۔) الحاصل یہ کہ جو بھی ہدف مقرر کیا جائے پھر اس کی طرف شعوری اور نظر آنے والی پیش رفت کی جائے' اور ہر شعبے میں گہری اور جوہری اصطلاحات کا پیکج تیار کیا جائے اور اس پر ریفرنڈم بھی ہو سکتا ہے اب تک تمام فیصلے ایک خاص کلاس کو سامنے رکھ کر کئے جاتے رہے ہیں' اور لوگوں کو تقریروں پر ٹرخایا جاتا رہا ہے' آخر ساری عقل و دانش صرف بھٹوؤں' بگٹیوں' مینگلوں' جتوئیوں' گیلانیوں' عباسیوں' چٹھوں اور وٹوؤں کے پاس کیسے جمع ہو گئی ہے کہ ان سے ہی مشاورت ہوتی ہے' انہی کی مصلحتوں کو زیر غور لایا جاتا اور انہی کی خوشنودیوں کو حاصل کیا جاتا ہے' آخر یہ کیسا نظام ہے جس میں مولانا مودودیؒ' مولانا نورانی' حکیم محمد سعید' مرحوم اے کے بروہی' آغا شاہی' ڈاکٹر اسرار احمد'

Marfat.com

پروفیسر طاہر القادری، ڈاکٹر جمیل جالبی، قاضی حسین احمد، ایس ایم ظفر، جسٹس جاوید اقبال، ڈاکٹر رفیق احمد، مرحوم صلاح الدین، مجید نظامی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے جاوید احمد غامدی اور ان جیسے دوسرے لوگ تو منتخب نہیں ہو سکتے اور ایسے لوگ پانچ پانچ بار منتخب ہوں جن کا نام لکھنے سے کئی پیشانیاں شکن آلود ہوں گی اور لاکھوں لوگوں کو شائد اُبکائی آنے لگ جائے، کوئی مانے نہ مانے کہیں نہ کہیں خلاء ضرور ہے، ایسی بنیادی تبدیلی کا میکانزم کیا ہو؟ اس پر کھلی بحث ہونی چاہیے لیکن اس سے پہلے سیاست میں انفرادی دولت کی بجائے اجتماعی دانش کی رسم تو ڈالی جائے، پارلیمنٹ کسی بھی ملک کی اجتماعی سیاسی و آئینی دانش کا مظہر ہوتی ہے، سو اس میں ایسے لوگ ہونے چاہئیں جنہیں دھوم دھڑکے سے "خدمت عوام؟" کا شوق ہے ان کے لئے بلدیاتی ادارے موجود ہیں جن میں دو چار سو نہیں ہزاروں افراد کھپ سکتے ہیں، یونین کونسل، ٹاؤن کمیٹی، میونسپل کارپوریشن، میٹروپالیٹن کارپوریشن اور ضلع کونسل جیسے نصف درجن لوکل ادارے ان لوگوں کے لئے چشم براہ ہیں، بڑے شوق سے سیاسی بدلے بھی اتاریں، بڑی چاہ سے سڑکیں بھی بنوائیں، بڑے چاؤ سے کچہریاں بھی سجائیں، بڑے بھاؤ سے ترقیاتی منصوبے بھی تیار کریں اور بڑے لگاؤ سے گاڑیوں پر نمبر پلیٹیں بھی لگوائیں، یہی صورت ملکی معیشت کی ہے ملک چالیس ارب ڈالر کا مقروض ہے اور جو لوگ معیشت کے ناخدا ہیں ان کی تقریباً سوا ارب ڈالر رقم بیرون ملک بنکوں میں ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کا قبلۂ توجہات اور نقشۂ ترجیحات کیا ہے؟ ہمارے نزدیک آئین میں کوئی خامی نہیں کہ اسے نئے سرے سے تیار کیا جائے اصل مسئلہ "بدانتظامی" ہے، قانون میں بھی کوئی لفظی اور نظری خلاء نہیں، جو بھی ہے، "عملی خلاء" ہے، اسی طرح موجودہ نظام بھی بار آور ہو سکتا ہے۔

اگر پہلے سے مسلط "امام" ادھر اُدھر کر دیئے جائیں، بات آگے کیوں نہیں بڑھ رہی ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے سیاسی بقراط و افلاطون یہ چاہتے ہیں کہ مصلّٰی بدل دیا جائے امام پہلے والا رہے، جب کہ ہمارا نقطۂ نظریہ ہے کہ مصلّٰی بیچارہ کیا قصور کر بیٹھا ہے۔ سارا فتون "امامان سیاست" کا ہے جو کبھی کعبہ کی بجائے "گنگا" کا رخ کر لیتے ہیں، "وقت قیام" وہ "سجدے" میں گر جاتے ہیں، اور "قرآن مجید" کی جگہ "گیتا" پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

(30 نومبر 1998ء)

سوچ اور ذوق کا ماتم

لیڈی ڈیانا کیا مری ہے کہ پوری دنیا میں ایک بھونچال سا آگیا ہے' جو ابھی تک تھمنے میں نہیں آرہا' کیا مغربی اور کیا مشرقی دونوں طرف کا پریس صرف اسی ایک موضوع کے لئے وقف ہو کر رہ گیا ہے' ہمارا پریس بھی اس باب میں کسی سے پیچھے نہیں رہا' میرے جیسے "سنکی" آدمی کے نزدیک ڈیانا کی مرگ ناگہانی پر ماتم کی بجائے اپنی سوچ کی پستی اور ذوق کی خرابی پر ماتم کرنا چاہیے' کہ یہ اخلاق زوال اور فکری افلاس کا نقطۂ انتہا ہے' میں آج تک اس خوش فہمی میں تھا کہ یورپ بہت بالغ نظر اور پختہ فکر ہے' وہاں کے معاشرے میں چند آوارہ منش اور دم کٹے ہی رہ گئے ہوں گے باقی سوسائٹی بہت حقیقت پسند اور علم دوست ہے مگر ڈیانا کی آخری رسوم کی جھلک دیکھ کر یہ توقع نقش بر آب ثابت ہوئی کہ عالم بالا کی سخن فہمی کچھ ہم سے ملتی جلتی ہے' دونوں میں چنداں فرق نہیں۔

لیڈی ڈیانا آخر تھی کیا؟ کوئی عظیم سائنسدان؟ زبردست علمی شخصیت؟ روحانی دنیا کی ملکہ؟ عالمگیر سماجی خدمات کا مرقع؟ ممتا کی لازوال محبت کا عکس؟ وفادار بیوی؟ معاشرتی و اخلاق قدروں کی جیتی جاگتی تصویر؟ امن عالم کی انتھک پیامبر؟ ان میں سے کچھ بھی نہیں بلکہ اس کی ساری زندگی کا ماحصل صرف معاشقہ اور معاشقہ تھا' آج جیمز ہیوٹ کے ساتھ اور کل ڈوڈی کے ساتھ' دنیا بھر میں اس کا تعارف ایک ایسی لڑکی کا تھا جس کے دامن میں اخلاق کا رتی بھر اثاثہ نہیں تھا۔ اور جس کی داستان حیات میں حیا نام کوئی باب نہیں تھا' اس کی وجہ شہرت شہزادہ چارلس کے ساتھ شادی اور اس کے بعد مسلسل پھڈے بازی بنی' اور عمر کے آخری لمحے تک شب خوابی کے لباس' بیڈ روم اور سن باتھ کی تصویریں' جنہیں مغربی اخبارات نے بڑے طمطراق اور "خشوع خضوع" کے ساتھ شائع کیں' شہزادی کے حصے میں بے طرح شہرت اور اخبارات کے ہاتھ میں دولت آئی۔

یار لوگوں نے کبھی اسے پریوں کے دیس کی شہزادی کہا' کبھی دکھی انسانیت کی نجات دہندہ لکھا' کبھی انسانی درد سے معمور شخصیت قرار دیا' اور کبھی وفا اور پیار کی تلاش میں سرگرداں عورت سمجھا' جب کہ ان میں سے ایک تصویر بھی اس فریم میں فٹ نہیں بیٹھی' بہت سوں نے تو لیڈی کو

Marfat.com

اسلام کی دہلیز پر کھڑے ہوئے بھی پایا' بزم سے کیا کیا لائی گئیں۔ اور ہوا کے دوش پر اچھالی گئیں'
میرے نزدیک دنیا میں دو شعبے بہت مظلوم ہو چکے ہیں ایک سوشل ویلفیئر کا اور دوسرا اسلام کا!

ہر غیر اخلاقی دھندا رفاہی اور سماج کاموں کی آڑ میں ہوتا ہے جب کسی مکروہ کام کے لئے کوئی عنوان نہ سوجھے تو اسے "رفاہی کام" کا ٹائٹل مل جاتا ہے اور رفاہی کام کیا ہوتے ہیں ہوٹلنگ' پبلک ریلیشنگ اور شاہانہ ٹریولنگ' اور رہ گیا اسلام' تو ہائی کلاس میں اسلام صرف عشق کے راستے سمجھ بھی آتا ہے قبول بھی کیا جاتا ہے۔ نہ درمیان میں قرآن نہ حدیث نہ سیرت اور نہ اخلاق و کردار' ڈیانا بھی اسلام کے بہت قریب آگئی تھی اور خبریں چھپ گئیں سوال یہ ہے کہ موت سے صرف ایک ہفتہ قبل لیڈی ڈیانا اور ڈوڈی کی شرمناک تصویریں اخبارات کی زینت بنیں جب دونوں بغلگیر ہو رہے تھے اور میڈ ٹرینین بجرے میں لیٹے ہوئے تھے' یہ اسلام سے قربت کی کون سی دلیل اور قسم ہے؟

ڈیانا کی وفات پر پوری دنیا کا پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا بڑبڑا اٹھا اور ہر لمحے کی عکسبندی کے لئے چوکس ہو گیا جبکہ چند دن بعد ہی عالمی شہرت کی حامل اور درویش صفت سماجی خادمہ مدر ٹریسا کلکتہ میں انتقال کر گئیں مگر پریس معمول کی خیر دینے کے سوا کچھ نہ کر سکا آخر کیوں؟ صرف اس لئے کہ مدر ٹریسا عمر کے اس حصے میں تھیں جس میں ظاہری جاذبیت نہیں ہوتی' وہ کسی شاہی خانوادے سے منسلک نہیں تھیں' ان کے حسن کے چرچے نہیں تھے' ان کی تصویریں "ہاٹ کیک" کی طرح نہیں بکتی تھیں' وہ ذاتی طور پر تین ارب کے اثاثوں کی مالک نہیں تھیں' وہ لوگوں کی پستی ذوق کا اشتہار نہیں بنی تھیں' ان کا اثاثہ صرف دو سوتی ساڑھیاں اور ایک بالٹی تھا' ورنہ مدر ٹریسا نے تو پچاس سال یعنی نصف صدی اس کام میں کھپائی جسے مجاہدہ اور ریاضت کے علاوہ کوئی دوسرا عنوان نہیں دیا جا سکتا' لیڈی ڈیانا کی انسانی خدمت محض "فوٹو سیشن" تک محدود رہی کوئی اور مستقل کام ہو تو اس کا انکشاف کیا جانا چاہیے۔

- لیڈی ڈیانا نے پوری عمر میں صرف دو چار مرتبہ کسی مریض بچے' کسی طاعون زدہ' کسی کوڑھی یا کسی کینسر میں مبتلا بچے کو ہاتھ لگایا ہو گا اور اس کی یہ تصویریں پوری دنیا میں پھیل گئیں' مگر ہمارے مولانا عبدالستار ایدھی اور ان کی بیگم بلقیس ایدھی تو چوبیس گھنٹے رہتے ہی ان لوگوں کے پاس ہیں جنہیں ماں باپ گھر رکھنے کو تیار نہیں' غریب' لاوارث' یتیم' کوڑھی' جذام زدہ' طاعون کے مارے' مسخ شدہ لاشیں' ذہنی معذور اور اپاہج لوگوں کے درمیان ان میاں بیوی کی عمر گزری

Marfat.com

ہے' ان دونوں کی شومئی قسمت بھی یہی ہے کہ یہ کسی کے سفلی ذوق کی تسکین نہیں کرپاتے' ورنہ جہاں تک خدمت کا سوال ہے اس سے بڑھ کر کیا ہو گی جو ایدھی ٹرسٹ کرتا ہے کسی نیوٹن کا اتنا بڑا جنازہ اٹھے' کسی آئن سٹائن کو یہ خراج ملے' کسی قدیر خاں کی یہ شہرت ہو' کسی ڈاکٹر حمید اللہ کو یہ اعزاز ملے' اور کسی مدر ٹریسا کی یاد میں یہ آنسو بہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے لوگوں کی فرد عمل پہ انسان بھی ناز کرتا ہے اور خدا بھی خوش ہوتا ہے کہ انسانی فکر و شعور کو ان لوگوں نے نئی جہتیں دیں' ایسے ہی بے شمار دوسرے لوگوں نے خلق خدا کا بھلا کیا' علم کو فروغ دیا' آگہی کو عرفان کی منزل عطا کی' اور انسان کے فکری و ذہنی سفر کو آسان بنایا' یہ کیا کہ ایک ایسی عورت کو ماڈل بنایا جائے جو نہ مغرب کی تہذیبی زندگی کا بہتر نمونہ ہو اور نہ مشرق کی روایات کا عکس جمیل! ہمارے "دانشور" کہتے ہیں کہ آخر اس مقبولیت کا کوئی تو راز ہو گا میرے نزدیک یہ کوئی بڑا راز نہیں صاف سی بات ہے کہ یہ مقبولیت نہیں بلکہ لوگوں کی ذہنی طفولیت اور فکری غربت کا شاخسانہ ہے اور کچھ بھی نہیں' اگر شہرت ہی واحد وجہ عزت قرار پا جائے' اور باقی تمام چیزوں کو غرق دریا کر دیا جائے تو معلوم نہیں آج تک عالم انسانی ایک باوقار' بامقصد اور بااخلاق معاشرہ تشکیل دینے کے لئے اتنے پاپڑ کیوں بیلتا رہا' شہرت کا تو آسان طریقہ سب کو معلوم ہے کہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اپنا سب کچھ بھرے چوک کی نذر کر دیا جائے اور اس کے بعد پیسے کے زور پر پبلسٹی مہم شروع کر دی جائے۔ آوارگی کو پیار کی تلاش قرار دے دیا جائے' پبلسٹی کو دکھی انسانیت کی خدمت بنا دیا جائے' معاشقوں کو انسان دوستی ثابت کر دیا جائے اور ذوق کی پستی کو مقبولیت کا نام دے دیا جائے' سچ یہ ہے کہ اس منظر نے بہت مایوس کیا ہے۔ میں سمجھتا رہا کہ اب دنیا بہت آگے بڑھ چکی ہے کام اہم ہے مگر پتہ چلا کہ "نام" زیادہ اہم ہے خواہ وہ بدی ہو' اسی طرح کردار ضروری نہیں بس لفظوں اور تصویروں کی "یلغار" ضروری ہے۔

(15 ستمبر 1997ء)

Marfat.com

جیویں عمر نبھی ہے شاکر دی ہک منٹ نبھا پتہ لگ ویندے

زندگی تو بہر طور گذر ہی جاتی ہے' شاہ کی بھی اور گدا کی بھی' خواہ گرم تنور میں ہو یا نرم سنجاب و سمور میں' وقت گزر ہی جاتا ہے سکھ کی سیج پر لیٹ کر یا دکھ کی چادر لپیٹ کر' دُنیا سے بہرکیف ہر ایک نے چلے ہی جانا ہے' البتہ حیاتِ چند روزہ میں جو ارمانوں کا لہو ہوتا ہے' وہ قبر میں تو کیا یاد آتا ہو گا یہاں ایک کرب بن جاتا ہے' کربِ مسلسل۔

کتنے سنگدل ہیں وہ لوگ جو اپنی زندگیوں میں عیش بھرنے کے لئے دوسروں کے جذبات کو ٹھیس دیتے رہتے ہیں' اپنی خواب گاہوں کو رنگین بنانے کے لئے اوروں کے دن رات سنگین بناتے رہتے ہیں' اور اپنے نشاط کدے کو پرلطف بنانے کے لئے ہزاروں لاکھوں گھروں کو غمکدے میں بدل دیتے ہیں' دنیا کے دو طبقات یعنی امیر و غریب کے درمیان اس قدر فاصلہ ہے کہ زمین و آسمان کا فاصلہ بھی کم معلوم ہوتا ہے۔

اہل زر نے شائد کبھی پلٹ کر نہیں سوچا کہ غریب کا دل بھی امیروں کی طرح دھڑکتا ہے' اس کا ذہن بھی ویسے ہی سوچتا ہے' اس کے احساسات بھی ویسے ہی نازک ہوتے ہیں' اس کے جذبات بھی ویسے ہی آبگینے ہوتے ہیں۔ جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے پھوٹ جاتے ہیں' اس کے ارمان بھی ویسے ہی مچلتے ہیں اور اس کی آرزوئیں بھی ویسے ہی بیدار ہوتی ہیں۔

ے یہ الگ بات کہ تعمیر نہ ہونے پائیں
ورنہ ہر ذہن میں کچھ تاج محل ہوتے ہیں

اربابِ تاج و تخت اور اصحابِ زر و بخت نے کبھی اس طرف دھیان دیا ہے کہ اس باپ کے کلیجے کے اس وقت کتنے ٹکڑے ہوتے ہوں گے جب وہ اپنے لخت جگر کی دس روپے قیمت کے کھلونے کی فرمائش بھی پوری نہیں کر پاتا ہو گا' اس ماں کے دل میں کتنے تیر ترازو ہوتے ہوں گے جو عید کے روز اپنے جگر گوشے کو میلے کپڑے پہنانے پر خود کو مجبور پاتی ہو گی' اور خود اس بچے کی سجری آرزوؤں پر کتنی چھریاں چلتی ہوں گی جو کسی جشن یا میلے کے موقع پر بھی محض ایک غبارہ خرید کر کھیلنے سے قاصر ہوتا ہو گا' ان لمحوں میں غریب باپ کی آنکھوں کی ویرانی' بے بس ماں کی

سوختہ سامانی اور لاچار بچے کے دل کی حیرانی کا کیا عالم ہو گا؟ وہ اپنے رب ' اس دنیا' اہل جہاں ' اپنے گردوپیش اور اپنے مقدر کے بارے میں سوچتے ہوں گے؟ ہرباپ کے نزدیک اس کا بیٹا یوسف ثانی ہوتا ہے' ہرماں کو اس کا کالا کلوٹا بیٹا چاند لگتا ہے اور ہر بچہ اپنے بچپن میں خود کو بادشاہ سمجھتا اور شاہانہ مزاج رکھتا ہے۔

ایک طرف غربت کے یہ نمونے اور دوسری طرف اہل زر کے چونچلے' دل دھک دھک کرکے باہر اُبلنے کو آجاتا ہے' خدا جانے اس غریب اور بے روزگار نوجوان پر کیا عالم تنہائی ہوتا ہو گا جب وہ اپنے بیمار ماں باپ کو دوائی لے کر دینا تو کجا ڈھنگ کی پرہیزی غذا فراہم کرنے پر بھی قادر نہ ہو' وہ ان ساعتوں میں کیا سوچتا ہو گا؟ وہ کیسے آہوں کو روکتا اور آنسوؤں کو پونچھتا ہو گا؟ ہمارے وزیراعظم' غریبوں کا نام لیتے وقت ایسے منہ بسورتے ہیں کہ ابھی رو پڑیں گے' لیکن کبھی انہوں نے سوچا ہے کہ ان کا ٹماٹر جیسا لال رنگ کتنوں کا لہو نچوڑ کر نکھرا ہے' وہ دن میں تین بار لباس بدلتے ہیں کبھی انہیں معلوم ہوا ہے کہ اس دھرتی پر وہ بھی ہیں جو روزِ عید بھی نیا لباس پہننے کے روادار نہیں' ہمارے اربابِ اقتدار کے جوتے بھی سرخ قالینوں کے بغیر زمین پر نہیں لگتے کبھی انہوں نے غور کیا ہے کہ کتنی بیٹیاں ہیں جو بالوں میں چاندی آنے تک عروسی کے سرخ جوڑے کو ترستی رہ جاتی ہیں۔

اربابِ زر کا ایک شغل یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں میں منفرد نظر آنے کے لئے کچھ چیزوں کو اپنے لئے ناگزیر بنا لیتے اور مصنوعی طور پر ان کی قدر و قیمت بڑھا لیتے ہیں' مثلاً آغا خان کا شرگر گھوڑا' جس کی قیمت دس کروڑ روپے بتائی جاتی ہے' آخر وہ سونے کا بنا ہوا ہے یا آسمان سے اترا ہوا؟ ان لوگوں کے لئے بعض کمپنیاں یہ بھی کرتی ہیں' کہ بہت تھوڑی مقدار میں کچھ آئٹم تیار کئے' اور یہ لوگ چیزوں کے خریدار ہوتے ہیں اور پھر ہر ایک کے سامنے اٹھلاتے اور ہر ایک کو بتلاتے پھرتے ہیں کہ ایسا جوتا دنیا میں میرے علاوہ صرف پندرہ آدمیوں کے پاس ہے' ایسی گھڑی میرے علاوہ دنیا بھر میں صرف ایک درجن افراد کی کلائی پر نظر آئے گی' اور ایسی انگوٹھی میرے علاوہ شرق و غرب میں صرف چند لوگوں کے تصرف میں ہے' اور یہ صرف یہ بتانے اور تسکین پانے کی خاطر ایک جوتا' ایک گھڑی اور ایک انگوٹھی لاکھوں روپے میں خرید لیتے ہیں' لعنت ہے اس شوق پر اور پھٹکار ہو اس ذوق پر' یہ دولت کی بدہضمی نہیں تو اور کیا ہے؟

اخبارات میں پرانی رولیکس (Rolex) گھڑیوں کا اشتہار چھپتا رہتا ہے کہ کوئی اس کا خریدار

Marfat.com

ہو یا بیچنے والا تو ہم سے رجوع کرے اور تیس ہزار روپے سے لے کر چھ لاکھ روپے تک اس گھڑی کی قیمت ہوتی ہے' یہ سب کچھ آخر کیا ہے؟ گذشتہ دنوں سابق صدر فاروق لغاری نے پی پی پی کے لیڈر خورشید شاہ کے بارے میں بتایا کہ جناب جو گھڑی باندھتے ہیں اس کی قیمت چون ۵۴ لاکھ روپے ہے یہ کیا ماجرا ہے؟ کسی مزدور کو ایک دن کی محنت کا معاوضہ ۵۴ روپے مل جائے تو وہ اس دن اس کے لئے عید بن جاتا ہے' چلو رہنے کو تو ایک اچھا گھر گوارا ہے اور غریب گوارا کر لیتا ہے لیکن باتھ روم کا ٹب چاندی اور ٹونٹیاں سونے کی ہوں تو یہ تو سینے پر آرا چلانے والی بات ہوئی' دولت کی یہ ساری افزائش حرام ذرائع سے سہی' لیکن اتنی بھونڈی نمائش کا کیا جواز ہے؟ کہا جاتا ہے کہ یہ سب مقدر کی بات ہے حالانکہ یہ مقدر کی بات نہیں موجودہ مکروہ نظام زر کی سوغات ہے' مقدر کی بات کرنے والے کبھی یہ تصور تو کریں وہ لمحہ انہیں کیسے لگے گا کہ ان کی بہو بیٹی روزی کی خاطر کسی گھر کے جھوٹے برتن مانجھنے پر مامور ہو' ان کی بوڑھی ماں سارا دن دھوپ میں کپاس چنتے نظر آئے' ان کا جوان بیٹا کسی تھڑے پر بیٹھ کر جوتے پالش کر رہا ہو' اور ان کی بیوی گھروں کی صفائی کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنے پر مجبور ہو۔

حکمران دل لبھانے والی بات تو کر جاتے ہیں مگر دل میں کبھی جھانکنے کی زحمت نہیں کرتے کہ کیا کیا داغ غریبوں کے دل پر لگے ہوئے ہیں اور انہوں نے کیا کیا زخم سہے ہوئے ہیں؟ اہل زر بے شک اپنی آسائش نہ چھوڑیں صرف آرائش اور نمائش سے باز آجائیں تو لاکھوں گھروں میں دیپ جل اٹھیں گے۔ اور کروڑوں آنکھوں میں چمک آجائے گی۔

غربت کے بارے میں تصور کرنا' تقریر کرنا' اور کالم لکھنا یہ بہت آسان ہے بس تھوڑا سا ذہن پر بوجھ پڑتا' ذرا سی زبان لڑکھڑاتی اور معمولی سا قلم لرزتا ہے' خدا نہ کرے کسی کا اس نامراد چیز سے پالا پڑے' یہ انسان کو زندہ درگور کر دیتی ہے' انسان کو بے عزت بنا دیتی اور انسان کو خون کے آنسو رلا دیتی ہے' ارمانوں کا جنازہ ہر لمحے کندھوں پر اٹھائے رکھنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

(7 نومبر 1998ء)

"حضرت انسان"

کسی نے کہا ہے اور خوب کہا ہے۔

حسن انساں سے نمٹ لوں تو خدا تک پہنچوں

واقعی انسان کائنات کا خلاصہ، تخلیق خداوند کا شاہکار، دنیا کا بھرپور اور حیرت انگیز موضوع، اور ایک دلچسپ مطالعہ ہے، جو حسن کائنات کے گوشے گوشے میں بکھرا پڑا ہے۔ اسے یکجا کیا جائے تو وہ "انسان" بنتا ہے، گلاب کے پھول کی رنگت اور نزاکت انسان کی کیفیت حیا سے پھوٹنے والی لالی اور ہونٹوں کی لطافت سے مشابہ قرار دی جاتی ہے، یاقوت کی تراوش اور کسی خوبرو کے ہونٹ کی ساخت کو ایک برابر سمجھا جاتا ہے، بعض انسانی چہرے آفتابی چہرے کہلاتے ہیں، چہرے کے حسن کو ماہتابی بھی کہا جاتا ہے، انسانی نگاہ کے اٹھنے اور جھکنے کے انداز کو بجلی کے کوندے سے تشبیہ دی جاتی ہے، سرو کے راس قد میں جو حسن ہے وہ انسانی قامت کے لئے استعارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے، کسی سرمہ آلود آنکھ اور دُر ابلق کو دیکھنے والے ایک ہی نظر سے دیکھتے اور حظ اٹھاتے ہیں، شب دیجور اور زلف کی سیاہی کا ہمیشہ ایک ساتھ ہی تذکرہ ہوتا ہے۔

چاند کے طویل سفر کے عہد افق میں ڈوبنے کا منظر بہت ہی بھلا ہوتا ہے اور کوئی شاعر اسے دیکھ لے تو بول اٹھتا ہے۔

تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

کسی کا گلابی آنچل ہوا میں لہرائے تو دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ شائد پھول سے رنگ جدا ہو رہا ہے، کوئی جھانک کر چلمن ڈال دے تو دیکھنے والوں کی گردنیں ڈھلک جاتی ہیں، انسان کی شیرینی تکلم کو مصری کی ڈلی کہا جاتا ہے، حسن نطق کو پھول جھڑنے سے تعبیر کیا جاتا ہے، کاجل لگی آنکھوں کی چمک چاند کو شرما رہی ہوتی ہے، کوئی پری وش دو قدم چل دے تو شاعروں کو فتنۂ محشر یاد آجاتا ہے، کسی کی نیم باز آنکھیں میر تقی میر کو شراب کی مستی بھلا دیتی اور مرزا سودا کے ہاتھ سے ساغر گرا دیتی ہیں، کسی کے رخسار پر حیا کی لکیریں ابھریں تو ان کے سامنے قوس و قزح کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے،

حضرت انسان کا مزاج برہم ہو تو فانی بدایونی کو نبض کائنات ڈوبتی ہوئی محسوس ہوتی ہے' کوئی رخ سے نقاب اٹھا دے تو لگتا ہے کہ ماحول کے لئے مصحف کی تلاوت کا وقت ہو گیا ہے' کوئی انگڑائی لے تو معلوم ہوتا ہے کہ حسن اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز ہے اور انسانی تحفے کو کہنے والے لوح تقدیر کہتے ہیں' یہ تو ہے حسن انسان کی کہانی' ایک دوسرے پہلو سے انسان کا مطالعہ کیا جائے تو عجیب مجموعۂ اضداد دکھائی دیتا ہے تسخیر کائنات بھی اس نے کی اور اسیر کائنات بھی خود ہی نظر آتا ہے' یہی انسان ایک طرف سمندروں کے سینے چیرتا نظر آتا ہے اور دوسری طرف اس کے جسم میں پانی کی کمی واقع ہو جائے تو آناً فاناً موت کے منہ میں چلا جاتا ہے' دیوہیکل طیارے' ٹرک اور ٹرالر اس نے اپنے ہاتھوں سے بنائے لیکن ان کے ایک پہیے کی زد نہیں سہہ سکتا' بجلی جیسی آفت اس کی ایجاد ہے مگر اس کا ایک جھٹکا اس کے لئے جان لیوا بن جاتا ہے' انسان نے ہواؤں کو مٹھی میں کر لیا لیکن اس کی اپنی زندگی کا دارومدار چند لمحوں کی سانس کے آنے جانے پر ہے' انسان کی طاقت کا یہ عالم ہے کہ اس نے ہاتھی کو اپنی سواری بنایا' شیر کو سرکس کا تماشا بنایا' اونٹ کو بار برداری کا ذریعہ بنایا' اور گھوڑے کو سدھا کر اپنا غلام بنایا' لیکن اس کی نزاکت کا حال یہ ہے کہ وہ ہاتھی کے پاؤں کی ایک داب' شیر کے پنجے کی چھیلن' اونٹ کی داڑھ کی کاٹ اور گھوڑے کی دولتی برداشت نہیں کر پاتا' انسان چاہے تو کے ٹو پہاڑ کی چوٹی سر کر سکتا ہے' لیکن ایک معمولی پتھر اس کا سر پھوڑ دیتا ہے' انسان نے آگ سے کیا کیا کام نہیں لیا مگر اس کا شعلہ انسان کو کوئلہ بنا دیتا ہے' انسان کے علم کا احوال یہ ہے کہ اسے گزشتہ ہزاروں سال کی تاریخ ازبر ہے اور آئندہ کئی صدیوں کی خبر دیتا ہے' مگر اس کی اپنی حالت یہ ہے کہ اسے اپنے پل بھر کی خبر نہیں' انسان نے ہزاروں میل دور مار کرنے والے میزائل بنا لئے' ایٹم بم ایجاد کر لئے' ہائیڈروجن بم تیار کر لئے اور کولیسٹرول بم اختراع کر لئے' مگر اس کی ناطاقتی دیکھنے کے قابل ہے کہ ایک معمولی ریوالور کے چنے بھر کی گولی اس کا کام تمام کر سکتی ہے' انسان پھیلنے پہ آئے تو اس کے سامنے وسعت کون و مکاں جواب دے جاتی ہے' اور وہ سکڑنے اور سمٹنے پہ آئے تو قبر کی دو گز زمین سے اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے' ایک دنیا محو حیرت ہے کہ انسان ہے کیا؟ اس کی جرأت اور ہمت کا انداز یہ ہے کہ خدا کی جو امانت زمین و آسمان اور پہاڑ نہ اٹھا سکے وہ رازِ الٰہی جھٹ سے حضرتِ انسان نے اپنے سینے میں سمو لیا' مگر خود رازِ حیات پانے سے ابھی تک قاصر ہے اور ہزاروں سال سے اس جستجو اور کشمکش میں گرفتار ہے' یہ انسان سرکشی پہ آتا ہے تو انا ربکم الاعلیٰ کہہ اٹھتا ہے اور پستی میں گرتا ہے تو آگ' پہاڑ' سورج' ستارے' چاند' دریا'

سانپ، حتیٰ کہ مٹی کی مورت کو پوجنے لگ جاتا ہے، اس انسان نے انٹرنیٹ، ای میل، فیکس، اور ٹیلی فون کے ذریعے اپنی بات ہزاروں میل تک پہنچا دی مگر دوسری طرف حال یہ ہے کہ اپنے سامنے رہتے اور پہلو میں بستے ہوئے انسان کے دل میں اپنی بات نہیں اتار سکا، ورنہ یہ غلط فہمیاں کیوں ہیں؟ اور جنگ کی تباہ کاریاں کس لئے ہیں؟ انسان کی مختاری اور مجبوری کا فلسفہ آج تک کھل نہیں سکا، اور اس کے ڈانڈے اس قدر ملے ہوئے ہیں کہ درمیان میں کسی باریک سی لکیر کا گزر ممکن نہیں، حضرت علیؓ سے کسی نے اسی بابت پوچھا کہ یا حضرت! یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان بیک وقت مختار بھی ہو اور مجبور بھی؟ آپ نے فرمایا "ایک ٹانگ اوپر کرو، اس نے کی تو آپ نے کہا اب دوسری ٹانگ بھی اوپر اٹھاؤ۔" اس نے جواب دیا "اس طرح تو میں گر پڑوں گا۔" آپ نے ہنس کر فرمایا "بس تم اس قدر مختار اور اس قدر مجبور ہو۔"

انسان اپنے خصائص و اطوار میں بھی ایک طرح کا عجیب مرکب ہے، عفو و درگزر پہ آئے تو قاتل کو دودھ کا پیالہ پیش کر دیتا ہے اور انتقام پہ آئے تو مخالف کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلاخیں پھروا دیتا ہے، بے نیاز اس قدر کہ شہزادگی چھوڑ کر بن باس لے لیتا ہے، اور حریص اقتدار اور اس طرح کہ حکومت کی خاطر باپ کو جیل بھجوا، بھائیوں کو مروا اور دوسروں کی کھال کھنچوا دیتا ہے، یہ سخی اتنا ہے کہ سینکڑوں بار کسی نصب العین کے لئے اس نے اپنی جان دے دی، اور بخیل اس قدر کہ چند روپوں کی خاطر ہزاروں دفعہ اپنے بھائیوں کا خون بہا دیا، دنیا سمیٹنے پہ آتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا ہزاروں برس جئے گا، اور ایثار کرنے پہ آئے تو یوں دکھائی دے کہ کل مرنے والا ہے، المختصر یہ کہ شائد یہی تضاد ہے جو دنیائے انسانی کو دلچسپ اور پرکشش بنائے ہوئے ہے، ورنہ دنیا کب کی اپنی صف لپیٹ چکی ہوتی۔

(13 اکتوبر 1998ء)

Marfat.com

○ فریب خوردہ "شاہین"

اقبالؒ کے نزدیک کرگسوں کی صحبت میں پرورش پانے والا شاہین کبھی اس حقیقت سے آشنا نہیں ہو سکتا کہ شاہبازی کے آداب و قواعد اور مزے کیا ہیں؟ یہی حال ہمارے عوام کا ہے یہ اگرچہ شاہین ہیں مگر مستقل طور پر صحبت زاغ نے انہیں ناآشنائے بال و پر اور محروم سیر سپہر کر رکھا ہے' انہیں علم تک نہیں ہونے دیا گیا کہ ان کے پروں میں کیا طاقت پرواز پوشیدہ ہے اور یہ چاہیں تو ان کے سامنے ہفت افلاک سرنگوں ہو سکتے ہیں' یہ عمر بھر دانہ دُنکا چننے میں لگے رہے جھپٹنے اور پلٹنے کے لطف سے محروم رہے' انہیں اس لذت کی خبر ہی نہ ہو سکی کہ اپنے ہاتھ کے شکار میں کیا مزا ہے اور شکار مردہ ان کو سزاوار نہیں یہ دوسروں کے شکار پر قانع ہو گئے' کاش کہ عوام کو اپنی طاقت کا احساس و ادارک ہوتا' عہد سلطانی جمہور میں فیصلہ کن حیثیت کسی جاگیردار' کسی صنعت کار' کسی بیوروکریٹ اور کسی فوجی جنرل کو نہیں عوام کو حاصل ہوتی ہے' عوام جسے چاہیں اپنے ووٹ دے کر منصب حکومت تک پہنچا سکتے ہیں اگر کوئی فرد یا جماعت ان کے معیار پر پورے نہ اتریں تو انہیں اونچے منصب سے نیچے اتار سکتے ہیں' کوئی ڈھیٹ بن کر بیٹھنا چاہے تو یہ گلی کوچے میں حشر اٹھا سکتے ہیں اور حکمران کا جنازہ اٹھوانے پر قادر ہیں' جس حکمران کے لئے اپنا دل کھول دیں اسے پانچ سال تک حق حکومت دینے کی قوت رکھتے ہیں اگر دل تنگ کر لیں تو حکومت کا قافیہ تنگ ہو سکتا ہے' لیکن جب سے عوام اپنے ----- اختیار و انتخاب--- کے منصب سے ناواقف ہوئے ہیں اس خلاء کو سازشوں نے پر کیا ہے' کبھی فرد واحد اسمبلی توڑ دیتا ہے' کبھی کوئی طاقت شب خون مار لیتی ہے' کبھی چند رکنی اسمبلی نظام حکومت کو "میوزیکل چیئر" بنا دیتی ہے' اور آئے روز حکمران بدلنے شروع ہو جاتے ہیں' بدقسمتی سے عوام اپنے اختیار و انتخاب کے معاملے میں غیر محتاط واقع ہوئے ہیں' یہ ان لوگوں کو "محبوب قائد" "قائد عوام" "پاسبان جمہوریت" اور "محافظ پاکستان" سمجھتے اور بناتے ہیں جن کی کوئی قدر عوام سے مشترک نہیں ہوتی' یہ اسے--- محبوب قائد----- بناتے ہیں جس کے دل میں عوام کے لئے محبت کی بجائے کراہت بھری ہوتی ہے اور وہ عوام کو

Marfat.com

تیسرے درجے کی مخلوق سمجھتا ہے' اس کا اٹھنا بیٹھنا' اس کا لباس' اس کی گاڑی' اس کا بنگلہ اس کا سٹینس' اس کا اندازِ گفتگو اور اس کا ذوق خورد و نوش سبھی کچھ پتہ دیتا ہے کہ وہ عالم بالا کی مخلوق اور ووٹر عالم اسفل کے کیڑے ہیں' لوگ ---- قائد عوام ---- اسے بناتے ہیں جو حقیقت میں قائد ہی نہیں ہوتا بلکہ پیروکار ہوتا ہے۔ اپنی ناآسودہ خواہشات' اپنے بے لگام جذبات اور اپنے مفادِ ذات کا' اور طلبگار ہوتا ہے۔ بین الاقوامی عنایات و نوازشات کا! عوام ----- پاسبان جمہوریت ---- اسے سمجھتے ہیں جو بذاتِ خود غیر جمہوری عمل کی پیدوار ہوتا ہے' اور ----- محافظ پاکستان ---- اسے قرار دیتے ہیں جس کے ذمے پاکستان کی دولت سب سے زیاہ واجب الادا ہو' حال ہی میں ایک خبر آئی ہے کہ "دختر مشرق" نے اپنی اولاد کے لئے ایک درسگاہ مغرب کا انتخاب کیا ہے اور ان کی اولاد عزیز کو لندن میں داخلہ مل گیا ہے' قبل ازیں انہوں نے لندن کے انتہائی مہنگے اور فیشن ایبل علاقے ---- کنگسٹن ---- کے سکول میں داخلے کی کوشش کی تھی جہاں ایک بچے کے سالانہ اخرجات بیس لاکھ روپے ہیں اس طرح قائد عوام کی بیٹی اپنے تینوں بچوں پر ساٹھ لاکھ روپے سالانہ خرچ کرتیں یعنی پانچ لاکھ روپے ماہانہ! مگر سکیورٹی مہیا کرنے پر معذرت کے سبب مذکورہ سکول کا انتخاب نہ ہو سکا' ظاہر ہے سکیورٹی اخراجات اس پر مستزاد ہوتے' ان اخراجات پر موصوفہ کی باقی ضروریات اور بجٹ پر قیاس کیا جا سکتا ہے یہ اس قوم کی قیادت کے احوال ہیں جس کی فی کس آمدنی ساڑھے چار سو ڈالر ہے یعنی پندرہ سو روپے پاکستان ماہانہ' یہ بات محض موصوفہ کی نہیں ہر لیڈر کی ہے' وہ سندھ کا ہو چاہے پنجاب کا پشتون ہو یا بلوچ' کوئی بھی نواب اور تمن دار سے کم نہیں' اور دعویٰ اور زعم ہے غریب عوام کی قیادت کا' یہ دعویٰ اور زعم جو سربسر جھوٹا اور جعلی ہے اس وقت تک باطل اور خاک میں نہیں مل سکتا جب تک خود ---- غریب عوام ----- ایسا نہ چاہیں' اگر شاہین ہی فریب خوردہ ہو' کرگسوں کی صحبت کا رسیا ہو' زاغ و زغن کا مونس و خادم ہو' فرش خاک پر رزق دیکھنے کا آرزو مند ہو' مردار کھانے سے اسے عار نہ ہو۔ نچلے منڈیروں پر بسیرا کرنے کا عادی ہو' قصر سلطانی کے گنبد پر اس کا دل آتا ہو' اور کسی کے پس خوردہ پر قناعت کرنے والا ہو تو اسے رہ و رسم شاہبازی کیسے معلوم ہو گی؟ کروڑوں کی آبادی میں لاکھوں پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان ہزاروں ذمہ دار اور اہل اشخاص کے مقابلے میں ہمارے عوام کا ہمائے قیادت ان کے سر پر بیٹھتا ہے جو پہلے ہی سربلند اور قلعہ بند مخلوق ہے' اتنی سربلند کہ عوام اسے حقیر جرثومے دکھائی دیتے ہیں اور اتنی قلعہ بند کہ لوگوں کی آہ ان تک کبھی پہنچ ہی نہیں پاتی' ہماری لیڈر شپ مخلص ہو' ذمہ دار

ہو' درد مند ہو' غریب پرور ہو' سفید پوش ہو' اور غم آشنا ہو یہ مسئلہ قیادت کے سوچنے کا نہیں خود عوام کے غور کرنے کا ہے' وہ مخلص کیوں بنے جو غیر مخلص ہو کر بھی مقبول ہو' وہ ذمہ دار کیوں بنے جو آزار دے کر بھی قابل قبول ہو' وہ درد مند کیوں بنے جس بے درد سے ہر کوئی دوا مانگے' وہ غریب پرور کیوں بنے جو غریبوں کا پہلے ہی رہبر ہو' وہ سفید پوش کیوں بنے جس کو ہر وقت مدہوش دیکھ کر بھی عوام بہت پرجوش ہوں' اور وہ غم آشنا کیوں بنے جس کے دیئے ہوئے الم کو ہر ایک مرہم سمجھے' عوام اگر کسی دن غور کریں کہ ہمارا انتخاب کیا ہے؟ تو خود اپنے سامنے لاجواب ہو جائیں گے تن پر چیتھڑے ٹانکنے والے غریب بلوچوں کا لیڈر کون؟ خان یا سردار! بوٹ پالش کر کے گزارا کرنے والے پٹھانوں کا رہبر کون؟ خان ابن خان! عمر بھر ہل چلانے والے سندھی ہاری کا پیشوا کون؟ پیریا جام! محنت کی کٹھالی میں گھلنے والے پنجابی کا رہنما کون؟ جاگیردار یا صنعتکار!

ایسے لوگوں سے امید وفا سب سے بڑی توہین وفا ہے۔

معلوم نہیں وہ کون سی کسوٹی ہے جس پر پرکھ کر لوگ انہیں لیڈر بناتے ہیں جن کے بنگلے ہر صحت افزا مقام پر ہوتے ہیں' نیویارک جن سے دو ہاتھ کے فاصلے پر ہوتا ہے' جو ناشتہ لندن میں لنچ پیرس میں اور ڈنر فرینکفرٹ جا کر کرتے ہیں' جن کے بچوں کو پاکستانی سکولوں سے بدبو آتی ہے' جن کا نزلہ زکام بھی باہر جا کر ٹھیک ہوتا ہے۔ اور جن کی شخصیت کا ہر پرت یورپ ہی جا کر کھلتا ہے' فریب خوردہ شاہین زندہ باد صحبت زاغ کا پروردہ شاہین پائندہ باد!

(12 اگست 1997ء)

Marfat.com

اے خدا "شہناز گل" سی بیٹیاں پیدا نہ ہوں

یہ ۷۰ء کے آخری مہینوں کی بات ہے ملتان کے ایک بڑے انتظامی افسر اور سخنور مصطفیٰ زیدی نے خود کشی کر لی، زیدی کی محبوبہ "شہناز گل" نے اس سے رخ پھیر لیا، اس صدمے کی تاب نہ لا کر مصطفیٰ زیدی نے زندگی سے منہ موڑ لیا، شہناز نے ایک صنعتکار سے ناتا جوڑ لیا تھا، اس واقعے پر اخبارات نے رنگین حاشیے چڑھائے، زبانوں نے ایک عرصے تک چٹخارے لئے، کوچہ و بازار میں اس کے چرچے ہوئے، مرحوم شورش کاشمیری اس وقت زندہ تھے، ان کے خیال نے کروٹ، شاعری نے جھرجھری اور قلم نے انگڑائی لی، وہ مصرعے کیا تھے، مرثیے تھے، ظاہر ہے خیال شورش کا ہو تو بھونچال کیوں نہ اٹھے؟ شاعری شورش کی ہو اور ساحری نہ کرے؟ اور قلم شورش کا ہو اور جادو رقم نہ ہو؟

ے
بانجھ ہو جائیں زمینیں لڑکیاں پیدا نہ ہوں
اے خدا شہناز گل سی بیٹیاں پیدا نہ ہوں
مائیں جننا ترک کر دیں نرم نازک کونپلیں
روزناموں کے لئے شہ سرخیاں پیدا نہ ہوں
شاعروں کو مہ وشوں پر تبصرہ کرنے کا حق؟
نے نوازوں کے لئے شہنائیاں پیدا نہ ہوں
جن کے جلووں سے ہیں دو غزلہ شبانہ محفلیں
وہ پری چہرہ کسی صورت یہاں پیدا نہ ہوں
پھول پیدا ہوں مگر شاخوں کی آرائش رہیں
لڑکیاں پیدا ہوں لیکن تتلیاں پیدا نہ ہوں

"مصطفیٰ زیدی" اور "شہناز گل" یہ دو افراد اور نام نہیں دو کردار اور علامات ہیں، زیدی ملتان کے انتظامی افسر تھے غالباً کمشنر تھے یا ڈپٹی کمشنر، اہل علاقہ کی جان، ان کے مال اور لوگوں کی آبرو

Marfat.com

کے محافظ، مگر خود ہی نظرباز اور دل پھینک واقع ہوئے، چمن کی حفاظت کے بجائے خود ہی کونپلوں اور تتلیوں کے تعاقب میں رہے نتیجہ خودکشی اور انجام رسوائی، اس طرح شہناز گل کسی بوڑھے باپ اور لاجوں والی ماں کی بیٹی تھی، مگر اس نے نہ باپ کی پگڑی کی کوئی دھجی چھوڑی اور نہ ماں کی چولی کا لحاظ کیا، بیٹی اگر یہ چاند چڑھائے گی تو ماں باپ یہی کہیں گے۔

ے اے خدا شہناز گل سی بیٹیاں پیدا نہ ہوں

"ورنہ بیٹی کس باپ کے سینے کی ٹھنڈک اور کس ماں کے دل کی دھڑکن نہیں ہوتی؟ کچھ دن ہوئے لاہور ہائیکورٹ نے ایک لو میرج کیس کا فیصلہ سناتے ہوئے یہ رولنگ دی کہ "گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والی لڑکی کو شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنون بننے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے کہ نہ ان کی عزت باقی رہے گی اور نہ معاشرہ انہیں دوبارہ قبول کرے گا کیا عدالتیں صرف لو میرج کے لئے رہ گئی ہیں؟""

ہائیکورٹ کی یہ ابزرویشن برمحل اور صد فیصد درست ہے، اور معاشرے کے لئے انتباہ ہمارا مجموعی معاشرتی چلن، ٹی وی کا رویہ، مغربی تہذیب کی یلغار اور انڈین ثقافت کی بھرمار یہ سب اس رجحان کی حوصلہ افزائی کرنے میں پیش پیش ہیں جس سے آئے روز عشق و عاشقی کے افسانے اخبارات کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

میں ان جہول لوگوں میں نہیں جو بیٹی کو بیٹے کے مقابلے میں کمتر اور عورت کو جوتے کی نوک سمجھتے ہیں لیکن ان فضول لوگوں میں سے بھی نہیں ہوں جو اپنے لیکچروں اور کالموں کے ذریعے بیٹی کو ماں باپ کے مدمقابل کھڑا کرنے میں لگے رہتے ہیں، مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ایسے "خواتین و حضرات" کسی ذہنی و جذباتی صدمے کے باعث معاشرے سے انتقام لینے کے چکر میں ہیں، وہ کسی ماں کا آنچل اُڑتے اور باپ کی پگڑی اُچھلتے دیکھ کر لطف محسوس کرتے ہیں، ورنہ اس لسانی تبلیغ اور قلمی جہاد کا جذبۂ محرکہ کیا ہو سکتا ہے؟ ایسے کئی واقعات شریف گھرانوں کو بدنام اور والدین کو برباد کر چکے ہیں جن کی بیٹیوں کے تذکرے اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ چھپے اور افسانے بنے ہیں، کبھی معاشرے کا وقار و اعتبار اس سے نہیں ہوتا کہ اس نے کتنے لیلیٰ مجنوں جنم دیئے ہیں، کتنے شیریں فرہاد پیدا کئے ہیں، کتنے سسی پنوں پروان چڑھائے ہیں، کتنے ہیر رانجھے بنائے ہیں اور کتنے صاحباں مرزے تیار کئے ہیں، بلکہ معاشرے کی آبرو بیٹے ہوتے ہیں جو ماؤں کا مان اور بہنوں کا دھیان رکھتے ہیں، اور سوسائٹی کی حرمت اُن بیٹیوں کے دم سے ہے، جن کے گھر کی دہلیز سے فرشتے

Marfat.com

جھک کر گزرتے اور جن کے آنچل کے تقدس پر ماں باپ فخر کرتے ہیں۔

گلیمر زندگی نہیں کریکٹر زندگی ہے' لیکن مغرب کی دیکھا دیکھی ہمارے اخبارات اور ہمارا ٹی وی گلیمر کو حاصل زندگی بنانے پر تلا ہوا نظر آرہا ہے۔

گلیمر کی آواز کوئی بڑی آواز نہیں لیکن فقط شوبز کی دنیا ہی گلیمر کی دنیا نہیں' بیسیوں شعبے ایسے ہیں جن میں کمال حاصل کر کے مرد اور عورت شہرت حاصل کر سکتے ہیں' زہد و عبادت' حکمت و دانش' سخنوری و سخن فہمی' تحریر و تقریر' تدبیر و سیاست' درس و تدریس' تعلیم و تعلم' تصنیف و تالیف' خدمت خلق' سائنس' ادب' طب' وغیرہ۔

یورپ جس سفر سے واپسی کا سوچ رہا ہے ہم اس سفر کے لئے کمر بستہ ہو رہے ہیں' ضروری ہے کہ ہر گھاٹی میں گر کر اور ہر ٹھوکر کھا کر ہی اس سفر سے لوٹیں؟ جس سفر کی منزل آنکھوں کے سامنے ہو تو اس سمت نکلنے کی آخر کیا مجبوری ہے؟

بے راہروی کے اس سفر کی منزل تباہی ہے----- مکمل تباہی------ خاندانی تباہی' اخلاقی تباہی اور سماجی تباہی۔

جذبات سے ہٹ کر غور کیا جائے تو بھی منطقی و عقلی اعتبار سے اور مستند اعداد و شمار سے یہی ثابت ہو گا کہ لو میرج ہو یا کورٹ میرج' ان میں سے پانچ فیصد شادیاں کامیاب رہتی ہیں' باقی کا انجام پشیمانی و پامالی۔

کسی وقتی اشتعال اور سفلی ابال کے سبب اپنی تہذیب کے شاداب چمن کو پامال کر دینا کہاں کی دانشمندی ہے؟

(3 اپریل 1999ء)

Marfat.com

مشرق کے آخری قلعے پر مغرب کی یلغار

مغرب اور اسلام کا تصادم اب نوشتۂ دیوار بن چکا ہے' کسی بھی حیلے بہانے سے اب یہ جنگ کچھ وقت کے لئے مؤخر تو ہو سکتی ہے موقوف ہونے کا امکان نہیں' واقعہ یہ ہے اس جنگ کے شعلے بھڑکانے میں اہل اسلام کا کوئی حصہ نہیں' پھیپھڑوں کا سارا زور لگا کر ان شعلوں کو ہوا دینے میں مغرب مصروف ہے' اور اس کی بدیہی وجہ مغربی تہذیب کا غلبہ اور مغربی طرزِ سیاست کا تسلط ہے' فاتح اگر نشے میں چور نہ ہو تو کیا کرے؟

پروفیسر سموئیل ہنٹنگٹن (Semoil Huntington) سے "تہذیبوں کا تصادم" جیسے مقالے لکھوائے جا رہے ہیں تاکہ دنیا ابھی سے ذہنی طور پر تباہ ہو جائے کہ بالآخر ایک تہذیب (اور وہ مغربی تہذیب ہے) غالب آئے گی' باقی تہذیبیں یا تو سرنڈر کر دیں یا پھر کشمکش کے لئے تیار رہیں' اور اسی طرح فوکویاما (Focoyama) کے قلم سے "تاریخ کا اختتام اور آخری آدمی" (End of History and Lastman) جیسی کتاب مارکیٹ میں یہ ثابت کرنے کے لئے آئی ہے کہ تاریخ کو ترقی کا جس قدر سفر کرنا تھا وہ اس نے کر لیا اور اس کا نقطہ عروج "مغربی تہذیب" ہے اور تاریخ کے سرے پر کھڑا ہوا آخری آدمی اپنے حلیے لباس اور انداز سے صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ "مغربی انسان" ہے۔

یہ ساری باتیں اس تصادم کی راہ ہموار کرنے کے لئے سامنے آ رہی ہیں' جو اب دو چار ہاتھ کے فاصلے پر رہ گیا ہے۔

دراصل سوویت یونین کے ٹوٹنے پر مغرب اور امریکہ کے رویے میں ڈرامائی مگر جارحانہ تبدیلی آئی ہے' اب مغرب اور امریکہ یہ سمجھتا ہے کہ جنگ تو وہ جیت چکا ہے دو چار بچے کھچے مورچے رہ گئے ہیں' جن میں چند جذباتی اور جوشیلے جوان اس کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

اہل مغرب کی طرف سے پیش کیا جانے والا یہ تجزیہ اور منظر چنداں خلاف واقعہ اور غیر حقیقی نہیں' پردے پر جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ یہی ہے لیکن پس پردہ جو کچھ ہے اس سلسلے میں اہل

Marfat.com

مغرب ظریفانہ حد تک خوش فہمی کا شکار ہیں' مغرب کو مسلمانوں کی نفسیات' عادات' کمزوریوں اور کوتاہیوں کا فی الواقع علم ہو چکا ہے' لیکن وہ اسلام کے مزاج' ورثے اور جوہر کا پوری طرح ادراک نہیں کر سکا ہے' اسے خون صد ہزار انجم کا منظر تو دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نور سحر کا اندازہ نہیں ہے' اسے تاتاریوں کا زور دار حملہ تو یاد ہے لیکن اس کا بالآخر پاسبان کعبہ بن جانا یاد نہیں رہتا اہل مغرب کے ذہن میں میر جعفر اور میر صادق تو رہتے ہیں صلاح الدین ایوبی" اور سلطان ٹیپو" محو ہو جاتے ہیں' مغرب اور امریکہ کو صرف "گورباچوف" نظر آتا ہے جو ریت کے ذروں کی طرح بکھر کر رہ گیا لیکن "جوہر داد ایوف" کو بھول جاتا ہے جو صفحۂ ہستی پر امر ہو نا جانتا ہے۔

تاہم اہل اسلام کو پس منظر کی روحانی قوتوں کے ساتھ ساتھ منظر کی سیاسی قباحتوں کو ضرور ذہن میں رکھنا چاہیے' گھر کا دروازہ کھلا نہ رہ جائے' تو کوئی چور اندر جھانکنے کی جرأت نہیں کرتا' اور کوئی جنس منڈی میں نہ آئے تو کوئی مول تول کرنے کی ہمت نہیں کرتا' ہماری سوسائٹی میں کچھ ایسی تبدیلیاں یقیناً واقع ہو گئی ہیں جو مغرب کو امید دلانے اور گھات لگانے کا موقع دے رہی ہیں۔

یوں تو نیو ورلڈ آرڈر کا ایجنڈا خاصا طویل اور بہت سے معاملات کو محیط ہے لیکن عالم اسلام اور پاکستان خاص طور پر اس ایجنڈے کی زد پر ہے' اور پاکستان پر یہ نظر کرم کچھ زیادہ ہی ہے' غالباً امریکہ کو عالم عرب سے چنداں خطرہ نہیں کیوں کہ عرب کی تیل کی دولت نے ان سے "شمشیر و سناں" چھین کر "طاؤس و رباب" کا پوری طرح خوگر بنا دیا ہے' پاکستان ایک ایسا خطہ ہے جہاں کے حکمران تو امریکہ اور مغرب کی آغوش میں کھیلنے اور اچھلنے کو بہت مضطرب ہوتے ہیں' لیکن عام مسلمان کباب میں ہڈی بنا ہوا ہے' اور اپنے بچے کھچے دینی ورثے اور نظریاتی اثاثے کو یوں بر سر عام لٹانے پر آمادہ نہیں' ہر چند کہ ہمارے حکمران فرنگی سیاسی قالب میں پوری طرح ڈھل چکے ہیں' معاشی مستیاں بین الاقوامی مالیاتی اداروں کا بھکاری بنا چکی ہیں' لیکن پاکستان کا معاشرتی ڈھانچہ ابھی کافی حد تک فرنگی دیمک سے بچا ہوا ہے' یہ وہ آخری مورچہ ہے جو اسلامیان پاکستان کے لئے پناہ گاہ اور مغرب کا ہدف نگاہ ہے' مغرب آج کل اس مورچے پر پوری طرح حملہ آور ہے' چنانچہ ہمارا ٹی وی جو کچھ دکھا رہا ہے دراصل اسی ایجنڈے کی تکمیل کی ایک بھونڈی کوشش ہے' اور طبقۂ اشرافیہ (Eliteclass) کے لچھن اس پر مستزاد! امریکہ اور مغرب اس کوشش میں ہیں کہ کسی طرح مسلمانوں کا سماجی تانا بانا (Social Fabric) بکھیر دیا جائے جب سماجی رویے بدل جائیں گے

تو پھر اسلامی اور مشرقی اقدار خود بخود زوال پذیر ہو جائیں گی' امریکہ نے اس معاملے میں اقوام متحدہ کو بھی اس مہم میں پوری طرح شامل کر لیا ہے قاہرہ کانفرنس اور بیجنگ کانفرنس کے انعقاد کا مقصد اس سماجی ڈھانچے کی شکست و ریخت کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اگرچہ نام اس کا "خواتین کی ترقی اور بہبود" رکھا گیا۔

گذشتہ کچھ عرصے سے خاص طور پر سندھ کے علاقوں میں ریسرچ کے نام پر کئی انگریز سکالر دیہاتوں اور گوٹھوں میں یہ معلومات حاصل کر رہے ہیں کہ یہاں صدیوں سے قائم منظم اور مربوط خاندانی نظام کیسے چل رہا ہے؟ پردادا سے لے کر پڑپوتے تک ایک حویلی میں کیسے گزر بسر کر رہے ہیں؟ چھوٹے موٹے اختلافات اور ہلکی پھلکی خاندانی رنجشوں کے باوجود جوائنٹ فیملی سسٹم کیوں کر قائم ہے؟

وہ کیا اسباب اور کیا عوامل ہیں جو خاندانوں کی مضبوطی کے لئے سیمنٹ کا کام دے رہے ہیں' چنانچہ اہل مغرب ان اسباب و عوامل اور بنیادوں پر تیشہ چلانے کی فکر میں ہیں تاکہ پاکستان میں سماجی انارکی پیدا کی جائے' یہ بات ان کے لئے حیرت کا موجب بھی ہے۔ حسرت کا سبب بھی اور اذیت کا باعث بھی!

حیرت اس لئے کہ مغرب میں سکول گوئنگ لڑکے اور لڑکیاں دوبارہ ماں باپ کے گھر کی دہلیز پر آنا گوارا نہیں کرتیں' یہ بات ان کی شخصی آزادی کے منافی ہے' پھر ان کی جوانی کسی کی بانہوں میں جھولتے' غیروں کا دل بہلانے اور غیر مطلوب بچوں کا بوجھ اٹھانے میں گزر جاتی ہے اور بڑھاپا اولڈ ہاؤسز میں!

حسرت یوں کہ کاش خود کو اس اندھے شوق کی نذر نہ ہونے دیتے' آج یورپ میں ہر بچہ ممتا کے پیار کا پیاسا اور ماں باپ لخت جگر کو سینے کی گرمی پہنچانے سے قاصر ہیں' نتیجہ یہ کہ لڑکے اور لڑکیاں نشہ کر کے سکون پانے کے چکر میں ہیں اور ماں باپ اپنے بچوں کی جگہ کتے اور بلیاں پال کر اپنے پیار کا مصرف ڈھونڈھتے ہیں' آخر اس قدر مہذب اور خوشحال ممالک میں ہیروئن اور دوسرے نشے کی اس قدر مانگ کا کوئی سبب تو ہو گا کہ پوری حکومت مشینری ڈرگ کنٹرول میں لگی ہوئی ہے۔

اور مضبوط خاندانی نظام مغرب کے لئے اذیت کا موجب اس لئے ہے کہ

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

پاکستان میں آج کل لو میرج اور سول میرج کی بھرمار اسی سازش کا حصہ ہے آج ہر دوسرے لڑکے اور لڑکی پر عشق کا خمار اور آزادی کا بخار اسی مہم کے غیر محسوس اثرات ہیں' رہا خاندانی نظام تو یورپ کے ہاں خاندان کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ ایک ایسا گھر جس میں ماں باپ' بہن بھائی اور میاں بیوی رہ رہے ہوں بلکہ اس کے ہاں اس کا مفہوم یہ ہے (اور یہ مفہوم ہوائی اور زبانی نہیں باقاعدہ بیجنگ کانفرنس کی دستاویز میں درج ہے) کہ اگر ایک لڑکا اور ایک لڑکی' یا دو لڑکے یا دو لڑکیاں ایک چار دیواری میں مل کر رہ رہے ہیں تو گویا ایک خاندان وجود میں آگیا' ان کے درمیان جنسی تعلقات ان کے بقول ایک خاندان کو جنم دے رہے ہیں۔

انسانی حقوق کے حوالے سے پاکستان میں ان دنوں ایک غلغلہ برپا ہے' ہر دوسری تیسری بات پہ انسانی حقوق اور شخصی آزادی کی دہائی مچ جاتی ہے' کوئی لڑکی بھاگ جائے تو مخالفت پر انسانی حقوق کا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے کوئی لڑکا کسی کو بھگا کر لے جائے تو مزاحمت پر شخصی آزادی کی ڈھنڈیا پٹ جاتی ہے سوال یہ ہے کہ انسانی حقوق کا کوئی اسلامی تصور بھی ہے؟ ماں باپ بھی انسانوں کے دائرے میں داخل ہیں یا نہیں؟ آخر ان کے حقوق کیا ہیں؟ بہن بھائی بھی انسان شمار ہوتے ہیں یا نہیں؟ ان کے حقوق کی وضاحت کیسے ہو؟ محلے دار اور رشتے دار بھی انسانی حقوق میں حصے دار ہیں کہ نہیں؟ یا صرف خود سر لڑکا اور لڑکی ہی "انسانی حقوق" کا لطف لینے کے مجاز ہیں' بیٹی ماں کو رسوا کردے اور بیٹا باپ کو دھکا دے کر گرادے یہ حرکت بنیادی حقوق کے دائرے میں آتی ہے یا نہیں؟

ہمارا معاشرہ جس شوق اور فیشن کی طرف بڑھ نکلا ہے' اور ہمارا معاشرتی قلعہ جس حملے کی زد میں ہے' اربابِ حکومت اور اصحابِ دانش کو ضرور اس پر غور کرنا چاہیے' اور ہمارا الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا ہوس کی اس آگ پر پانی کے چھینٹے ڈالنے کے بجائے تیل چھڑک کر بھڑکانے کی جس کوشش میں ہے اللہ نہ کرے کہ یہ آگ خود آگ لگانے والوں کے دامن تک پہنچ جائے' تازہ ہوا کا شوق بجا اور نئے روزن کھولنے کا لپکا اپنی جگہ لیکن

؎ اتنے نہ در بناؤ کہ دیوار گر پڑے

(12 اکتوبر 1998ء)

Marfat.com

"غلبہ اسلام"

غلبہ اسلام ------ یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس کی پشت پر کروڑوں انسانوں کے جذبات ہیں' یہ ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر صدیوں سے ڈھونڈھی جارہی ہے' یہ ایک ایسا خیال ہے جو ہر دور میں حقیقت بننے کے لئے بے تاب رہا ہے' یہ ایک ایسا تصور ہے جس میں بیسیوں تحریکیں جی رہی ہیں اور یہ ایک ایسی جدوجہد ہے جو ہر خطے میں برپا ہے۔

اسلام کے لغوی اعتبار سے تین مفہوم ہیں۔

۱۔ تسلیم ۲۔ سلامتی ۳۔ تکمیل 'یعنی اطاعت' امن اور کمال

جدید ذہنوں کے لئے ان مفاہیم کی مزید وضاحت کی خاطر انگریزی (Version) بھی پیش کر رہا ہوں' تسلیم کا مطلب ہے (Submission) سلامتی کا مفہوم ہے (Safety) اور تکمیل کا معنی ہے۔(Perfection)

یہ فقط تین ترجمے ہی نہیں بلکہ درجے ہیں' جو اسلام کے پروگرام اور ایجنڈے کو واضح کرتے ہیں' بنی نوع انسان سے اسلام کا محوری اور مرکزی مطالبہ اس اللہ کی اطاعت ہے جو نسل' رنگ' قبیلے' وطن' زبان اور سمت سے پاک اور ماوراء ہے اس کے قانون' اس کی مرضی اور اس کے حکم کے سامنے سرنڈر کرنے اور جھک جانے کا حاصل یہ ہے کہ دنیا ان امتیازات اور تعصبات سے بچ جاتی ہے اور یہ اطاعت امن عالم کے لئے بنیاد فراہم کرتی ہے' اگر کوئی انسانی معاشرہ ان خطوط پر اپنے آپ کو استوار کر لے تو گویا مقصد انسانیت کی تحصیل اور تکمیل ہو جاتی ہے' اور فردوس گم گشتہ کی تلاش کا کام پورا ہو جاتا ہے' اسلام کوئی Dogma نہیں بلکہ ایک Manifesto ہے' نسل آدم کا مقدس اور مشترک منشور' جس کی تکمیل ہر انسان کا انفرادی اور اجتماعی فریضہ ہے۔

غلبہ اسلام کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ ایک خاص نسل یا گروہ کو دنیا پر تسلط اور غلبہ حاصل ہو' نہ ایک خاص علاقائی تہذیب کی برتری' بلکہ اس کا سادہ سا مقصد یہ ہے کہ دنیا کو دنیا کے پیدا اور

اسے اسبابِ پرورش و دانش فراہم کرنے والے رب کی مرضی کے مطابق چلایا جائے' وہ رب جو عربی ہے نہ عجمی' یورپی ہے نہ ایشیائی گورا ہے نہ زرد' قریشی ہے نہ حبشی' غلبۂ اسلام کا مفہوم یہ ہے کہ ہر انسان صرف اللہ کا بندہ ہو اور ایک دوسرے کا بھائی' کوئی کسی کو اپنا غلام سمجھے اور نہ دشمن' نہ کوئی کسی کے رزق کا مالک ہو اور نہ سجدے کا طالب' کوئی کسی کو زندگی اور موت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے' اور نہ ہی عزت و ذلت کے پیمانے وضع کرے' اسلام اس طرح کا ماحول چاہتا ہے کہ شرف انسانی کسی صورت میں مجروح نہ ہو' اس کے مقابلے میں ہر دوسرا انسانی نظام کسی نہ کسی ذہنی تحفظ اور فکری علاقائی تعصب کا آئینہ دار ہوتا ہے' اسلام اس خدا کا دین ہے' جو لم یلد اور ولم یولد ہے' نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور اس کے آباء و اجداد' اس کے احکام میں اولاد کی محبوبیت اور آباء و اجداد کی مرعوبیت کا کوئی دخل نہیں' اس کی کوئی برادری نہیں' اس لئے انسانوں میں برابری اس کے قانون سے ممکن ہے' اللہ تعالیٰ نے شعوب و قبائل محض تشخص کے لئے بنائے تھے انسانی نظام نے انہیں تعصب کا رنگ دے دیا غلبۂ اسلام سے قطعاً یہ مراد نہیں کہ کوئی ایک گروہ یا علاقہ یا خاص نسلی تہذیب غالب آجائے گی بلکہ اس کا واضح مقصد ایسی تہذیب کا غلبہ ہے جو محض الٰہی رنگ رکھتی ہو' اسے سرخی و سیاہی اور زردی و سبزی سے کوئی تعلق نہ ہو' اسے فارس و یمن اور شام و عدن سے کوئی دلچسپی نہ ہو' وہ پورب اور پچھم کی ترجمان نہ ہو' ایسی تہذیب جس کے دامن میں حبشی کا بلالؓ روم کا صہیبؓ فارس کا سلمانؓ' قرن کا اویسؒ. سطام کا بایزیدؒ' بغداد کا جنیدؒ' غزنی کا محمود اور ترکی کا یلدرم جذب ہوتا چلا جائے۔

غلبۂ اسلام کے نتیجے میں کسی نام کا نہیں کام کا غلبہ ہوگا' اور اسی سے کسی کا مقام متعین ہوگا' اسلام ایک ایسی تہذیب کی بناء رکھتا ہے جہاں کپڑے بننے والے "غزالی" کو امام غزالیؒ کے باوقار لقب سے یاد کیا جاتا ہے' چمڑا رنگنے والے "دباغ" کو شیخ عبدالعزیز دباغؒ کا نام ملتا ہے' خیمے بنانے والے "خیام" کو عمر خیامؒ جیسا لازوال نام حاصل ہوتا ہے۔

مٹھائی بنانے والے "حلوائی" کو اس تہذیب میں شمس الائمہ کا مقام نصیب ہوتا ہے۔ جو فقہ کے امام سرخسیؒ کے اساتذہ میں شامل ہیں' کپڑے سینے والے "خیاط" حقیر نہیں علامہ ابو نافع خیاطؒ کے طور پر سامنے آتے ہیں جو حضرت حسن بصریؒ اور حضرت امام مالکؒ کے مقرب شاگرد اور دنیائے حدیث و فقہ میں محترم جانے جاتے ہیں' پنساری یعنی "عطارؒ" کا نام اس سلسلے کا معتبر حوالہ ہے' غلبۂ اسلام کے نتیجے میں چودھریوں' سرداروں' خانوں' پیروں' مفت خوروں' سیٹھوں'

Marfat.com

وڈیروں' مینگلوں' بگٹیوں' مگسیوں' تالپوروں' جتوئیوں' بجرانیوں' دریشکوں' کھوسوں' لغاریوں' اربابوں اور عباسیوں کو احترام حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اسلامی تہذیب کے بڑے لوگوں میں خالا طحان (آٹا پیسنے والے) ابو علی دقاق (نان بیچنے والے) امام ابو القاسم نساج (جولاہا) طلحہ بن عمرو القناد (شکر فروش) اور اسلامی تہذیب کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان کو دیکھا جائے خاندان کو نہیں' کمال دیکھا جائے' زر و مال کو نہیں' علم و فضل دیکھا جائے' رنگ و نسل کو نہیں' عقل دیکھی جائے شکل کو نہیں' فن و ہنر دیکھا جائے' میراث پدر کو نہیں' اخلاق دیکھا جائے' پوشاک کو نہیں' سلیقہ دیکھا جائے' پیشہ کو نہیں اور' کارکردگی دیکھی جاتے' فقط "بزرگی" کو نہیں۔

غلبۂ اسلام کا یہ بھی معنی نہیں کہ کوئی امام' کوئی فقیہ' کوئی صوفی اور کوئی مفتی' لوگوں کو اپنی اطاعت پر مجبور کرے بلکہ یہ سب لوگ خود بھی خدا کی اطاعت کریں اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیں' اسلام کسی کو رہبان' پروہت' پنڈت' مہاتما' اور بھگوان کا درجہ نہیں دیتا بلکہ ہر ایک کو انسان بن کر رہنے کا حکم دیتا اور ڈھنگ سکھاتا ہے' خدا ایک ہے اور باقی سب بندے' اور ہر بندہ اولادِ آدم ہے اور آدم مٹی سے بنائے گئے' اور اس حقیقت کو حضور ﷺ نے غلبۂ اسلام کا نصب العین حاصل کرنے کے بعد مقام عرفات کے کھلے میدان میں مختلف قبیلوں' نسلوں' رنگوں علاقوں' اور درجوں کے لوگوں کے سامنے واضح کیا' گویا خطبۂ حجتہ الوداع میں غلبۂ اسلام کا مفہوم واضح کیا جا رہا تھا۔

(1 اپریل 1999ء)

Marfat.com

"سامری کے گئوسالے"

رفتہ رفتہ یہ منطق اب فروغ پاتی جا رہی اور اس کی جگالی کی جا رہی ہے' کہ بے نظیر بھٹو کے خلاف احتساب کا عمل جانبدارانہ اور غیر منصفانہ ہے' اسے شفاف اور دو طرفہ بنانے کے لئے ضروری ہے کہ میاں نواز شریف اور ان کے رفقاء کے خلاف دائرہ شدہ ریفرنسز زیر غور لائے جائیں' ہائیکورٹ کے احتساب بنچ کے حالیہ فیصلے نے متاثرہ فریق کو تو حواس باختہ کیا ہے اس پر اچھے خاصے دانشور بھی کنفیوزڈ نظر آتے ہیں' حال ہی میں ملک غلام مصطفیٰ کھر کے ایک انٹرویو کی روشنی میں بڑے پائے کے دانشوروں کے اس میں بڑا وزن نظر آنے لگا ہے کہ اگر بے نظیر بھٹو کے خلاف یک طرفہ احتسابی کارروائیاں جاری رہیں تو ملکی سالمیت اور وفاق کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے' اس کی سب سے بڑی دلیل وہ بھٹو صاحب کی پھانسی کو بناتے ہیں' ان کے بقول جس کی سزا آج تک ملک اور وفاق بھگت رہا ہے۔

مجھے چونکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے کسی کی نفرت نے مغلوب اور کسی کی محبت نے مرعوب نہیں رکھا اس لئے میری رائے نہ تو موضوعی اور تجریدی دانشوری کی مظہر ہے اور نہ ہی معروضی اور سیاسی موقف اور مفادات کی ترجمان۔

متذکرہ بالا منطق نہ تو نئی ہے اور نہ بہت جاندار' اصل ممغمہ یہ ہے کہ صدیوں سے ہم نے بعض لوگوں اور بعض خاندانوں کو ہر نوع کی مراعات کا حقدار' ہر قانون سے بالا' ہر دور کے لئے ناگزیر اور ہر احتساب سے بلند تصور ہی نہیں کیا ہوا بلکہ مانا ہوا ہے' چنانچہ خواہی نخواہی جب اس قبیلے کا کوئی فرد کسی مشکل میں پھنستا اور آزمائش میں پڑتا ہے تو ہمیں چاروں طرف سے خدشے اور اندیشے گھیر لیتے ہیں' جب کہ یہ اندیشے ہمیشہ اندیشے ہی رہے ہیں۔

بڑے بڑے قیصر و کسریٰ اس دنیا سے چل دیئے پھر بھی نظام دنیا پوری آب و تاب سے چل رہا ہے' اور بڑے بڑے "قہار و جبار" تاریخ اور وقت کے پاؤں تلے روندے گئے ہیں' رفتارِ زمانہ میں کوئی سستی واقع نہیں ہوئی' میں دال اور لسی کی طرح دانشوری کو بڑھائے اور پھیلائے بغیر

Marfat.com

متعین طور پر چند باتیں اور سوالات پیش کرتا ہوں' جن پر کم از کم مجھے اطمینان ہے اور میری یہ دلی خواہش ہے کہ اب عوام اور اربابِ دانش کے خواص کی بجائے اپنی وکالت کرنی چاہیے۔

پہلی بات یہ ہے کہ احتساب ضرور ہونا چاہیے' غیر جانبدارانہ اور شفاف ہونا چاہیے' مجھے اور کسی کو اس سے کوئی اختلاف نہیں۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ موجودہ حکمرانوں اور ان کے رفقاء کا ضرور احتساب ہونا چاہئے اس میں بھی کوئی دوسری رائے نہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب کہاں سے نکل آیا کہ احتساب تو ہونا چاہیے اور جب ہونے لگے تو پھر کہا جائے کہ یہ غلط ہو رہا ہے' کوئی ایک فرد تو عدالت بن کر نہیں بیٹھا' باقاعدہ بنچ ہے' اور ہائیکورٹ کی سطح کے جج ہیں' اگر یہ نہیں تو پھر کیا طریق کار ہو؟ مثلاً ملزم سے پوچھا جائے کہ عدالت کیسی ہو؟ اور جج کون کون سے ہوں؟ دوسرے یہ کہ حکمرانوں کا اگر احتساب نہیں ہو رہا تو پھر کسی کا بھی احتساب نہیں ہونا چاہیے آخر کیوں؟ آنے والے حکمران موجودہ حکمرانوں کا احتساب کریں ہمیں یا کسی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں' جس طرح آج ایک پارٹی کے حامی اس احتساب پر اعتراض کر رہے ہیں' کل دوسرے کریں گے' کرتے رہیں' یہ ان کے مفادات کا تقاضا ان کی ذہنی غلامی کا نتیجہ اور ان کی سیاسی وابستگی کا شیوہ ہے' اور ہر دور میں رہا ہے' عوام اور اہل دانش کو اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے' اگر اس واویلا کو لائق توجہ اور وزنی سمجھا گیا تو پھر جان لیجئے احتساب کبھی بھی نہیں ہو گا' ہر ڈاکو کے آخر کچھ رشتہ دار اور چند حواری ہوتے ہیں وہ شور نہیں مچائیں گے تو کیا کریں گے؟

کلی اتفاق رائے کا پیمانہ آج تک سامنے نہیں آسکا اور نہ فارمولا وضع ہو سکا ہے' قیام پاکستان کے لوگ حامی بھی تھے اور مخالف بھی' ایوبی مارشل لاء کا خیر مقدم کرنے والے بھی تھے اور چیلنج کرنے والے بھی' ایوب کے خلاف تحریک کے لوگ مؤید بھی تھے اور ناقد بھی' بھٹو صاحب کے فدائی بھی لاکھوں ہیں اور ان کے دشمن بھی لاکھوں' ضیاء الحق کے مارشل لاء کو لوگوں نے خوش آمدید بھی کہا اور لوگوں نے اس کے خلاف احتجاج بھی کیا' کوئی ایک واقعہ یا فیصلہ متعین طور پر بتا دیا جائے جو بالخصوص سیاسی حلقوں میں برابر پذیرائی کا مستحق ٹھہرا ہو' اور اس کی بڑی مثال بھٹو صاحب کی پھانسی ہے' جس نے بقول کھر صاحب اور دانشور حضرات کو ملک اور وفاق کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ پھر میرا متعین سوال ہے کہ کیا نقصان پہنچا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ ملک میں سیاسی پولرائزیشن بڑھ گئی ہے۔ تو میں بلا خوف تردید عرض کروں گا جس قدر آج پولرائزیشن کا شور مچایا جاتا ہے اس

Marfat.com

سے کہیں زیادہ سیاسی تناؤ اور کچھاؤ بلکہ دشمنی کی حد تک کیمپنگ خود بھٹو کے ہوتے ہوئے ۷۰ء سے ۷۷ء تک رہی ہے کوئی ضد کرے تو الگ بات ہے ورنہ واقعہ یہی ہے' یہ بھی کہا جاتا ہے' کہ ایک پارٹی کے خلاف احتساب سے سندھیوں میں نفرت اور احساس محرومی بڑھ جائے گا' ریکارڈ اٹھا کر دیکھ لیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ بھٹو کے ہوتے ہوئے سرحد اور بلوچستان میں آج سے کہیں زیادہ احساس محرومی تھا۔ حکومتیں توڑی گئیں' بلوچستان پر فوج کشی ہوئی لوگ پہاڑوں پر گئے' سیاسی قیادت یا جیل میں تھی یا بیرون ملک بھاگ گئی' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ محرومیاں اور محرومیوں کے نعروں کا فیشن ہر دور میں رہا ہے اور اسے بطور حربہ ہمیشہ استعمال کیا گیا ہے' ہمارے سیاسی مداری جب چاہتے ہیں یہ مرغ بغل سے نکال لیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں اسے بغل میں داب لیتے ہیں' یہ ان "مہوشوں" کو قدرت حاصل ہے رات کو دل نرم کر لیا اور سحر کو آہن بنا لیا' اور دانشور بیچارے لفظوں کے ہار پہناتے اور حرفوں کے موتی لٹاتے رہ جاتے ہیں' بھٹو صاحب کی پھانسی سے نہ کاروبار حکومت رکا ان کے بعد کئی الیکشن ہوئے خود ان کی بیٹی سیاسی عمل کے ذریعے دوبار وزیراعظم بنیں' ایٹمی منصوبہ پوری رفتار سے جاری رہا' نئی سیاسی قیادتیں فروغ پذیر ہوئیں' اور خود کھر صاحب اسمبلی اور حکومت کے مزے لوٹتے رہے' آخر کیا نقصان ہوا ہے؟ حکومتوں کی نااہلی بیرونی سازشیں' مالی کرپشن' اور انتظامی بدعنوانی سے تو یقیناً ملک کو نقصان ہوا ہے لیکن اس کا بھٹو صاحب کی پھانسی سے کیا تعلق؟

مجھے یہ کہنے اور لکھنے میں کوئی عذر نہیں کہ اگلی حکومت موجودہ سیاسی قیادت کا کڑا اور بے رحم احتساب کرے ہمیں کیا تکلیف ہے؟ لیکن اس مطالبے اور خدشے میں رتی بھر وزن نہیں بے نظیر کی نااہلی اور ان کے احتساب سے بڑا نقصان ہو گا کیا کروڑوں ڈالر لوٹنے سے ملک کو کوئی نقصان نہیں ہوا؟ کیا سونے کے بنے ہوئے ان سامری کے گئو سالوں کے وجود اور کرپشن سے ملک کو کوئی نقصان نہیں ہو رہا ہے؟ یہ جو چاہیں کرتے پھریں پھر بھی ان کی پوجا ہو' اور ان کی ذات اور سیاست کے نقصان کو ملک اور وفاق کے نقصان سے نتھی کر دیا جائے اس میں آخر کیا منطق ہے؟ پھر وہ ملک اور وفاق کیا؟ جو بات بات پر ہلتا اور ٹوٹتا رہے کیا تیرہ کروڑ عوام پر تیرہ سو سیاسی بہروپیئے فوقیت رکھتے ہیں؟

(23 اپریل 1999ء)

ذہانت اور دیانت

اگر ہم پاکستان کے "مسائلستان" بن جانے کی ایک جوہری اور بنیادی وجہ تلاش کریں تو میرے نزدیک مرکزی سبب یہ ہے کہ یہاں ذہانت ملک کے کام نہیں آئی اور دیانت سے عوام نے فائدہ نہیں اٹھایا۔

یوں تو ہر شعبۂ زندگی میں ذہانت کو دماغ اور دیانت کو دل کا درجہ حاصل ہے لیکن سیاست میں تو یہ ازبس لازمی ہے' قیادت ذہین نہ ہو تو مسئلہ سمجھ میں نہیں آتا اور اگر امین نہ ہو تو مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

پاکستان میں کسی بھی دور میں نہ ذہانت کا قحط پڑا ہے اور نہ دیانت کا کال رہا ہے' بات صرف یہ ہے کہ ذہانت الٹے رخ چلی اور دیانت کو راستہ نہیں ملا۔

ذہین لوگ اپنی ذات سے اوپر نہ اٹھ سکے اور امین لوگ اسمبلی میں نہ بیٹھ سکے' سیاست میں یہاں ایک سے ایک بڑھ کر جناتی اور کرشماتی ذہانت کا حامل آیا' ملک غلام محمد' ایوب کھوڑو' مشتاق گورمانی' سکندر مرزا' ذوالفقار علی بھٹو' ممتاز دولتانہ' سنا ہے کہ یہ لوگ شہ دماغ تھے۔ لیکن ان کا دماغ ---- عظمت کا سراغ ---- نہ پا سکا یہ گردوپیش سے باہر نہ نکل سکے' طبقاتی منفعت اور مفاداتی سیاست کا خول نہ توڑ سکے۔

ملک صاحب ہمیشہ افسرانہ خوبو میں اور کھوڑو صاحب ہر لحہ کرسی کی آرزو میں رہے' گورمانی مخالف مہروں کو مات دیتے اور مرزا ہر اک کے ساتھ ہاتھ کرتے رہے' بھٹو نمائش کے اور دولتانہ سازش کے آدمی تھے' اگر یہ لوگ ان بیماریوں میں مبتلا نہ ہوتے تو یہ پوجے جانے کے قابل تھے۔

ذہانت دو دھاری تلوار ہے نعمت بھی اور آفت بھی' اپنے لئے بھی اور ملک کے لئے بھی' اگرچہ اکیلا ذہین ہوتا بھی کافی نہیں جب تک کہ انسان امین نہ ہو' اسی طرح تنہا دیانت دار بھی درکار نہیں اگر وہ فکر بیدار نہیں رکھتا؛ لیکن اب تو رہ رہ کے خیال آتا ہے کہ ذہانت نے جو آج تک قیامت ڈھائی ہے بہتر تھا کہ عوام "بیچاری دیانت" ہی بروئے کار لاتے تو ارض وطن پر جنت نہ

Marfat.com

اتر تی تو کم از کم یہ مصیبت بھی نہ برستی جس سے آج ہر ایک دو چار ہے۔

ویسے میں دل کی بات کہوں یہاں ذہانت کا بھی شہرہ بہت ہے ورنہ امر واقعہ یہ نہیں' یہاں جس کے ہاتھ دولت لگی ہے خواہ ورثے میں خواہ ناجائز حربے سے' ذہانت از خود اس کے نام منسوب ہو گئی ہے' صدیوں کا مشاہدہ اور تجربوں کا خلاصہ اس ضرب المثل میں آگیا ہے۔

جنھاں دے گھر دانے انھاں دے کملے وی سیانے

یہاں غریب کی ذہانت کا وہی حال ہوتا ہے جو جنگل میں مور کے ناچنے اور صحرا میں پھول کے کھلنے کا نہ کوئی داد دینے والا اور نہ کوئی دیکھنے والا۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا' ہمارے اہل سیاست کی جملہ ذہانت ان کے اپنے کام آئی ہے یا غلط جگہ صرف ہوئی ہے ورنہ وہ چاہتے ہیں تو اپنی ذہانت کے بل بوتے پر ملک پر کسے ہوئے سیاسی دباؤ اور معاشی گھیراؤ کے کالبوت کو اتار اور توڑ سکتے تھے' عالمی برادری سے کٹتے بھی نہ اور دبتے بھی نہ' وہ چاہتے تو ملک کے اندر سیاسی و انتظامی اداروں کو تشکیل دے سکتے تھے تاکہ ہر چوتھے دن ملک سیاسی و انتظامی بحران کا سامنا نہ کرتا' اور وہ چاہتے تو کھلے پن اور برداشت کا کلچر متعارف کراتے تاکہ ایک طرف رائے کے اظہار میں کوئی دقت پیش نہ آتی اور دوسرے قومی و ملکی مفاد میں مشترکہ فیصلوں اور اقدامات کا رواج پڑتا' آج پچاس سال بعد ہاتھوں کے بوئے ہوئے کانٹے پلکوں سے چننے پڑ رہے ہیں' جو کنواں دوسروں کے لئے کھودنے کی کوشش کی گئی تھی آج اس میں ہر سیاستدان خود ڈبکیاں لے رہا ہے' اور ہر ایک کی آنکھ اور کان سے پانی بہہ رہا ہے' جن کے ہاتھ میں زمام کار رہی چونکہ ان کی ذہانت ملک کے کام نہ آسکی اس لئے عوام میں سے بھی ذہین لوگ اپنی ذہانت ملک پر خرچ کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے انہوں نے دیکھا کہ یہاں کے اربابِ بست و کشاد نے اپنی ذہانت یا تو بیرونی آقاؤں کا ایجنڈا آگے بڑھانے کے لئے استعمال کی یا پھر اپنی ذات کا فائدہ سوچنے کے لئے' کیوں نہ ہم بھی ایسا ہی کریں' نتیجہ یہ نکلا جو باہر گیا وہ وہیں کا ہو گیا' (Brain Drain) بھی اس ملک کا بہت بڑا مسئلہ بن گیا' اربابِ شعور اسی سے اندازہ کر لیں کہ اب تک جو سائنسی فنی اور مشینی (Achievements) ہوئی ہیں یہ تو ہماری اجتماعی ذہانت کی تلچھٹ کا حاصل ہیں اگر سارے دماغ یہاں ہوتے اور سارا دماغ خرچ ہوتا تو ہم کسی سے کیسے پیچھے رہ سکتے تھے؟

رہ گئی دیانت' یہ بدقسمتی سے نہ اوپر والوں کو قبول ہے اور نہ نیچے والوں یعنی عوام کو' کئی دیانتدار لوگ ہیں جو میدان سیاست میں رہے مگر جیسے پاک صاف اس میدان میں اترے تھے ویسے

Marfat.com

ہی خالی ہاتھ اس سے نکل گئے' اس لئے کہ ان کے پاس الہ دین کا چراغ نہیں تھا۔ جو چشم زدن میں " گکھ کو لکھ " بنا دیتا' ان کی نظر حریص نہیں تھی' ان کا ہاضمہ تیز نہیں تھا' ان کا احساس مردہ نہیں تھا' اور ان کا شعار دھوکہ نہیں تھا' عوام نے ان لوگوں کو سر چڑھایا جو سولی چڑھنے کے لائق تھے' عوام نے انہیں لیڈر بنایا جو نمونۂ عبرت بننے کے قابل تھے' عوام نے انہیں دل میں بسایا جو دیس نکالی کے مستحق تھے' اور عوام نے انہیں ایوان حکومت میں پہنچایا جو جیل کی کال کوٹھڑی کے اہل تھے۔

اب تو نوبت یہاں آ پہنچی ہے کہ دیانت کے ساتھ ذہانت کی پونجی بھی کم ہو رہی ہے۔ پہلے کم از کم سیاست میں امین نہیں تو ذہین لوگ ہوتے تھے اب ذہین بھی اس کوچے کا رخ نہیں کر رہے کہ ذہانت کی بہرحال ایک انا ہوتی ہے اور اس آبگینے کو اس بزم میں قدم قدم پر ٹھیس لگتی ہے' اب زیادہ تر یہ مشغلہ ان کا رہ گیا ہے جن کے سر میں کچھ ہو نہ ہو گھر میں مال و زر کا ڈھیر ہو' اور سوچ خواہ پست ہو اپروچ زبردست ہونی چاہیے' یہ صورتحال اس وقت تک رہے گی جب تک عوام دولت کے بھکاری اور طاقت کے پجاری بنے رہیں گے' جس دن دولت کی جگہ ذہانت اور طاقت کی مسند دیانت سنبھال لے گی' اس دن کی صبح سونے کی اور شام چاندی کی ہو گی۔

(22 مارچ 1999ء)

Marfat.com

"خوف و حزن"

میرے خیال میں قارئین میرے اس احساس کے ہمنوا ہوں گے اگر میں یہ کہوں کہ خوش وہ شخص نہیں جو خوش حال' خوش لباس اور خوش خوراک ہو بلکہ حقیقی معنوں میں خوش وہ ہے جو خوش رہے' اسی لئے اہل دل نے یہ آرزو کی ہے۔

ے
دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

اسی طرح کامیاب وہ شخص نہیں جس کا ہر کام ہو رہا ہے بلکہ کامیاب وہ ہے جس کا کسی سے کام ہی نہ پڑے' کلی کا چٹکنا اور بچے کا چہکنا دونوں کی فطرت ہے اسی لئے یہ دونوں کیفیتیں جاذبیت اور معصومیت سے معمور اور لبریز ہوتی ہیں' کلی کی چٹک میں تصنع کیسا اور بچے کی چہک میں تکلف کیسا؟ زندگی بھی وہی خوبصورت ہے جس میں خوشی ڈھونڈ ہی نہ جائے خود پھوٹ پڑے اور کام نکلوایا نہ جائے بلکہ کام پڑنے کی نوبت نہ آئے' اس بھری دنیا میں ایسی خوشی اور کامیابی کا کون طالب نہیں ہو گا؟ ساری تگ و تاز حیات اسی لئے ہے کہ بندہ خوش رہے اور کامیاب رہے حالانکہ یہ الگ بات ہے کہ دنیا نے خوشی کے مراحل اور کامیابی کے مدارج اپنے طور پر وضع کر لئے ہیں' خوشی کی اس قدر بے محابا آواز اور کامیابی کی بے تحاشا جستجو کے باوجود حقیقی مسرت ہنوز خواب اور کامرانی نایاب ہے۔

ناخوشی اور ناکامی کا اصل سبب--- اندیشہ --- ہے جسے انگریزی میں Fear کہتے ہیں۔ اور قرآن مجید اسے ---- خوف و حزن--- کا عنوان دیتا ہے۔

اس دنیا میں پائیدار خوشی اور دائمی کامیابی کا تصور تو کیا جا سکتا ہے حصول اور وجود تقریباً ناممکن ہے' اندیشہ کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا' کوئی سیری ایسی نہیں جس کے بعد بھوک نہ ہو' کوئی سیرابی ایسی نہیں جس کے بعد پیاس نہ ہو' کوئی صحت ایسی نہیں جو بیماری سے کلیتہً پاک ہو' کوئی جوانی ایسی نہیں جسے بڑھاپا نہ آئے' کوئی قہقہہ ایسا نہیں جو آنسو سے بالکل ناآشنا ہو' کوئی عروج ایسا نہیں جسے

Marfat.com

زوال نہ ہو' اور کوئی زندگی ایسی نہیں جس کا خاتمہ موت پر نہ ہو' ہر چیز کے ساتھ ایک اندیشہ لاحق ہے۔

اس مسلسل تجربے اور بدیہی حقیقت کے باوجود لوگوں نے حصول مسرت کے لئے اقتدار کی پناہ لی' دولت سے ہم آغوش ہوئے' اور شہرت کی طلب کی' مگر اس اندیشے سے نجات نہ پاسکے کہ کہیں اقتدار چھن نہ جائے' دولت دغا نہ دے جائے اور شہرت روٹھ نہ جائے' چنانچہ اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے سازش کی گئی' جبر کے حربے آزمائے گئے' خونی رشتے پامال کئے گئے اور عوام کو مسلسل عذاب میں ڈالا گیا' دولت کے حصول کے لئے جائز و ناجائز کا فرق مٹایا گیا' اور ضمیر بیچ کر امیر بننے اور رہنے کے جتن کئے گئے' اسی طرح شہرت کے لپکے نے انسان کو ایسا ڈھنگ اپنانے اور کرتب دکھانے پر آمادہ کیا کہ انسان اور بندر کے درمیان تمیز اٹھ گئی' اللہ کی الہامی کتاب--- قرآن مجید------ نے حقیقی مسرت اور لازوال کامیابی کا گر یہ بتایا کہ انسان---- خوف اور حزن ----- سے پاک ہو جائے' تو وہ اللہ کا دوست یعنی-------- ولی اللہ -------- بن جاتا ہے۔

"آگاہ رہو اللہ کے دوست نہ خوف میں مبتلا ہوتے اور نہ حزن کا شکار ہوتے ہیں۔" (یونس: ٦٢)

خوف اور حزن دو کیفیات ہیں' جن کا تعلق انسان کے باطن' سوچ' فکر اور دل سے ہوتا ہے' انگریزی کا لفظ Anxiety ٹھیک وہی معنے دیتا ہے جو عربی میں خوف کے ہیں جس کا مفہوم ہے۔ بے چینی' بے تابی اور اضطراب' اسی طرح Depression کا وہی مطلب ہے جو قرآن مجید میں---- حزن---- کا ہے' یعنی مایوسی' پژمردگی' اداسی اور آزردگی۔

ان دونوں کیفیات اور اصطلاحات کو اگر کھول کر بیان کیا جائے تو مدعا یہ سامنے آئے گا کہ کس چیز کے پانے' اپنانے' اور حاصل کرنے کی تڑپ خوف کے زمرے میں آتی ہے' آدمی کے حصول مدعا کے لئے بے چین ہو جاتا ہے کہ یہ نعمت کھو نہ جائے' چھن نہ جائے اور سلب نہ ہو جائے' اس فکر میں وہ اداس اور آزردہ رہنے لگتا ہے' اور اگر وہ واقعی چلی جائے تو پھر انسان اداس اور مایوس ہو جاتا ہے' جب کہ اللہ کے دوست نہ کسی غیر ضروری چیز کے طالب ہوتے ہیں اور نہ خوف ان پر غالب آتا ہے۔ اور جو چیز حاصل نہ ہو اس کے چلے جانے کا حزن لاحق نہیں ہوتا۔

یہ ہے رازِ مسرت اور کلید کامرانی

یہاں بات یہ نہیں ہو رہی کہ امیر عشق کرتے رہیں اور غریب قناعت' بلکہ اس کا لب لباب یہ ہے کہ چند انسانوں نے جو حصول لذت و مسرت کے لئے پوری دنیا میں اندھیر مچا رکھا ہے۔ انہیں

آئینہ دکھایا جائے کہ وہ سب کچھ پا کر بھی اگر خوف و حزن کے حصار میں رہتے ہیں تو کیا بہتر نہیں کہ وہ پانے کے لپکے سے آزاد ہو کر خود بھی بے خوف ہو جائیں اور مخلوق خدا کو بھی غمگین نہ ہونے دیں' مسرت کے حصول کا یہ طریقہ نہیں کہ کسی مجبور کو آنسو بہانے پر مجبور کیا جائے بلکہ مظلوم کے آنسو پونچھ کر لطف سمیٹا جائے' بیوہ کے سر سے دوپٹہ اتار کر مسرت نہیں ملتی' اسے پناہ دے کر راحت نصیب ہونی چاہیے' کسی یتیم کو جھڑک کر دور ہٹانے سے آدمی خوش نہ ہو بلکہ اسے لپک کر سینے سے چمٹانے سے شاد ہو۔

جنہیں ہر لحظہ پانے کا جنون ہوتا ہے پھر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی قیمت کیا دی جا رہی ہے' خوشامد' تملق' چاپلوسی' بے غیرتی' چمچہ گیری' مدح سرائی' قصیدہ خوانی' بے توقیری یہ سبھی کچھ کرنا پڑتا ہے خدا معلوم یہ سب کچھ کرنے اور غیرت' حمیت' انانیت عزت نفس گنوا دینے کے بعد کچھ مل بھی جائے تو کیا راحت حاصل ہوتی ہو گی؟ راحت و مسرت کوئی دال سبزی نہیں جو دکان سے مل جائے سراسر ایک کیفیت ہے مگر جو شخص ان تمام لطیف کیفیات کو حصول مطلب کے لئے خود ہی پامال کر ڈالے وہ سکون میں کیسے رہتا ہو گا؟ رہ گئی وہ چیز جس کا بندہ مستحق ہے تو وہ گھر بیٹھے مل جاتی ہے کیا سقراط نے دانش اپنی عزت نفس بیچ کر لی تھی؟ کیا افلاطون کو دماغ اپنی غیرت تج کر ملا تھا؟ کیا دیو جانس کلبی کو فقر اور بے نیازی بھاگ دوڑ کے نتیجے میں ملی تھی؟ کیا جنیدؒ و بایزیدؒ کو ولایت کسی بادشاہ کی خوشامد کے عوض نصیب ہوئی تھی؟ کیا مولانا رومؒ اور سعدی شیرازیؒ کو یہ شہرت دوام کسی ہوس میں مبتلا ہو کر ارزاں ہوئی؟ کیا غزالیؒ و رازیؒ کو یہ مقام دولت کے بل بوتے پر حاصل ہوا ہے؟ کیا اقبالؒ کی قلندری کے پیچھے کوئی تونگری کار فرما ہے؟ ہرگز نہیں بات وہی ہے جو پہلے ہو چکی ہے۔ کہ

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق

آدمی اگر پانے کے خمار اور کھو جانے کے آزار سے پاک ہو جائے تو وہ مٹی کے ڈھیلے سے سونے کے ڈلے جیسا حسن پاتا ہے' اور اسے کچے چھپر میں قصر مرمر جیسا سکون ملتا ہے' حبیب جالب کے ایک جملے نے مجھے پہروں تڑپا کر رکھ دیا تھا کہ "لوگوں نے اتنا پایا نہیں جتنا میں نے ٹھکرایا ہے۔" اہل دنیا پانے کے فن سے تو آگاہ ہیں کبھی ٹھکرانے کا ہنر بھی آزمالیں' شائد فردوس گم گشتہ اسی خطۂ ارضی پر مل جائے۔

(3 اکتوبر 1998ء)

Marfat.com

یوں ہوتا تو کیا ہوتا

مولانا چراغ حسن حسرت نے کہا تھا۔

ناکام تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے
یوں ہوتا تو کیا ہوتا یوں ہوتا تو کیا ہوتا

میں بھی اکثر اس سوچ میں رہتا ہوں کہ دنیا والوں کا کیا بگڑتا اگر وہ دنیا کو ---- خطۂ امن ---- رہنے دیتے' اس وقت روئے زمین پر پانچ ارب چوراسی کروڑ انسان چل پھر رہے ہیں اور انسانوں کے برابر مسائل کی تعداد ہے بلکہ کچھ زیادہ! ہر انسان کو ایک نہیں کئی مسائل اور مشکلات درپیش ہیں' اور خود ان کی اپنی پیدا کردہ' ورنہ قدرت نے تو فطری نظام بڑا منضبط اور متوازی رکھا ہوا ہے' سمندروں کے پانی اچھل اچھل کر انسانی بستیاں نہیں نگل رہے بلکہ اپنے رخ پر بہہ رہے ہیں' سورج کی تمازت کی ایک حد ہے کوئی شخص سورج کی تپش سے جل کر نہیں مرا' صحرا میں بگولے اٹھتے ہیں لیکن جلد ہی بیٹھ جاتے ہیں' کوئی آبادی اپنی لپیٹ میں لے کر کہیں بھاگ نہیں جاتے' پہاڑ اپنی جگہ پر سینکڑوں ہزاروں سال سے کھڑے ہیں' کبھی جوش میں آکر ایک آدھ جھرجھری لے لیتے ہیں اور آفت کا سامان کرتے ہیں اور یہ عمل کہیں سالوں میں ہوتا ہے مگر انسان تو بلاناغہ کہیں نہ کہیں تاخت و تاراج کی کیفیت پیدا کئے رکھتے ہیں' زلزلوں کے کئی سالوں پر انسانوں کا ایک دن بھاری ثابت ہوتا ہے' ستارے ٹکراتے ہوں گے مگر برسوں بعد انسانوں کا ٹکراؤ تو ہر پل جاری ہے' شہاب ثاقب سنا ہے گرتے رہتے ہیں مگر اپنی ہی راکھ میں دب جاتے ہیں' مگر انسان جب بھی گرتا ہے بیسیوں کو گرا کر دم لیتا ہے۔

دنیا کتنی خوبصورت ہے' جھومتے ہوئے باغ' لہلہاتے ہوئے کھیت' چھٹکی ہوئی چاندنی' پھیلی ہوئی روشنی' سانولی شام' حسین رات' رخشندہ سحر' سریلے جھرنے' رقص کرتی موجیں' روپہلی کرنیں' رشک گلاب چہرے' کجرالی آنکھیں' مشکیں زلفیں' رعنا قامتیں' نیم خوابیدہ کلیاں' نازک پھول' رنگ برنگ تتلیاں' من بھاتے سبزہ زار' چہچہاتے مرغزار' ہنگام طلوع پہلی کرن اور ڈوبتے

Marfat.com

سورج کی تھکن کا منظر کس قدر دلفریب اور سحر انگیز ہے' ایک پوری عمر حسن کائنات کو پانے اندر جذب کرنے کو ناکافی ہے' کجا کہ سارا زور حسن کائنات کو برباد کرنے پر صرف کر دیا جائے۔

آج دنیا والے اپنی دنیا کے ساتھ یہی سلوک کر رہے ہیں' ورنہ کس چیز کی کمی ہے؟ انسانوں' چرندوں' درندوں' اور پرندوں حتیٰ کہ بنجر زمین کی پیاس بجھانے کو ایک نہیں سات سمندر موجود ہیں لیکن انسان ایک دوسرے کے خون سے پیاس بجھانے پر تلا ہوا ہے' یہ دھرتی اتنا رزق اگاتی ہے کہ نسل انسانی کی سات پشتوں کے لئے کافی ہے' لوگ کھاتے نہ تھکیں اور زمین اگاتے نہ تھکے لیکن آدمی ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کی فکر میں ہے' اس پیاس اور بھوک کا کیا علاج ہے؟

حالانکہ انجام سب کو معلوم ہے کہ مٹی کی پیداوار انسان کو بالآخر مٹی میں جا کر ملنا اور خاک ہونا ہے' رستم و اسفندیار نہیں رہے تو اور کون رہے گا؟ قیصر و کسریٰ لد گئے تو اور کون ٹھکانہ کرے گا؟ دارا و سکندر کوچ کر گئے تو اور کون قیام کرے گا؟

آفتاب صورتیں اور ماہتاب مورتیں رزق خاک ہو گئیں' گلگوں چہرے مرجھا گئے اور غزالی آنکھیں پتھرا گئیں' یاقوتی ہونٹ خشک ہو گئے اور جادو نگار زبانیں گنگ ہو گئیں'

وہ بندے مٹ گئے نازک بہت اندام تھے جن کے
گلاب و مشک میں گوندھے ہوئے اجسام تھے جن کے
بہت بے آبرو ہو کر اٹھے دنیا کی محفل سے
زمانے میں بہت اعزاز اور اکرام تھے جن کے
کہیں بھولے سے کوئی نام اب لیتا نہیں ان کا
زبان خلق پر اذکار صبح و شام تھے جن کے

سارے براعظم گھوم جایئے ہر جگہ انسان دست و گریبان ہے' کوئی خود کو دنیا کا چوکیدار سمجھے بیٹھا ہے تو کوئی خدائی فوجدار بنا پھرتا ہے' کہیں حق طلبی کے عنوان سے کشمکش ہے تو کہیں ادائیگی فرض کے پردے میں کشاکش ہے' سیاست اگر میدان جنگ ہے تو بھی عنوان جنگ! لگتا ہے انسان حسن فطرت کو دیکھ نہیں سکا یا اس کا لطف نہیں لے سکا' انسان جو لاؤ لشکر سمیت دوسروں پر چڑھائی کر کے خوش ہوتا ہے کبھی اپنے سینے پر معصوم بیٹے اور بیٹی کو چڑھ کر کھیلنے دے ایک بار ایسا کر کے دیکھ لے دنیا کی ساری خوشیاں قربان کر ڈالے گا' آج جو انسان غم اور غصے سے ہر ایک کے لئے ہونٹ بھینچے اور ابرو سکیڑے ہوئے ہے کبھی معصوم بچے کے ہونٹوں پر تیرتی مسکراہٹ اور آنکھوں

Marfat.com

میں مچلتی شرارت کا نظارہ کرلے اس کا سارا غصہ کافور ہو جائے گا۔

آج جو انسان دنیا بھر کو اپنے وعظ' بھاشن اور فلسفے کی زد پر رکھے ہوئے ہے کبھی معصوم بچے کی توتلی باتیں جی لگا کر سن لے ساری تلقین غزالی اور فلسفۂ رازی بھول جائے' آج جو انسان ہر ایک کا سینہ چیرنے اور چھلنی کرنے پر تلا ہوا ہے کبھی صبح دم کلی کے چٹک کر پھول بننے کا عمل دیکھ لے' تو ساری تلواریں اور برچھیاں کند ہو جائیں گی' آج جو انسان ہر ایک کے لئے فولاد بن کر اٹھلاتا ہے ذرا پھول کی پتیوں کی نزاکت اور نرمی کا جائزہ لے لے' یا اس کا نظاروں سے دل بھر گیا اور جی اکتا گیا ہے کہ ہر انسان دوسرے سے اکتایا ہوا پھر رہا ہے؟ تو اس کا فولادی جثہ اس طرح گھل جائے گا جیسے بتاشہ پانی میں! کیا حسن فطرت ختم ہو گیا ہے۔

کیا فرق واقعہ ہو جاتا اگر انسان نت نئے مہلک ہتھیار ڈھالنے کے بجائے دل کے آنگن میں پھول اگانے کا اہتمام کرتا' اور کیا کمی ہوتی اگر انسان قینچی کی طرح کاٹنے کے بجائے سوئی کی مانند پرونے کا کام کرتا؟

سکندر جب دنیا کا ایک حصہ فتح کر کے واپس یونان پلٹتا تھا تو مجذوب فلسفی اور صوفی دیو جانس کلبی کے پاس ضرور حاضر ہوتا ایک بار اس مجذوب نے سکندر کو کھانے کے لئے تھال میں ہیرے اور جواہر سجا کر پیش کئے سکندر نے کہا یہ میں کیسے کھاؤں گا؟ کلبی نے کہا میں سمجھا تھا کہ دنیا کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد تم ہیرے' جواہر اور سونا چاندی کھاتے ہوگے' اگر عام انسانوں کی طرح گندم کی روٹی ہی کھانی ہے یہ چیز تو گھر بیٹھے بھی مل سکتی ہے مخلوق خدا کو آزار پہنچانے سے کیا حاصل؟

یہی حال آج کی دنیا کا ہے دنیا کو تباہ کرنے پر تو بہت خرچ اٹھتا ہے انسانوں سے نباہ کرنے پر کتنے ٹکے لگتے ہیں؟ صرف دل کی فراخی درکار ہے' حریفانہ کشمکش برقرار رکھنے کے لئے تو بڑا بجٹ چاہیے امن و محبت کے ساتھ اپنے پر کتنا صرفہ ہوتا ہے؟ صرف اندازِ حیات بدلنا پڑتا ہے اگر لوگ ایسے رہ لیتے تو' کسی کا کیا بگڑتا؟ اور کسی کا کیا جاتا؟ البتہ یہ دنیا ایک چمن ہوتی اور صبح و شام باد بہار کے ہلکورے ہوتے۔

(26 اکتوبر 1998ء)

Marfat.com

اللہ بے نیاز ہی نہیں بہت بندہ نواز بھی ہے

دو روز قبل ایک دوست کی شادی کی تقریب میں مجھ سے بہت محبت کرنے والے پیارے دوست شعیب بن عزیز ڈائریکٹر جنرل پبلک ریلیشنز پنجاب ملے' شعیب صاحب بہت باغ و بہار' دل زندہ دار' اور شگفتہ نگار شخص ہیں' صرف افسر ہی نہیں خوبصورت شاعر بھی ہیں' ان کا یہ شعر خود انہی کے حسب حال ہے۔

ڈوبتی شام کا پھٹکار پڑے مجھ پر میں اگر
چڑھتے سورج سے کبھی ہاتھ ملانا چاہوں

تقریب میں انہوں نے مجھ سے معانقہ کرتے ہوئے بے ساختہ کہا۔ "اللہ تعالیٰ بڑا بے نیاز ہے۔" اور میرے منہ سے برجستہ نکلا' "وہ بہت بندہ نواز بھی ہے۔" یہ دونوں جملوں میری گذشتہ طویل اور حوصلہ توڑ دینے والی بیماری کے پس منظر میں لبوں پر آئے' وہ جب میری عیادت کو آئے تھے تو مجھے ہڈیوں کا جال اور نڈھال دیکھا تھا اور آج وہ میرا رنگ لال اور قدرے مجھے نہال دیکھ رہے تھے' وہ اللہ کی بے نیازی کا ذکر زبان پر اس لئے لائے تھے کہ وہ صرف خدا ہی ہے جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے اور اس کی ذات و صفات کے متعلق یقین رکھا جاسکتا ہے۔ کہ

کیا شان تیرے جمال میں ہے
ہر وقت زمانہ حال میں ہے

ورنہ انسان خواہ فولاد کی فصیلوں میں رہتا ہو' یا خوشیوں کے پنگھوڑوں میں جھولتا ہو' یوسف کنعانی ہو یا رستم و سہراب ایرانی ہو' کمال و زوال کے تنے ہوئے رسے پر رہتا ہے نجانے کب پاؤں پھسلے اور وہ نیچے آرہے' دوران علالت جنہوں نے مجھے دیکھا انہوں نے خدا کی بے نیازی مشاہدہ کی اور اب نظر پڑتی ہے تو اس کی بندہ نوازی کا خیال آتا ہے' ان کے اور میرے منہ سے نکلے ہوئے ان دو جملوں نے مجھے رات بھر اپنے حصار میں جکڑے رکھا اور ایک کیفیت دل نواز مجھ پر طاری رہی' وہ بے نیاز اس لئے ہے تاکہ بندے اپنی اوقات میں رہیں اور بندہ نواز اس لئے ہے تاکہ لوگوں کی توجہ اور نگاہ ہمہ وقت اس کی عنایات پر رہے' اس کی بے نیازی کے مظاہرے تو خال

Marfat.com

خال دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن اس کی بندہ نوازی کے مناظر تو ہر پل ہر آن آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں' وہ دنیا بنا کر الگ نہیں ہو گیا اس کی حفاظت اور رکھوالی اپنے ذمے لی ہے' وہ حیی و قیوم ہے زندہ و بیدار' دنیا اونگھتی اور سوتی ہے وہ ہمہ وقت جاگتا ہے' تاکہ نظام کائنات میں خلل نہ آنے پائے' بندے خواہ لاکھ غافل ہو جائیں وہ کبھی غافل نہیں ہوتا' بندے چاہے خود فراموش اور خدا فراموش ہو جائیں مگر وہ اپنی رحمت کی آغوش ہمیشہ کھلی رکھتا ہے' نجانے کب کوئی پناہ کی تلاش میں آنکلے' بندے اپنے گھروں کے کواڑ بند کر کے رکھتے ہیں لیکن وہ دروازہ رحمت سدا وا رکھتا ہے' نجانے کس وقت کون دستک دینے آجائے' بندے گہری نیند سو جاتے ہیں مگر وہ اونگھتا بھی نہیں کیا خبر کوئی رات کے پچھلے پہر مناجات کے لئے حاضر ہو جائے' بندے بسا اوقات قرینۂ دعا بھول جاتے ہیں مگر وہ شیوۂ عطا کبھی نہیں بھولتا' بندے کبھی حجت طرازی پر اتر آتے ہیں مگر وہ اپنی شان بندہ نوازی قائم رکھتا ہے' شیخ صفوریؒ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک بت پرست کو حاجت آپڑی اور وہ اپنے بت کے سامنے ہاتھ باندھ کر بیٹھ گیا' اور "یا صنم یا صنم" کا ورد الاپنے لگا' مگر مٹی کے مادھو نے کیا جواب دینا تھا' رواروی میں اس بت پرست کے منہ سے "یا صنم یا صنم" کے بجائے دو چار مرتبہ "یا صمد یا صمد" کا جملہ وارد ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فوراً جواب عطا فرمایا "جی میرے بندے! کیا کہنا ہے میں حاضر ہوں۔" فرشتوں نے عرض کیا۔ مولا! وہ تجھے نہیں اپنے بت کو پکار رہا تھا۔ یہ تو بے خیالی میں تیرا نام اس کی زبان پر آگیا تھا' اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وہ ایک مدت بت کو پکارتا رہا مگر اس کو جواب نہ ملا' اب اس نے بے دھیانی میں سہی مجھے بلایا ہے اگر میں بھی جواب نہ دوں تو پھر صنم اور صمد میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟"

سورۂ اخلاص میں اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام "الصمد" ہے جس کا ایک معنیٰ "بے نیاز" ہے مگر بے نیاز کا مفہوم یہ نہیں کہ بندوں کی حالت نزار پر ترس نہیں کھاتا' یا اسے بندوں کا پکار پر رحم نہیں آتا بلکہ یہ صفاتی نام لانے کا مقصد دراصل عقیدے کی اصلاح ہے کہ "الصمد" وہ ذاتِ بے نیاز ہے جو دنیا کے بغیر رہ سکتی ہے مگر دنیا اس کے بغیر نہیں رہ سکتی' شیخ فضیل بن عیاضؒ نے ایک آیت سے بڑا نفیس نکتہ نکالا ہے' اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پوچھتا ہے یَآاَیُّھَا الانسان مَاغَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيم ○ "اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے رب کریم سے غرہ کیا؟" شیخ کہتے ہیں "بندہ عرض کرے گا الٰہی تیرے یہ رب اور کریم کہنے کی بدولت ہم سے غفلت ہوئی۔" ہم کچھ بھی کر گزرتے تیری شان ربوبیت پھر بھی برقرار رہتی' ہم سے کچھ سرزد ہوتا تیرا اندازِ کریمی تب بھی

Marfat.com

جوبن پر رہتا، ہم غرہ نہ ہوتے تو کیا کرتے؟ واقعہ بھی یہی ہے کہ ایک سیاہ کار کی پیشانی پر ابھرنے والے ندامت کے قطرے اس کی شان کریمی موتی سمجھ کر چن لیتی ہے، یہ بندہ نوازی کی حد نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کا اندازِ بے نیازی اگر کبھی سامنے آیا بھی ہے تو صرف سرکشوں اور باغیوں کے لئے ورنہ تو اس نے اپنی رحمت و شفقت کو ہر چیز سے وسیع اور ہر چیز پر محیط رکھا ہے، کوئی مجھ سا خطاکار آخر کتنی خطائیں کرے گا، سمندر کے قطروں جتنی، صحرا کے ذروں جتنی، درختوں کے پتوں جتنی سر اور جسم کے بالوں جتنی، وہ پھر بھی کہتا ہے۔ **لا تقنطوا من رحمت اللّٰہ ورحمتی وسع کل شیئ** "اللہ کے رحمت سے مایوس نہ ہونے پاؤ۔ میری رحمت ہر شئے سے زیادہ ہے۔"

ماں باپ کی محبت و شفقت کے اولاد کے لئے ہزار روپ ہیں اس کا ہر پہلو بے کنار، اور ہر گوشہ بے لوث ہے مگر یہ سب کچھ اللہ کی ربوبیت اور رحمت کا ہلکا سا عکس اور کرشمہ ہے جو ماں باپ کی صورت میں جھلکتا ہے وہ چاہتا ہے تبھی تو ماں کا دل اولاد کے لئے دھڑکتا اور باپ کا خون جوش مارتا ہے، ورنہ دل کو پارہ سنگ بننے اور خون کو سفید رنگ ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے؟

خدا گواہ ہے میرا مقصود مرض کا ذکر نہیں اب اس قرض کی فکر ہے جسے مجھے اتارنا ہے، یہ قرض زر و مال کا نہیں اللہ کی محبت کا قرض ہے اس کی شفقت کا قرض ہے، اس کی عنایت کا قرض ہے، اس کی عنایت کا قرض ہے اور اس کی رحمت کا قرض ہے، میں اگر دوبارہ جنم لوں اور ہزار برس کی عمر پاؤں قرض تو پھر بھی ادا نہیں کر سکوں گا، البتہ اب فکر لاحق رہتی ہے، خداوند تو نے مجھ پر کمال رحم کیا، اب اِتمام کرم کر، کہ میرے دل کو خیال غیر سے پاک فرما دے، میری فکر کو پاکیزگی دے دے، میری زبان کو محبت کا ترجمان بنا دے اور میرے قلم کو ڈرپوک نہیں دو ٹوک کر دے، (آمین)

اگر میری یہ چند سطریں کسی کا دھیان خدا کی طرف کر دیں، اور کسی کو رجوع الی اللہ کا موقع فراہم کر دیں، تو میرا یہ کالم میرے کالے کرتوتوں کا کفارہ بن جائے گا۔

داغ کو کون دینے والا تھا
اے خدا، جو دیا، دیا تو نے

(19 نومبر 1998ء)

"مطالعہ"

بیسیوں احباب ذاتی طور پر مل کر اور درجنوں لوگ خطوط لکھ کر مجھ سے پوچھتے رہتے ہیں کہ اچھی تحریر کا فن اور خوبصورت تقریر کا ہنر کیسے ہاتھ آتا ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں تحریر اور تقریر کے شعبے سے دلچسپی ہوتی ہے' یہ دلچسپی بھی آج کے دور میں غنیمت ہے' ورنہ آج کے نوجوان کو کرکٹ اور پاپ میوزک سے فرصت کیوں؟

ان کا متعین سوال یہ ہوتا ہے کہ تحریر و تقریر میں حسن پیدا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

میرا اس سلسلے میں ہمیشہ یہی جواب رہا ہے کہ "مطالعہ"

مطالعہ کے بغیر لکھنے میں نکھار آتا ہے نہ بولنے میں سنوار' اگلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کتنا کس طرح کا اور کتنی دیر مطالعہ کرنا چاہیے؟

میرے نزدیک ان تین سوالوں کے تین ہی جوابات ہیں' "کتنا مطالعہ" کے جواب میں عرض کروں گا کہ "ذوق مطالعہ" اصل بات ہے اگر یہ پیدا ہو جائے تو نہ دماغ تھکتا ہے اور نہ دل بھرتا ہے' اچھی کتاب سے لے کر کاغذ کی اس پڑیا تک جس میں آدمی ہلدی مرچ لے کر آتا ہے' سبھی ایک نظر دیکھنے کو جی چاہتا ہے' اگر ذوق نہ ہو تو کتاب سامنے بھی دھری ہو تو یا اباسی آنے لگتی ہے' یا تھکن طاری ہو جاتی ہے یا سر بوجھل محسوس ہونے لگتا ہے' جس طرح دیوار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس سے بھی مشورہ کر لینا چاہیے اسی طرح کاغذ کا ہر ٹکڑا ایک نظر کا ضرور مستحق ہوتا ہے' ذوق مطالعہ کی یہ قطعاً دلیل نہیں کہ آراستہ پیراستہ کمرہ ہو' چمکدار جلد کی کتابیں ہوں' چار رنگی طباعت ہو اور آرام دہ کرسی اور صاف شفاف میز ہو' جنہیں قدرت نے ذوق مطالعہ سے نوازا ہے وہ گلی میں لگے بلب کی روشنی میں بھی اس کی تسکین کر لیتے ہیں جنہیں مطالعہ سے وحشت ہو وہ ڈرائنگ روم کے قیمتی فانوس سے بھی کوئی استفادہ نہیں کر پاتے' اگلا سوال ہے کہ "کس طرح کا مطالعہ کرنا چاہئے؟" اس کا جواب ہے "وسعت مطالعہ" موضوع اور کتاب کے انتخاب کا مرحلہ بہت دیر بعد آتا ہے' پہلے ہر نوع کی کتاب پڑھنی چاہیے اخباری مضامین سے لے کر ٹھوس تحقیقی مواد تک سبھی کا مطالعہ ناگزیر ہے ایک مدت بعد یہ ذوق پیدا ہوتا ہے کہ کتاب دے کر یا سونگھ کر

Marfat.com

اس کا پورا متن سمجھ میں آجائے ابتدائی مراحل میں رطب و یابس کی کوئی قید نہیں رکھنی چاہیے' مطالعہ میں وسعت آئے گی تو انتخاب کی نوبت آسکے گی' درجنوں کتابوں میں سے ایک آدھ کا مواد ذہن میں اترے گا' ڈائننگ ٹیبل پر بہت سے کھانے سجے ہوں گے تو ایک دو پر دل آئے۔ اگر کھانا ہی ایک ہو تو انتخاب کیسا؟

تیسرا استفسار ہوتا ہے۔ کہ کتنی دیر اور کب تک مطالعہ جاری رکھنا چاہیے؟ میں کہوں گا کہ عمر بھر! وہ شخص کبھی عالم نہیں ہو سکتا جو زندگی کے کسی مرحلے میں مطالعہ سے خود کو بے نیاز سمجھ لے' آج جو گردوپیش میں بہت سے "علامہ" نظر آتے ہیں وہ ماشاء اللہ زیادہ تر "علم لدنی" پر انحصار کرتے ہیں' اس لئے دوران گفتگو ان کے ایک جملہ بولنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ جنابِ والا علامہ کتنے ہیں اور "الاہمہ" کس قدر؟

ایک سچا عالم بستر مرگ پر بھی کتاب سے مستغنی نہیں ہوتا' آکسیجن سے کہیں زیادہ مطالعہ اس کی زندگی کی ضمانت ہوتا ہے' ہلدی کی گانٹھ ملنے پر کوئی چاہے تو پنسار بننے کا دعویٰ کر سکتا ہے مگر درجن ڈیڑھ کتابیں پڑھ اور سال چھ مہینے مطالعہ کر لینے سے کوئی اچھا ادیب اور اچھا خطیب نہیں بن سکتا' امام غزالیؒ اڑتیس برس کی عمر میں جامعہ نظامیہ کے وائس چانسلر کے عہدے سے الگ ہو کر غور و فکر اور مطالعے کے لئے شہر سے نکل کھڑے ہوئے' دس سال بعد واپس ہوئے بچپن سال کی عمر میں ان کی وفات ہوئی' درمیان کے سات سال میں ان کے قلم سے "تہافت الفلاسفہ" اور "المنقذ من الضلال" جیسی کتابیں نکلیں جنہوں نے فلاسفۂ یونان کا بھیجا ہلا دیا' گویا غزالیؒ جیسا شخص رئیس الجامعہ بننے کے بعد بھی مطالعے کا محتاج اور تلاش حق کا آرزو مند رہا۔

میں اگر یہ دعویٰ کروں تو بہت زیادہ جھوٹا نہیں ہوگا کہ کم از کم اردو لٹریچر میں خوبصورت لکھنے والے لوگ خواہ وہ نثر نگار ہوں یا شاعر' زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنہیں مکتبی تعلیم تو واجبی سی نصیب ہوئی مگر مطالعہ کے ذوق' وسعت اور تسلسل نے ان کے ذہن کو مالا مال' زبان کو پاکیزہ اور قلم کو شستہ اور رواں دواں بنا دیا۔

مولانا ابو الکلام آزاد آخر کس دار العلوم اور یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے؟ مگر ان کا اسلوبِ نگارش بیسیوں اہل قلم کا آستانہ بنا جہاں وہ جھکتے رہے۔

مولانا مودودیؒ بھی تو نہ دیوبند پڑھے نہ بریلی' مگر ان کی نثر کیا ہے ایک شکر پارہ ہے جو منہ میں گھلتی جاتی ہے' خواجہ حسن نظامیؒ بھلا کہاں کے ڈگری ہولڈر تھے کہ علامہ اقبالؒ کو کہنا پڑا "مجھے

اگر خواجہ حسن نظامی جیسی نثر لکھنے پر قدرت حاصل ہوتی تو میں کبھی شاعری کو ذریعۂ اظہار نہ بناتا۔"

یہی حال شورش کاشمیری کا ہے، نہ سکول گئے نہ مدرسہ دیکھا، مگر ان کی شاعری ہو یا نثر، کہنا پڑتا ہے۔

؎ اُٹھے تو بجلی پناہ مانگے گرے تو خانہ خراب کر دے

احسان دانش مرحوم بھی عمر بھر مزدور ہی رہے، کبھی کانجی ہاؤس کے چوکیدار، کبھی مالی، کبھی ماشکی، مگر ان کی شعری و نثری کاوش اور خوبصورتی دیکھ کر بے اختیار منہ سے نکلتا ہے۔

؎ یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

مرحوم غالباً پرائمری پاس بھی نہیں تھے، مگر شورش ان کی شاگردی پر عمر بھر نازاں رہے، اور اپنے کلام کی اصلاح لیتے رہے۔

ماہر القادری مرحوم جیسا زبان کی ثقاہت اور لطافت کا نمائندہ شخص بھی کوئی اندرون یا بیرون ملک جامعہ کا طالب علم نہیں رہا لیکن ذوق مطالعہ اور ممارست فکر نے ان کے قلم کو وہ جولانی بخشی کہ دقیق سے دقیق موضوعات ان کے ہاتھ میں پہنچ کر پانی بن جاتے تھے، نرم اور سبک کس کس کا نام لیا جائے؟ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ سکول، کالج یا دارالعلوم کی تعلیم ضروری نہیں بلکہ مدعا یہ ہے کہ اصل چیز ڈگری نہیں پاکیزہ فکری ہے۔

میرا جو دوست یہ چاہتا ہے کہ اس کے قلم میں ذائقہ اور اس کی زبان میں رونق آجائے اسے چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرے، دینیات، تاریخ، فلسفہ، ادب، سوانح، عمرانیات، سیاسیات، عصریات، جو کچھ میسر ہو اسے نعت سمجھئے ایک وقت آئے گا اسے قدرت حق و باطل میں تمیز بھی عطا کر دے گی، جھوٹ سچ میں امتیاز کا ملکہ بھی پیدا ہو جائے گا، وہ ثقاہت اور ظرافت میں فرق بھی کر سکے گا اور معیاری اور بازاری لٹریچر میں حد فاصل بھی قائم کر سکے گا، بلکہ یہ کہوں تو تعلی نہ سمجھا جائے کہ وقت آنے پر کتاب پڑھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کتاب کے لفظ و حرف خود بولنے لگ جائیں گے کہ ہم یہ ہیں اور ہمارا مفہوم یہ ہے، جس طرح عشق بعد میں مچلتا ہے اور مذاق عاشقی پہلے پیدا ہوتا ہے اسی طرح علم بعد میں آتا ہے ذوق علم پہلے ابھرتا ہے۔

(17 جون 1999ء)

Marfat.com

"یقین"

ایک انگریزی محاورہ ہے۔

Action Follow,s conviction and not knowledge

یعنی عمل یقین کا محتاج ہوتا ہے محض عالم کا نہیں' دنیا کی ہر پیش رفت کے پیچھے "یقین کامل" کی کار فرمائی نظر آتی ہے' حرف دھماکہ اس وقت کرتا اور لفظ زلزلہ اس وقت برپا کرتا ہے۔ جب اس کی پشت پر جذبہ کھڑا ہو' اگر ایسا نہ ہوتا' برف سے زیادہ یخ اور پتھر سے زیادہ سخت' بحر مراد کے کنارے پہنچ کر کھونٹا گاڑنا اور مصلیٰ بچھانا یقین ہی کا نتیجہ تھا' بحر ظلمات میں کشتیاں جلانا اور گھوڑے دوڑانا یقین ہی کا کرشمہ تھا' یقین ہی کی بدولت نئی دنیائیں دریافت ہوئیں' انکشافات کے نئے افق طلوع ہوئے' ان گنت کہکشاؤں کا سراغ ملا' مریخ اور چاند مسخر ہوئے اور ایجادات کا ایک پورا ذخیرہ وجود میں آیا' جس نے جنگل کے ماحول میں منگل کا سماں بھر دیا' فرد ہو یا قوم' یقین ہی اس کا جذبۂ محرکہ اور سفر کا سرمایہ ہوتا ہے' یقین نہ ہو تو عرب کا قریشی ---- ابو الحکم ---- دنیا میں "ابو جہل" کہلا کر بدنام ہوتا اور افریقہ کا حبشی --- بلالؓ --- یقین کی بدولت دوام پاتا ہے' بو علی غبارِ ناقہ گم رہتا اور دست رومیؒ محمل لیلیٰ تک جا پہنچتا ہے' رازی حرفوں میں الجھ کر رہ جاتا اور غزالیؒ جامعہ نظامیہ سے استعفیٰ دے کر بھی سلجھ جاتا ہے' نیٹشے تکرارِ ازلی کے فلسفے میں فنا اور اقبالؒ مقام کبریا سے آشنا ہو جاتا ہے' ابو الفضل اور فیضی کی شخصیتیں وقف دربار رہتیں اور شیخ سرہندیؒ کی لحد مطلع انوار بن جاتی ہے۔ حضرت سراقہ بن جعشمؓ مرض الموت میں گرفتار ہیں' اطباء لاعلاج قرار دے چکے ہیں' ورثاء تدفین کی تیاریوں میں ہیں' مگر سراقہؓ کہتے ہیں "واللہ ابھی موت بہت دور ہے کیوں کہ میں نے ابھی کسریٰ ایران کے کنگن پہننے ہیں جس کی بشارت خود حضورؐ نے مجھے دی تھی" یہ وہی سراقہ ہیں جنہیں ہجرت کے موقع پر کفار کے سونے کے کنگن پہنانے کا لالچ دے کر حضور ﷺ کے تعاقب میں بھیجا تھا' مگر آپ نے اسے فرمایا تھا اگر تم دعوتِ اسلام قبول کر لو تو ایک وقت آئے گا جب فارس فتح ہو گا اور شاہ فارس کے کنگن تمہیں پہنائے جائیں گے۔"

سراقہؓ بالآخر صحت یاب ہوئے' کچھ مدت بعد ایران فتح ہوا' اور حضرت عمرؓ نے اپنے ہاتھوں

Marfat.com

سے کنگن سراقہ کو پہنائے' یہ سراقہؓ کے قالب میں یقین کی روح گویا نہیں تھی تو اور کیا چیز تھی؟

ایک جنگ میں ثابت بن اصیرم مسلمانوں سے بر سرپیکار ہے' معاً اسے خیال آیا اور وہ حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر پوچھتا ہے "اگر میں اسلام لے آؤں تو مجھے کیا ملے گا؟" آپ نے فرمایا "جنت" اس وقت ایک کھجور کا دانہ اس کے ہاتھ میں تھا اس نے اسے زمین پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "یارسول اللہ آخری سلام قبول ہو یہ کھجور میں جنت جاکر کھاؤں گا۔" پلٹ کر صف کفار پر حملہ آور ہوا اور پھر شہید ہو گیا۔ حضورؐ نے لاشوں کا معائنہ کرتے ہوئے فرمایا آؤ دوستو میں تمہیں ایسا جنتی دکھاؤں جس نے نہ نماز پڑھی' نہ روزہ رکھا' اور نہ حج کیا مگر سیدھا جنت میں پہنچ گیا اور یہ جنتی ثابت بن اصیرمؓ ہے۔

پروانے کا حال اس محفل میں ہے قابل رشک اے اہل نظر
شب بھر میں یہ پیدا بھی ہوا' عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

یہ ثابت بن اصیرمؓ کا یقین تھا' جس نے جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے طے کر لیا' مصریوں کا عقیدہ بھی تھا اور ان کے ہاں رواج بھی' کہ وہ خشک سالی کے موسم میں دریائے نیل کو ایک انسانی جان کا نذرانہ اور بھینٹ دیتے اور ان کے خیال میں نیل تب رواں ہوتا تھا' عہد فاروقیؓ میں بھی ایک بار دریائے نیل خشک ہو گیا' اہل مصر نے آپ کی خدمت میں فریاد کی اور انسانی بھینٹ چڑھانے کی درخواست کی' آپ نے فرمایا' یہ عقیدۂ توحید اور ایمان کے منافی ہے' انسانی جان نہیں' میرا پیغام لے جاؤ' نیل نے بہنا ہوا تو بہنا شروع کر دے گا' آپ نے دو حرفی رقعہ تحریر فرمایا' ذرا عبارت ملاحظہ کیجئے۔

"اے دریائے نیل' اگر تو بھینٹ لے کر بہتا ہے تو قیامت تک سوکھا رہ' اگر خدا کے حکم کے مطابق تیری روانی ہے تو خدا کا بندہ عمرؓ تجھے حکم دیتا ہے کہ تو بہنا شروع کر دے' کیونکہ مخلوق خدا قحط میں مبتلا ہے۔"

یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ رقعہ پاتال تک پہنچا ہی تھا کہ پانی کی موجیں نیل کے کنارے سے اچھلنے لگ گئیں' یقین کا عالم یہ ہو تو پھر شعبدے دم توڑ دیتے اور معجزے رونما ہونے لگتے ہیں۔

شیخ شبلیؒ کے بارے میں آتا ہے کہ کہیں سے سفر کر کے واپس اپنے گاؤں لوٹ رہے تھے کہ گاؤں کے کھلے میدان میں آپ نے لوگوں کا مجمع دیکھا' آپ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا خیر باشد' کوئی آفت آگئی ہے؟ لوگوں نے کہا قحط نے گھیر لیا ہے بارش آنے کا نام نہیں لے رہی' ہم نمازِ استسقاء

Marfat.com

پڑھنے نکلے ہیں' آپؐ نے فرمایا' سب لوگ واپس لوٹ جاؤ' تمہاری نماز سے بارش نہیں ہو گی' لوگ متعجب ہوئے کہ کیوں؟ آپ نے فرمایا "تم میں سے کسی کے پاس بارش سے بچاؤ کے لئے کوئی چھتری اور کپڑا نہیں اس کا مطلب ہے خود تمہیں بھی بارش ہونے کا یقین نہیں ورنہ تدبیر کر کے آتے۔"

آج وطن عزیز کی زمین اپنے خزانے اگلنے پر کیوں آمادہ نہیں اور نامہربان آسمان اپنا ہن برسانے پر کیوں تیار نہیں؟ اس لئے کہ فرزندان وطن دولت یقین سے محروم ہو چلے ہیں' آسمان سے تارے توڑ لانے کے دعوے کرنے والے سیاستدان تنکا توڑنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے' کرامات بیان کرنے والے واعظ حکایات سے آگے نہیں بڑھتے اور ایک پھونک کے زور پر تقدیر میں بدلنے والے مشائخ خود بے عملی کی تصویریں ہیں' زمین موم اور آسمان رام ہو تو کیسے ہو؟ آبِ زم زم کا چشمہ یقین کی ایڑیوں سے ابلتا ہے۔ کدال اور پھاوڑوں کے زور سے نہیں نکلتا۔

بلاشبہ ہمیں حرف دعا تو یاد ہے دست دعا پھیلانے کا قرینہ بھول بیٹھے ہیں' ورنہ بادلوں کی کیا مجال کہ وہ آہ کو عرش تک پہنچنے میں رکاوٹ بن سکیں' علم زیادہ سے زیادہ تدبیر پر جال پھینکتا ہے مگر یقین سیدھا تقدیر پر جالکمند ڈالتا ہے۔

؎ ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے؟

(3 اکتوبر 1998ء)

رنگیلا شاہی شوق

غریب ملک اور مفلس عوام کے امیر حکمران مغلیہ دور زوال کے "رنگیلا شاہ" معلوم ہوتے ہیں' ان کے کسی ایک فیصلے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ملک مقروض اور رعایا مفلوک ہے۔

چند نمائشی اقدامات کو چھوڑ کر باقی تمام منصوبے شاہانہ شوق کی تکمیل دکھائی دیتے ہیں' اللہ جانتا ہے کہ اصل مسئلہ کیا ہے ہمارے حکمرانوں کی مت ماری گئی ہے' ان کے دماغ مفلوج ہو گئے ہیں آنکھوں کی بصارت کھو گئی ہے' دل پتھر ہو چکا ہے' یا لذت پرستی غالب آچکی ہے کہ ان کا ہر فیصلہ ملکی ضرورت اور عوامی سہولت کے برعکس نظر آتا ہے۔

بالکل سامنے کی بات ہے کہ ملک تقریباً پینتیس ارب روپے کا مقروض ہے اور لاہور اسلام آباد موٹروے پر پینتیس ارب روپے اڑا دیئے گئے' موٹروے بہت ضروری ہے مگر اس ملک کے لئے جو مقروض نہ ہو اور عوام کو بنیادی ضرورتیں مہیا ہوں' ورنہ یہ سراسر عیاشی اور رنگیلا شاہی ہے' جب کہ کراچی سے پشاور تک قومی شاہراہ پر صرف ستائیس ارب روپے خرچ کرکے اسے از سرنو بنایا جا سکتا تھا' جو سفر تجارت اور نقل و حمل کے حوالے سے ضروری بھی ہے اور ملکی معیشت کے لئے نفع بخش بھی' موٹروے کو کھولے ہوئے دو سال ہونے کو ہیں' وہ ابھی تک بھائیں بھائیں کر رہا اور خسارے میں جا رہا ہے۔

لاہور کا نیا ایئرپورٹ گیارہ ارب روپے کی لاگت سے زیر تعمیر ہے اور یہ ساری رقم باہر سے قرض لی گئی ہے' کیا ماہرین نے موجودہ ایئرپورٹ کو سفر کرنے کے لئے خطرناک اور موجودہ ضروریات کے لئے ناکافی قرار دے دیا تھا؟ ہرگز نہیں' شوکت خانم ہسپتال غالباً بچپن کروڑ روپے سے بنا ہے اگر قرض کی رقم سے کچھ بنانا ہی تھا تو ملک بھر میں گیارہ ارب روپے کی خطیر رقم سے شوکت خانم ہسپتال کے معیار جیسے بائیس ہسپتال بن سکتے تھے اور لاکھوں لوگ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے بچائے جا سکتے تھے۔

اس وقت پشاور سے اسلام آباد اور کراچی سے حیدر آباد تک موٹروے زیر تعمیر ہے سوال یہ ہے کہ پہلے موٹروے نے قومی معیشت کو کیا سہارا دیا ہے جو یہ دو منصوبے نفع بخش ثابت ہوں گے؟ ان دونوں منصوبوں پر اٹھنے والے اخراجات کے صوبہ سرحد اور کراچی کے کئی اہم طبی' تعلیمی اور مواصلاتی کام ہو سکتے ہیں جو یقیناً عوام کے لئے تحفہ ہوتے' ایک اور پراجیکٹ شروع ہو چکا ہے وہ ہے قائداعظمؒ کے مزار پر شالامار باغ کے طرز کا گارڈن' جو ایک سو سالہ ایکٹر رقبے پر محیط ہے اور اٹھائیس کروڑ روپے خرچ کرنے کا پروگرام ہے' میں دعویٰ

Marfat.com

سے کہتا ہوں کہ کوئی بزرگ جنہیں "کشف القبور" کا ملکہ حاصل ہو وہ کشف کے ذریعے قائداعظمؒ کی روح سے پوچھ سکتے ہیں کہ "باباؒ! کیا آپ اس منصوبے سے خوش ہیں؟" تو جواب میں بانی پاکستانؒ سخت ناپسندیدگی کا اظہار کریں گے' اس لئے کہ اس وقت ملک کو ایک ایک پائی کی اشد ضرورت ہے اور اس وقت مسئلہ باغ سجانے کا نہیں اُجڑے گھر بسانے کا درپیش ہے' یہ سارے منصوبے اور خوش ذوقی کے مظاہرے اس وقت تک کے لئے اٹھا رکھے جائیں جب ملک قرضوں سے نجات پا کر خود کفالت کی منزل پا چکا ہو' جس ملک کی آمدنی چار کھرب اور اخراجات سات کھرب ہوں وہاں یہ رنگیلا شاہی شوق عوام کی گردنوں میں قرضوں کے بھاری طوق ڈالنے کے مترادف ہے' ان منصوبوں سے ہٹ کر بھی ہمارے حکمرانوں کا مزاج سراسر رنگیلا شاہی ہے' ان کی آمد و رفت' ان کا اندازِ سفر' ان کا طرزِ بودوباش اور ان کا پروٹوکول سارے کا سارا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ ملک کے تمام مسائل حل ہو چکے ہیں صرف زیبائش و آرائش' آسائش و نمائش' اور کھلائش و پلائش کا کام باقی رہ گیا ہے' میں نے کئی بار سوچا ہربار حیران ہوا اور متعدد سیانے لوگوں سے بھی پوچھا کہ پارلیمانی نظام حکومت میں ایک پاور فل چیف ایگزیکٹو کے ہوتے ہوئے بے اختیار صدر اور نمائشی گورنروں کی کیا ضرورت ہے؟ اور ان کے دفتروں پر سالانہ کئی ارب خرچ کرنے کی کیا منطق ہے؟ اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب کہیں سے نہیں مل سکا' زیادہ سے زیادہ کہا جاتا ہے کہ آئینی ضرورت ہے ہمارے خیال میں آئین میں جہاں اور ترامیم ہوتی ہیں وہاں ایک اور ترمیم کرکے ان عہدوں کو ختم کیا جا سکتا ہے ہاں ان کے کوئی اختیارات ہوں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں' اسی طرح صدر اور وزیراعظم کے لئے تین تین اے ڈی سی' اور پھر ملٹری سیکرٹری اور گورنروں کے لئے ملٹری سیکرٹری رکھنے کا کیا جواز ہے؟ انہوں نے کیا کرنا ہوتا ہے؟ پھر پروٹوکول کے نام پر وزیراعظم کے سکواڈ اور موٹر کیڈ میں اٹھائیس گاڑیوں کا شامل ہونا آخر کیا ضروری ہے؟ سکیورٹی اور چیز ہوتی ہے اور نمائش دوسری چیز' اس میں حد فاصل ہونی چاہیے۔

وزیراعظم کے لئے بائیس مرسڈیز گاڑیوں کا مہیا کرنا آخر اس مقروض ملک کے ذمے کیوں ڈالا گیا ہے؟ وزیراعظم کا بیرونی ملک کا اندازِ سفر تو اور بھی نرالا ہے سعودی عرب جاتے ہیں تو نوے افراد ہم رکاب ہیں' ایک مولانا صرف دعا مانگنے کے لئے' ایک نعت خواں نعت خوانی کے لئے' اور کئی وزراء اور ممبران دلجوئی کے لئے' کیا خوئے شاہانہ اور ادائے خسروانہ ہے؟ حالانکہ صرف نمائشی طرزِ زیست چھوڑنے سے اربوں روپے بچا کر بجٹ خسارہ کم کیا جا سکتا ہے' جو ملک اور عوام پر بڑا احسان ہے۔

(9 ستمبر 1999ء)

Marfat.com

علم، عقل، یقین

دین اسلام خدائے زندہ کا زندہ نظام حیات ہے' اور اسلام کے تین بنیادی عقیدے توحید' رسالت اور آخرت دراصل زندگی کے تین جوہری اور عملی تقاضے ہیں' عقیدۂ توحید انسانی وحدت کا تصور ابھارتا اور عالم انسانی کو امت واحدہ بننے پر اکساتا ہے یہ عقیدہ اگر عمل سے ہم آہنگ ہو جائے تو کسی نسلی' لسانی' علاقائی اور قومیتی تعصب کی گنجائش نہیں رہتی' رسالت پر ایمان کا واضح مطلب یہ ہے کہ جس طرح رسولؐ کا منصب خدا اور بندے کے درمیان تعلق استوار کرنا اور رابطہ پیدا کرنا ہے اسی طرح انسان بھی اپنے درمیان اٹھی ہوئی اجنبیت اور نفرت کی دیواریں گرا کر رشتۂ الفت و محبت قائم کریں اور رسول رحمت ﷺ کی ذات مہر و محبت اور اخوت شفقت کا محسوس پیکر اور عملی مظہر ہے' یہ عقیدہ ہر نوع کی گروہی اور مسلکی منافرت ختم کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے' اور آخرت پر یقین سوسائٹی میں ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس اجاگر اور راسخ کرتا ہے' جس سے مزاج میں اعتدال' معاشرت میں ڈسپلن' معیشت میں انصاف اور حکومت میں احتساب کا رویہ جنم لیتا ہے' مگر بدقسمتی سے ان عقائد کو ذریعۂ انقلاب اور سرچشمۂ عمل بنانے کے بجائے انہیں ناقابل فہم معمہ اور موضوع مناظرہ بنا دیا گیا ہے۔ اس رویے کے اثرات مدتوں سے ہر شعبۂ زندگی میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

عقیدۂ توحید رکھنے کے باوجود مسلم سوسائٹی میں نسل و لسانی امتیاز' رسالت پر ایمان کے باوصف تفرقہ انگیزی اور آخرت کا تصور ہوتے ہوئے بھی بے لگام اور غیر ذمہ دارانہ روش زندگی اس بات کی واضح علامت ہے کہ ہم عقیدے کو عمل کے پیکر میں ڈھالنے میں بہت حد تک ناکام رہے ہیں' پیغمبر اسلام ﷺ نے اسی دین کی بدولت دنیا کی تقدیر بدل کر رکھ دی مگر ہم اپنا آپ بدلنے پر قادر نظر نہیں آ رہے بعض اوقات یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ عرب کی جاہلی اور جمود زدہ سوسائٹی میں علم و عمل کی حرکت اور انقلاب کی برکت جس قدر بھی پیدا ہوئی وہ سب کی سب روح اسلام کے سبب ہوئی تو کیا آج کی پاکستان سوسائٹی عرب کے اس نسل گزیدہ' اوہام گرفتہ' اخلاق

باختہ' علم سوز اور تہذیب ناآشنا ماحول سے بھی گئی گزری ہے کہ یہاں اسلام اپنی تمام تر رعنائیوں اور دلنوازیوں' اور انقلابی رویوں کے ساتھ برپا نہ ہو سکے اور نتیجہ خیز نہ بن سکے؟

ہمارے خیال میں اسلام کے تین اساسی عقائد کو تین رویوں میں ڈھال کر ارفع مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں' اور وہ ہیں علم' عمل اور یقین' توحید دراصل علم کا منبع ہے' علم کی سچائی اور انتہاء عقیدۂ توحید ہے' یعنی جس شخص کو اپنے پیدا کرنے والے' رزق دینے والے' ہدایت عطا کرنے والے اور قیامت کے دن اٹھانے والے کی معرفت حاصل ہو جائے اس نے گویا علم کی صداقت اور اس کی غایت اور نہایت کو پا لیا ہے' اب زمین و آسمان کے تمام پردے بھی اس کے سامنے سے ہٹا لئے جائیں تو اس کے علم میں مزید کوئی اضافہ نہیں ہو گا۔

عقیدۂ رسالت اس سچے علم کا عملی اظہار ہے' زندگی' رزق' ہدایت دینے اور قیامت برپا کرنے والے خدا نے بندوں سے کیا چاہا؟ اس چاہت کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنت اور سیرت بنا دیا' یہی سنت اور سیرت دراصل ایمان بالرسالت ہے' آخرت پر ایمان یقین کی آخری منزل ہے جو انسان کو کسی صورت بے دین نہیں ہونے دیتی' چنانچہ آج علم' عمل اور یقین تینوں کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔

علم روشنی ہے اور روشنی کھرے اور کھوٹے' سچے اور جھوٹے' واقع اور افسانے اور تقویٰ اور فتویٰ میں تمیز پیدا کرتی ہے' علم کی کوئی ذات پات' نسل اور برادری نہیں ہوتی' نہ اس پر کسی کا اجارہ ہے اور نہ کسی کا پہرہ' نہ یہ وراثت میں ملتا ہے اور نہ کسی وصیت کے ذریعے' اس لئے اس کا فیصلہ بے لاگ' فتویٰ بے آمیز اور نتیجہ حیرت انگیز ہوتا ہے' اس لئے لوگوں میں جاہلیت جدیدہ کی نقالی' سیاست کی جھوٹی کرشمہ سازی' دولت کی ملمع کاری اور فرقہ وارانہ شعبدہ بازی کی جگہ نورِ علم بانٹنے کی ضرورت ہے' علم کامل وحی کا علم اور نبوت کا فیضان ہے جس کو اس سے حصہ مل گیا وہ صراط مستقیم پر گامزن ہو گیا اب اس کے راستے میں کوئی ٹھوکر' کوئی کھائی اور کوئی تاریک گھاٹی نہیں آ سکتی' اور نہ کوئی ایسا اندھا موڑ جس سے کسی حادثے کا امکان ہو' مزید برآں علم الفاظ و حروف کے مجموعے' قواعد و اصطلاحات کے گورکھ دھندے اور از کار رفتہ روایات اور من گھڑت حکایات کے پشتارے کا نام نہیں بلکہ ذہن کی تازگی' ضمیر کی روشنی اور دل کی بیداری ہی اصل علم ہے' یہی تازگی' یہی روشنی اور یہی بیداری انسان کے لئے ذریعۂ ہدایت بنتی ہے' علم کے بعد عمل کی باری آتی ہے جس طرح سورج سے اس کی کرن اور پھول سے اس کی خوشبو جدا نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا

Marfat.com

ہو جائے تو سورج محض مٹی کا ایک تودہ اور پھول فقط سوکھا ہوا پتہ رہ جاتا ہے اسی طرح علم کا رشتہ کبھی عمل سے منقطع نہیں ہو سکتا۔ اگر علم عمل سے خالی ہو جائے تو پھر وہ ذہنی و فکری دنگل بن کر صرف اکھاڑ پچھاڑ کا ذریعہ رہ جاتا ہے' جس سے زندگی بسر تو ہو سکتی ہے بدل نہیں سکتی' جبکہ ضرورت زندگی کی قدریں بدلنے کی ہے' واضح رہے کہ عمل "وظائف و عملیات" کا نام نہیں رویے کی تبدیلی کو عمل کہتے ہیں۔

عمل کی یہی کیفیت جب وسعت اور شدت اختیار کرتی ہے تو مرتبۂ یقین پر پہنچ جاتی ہے اسی یقین کی بدولت ذات سے کائنات فرد سے اجتماع' شہر سے ملک اور انفس سے آفاق تک کا سفر طے ہوتا ہے' جب یہ سارے مرحلے مکمل ہو جاتے ہیں تو یقین کے اس ٹھوس پیکر کو ---- انقلاب---- کا عنوان عطا ہوتا ہے' محسن انسانیت اور امام انقلاب اسلامیؐ نے علم' عمل اور یقین کے اس آمیزے کے ساتھ دنیا کو پہلی بار بہت بڑے علمی' روحانی' تہذیبی اور سیاسی انقلاب سے ہمکنار اور مالا مال فرما دیا تھا۔

انقلاب سماج کی تبدیلی کا نام ہے' جب سماج بدل جائے تو اس کی اقدارِ تہذیب' معیارِ تمدن' اصول معیشت' اور نظام سیاست اپنے آپ بدل جاتا ہے' انسان "کائناتِ اصغر" اور دنیا "کائناتِ اکبر" ہے' کائناتِ اصغر میں تبدیلی علم' عمل اور یقین سے آتی ہے اور کائنات اکبر میں یہی علم فلسفۂ تمدن' عمل اصول معاشرت اور یقین انقلابِ کامل میں ڈھل جاتا ہے' کیا آج ایسی تبدیلی کی ہر ایک ضرورت محسوس نہیں کر رہا؟

(14 اکتوبر 1999ء)

Marfat.com

"میں بلالی ہوں"

میں کسی خوف اور طمع کے بغیر بقائمی ہوش و حواس اپنے ضمیر کو گواہ بنا کر پورے صدق دل اور روح کی اتھاہ گہرائیوں کے ساتھ یہ کہتے ہوئے نہ صرف یہ کہ کوئی حجاب محسوس نہیں کرتا بلکہ اپنے لئے فخر و اعزاز سمجھتا ہوں کہ میں غلام حضرت بلالؓ ہوں' میں بلالی ہوں "سید زادہ" ہونے کے باوجود اس "حبش زادہ" کی گرد پا ہوں' اور اس کے در کی چاکری کو دنیا کی ہر سروری پر ترجیح دیتا ہوں' جب کہ میں نے تو حضرت بلالؓ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا نہ کبھی ان سے ملا' وہ افریقہ کے ہیں اور میں پاکستان کا' میرے اور ان کے درمیان چودہ صدیوں کا فاصلہ ہے' نہ وہ میرے آباء و اجداد میں ہیں نہ اساتذہ و مشائخ میں' میرا ان کا رشتہ حاکم اور رعایا کا بھی نہیں' ان کی اور میری زبان بھی ایک نہیں' نسل بھی مختلف ہے' رنگ کا بھی فرق ہے' وطن بھی جدا ہے اور قومیت بھی الگ ہے' اس کے باوجود وہ میرا تاج سر ہیں اور میں ان کی خاک در' وہ میرے آقا ہیں اور میں انکا نوکر' میں یہ الفاظ لکھتے ہوئے اپنے قلم میں شگفتگی' اپنی سوچ میں پاکیزگی' اپنے دل میں وارفتگی اور اپنی روح بس تازگی محسوس کر رہا ہوں' ان کے ساتھ اپنی غلامی کی نسبت جوڑتے ہوئے فرحت محسوس کر رہا وں' اور اپنے اس گہرے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے کوئی شرمندگی نہیں تابندگی محسوس کر رہا ہوں' لر یہی مطالبہ پاکستان کا ہمہ مقتدر وزیراعظم مجھ سے کرے تو میری زبان تالو میں اٹک جائے گی' مجھے پپ لگ جائے گی' اور میری قوتِ گویائی جواب دے جائے گی' حالانکہ وزیراعظم بڑا صاحب اختیار ہوتا ہے' اگر چاہے تو وہ مجھے بیروزگار کر دے' مجھے جیل میں ڈال دے' میرا پاسپورٹ ضبط کر لے' میرا ویزا کینسل کر دے' مجھے جلاوطن کر دے' مجھے گھر میں نظر بند کر دے' اور میرا جینا حرام کر دے بظاہر وہ یہ سب کچھ کر سکتا ہے' لیکن اس کے باوجود میں نہ خلوت میں اور نہ جلوت میں کسی وزیراعظم کی آقائی کا دم بھروں گا اور نہ اپنی غلامی کا اقرار کروں گا' میں اسے فقط وزیراعظم تسلیم کروں گا' قائد ایوان مانوں گا' حکمران سمجھوں گا' اور خود کو رعایا ایک فرد اور عام انسان کہوں گا' آخر کیا وجہ ہے کہ وقت کا حکمران تو میرا آقا نہیں ہو سکتا مگر چودہ سو سال پہلے کا ایک "حبشی غلام" میرا آقا بن سکتا ہے' اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ بلالؓ کو کائنات انسانی کی اس بڑی ہستی سے

نسبت ہے، جس نے اپنے دامن میں پناہ دے کر اور اپنی آغوش رحمت میں لے کر نہ صرف بلالؓ کو "غلام" سے "امام" بنا دیا بلکہ مجھ جیسے کروڑوں بے نام و نشان لوگوں کو "حضرتِ انسان" ہونے کا شعور عطا کر دیا، ورنہ آپ سے پہلے انسان یا تو عربی ہوتا تھا یا عجمی گورا ہوتا تھا یا کالا، امیر ہوتا تھا یا غریب، آقا ہوتا تھا یا غلام، قریشی ہوتا تھا یا حبشی، انسان "بنی آدم" کے طور پر نہیں رنگ، نسل، وطن، زبان اور پیشہ کے لحاظ سے پہچانا جاتا تھا، اور آج بھی اس محسنِ انسانیتؐ کی تعلیم اور ہدایت سے انحراف کے نتیجے میں انسان کو انسان نہیں گورا اور کالا، یورپی اور ایشیائی اور چودھری اور کمی کے خانوں میں بانٹ کر دیکھا جاتا ہے، بلالؓ کو اس نسبت نے شرف و کمال اور جاہ و جلال عطا کر دیا ہے، پہلے بلالؓ اپنے آپ کو دیکھ کر شرماتا تھا لیکن آج ایک جہاں اس سے منسوب ہو کر عزت پاتا ہے، بلالؓ ایک "سمبل" ہے عزتِ نفس کا، شرف انسانی کا، رنگ و نسل کے خلاف جہاد کا، اور ذات پات سے بلند ہو جانے کا، میں اس لئے بلالی ہوں کہ اس کی اذان نے شبستان رنگ و نسل کا طلسم توڑا، اس کی کالی رنگت نے گورے پن کا غرور خاک میں ملایا، اس کے "حبش زادہ" نے ہر خانزادے، نوابزادے، شاہزادے، جام زادے، پیرزادے کا رعب پاش پاش کیا، اس کے ٹوٹے پھوٹے لہجے نے عرب کا لسانی تعصب ختم کیا، اور اس کی "غلامی" نے تمیز بندہ و آقا، جبھی تو اس "سیاہ فام" کے قدموں کی چاپ میرے آقا نے جنت کی ڈیوڑھی میں سنی، جبھی تو "حبشی نژاد" کو امیر المومنین عمرؓ نے "میرا سردار" کہہ کر یاد کیا، جبھی تو اسے مسجد نبویؐ کا مؤذن مقرر کیا گیا اور جبھی تو آج تمام افریقی مسلمان خو کو "بلالی" کہہ کر خوش ہوتے ہیں۔

بلالؓ کسی "رنگ" کا نہیں، ایک نئے "آہنگ" کا ترجمان ہے، اس کی پہچان کسی "زبان" سے نہیں "اذان" سے ہے، وہ کسی خاص "علاقے" سے نہیں "عقیدے" سے جانا جاتا ہے، اسکا تشخص "قومیت" نہیں، "اسلامیت" ہے اور اب وہ کسی خاص براعظم کا باشندہ نہیں رہا اولادِ آدم کا "نمائندہ" بن چکا ہے، اس آدم کی اولاد کا، جو آدم، مٹی سے بنا تھا، عربی، و عجمی، سیاہ و سفید، امیر و غریب سبھی لوگوں کا باوا آدم، یہ تہمتیں بعد کی ہیں کہ وہ رومی ہے اور وہ شامی فلاں۔ چودھری ہے اور فلاں معلّی، میں چیمہ اور چٹھہ ہوں اور تو ترکھان اور جولاہا، حضرتِ بلالؓ کی سیاہ رنگت اور بے پناہ غربت نے ہر "کوجھے" اور "ماڑے" آدمی کی لاج رکھ لی ہے، اس لئے میں "بلالی" ہوں اور مجھے اس پر بڑا ناز ہے۔

(13 اکتوبر 1998ء)

Marfat.com

"اولیاء اللہ"

"اولیاء اللہ" یعنی اللہ کے دوست' یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی طرف اطاعت کرتے ہیں اور اللہ ان سے محبت فرماتا ہے' یہ اپنے سے خوش اور خدا ان سے راضی ہوتا ہے' یہ اپنے مالک و مولا کی بات مانتے ہیں اور وہ ان کی کوئی درخواست نہیں ٹالتا' یہ احکم الحاکمین کے سامنے جھکنے والے ہیں اور خالق کائنات اپنی مخلوق کا دل ان کی طرف مائل کر دیتا ہے' یہی وہ مقدس گروہ ہے جسے اولیاء اللہ کی جماعت کہا جاتا ہے' یہ خالق کے برگزیدہ اشخاص اور مخلوق کے پسندیدہ افراد ہوتے ہیں' عقیدت و ارادت میں لوگ ان سے بہت سی باتیں منسوب کرتے ہیں' اور عام لوگوں کی نظر میں ولی وہ ہوتا ہے جو دریا میں مصلیٰ بچھا کر اس سے کشتی کا کام لے اور دریا پار کر جائے' بعض ولی اسے سمجھتے ہیں جو ہواؤں میں اڑتا نظر آئے' عقیدت کیش ہر اس شخص کو ولی مانتے ہیں جس کی جھاڑ پھونک سے بیمار ٹھیک ہوں' جس کے اشارے سے بگڑے کام بن جائیں' جو پل بھر میں دنیا کی خبریں بتائے اور قسمت کا حال بتائے' یہ علامتیں اور باتیں کیوں مشہور ہوئیں؟ کس سے منقول ہوئیں؟ اور کن کتابوں کے ذریعے مقبول ہوئیں؟ اللہ بہتر جانتا ہے' تاہم مقام ولایت برحق ہے اور اولیاء اللہ کا وجود ایک حقیقت۔

نبوت خالصتاً اللہ کا انتخاب ہے' اس میں کسی چلے' مجاہدے' مکاشفے' ریاضت اور محنت کا دخل نہیں' جبکہ ولایت ایک ---- اکتساب---- ہے' جو بندہ جس قدر محنت کر لے اس کا پھل پا لے' منصب رسالت کے بارے میں ارشاد ربانی ہے۔ "اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ رسالت کے لئے کسے منتخب کرے۔" (الانعام۔ ۱۲۴)

مگر ولایت ایک جہد مسلسل ہے' "جتنا گڑ اتنا میٹھا" طریق نبوت کی تقلید ہی ولایت کی سند ہے' ہماری زندگی کے جہاں اور شعبوں میں زوال آیا ہے وہاں اللہ کے بندوں کی پہچان میں بھی ہمارا حال قابل رشک نہیں' بالعموم ہم ہر اس شخص کو ---- ولی ---- سمجھتے ہیں جو ایک خاص نسل کا وارث ہو' کسی قبر کا مجاور ہو' اور تعویذ گنڈے کا ماہر ہو' دھونی رما کر بیٹھتا ہو' دھمال ڈال کر چلتا ہو' سبز رنگ کا چوغہ پہنتا ہو۔ ہاتھ میں قدر کے برابر عصا رکھتا ہو' جناتی زبان کے الفاظ ورد کرتا ہو' جب کہ ان میں سے کوئی چیز بھی ولایت کی نشانی اور برگزیدگی کی علامت نہیں' معلوم نہیں یہ اشارے

Marfat.com

لوگوں نے کہاں سے حاصل کیے ہیں؟

ولایت ایک دینی اور اسلامی اصطلاح ہے اور دین کا سرچشمہ یا تو کلام الٰہی ہے یا پھر سنت و سیرت پیغمبر ﷺ بعد ازاں فقہ ہو یا علم کلام' تصوف ہو یا منطق و فلسفہ ان میں سے جو چیز قرآن و حدیث اور کتاب و سنت سے ماخوذ یا ہم آہنگ ہو وہ درست اور باقی "محل نظر" اسلام میں سند یا حجت کوئی فقیہ' متکلم' امام' صوفی' فلسفی' مفسر اور محدث نہیں بلکہ آخری اتھارٹی اللہ اور رسول ہیں جس بات کی سند اور تصدیق ان دو بارگاہوں سے مل جائے وہ سر آنکھوں پر اور ان سے ہٹ کر کوئی قول یا فعل ہو گا تو وہ ترچھی نگاہ کے قابل بھی نہیں' اولیاء اللہ وہ ہوتے ہیں جو اپنی خواہش کو خدا کی مرضی سے ہم آہنگ کر چکے ہوں' جو بندگی کے مطلوب درجے پر فائز ہوں' جن کا وجود لوگوں کے لئے آیہ الٰہی ہو' جنہیں دیکھ کر خدا یاد آجائے جن سے مل کر زندگی کا ڈھب بدل جائے' جن کی صحبت میں بیٹھ کر دنیا کمتر اور دین برتر نظر آئے' جن کی باتیں علم کی خوشبو دیتی ہوں' جن کا کردار گرد و پیش کے لئے خدا کی نعمت لگے' جن سے مخلوق آزار نہیں آرام پائے' اور جو خوف خدا کا پیکر اور اطاعت پیغمبر کا مظہر ہوں' یہی نشانیاں ہمیں "کشف المحجوب" میں لکھی ملتی ہیں' "قوت القلوب" میں نظر آتی ہیں۔ "رسالہ قشیریہ" میں منقول ہیں' "کتاب اللمع" میں درج ہیں' "کیمیائے سعادت" میں مرقوم ہیں "فتوح الغیب" میں موجود ہیں اور "التعرف" میں وارد ہوئی ہیں' یہ ساری کتابیں تصوف کی "امہات کتب" کہلاتی ہیں' سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کے بندوں اور اس کے پیاروں کا تفصیلی ذکر خود اللہ کی کتاب ---- قرآن مجید ---- میں ملتا ہے' انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین' یہ سب طبقات مقبولان بارگاہ الٰہی ہیں' اسی طرح کتاب حکیم میں مؤمنین' متقین' محسنین' قانتین' مجاہدین' خاشعین' راکعین' ساجدین' عاکفین کے کردار و حسن عمل کا ایمان افروز تذکرہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے' ظاہر یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ولی کہا جائے گا' بزرگ سمجھا جائے گا اور عارف و سالک کا نام دیا جائے گا' ولایت اور بزرگی کوئی چیستان اور پہیلی نہیں جو کسی کی سمجھ میں نہ آسکے' اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر سب سے بڑا احسان اور کرم یہی ہے کہ اس نے اپنے آخری رسولؐ اور دین اسلام کے ذریعے حق اور باطل کو اپنی آخری حد تک تمام جزئیات کے ساتھ واضح فرما دیا اور کوئی ابہام نہیں رہنے دیا' شریعت اسلامی---- شریعت بیضاء ---- ہے جس کی رات بھی اسی طرح روشن ہے جس طرح اس کا دن' حلال اور حرام جائز اور ناجائز' صحیح اور غلط متحقق اور مشکوک ہر چیز کھول دی ہے' خدا سے قرب کے کیا معنی اور ذرائع ہیں

Marfat.com

وہ بھی واضح کر دیئے ہیں' خدا سے دوری کی کیا علامات ہیں وہ بھی بیان کر دی ہیں' تقویٰ اور احسان کی منزل کیا ہے؟ اس کی بھی نشاندہی کر دی ہے' وہ کون سی ذہنی و فکری الجھن تھی جسے اسلام نے دور نہیں کیا؟ وہ کون سی عملی و اخلاقی گرہ تھی جسے اسلام نے نہیں کھولا؟ وہ کون سی علمی و روحانی پیچیدگی تھی جسے اسلام نے رفع نہیں کر دیا؟ اس قدر صراحت و وضاحت کے باوجود خدا معلوم کس لٹریچر اور کن اشخاص کے ذریعے فکری و عملی مغالطے پیدا ہوئے' کہ اولیاء کرام کو جاننے' پہچاننے اور ماننے کے نئے پیمانے وضع ہو گئے' محمد بن قاسمؒ سے بڑا ولی کون ہو گا جس کے طفیل جنوبی ایشیا ہند کو اسلام و ایمان کی روشنی نصیب ہو گئی' امام اعظم اور دیگر آئمہ فقہاء سے زیادہ برگزیدہ کون ہو گا جن کے دماغوں نے فقہی و قانونی گتھیاں سلجھا کرامت کے لئے راہ عمل اور شاہراہ حیات کو ہموار کر دیا' اسی طرح حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ حضرت جنید بغدادیؒ حضرت شیخ سری سقطیؒ خواجہ معین الدین اجمیریؒ' بابا فرید الدینؒ اور مجدد الف ثانیؒ جیسے بے شمار دوسرے اکابر جن کے افکار و اعمال نے گم گشتگان راہ کو صراط مستقیم پر قائم کیا' اس معیار اور سطح کے تمام بزرگوں کا تذکرہ مقصود نہیں محض نمونہ پیش کرنا تھا' لیکن ولائت اور بزرگی کی یہ قسمیں پتہ نہیں کہاں سے دریافت ہوئی ہیں کہ فلاں صاحب بڑے پہنچے ہوئے ہیں کیوں کہ ان کی کرامت یہ ہے کہ وہ دو تین بار زندہ ہوئے اور پھر فوت ہو گئے' فلاں بڑے بزرگ ہیں کہ وہ جب سے فوت ہوئے ہیں ان کی ایک ٹانگ قبر سے باہر نکلی ہوئی ہے' فلاں بڑے ولی ہیں کہ ان کے میلے پر ہر سال زور کی بارش ہوتی ہے' فلاں بڑے صاحب کرامت ہیں کہ ان کی قبر پر چھت ڈالو تو فوراً گر پڑتی ہے' وغیرہ' ہم لوگ یہ باتیں کرتے ہوئے آخر کیوں عقل و تدبر سے کام نہیں لیتے؟ جب کہ قرآن حکیم کی دو تہائی آیات غور و فکر' عقل و شعور اور حکمت و دانش کی دعوت دیتی ہیں' جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ولایت برحق ہے اور اولیاء کرام بھی ہر دور میں رہے ہیں' ولایت قرب اور محبت الٰہی جیسی صفات کا نام ہے اور اولیاء ان صفات کے حاملین' مگر قربِ الٰہی کے پیمانے وہی ہیں جو خود اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں' ولی وہ نہیں جسے میں آپ بنا دیں بلکہ ولی وہ ہوتا ہے جسے خدا تعالیٰ اپنا دوست قرار دے' حضرت بایزید بسطامیؒ فرمایا کرتے تھے "جب منکر نکیر قبر میں پوچھیں گے تمہارا رب کون ہے؟ تو میں کہوں گا پہلے میرے رب سے پوچھو کہ وہ مجھے اپنا بندہ قرار دیتا ہے کہ نہیں؟ میں ربی اللہ کہہ بھی دوں تو کیا ہو گا؟"

(16 جنوری 1999ء)

Marfat.com

ے تمیز رنگ و بو بر' حرام است

زمینی حقائق کیا ہیں اور امر واقعہ کیا ہے اس سے قطع نظر اخبارات کی چیختی چنگھاڑتی سرخیاں پتہ دے رہی ہیں کہ اس وقت علاقیت کا عفریت پوری قوت سے پھنکار رہا اور صوبائیت کا جن بوتل سے نکل کر خوب رقص فرما رہا ہے' اس تاثر کی یکسر نفی بھی قرین عقل نہیں آخر کچھ تو ہے جو سطح پر ابھر رہا ہے' ہم ایسے دیوانے ایک عرصے سے بتلانے میں لگے ہوئے ہیں کہ یہ سارا شاخسانہ ہے اساس پاکستان سے مجرمانہ بے آگہی اور قیام پاکستان کے جواز سے مکمل بیگانگی کا! پاکستان کا قیام صوبائی حقوق کے تحفظ اور علاقائی مفادات کی نگہبانی کی بنیاد پر نہیں ہوا تھا بلکہ اسلامیان ہند کے دینی تشخص' ملی مفاد اور قومی استحکام کے لئے ایک الگ خطہ زمین کا مطالبہ کیا گیا تھا' اسی فلاسفی نے مہاتما گاندھی کو چپ کرایا' متحدہ قومیت کے نام لیواؤں کو پسپا کیا' اور محض حقوق کی سیاست کرنے والوں کو ناکام بنایا' قیام پاکستان کے وقت کوئی ایسی دستاویز سامنے نہیں آئی جسے قائداعظمؒ نے اپنی بنائے استدلال ٹھہرایا ہو' کہ فلاں فلاں صوبے اور ریاست پر مشتمل ایک ملک ہمیں درکار ہے بلکہ مطالبہ یہی تھا کہ جہاں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہ علاقے مجوزہ نئے ملک میں شامل ہوں گے تاکہ مسلمانان ہند اپنے عقیدے اور نصب العین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں' لیکن بدقسمتی سے سب سے زیادہ اسی اساس کو کمزور کیا گیا' اسی نصب العین کو یتیم بنایا گیا اور اسی عقیدے پر ضرب لگائی گئی جو قیام اور استحکام پاکستان کی واحد ضمانت تھی یعنی اسلام! یار لوگ ممکن ہے اب بھی اسے مقطع میں سخن گسترانہ بات قرار دے دیں' لیکن پچاس سال کی اکھاڑ پچھاڑ' سازشوں' باہمی منافرتوں' حقوق کے نام پر لڑائیوں اور لسانی بنیاد پر کشاکشوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ پتھر ایک بار جب اپنی جگہ چھوڑ دے تو پھر وہ لڑھکتا ہی چلا جاتا ہے۔ کسی جگہ ٹھہرنا اور قرار پکڑنا اس کے مقدر میں نہیں رہتا' آج سیاسی بازیگر موجودہ حالات کو ۱۹۷۱ء' کے سانحے سے زیادہ مہلک اور خطرناک قرار دے رہے ہیں سوال یہ ہے کہ بنگلہ دیش تو صوبائی و لسانی نفرت کی بنیاد پر بن گیا لیکن کیا اس کے مسائل حل ہو گئے؟ شیخ مجیب کہتا تھا کہ مجھے اسلام آباد کی سڑکوں سے پٹ سن کی بو آتی ہے کیا آج اسی پٹ سن پر بنگالیوں کی مکمل دسترس حاصل ہونے کے بعد بنگلہ دیش میں سڑکیں چھما

Marfat.com

رہی ہیں' یا ہماری طرح خود ٹوٹ اور گاڑیوں کو توڑ رہی ہیں؟ وہاں سیلاب آنے بند ہو گئے ہیں؟ کیا وہاں سیاسی استحکام آگیا ہے؟ کیا باہمی خون ریزی امن و اخوت میں بدل گئی ہے؟ کیا وہاں بیرونی مداخلت کا باب بند ہو گیا ہے؟ کیا بنگال واقعی سنہرا بنگال "بن گیا ہے یا ہماری طرح اب بھی کنگال ہے؟ اگر آج بھی وہاں ۱۷ء سے پہلے کے حالات ہیں تو پھر اناج کی جگہ لاشوں کے انبار لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ بستیاں بسانے کے بجائے قبرستان آباد کرنے کا شوق کیوں پالا گیا؟ کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم مغربی پاکستانیوں کی چیرہ دستی سے تو نجات ملی' چلو غیروں کے ظلم سے تو رہائی نصیب ہوئی' بس یہی کج فکری اور کم نگہی ہے جس کی پرورش یہاں بھی ہو رہی ہے اور کی جا رہی ہے' یعنی ظالم دوسرا ہو تو لائق مذمت اور اگر اپنا ہو قابل برداشت! یہ وہ جال ہے جسے ظالموں نے ہر دور میں بچھایا اور بے خبر عوام کو اس میں پھنسایا' مسئلہ پنجاب اور بلوچستان کا نہیں اصل جنگ چودھری اور مصلی کی ہے' وڈیرے اور ہاری کی ہے' خان اور نوکر کی ہے اور سردار اور غلام کی ہے آخر کیا وجہ ہے کہ آج تک کسی سندھی وڈیرے نے کسی غریب سندھی کو رشتہ کیوں نہیں دیا' وہ پنجاب کا رخ کیوں کرتا ہے؟ کس بلوچ سردار نے اپنے شہر کے کسی غریب بلوچ سے رشتہ کیوں نہیں جوڑا وہ سرحد کیوں بھاگتا ہے؟ کسی چودھری نے اپنے ہی ہم قوم سے برادری قائم کیوں نہیں کی وہ اِدھر اُدھر کیوں جھانکتا ہے؟ کیا ان بڑوں کی چاروں صوبوں میں بڑے گھرانوں سے رشتہ داریاں نہیں؟ یہ لوگ رشتوں کے لئے جرنیل ڈھونڈھتے ہیں اور پھر وقت آنے پر فوج کو پنجابی کہہ کر بدنام کرتے ہیں' شادیوں کے لئے جج تلاش کرتے ہیں اور پھر لاہور لاڑکانے کی دہائی دیتے ہیں' برادری بندی کے لئے دوسرے صوبوں کے سیاسی گھرانے تاکتے ہیں اور پھر صوبے ہی کے نام پر عوام کو اکساتے ہیں' اس دوغلے پن کا کبھی تو پردہ چاک ہونا چاہیے' ایک زمانے میں بلوچستان میں بغاوت کی فضا بنائی گئی' پھر فوج کشی ہوئی' فوج کشی کا جواز تھا یا نہیں سوال یہ ہے کہ اس جنگ میں کوئی بڑا کوئی سربر آوردہ بگٹی' کوئی نامور مری اور لیڈر مگسی مرا یا انہی قبیلوں کے غریب ہی ایندھن بنے؟ ۸۳ء میں سندھ کے اندر ایم آر ڈی نے پر تشدد تحریک چلائی' ٹرینیں لٹیں' پٹڑیاں اکھڑیں' آتشزنی ہوئی' گولیاں چلیں کیا کسی وڈیرے کی چھنگلی بھی زخمی ہوئی! یا بیچارے غریب کارکن ہی اُدھڑے بکھرے اور مرے؟ آج پھر کالا باغ ڈیم کے نام پر وہی ناٹک رچانے کی کوشش ہو رہی ہے اور نفرتوں کی آگ دہکانے کی سعی کی جا رہی ہے' ان ظالموں کی سیاست تو چمک جائے گی لیکن ہر صوبے کے غریبوں کے دل پھٹ جائیں گے اور نفرت کی آگ بھڑک اٹھے گی' بات وہی ہے کہ ہمارے عیار رہنماؤں

Marfat.com

نے جن چراغوں کو حقیر سمجھ کر بجھا دیا ہے آج بھی وہی لودیں گے تو روشنی ہو گی اور پاکستان میں یکجہتی پیدا ہو گی، یعنی اسلامی تشخص، ملی وحدت، قومی سوچ، اور نظریاتی اپروچ اقبالؒ کے الفاظ میں، جن کی افادیت پہلے بھی تھی، آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

ے نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم وازیک شاخساریم
تمیز رنگ و بو برما حرام است
کہ ما پروردۂ یک تو بہاریم

"نہ ہم افغان ہیں نہ ترک اور تاتار، ہم ایک ہی چمن کے گل بوٹے اور ایک ہی شاخ کے پتے ہیں، ہم پر رنگ و بو کی تمیز (اسلام نے) حرام قرار دی ہے کیونکہ ہم ایک ہی بادِ بہار کے پالے ہوئے ہیں۔"

(10 اگست 1998ء

Marfat.com

توازن و اعتدال

"خیر الامور اوساطُھا" ؟ یعنی خیر کیا ہے ہر چیز کا حد اوسط میں رہنا۔

یہ مقدس اور فکر انگیز جملہ حدیث رسولؐ بھی ہے اور ایک ابدی و آفاقی اصول بھی' عالم بشریت کی سب سے متوازن شخصیت اور جہان آدمیت کی معتدل ترین ہستی نے یہ ارشاد فرما کر گویا ایک ایسا اصول مہیا کر دیا ہے جسے دنیائے انسانی اختیار کر لے تو اس کی فکر ہمہ نوعی اعتزال اور ہمہ جہتی انحراف سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

امت مسلمہ اس وقت تک سربلند رہی جب تک وہ "اُمت وسطٰی" بنی رہی' جب وہ دائیں بائیں لڑھکنا شروع ہوئی تو لڑھکتی چلی گئی' اور پستی کا یہ سفر اب تک جاری ہے۔

جب کوئی چیز "حد اوسط" سے تجاوز کرتی ہے وہیں سے خرابی کا آغاز ہو جاتا ہے' فرد اور سماج کا ہر عمل اور اقدام اگر اعتدال میں رہے تو اس کی ہر چول ٹھیک رہتی ہے۔

کام اور آرام میں اعتدال رہے تو آدمی بیمار نہیں ہوتا' فکر و نظر میں اعتدال رہے تو آدمی گمراہ نہیں ہوتا' دل و دماغ میں اعتدال رہے تو آدمی متعصب نہیں ہوتا' آمد و خرچ میں اعتدال رہے تو آدمی محتاج نہیں ہوتا' اختیارات میں اعتدال رہے تو آدمی آمر نہیں ہوتا' خواہشات میں اعتدال رہے تو آدمی کرپٹ نہیں ہوتا اور توقعات میں اعتدال رہے تو آدمی مایوس نہیں ہوتا۔

آج تک جو بھی فتنے اٹھے ہیں یا حسن سے اٹھے ہیں یا حسن نظر سے' دیکھنے والے نے محبت میں ڈوب کر دیکھا تو آگے فرشتہ نظر آیا' اور اگر نفرت سے مغلوب ہو کر نگاہ ڈالی تو سامنے شیطان دکھائی دیا' جب کہ انسان ان دونوں کے درمیان کی چیز ہے' نفرت کی سانگ پر چڑھا کر انسان کو شیطان بنا دینا اگر اس کی انتہائی تذلیل ہے تو اسے محبت کے مندر میں سجا کر فرشتہ قرار دے دینا بھی اس کی چنداں تعظیم نہیں' نہ غرور سے دیکھنا درست ہے اور نہ سرور میں دیکھنا صحیح اس طرح یہ غلطی سرزد ہوتی ہے یا پھر غلط فہمی' ہر فن مکر نہیں ہوتا اور ہر عیب ہنر نہیں ہوتا' نگاہ خوردبین بن جائے تو پرائے کا فن مکر نظر آتا ہے اور دوربین ہو جائے تو دوست کا عیب ہنر دکھائی دیتا ہے' اور یہی حد

اوسط سے تجاوز ہے' جس نے پوری میزان زندگی درہم برہم کر رکھی ہے۔

بے شمار ایسے اوصاف ہیں جو دیکھنے میں بظاہر ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں' لیکن موقع محل اور انسان کا طرزِ عمل ان میں خط امتیاز کھینچتا' اور اسے توازن کے ساتھ برت کر ایک خامی کو خوبی بنا دیتا ہے۔

ذہانت اور چالاکی میں بہت باریک فرق ہوتا ہے' ورنہ دیکھنے والا بظاہر دھوکہ کھا جاتا ہے' اپنا مدعا بہ عنوان احسن واضح کرنا ہو تو ذہانت ہے اگر دوسرے کو کنفیوز کرنا مقصود ہو تو یہ چالاکی کہلاتی ہے۔

تواضع اور تملق کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے' تواضع میں بھی جھکا جاتا ہے اور تملق یعنی خوشامد میں بھی بچھا جاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ کسی کی اہلیت و صلاحیت اور دیانت و لیاقت دیکھ کر تکریم کی جائے تو یہ تواضع ہے اگر کسی کی دولت و طاقت اور شہرت و حکومت دیکھ کر تعظیم کی جائے تو تملق شمار ہو گی۔

حکمت عملی اور موقع پرستی میں بھی دیکھنے کو کوئی واضح فرق نہیں ہوتا' دونوں کیفیتیں وقت کا تقاضہ ہوتی ہیں' لیکن یہ تقاضا حصول مقصد کے لئے پورا کیا جائے تو حکمت عملی ہے اور اگر حصول مطلب کے لئے ہو تو کھلی موقع پرستی' سخاوت اور اسراف کے درمیان بھی کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا دونوں ہی کشادہ دستی کے عمل ہیں' فرق اس وقت واقع ہوتا ہے جب پیسے کا مصرف سامنے آئے' اگر عوام کے لئے خرچ ہو رہا ہے تو سخاوت اور نام کے لئے اڑ رہا ہے تو اسراف' لوگوں پر سرمایہ اٹھے تو سخاوت اور اپنے مشغلوں پر اڑے تو اسراف۔

خودداری اور تکبر کو لے لیجئے' دونوں ایک جیسے عمل ہیں' یعنی ذات کا غور' اگر یہ رویہ تخت نشینوں کے ساتھ ہو تو خودداری ہے اور اگر خاک نشینوں کے سامنے ہو تو سراسر تکبر۔

صاف گوئی اور گستاخی بھی جڑواں بہنیں ہیں' دونوں ایک ہی انداز رکھتی ہیں' حقائق کو سامنے لانا ہو تو صاف گوئی ہے اور بزرگوں اور شریفوں کے منہ آنا ہو تو گستاخی بن جائے گی' جملے کا نہیں دراصل لہجے کا فرق ہوتا ہے۔

توکل اور کاہلی کے درمیان بھی کوئی اتنا بڑا فرق نہیں' توکل بھی ایک طرح کی قناعت ہے اور کاہلی بھی' لیکن پتہ اس وقت چلتا ہے جب کوئی آدمی کام تو سارا سرانجام دے البتہ نتیجہ خدا پر چھوڑ دے تو یہ شان توکل ہے اور ایک آدمی ملنے کا نام نہ لے اور نتیجہ اپنے اختیار میں سمجھ لے تو

Marfat.com

یہ کاہلی ہے' کچھ ایسا ہی حال بخل اور کفایت شعاری کا ہے' مال خرچ کرنے میں دل اور ہاتھ دونوں کو سکیڑ کر رکھنا' کوئی چاہے تو اسے بخل کا نام دے دے اور چاہے تو کفائت شعاری کا عنوان دے ڈالے' لیکن ان دونوں میں جوہری فرق یہ ہے کہ چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کو کفائت شعاری کہتے ہیں اور دولت کو اُجڑے چہرے' میلے کپڑے اور روٹی کے سوکھے ٹکڑے میں چھپانے کا نام بخل ہے۔

اسی طرح وضعداری اور تکلف کے درمیان لکیر کھینچنا' بھی خاصا مشکل ہے' رکھ رکھاؤ' بھرم اور رسم دنیا کو ملحوظ رکھنا وضعداری میں بھی شامل ہے اور تکلف میں بھی' لیکن یہاں بھی ایک حد اوسط ہے' اگر تو مقصود غیرت فقر کی لاج رکھنا ہے تو یہ وضعداری ہے اور اگر مطلوب نمائش زر ہے تو یہ علانیہ تکلف ہے' صبر اور بے حمیتی کا رویہ بھی دیکھنے کو ایک جیسا معلوم ہوتا ہے' ہربات ہضم کر جانا' ہر سلوک برداشت کر جانا اور ہر تلخی پی جانا صبر بھی ہے اور بے حمیتی بھی' مگر وقت اور موقع اس کا تعین کرتا ہے یہ صبر ہے یا بے حمیتی؟ اگر سب کچھ اس لئے سہا جائے کہ اخلاق کا تقاضا ہے اصول کا مطالبہ ہے دین کا فائدہ ہے اور ملت کا معاملہ ہے تو صبر کی صفت ہے' اور لائق تحسین' لیکن یہ سب کچھ چند سکوں' متوقع مفاد' کرسی کے تحفظ' ذاتی مصلحت اور سیاسی منفعت کے لئے گوارا کیا جائے تو اسے دنیا کی ہر لغت بے حمیتی کا عنوان دے گی۔

ایک نظر اصول پسندی اور جمود پر ڈال لی جائے تو یہاں بھی اس طرح کی غلط فہمی سر اٹھاتی ہے' ایک چیز پر جم جانا' ایک جگہ پر اڑ جانا' ایک موڑ پر رُک جانا اور ایک نقطے پر ٹھہر جانا' یہ اصول پسندی بھی ہے اور ایک طرح سے جمود کی حالت بھی' لیکن یہاں بھی باریک بینی سے کام لینا اور جوہر توازن کو تلاش کرنا ہو گا' اگر کوئی کلیات سے جڑا رہے تو یہ اصول پسندی ہے اور اگر جزئیات سے چپکا رہے تو یہ جمود ہے' اور اگر کسی نصب العین کے لئے کوئی ذات ہی سے گزر جائے تو یہ اصول پسندی ہے اور اگر کوئی مفادات ہی میں الجھا رہے تو یہ جمود ہے' اسی طرح اور بھی بہت سے اوصاف وخصائص ہیں جو دو انتہاؤں پر دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کے درمیان توازن اور اعتدال پیدا کرنا ہی خیر ہے اور یہی خیر فرد اور معاشرے دونوں کو مطلوب ہے۔

(14 فروری 1999ء)

Marfat.com

"خدا انحصاری"

مرحوم سرسید احمد خان سے ایک بار پوچھا گیا کہ آپ اگر اپنا حاصل حیات بیان کرنا چاہیں تو کیا کہیں گے؟ اس پر سرسید نے یہ شعر پڑھا۔

ے طفلی و دامان مادر خوش بہشتے بودہ است
چوں بہ پائے خود رواں گشتیم سرگرداں شدیم

فارسی کا یہ شعر سرسید کی سوانح حیات "حیاتِ جاوید" کا آج بھی سرنامہ ہے جسے مولانا الطاف حسین حالی نے مرتب کیا ہے۔

یہ دراصل استعارہ ہے کہ جس طرح بچہ جب ماں کی گود میں ہوتا ہے تو ہر طرح کی فکر اور پریشانی سے آزاد ہوتا ہے' وہ کیا کھائے' کتنا کھائے' کب کھائے؟ یہ مسئلہ اس کا نہیں اس کی ماں کا دردِ سر ہے' اس کی بھوک کی فکر ماں کو کیوں ہوتی ہے' اس کی پیاس کا خیال ماں کو رہتا ہے' سردی اور گرمی سے بچاؤ کی تدبیر ماں کرتی ہے' گویا بچہ جب ماں تک خود سپردگی کے عالم میں رہتا ہے تو ہر فکر سے بے نیاز ہوتا ہے۔ جوں ہی وہی بچہ بڑا ہو کر اپنا آپ ذمہ دار اور کفیل بننے کا شوق پالتا ہے تو دنیا جہان کے ہزار تفکرات میں گھر جاتا ہے' کچھ ایسی ہی کیفیت بندے اور خدا کے تعلق کی ہوتی ہے' اگر تو بندہ اپنے جملہ معاملات خدا کے سپرد کر دے تو پھر اس کی ہر ضرورت اللہ تعالیٰ پوری کرتا رہتا ہے جونہی بندے کو خیال آتا ہے کہ میں خود بڑا ذہین ہوں' معاملہ فہم ہو گیا ہوں' اپنا کاروبارِ حیات خود چلانے کے قابل ہو گیا ہوں اور میں اپنے دست و بازو سے مسائل زندگی سے نمٹوں گا تو پھر چاروں طرف سے اسے اضطراب گھیر لیتا ہے' قدم قدم پر فکر' لحہ بہ لحہ آزار ساعت بہ ساعت ڈپریشن اور زندگی اس کے لئے بھنور بن جاتی ہے جس میں وہ ہر گھڑی ڈوبتا تیرتا اور غوطے کھاتا رہتا ہے' اس لئے اہل اللہ نے کہا ہے۔

ے کارساز ما بہ فکر کارِ ما
فکر ما در کارِ ما آزار ما

آج پاکستان جس گرداب بلا میں ہے' اس موقع پر بلاشبہ ہاتھ پاؤں ضرور مارنے چاہئیں'

اجتماعی بصیرت کو لازماً بروئے کار لانا چاہیے' اپنے بہترین وسائل اس گرداب سے نکلنے کے لئے ہر حال میں کھپانے چاہئیں' اور ہر دستیاب فن اور ہنر آزمانا چاہئے مگر ایک بات نہ بھولنے پائے کہ اگر ہم من حیث القوم اپنے دل و دماغ' اور فکر و عمل کی باگ خدا کے ہاتھ میں دے دیں اور اس سے رشتۂ بندگی اور وفا جوڑ لیں تو جس طرح بچہ ماں کی گود میں ہر فکر سے محفوظ ہوتا ہے۔ اس طرح ہم بھی خدا کے دامن کی پناہ میں ہر خطرے سے مامون رہیں گے' یہ کوئی واعظانہ اور مولویانہ بات نہیں پوری انسانی زندگی خدا کی ربوبیت کی دلیل اور پورا کاروبارِ حیات خدا کی رحمت و شفقت کی کھلی شہادت ہے' اس عقیدے اور رویے سے ہوتا یہ ہے کہ انسان میں ایک طرح سے بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے' وہ ہمہ وقت اسباب ڈھونڈنے میں ہلکان نہیں رہتا' بلکہ مسبب الاسباب پر اعتماد کی نعمت سے شاداں اور فرحاں رہتا ہے' اسے یقین ہوتا ہے کہ نظام زندگی اسباب سے نہیں مسبب الاسباب کے امر سے چلتا ہے' اسباب اگر راحت کا سامان پیدا کرتے ہیں تو مسبب الاسباب ان سے کہیں بڑھ کر طمانیت فراہم کرتا ہے۔

ایک مجوسی نے حضرت علیؓ سے پوچھا "اگر کسی شخص کو ایک کمرے میں بند کر دیا جائے جہاں ہوا تک کا بھی گزر نہ ہو تو آپ کا خدا اس تک رزق کیسے پہنچائے گا؟"

آپ نے اس سے دریافت کیا کہ فی الواقع اگر ایسا ہو تو پھر کیا ہو گا؟ اس نے کہا پھر کیا ہو گا وہ شخص مر جائے گا اور کیا ہو گا؟ آپ نے بڑے اطمینان سے فرمایا "میرے بھائی' جو خدا اس بند کمرے میں موت کا فرشتہ بھیجنے پر قادر ہے وہی خدا رزق کا فرشتہ بھی بھیج سکتا ہے۔" آج انسان جن مصائب و مشکلات کا شکار ہے ان کا بیشتر حصہ اسی باعث ہے کہ انسان نے اپنے مسائل خود حل کرنے کی ٹھان لی ہے' کوئی یہ نہیں کہتا کہ ذہن نہ لڑایا جائے' وسائل جمع نہ کئے جائیں' ہاتھ پاؤں نہ مارے جائیں اور منصوبہ بندی نہ کی جائے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس لذت سے بھی آشنا ہونے کی کوشش کی جائے جو توکل علی اللہ سے حاصل ہوتی ہے' انسان بیسیوں بار بند اور اندھی گلی میں جا پہنچتا ہے اب یا تو وہاں سر پھوڑنا شروع کر دیا جائے یا پھر اس خدا سے رجوع کیا جائے جو بند گلی سے درجنوں کھلی شاہراہیں نکالنے پر قادر ہے' افراد اور اقوام حالات کے سامنے ہتھیار اس وقت ڈالتے ہیں جب ان کے ہاتھ شل ہو جاتے ہیں' کہ اب اور کوئی چارۂ کار نہیں رہا لیکن متوکل علی اللہ شخص اور غنی مزاج قوم کبھی سرنڈر نہیں کرتی اس لئے کہ وہ حالات کو آخری چارۂ نہیں سمجھتی بلکہ وہ خدا کو کارساز اور حقیقی سہارا سمجھتی ہے' سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کے مرشد اور ماموں

Marfat.com

حضرت شیخ سری سقطیؒ ایک بار کسی جنگل سے گزر رہے تھے راستے میں ایک جگہ پوستین اتار کر تھوڑے سے فاصلے پر سو گئے اسی اثناء میں ان کے معاصر بزرگ کا وہاں سے گزر ہوا گدڑی دیکھ کر پہچان گئے کہ ہو نہ ہو یہ شیخ سری سقطیؒ کی ہے' ایک درخت کے سائے میں انہیں گہری نیند میں دیکھا تو وہیں بیٹھ گئے کہ اٹھیں گے تو ملاقات ہو جائے گی' جب شیخ سری سقطیؒ جاگے تو ان کے ہمعصر صوفی نے ازرہ طنز کہا "بزرگو' فقیر کی کل متاع اس کی پوستین ہی تو ہوتی ہے آپ اسے ایک جگہ رکھ کر بے خبر سو گئے یہ تو شکر ہے کہ میں آگیا ورنہ کوئی اور بھی آسکتا تھا اور آپ کو گدڑی اٹھا کر لے جا سکتا تھا' یہ گدڑی آپ کس کی نگرانی میں دے کر سو گئے تھے؟"

آپ نے جواباً فرمایا "میں یہ گدڑی اس کی نگرانی میں دے کر سویا تھا جس نے آپ کو چوکیدار بنا کر اتنی دیر یہاں بٹھائے رکھا۔"

خدا انحصاری کا بالکل یہی مفہوم ہے کہ اگر بندہ مایۂ خویش اپنے رب کے حوالے کر دے تو پھر حساب کم و بیش کی فکر سے آزاد ہو جاتا ہے' ہاں البتہ یہ واضح رہے کہ خدا انحصاری کی یہ کیفیت اوپری سطح پر پیدا نہیں ہوتی نہ یہ دکھاوے کا عمل ہے بلکہ اس کے لئے صحیح معنوں میں شان خود سپردگی اپنانا پڑتی ہے اور گہرے شعور کا ثبوت دینا ہوتا ہے' ممکن ہے کچھ وقت کشادگی کے بجائے تنگی سے گزرے آدمی تھڑدلا ہو گا تو شکوہ سنجی پر آجائے گا۔ اگر پختہ کار ہو گا تو یہی سمجھے گا کہ ماں کی چھاتی میں دودھ اس وقت ابال کھاتا ہے جب بچے کے رونے کی آواز اس کے کان میں پڑتی ہے' ایک مرحلہ رونے کا ضرور آتا ہے تب شفقت مادری جوش میں آتی ہے' ہم اگر گلگلے بھی کھائیں اور توکل کے نغمے بھی گائیں تو یہ فکری و عملی تضاد ہو گا' متوکل بندہ ایسے ہوتا ہے جیسے ڈاکٹر کے ہاتھ میں مریض! ڈاکٹر اس کی پسند کی نہیں اس کی ضرورت کی غذا تجویز کرتا ہے جو مریض یہ برداشت نہیں کرتا کبھی صحت یاب نہیں ہوتا اسی طرح توکل کا دعویدار اگر خدا کی مرضی کا پابند نہیں رہتا تو وہ پابند ہوا ہے بندۂ خدا نہیں' انسان خدا کو وکیل بنا کر خود کفیل ہو سکتا ہے۔

(5 اگست 1998ء)

"اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے"

پیارے قارئین' میں ایک طویل وقفے کے بعد اور بہت ہی تکلیف دہ مرحلے سے گزر کر ایک بار پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں' آپ سے جدائی کا یہ دورانیہ تقریباً پون سال پر محیط ہے' اقبالؒ کے ہاں تو جدائی کی گھڑیاں مہینوں میں گزرتی ہیں مگر میں تو آپ سے فی الواقع مہینوں دور رہا' اس سے میری ذہنی اذیت اور فکری کلفت کا اندازہ لگا لیجئے' اس دوران میرے دن کیسے گزرے؟ اور راتیں کس طرح بسر ہوئیں؟

؎ اور سب پوچھئے یہ قیامت نہ پوچھئے

مجھے دراصل بڑی آنت کی بیماری لاحق ہو گئی تھی' اور حیرت و حسرت یہ کہ مہینوں تک اس کی تشخیص نہ ہو سکی' پیٹ میں مروڑ اٹھتے تھے' آنت میں بل پڑتے تھے' اور اس بیماری نے مجھے توڑ کر رکھ دیا اور سب کس بل نکال دیئے' سوکھ کر کانٹا ہو گیا اور بستر سے لگ کر رہ گیا' بالآخر اپریل میں ہسپتال داخلہ لیا' ایک میجر آپریشن ہوا اور تکلیف سے بہت حد تک نجات پائی' اگرچہ مکمل صحت یابی میں کچھ وقت لگے گا تاہم اب اس قابل ہو گیا ہوں کہ کہیں آجا سکوں اور قلم و قرطاس سے رابطہ استوار کر سکوں' بیماری چھوٹی ہو یا بڑی بہرکیف ایک آزار ہے پہلے تو رسماً اور محاورے کے طور پر اب دل سے اور واقعتاً دعاگو ہوں کہ خدا کسی دشمن کو بھی مبتلائے آزار نہ کرے' برسوں کی صحت بیماری کے ایک جھٹکے میں بتاشے کی طرح پانی میں گھل جاتی ہے' آئینہ دیکھتے ہوئے خود اپنی شکل سے ڈر لگتا تھا' مگر بیماری نے باور کرایا کہ رنگ روپ پر جس نے بھی ناز کیا سخت دھوکہ کھایا خوش قسمت ہیں وہ جو اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں' جوانی کی رعنائی کتنی دل فریب ہوتی ہے مگر اسے مرقع حسرت بنتے دیر نہیں لگتی۔

صحت کتنی رشک آمیز ہوتی ہے مگر ڈھلنے پر آئے تو قطرۂ اشک بن کر ٹپ ٹپ کرنے لگتی ہے اور آنسوؤں کی طرح انسان کچھ ہی دیر میں سوکھ کر رہ جاتا ہے' میں ملک بھر میں چوکڑیاں بھرتا پھرتا تھا مگر نظام جسم کی ایک کڑی ٹوٹی' تو سب کڑاکے نکل گئے' اپنے اوپر حیران ہوتا ہوں کہ وارد ہونے والی تکلیف کا اب خیال بھی آتا ہے تو نڈھال ہو جاتا ہوں نہ جانے سات آٹھ ماہ کیسے گزار لئے؟ جبکہ دن کو قرار نہیں تھا اور رات کو سکون! ہنسنا تو کجا مسکرانا تک بھول گیا تھا' یہ نہیں کہ مایوس ہو گیا تھا تاہم لطف انجمن نہ رہے تو بجھ ہی جاتا ہے' اس سارے تجربے کا حاصل یہ ہوا کہ ہر پل اپنے مہربان اور کریم رب سے عرض کرتا رہتا ہوں۔

؎ دستگیری میری تنہائی میں تو نے ہی تو کی

Marfat.com

میں تو مرجاتا اگر ساتھ نہ ہوتا تیرا

بس اللہ کی ذات تھی جس نے حوصلہ نہیں ہارنے دیا' دل نہیں چھوڑنے دیا' مایوسی کی طرف رخ نہیں مڑنے دیا' اور رشتۂ امید نہیں ٹوٹنے دیا' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ جو قرآن مجید میں نقل ہوئے سدا وردِ زبان رہے۔

"وہ جس نے مجھے پیدا کیا وہی راہ دکھائے گا' اور وہی ہے جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے' اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔" (الشعراء: ۷۸' ۷۹' ۸۰)

اس دوران احباب کی پرسش احوال نے بھی کمال کا حوصلہ بخشا' خیرخواہوں کی نیک خواہشات میرے لئے روحانی سوغات ثابت ہوئیں' اور تو اور غائبانہ محبت رکھنے والوں کی کثرتِ دعا سچ ہے کہ آیۂ شفا بن گئی' جب کبھی میری بیٹی سعدیہ اپنی توتلی زبان میں اور ننھے منے ہاتھ اٹھا کر کہتی تھی۔ "یا اللہ میرے بابا سائیں کو ٹھیک کر دے۔" تو میں آمین کہتے ہوئے رو بھی دیتا تھا اور اٹھ کر بیٹھ بھی جاتا تھا کہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ ایسے معصوم ہاتھ اللہ تعالیٰ خالی لوٹا دے؟

رہ رہ کر مجھے اپنے نالائقی کا خیال آتا ہے کہ میں نے معلوم نہیں اپنے مہربان رب کو کتنی بار بھلایا' صحت کی سرمستی میں بھلائے رکھا' جوانی کی ترنگ میں بعض اوقات غفلت برتی' خوشحالی کی بھنگ نے بھی کچھ لمحے مدہوش رکھا' دنیا کی بے لگام امنگوں نے بھی کبھی کبھار نسیاں کا غلاف دل و دماغ پر چڑھا دیا' مگر میرے کریم نے مجھے ہر گھڑی یاد رکھا۔

چھوٹے نہ گناہ مجھ سے چھوڑا نہ کرم اس نے

یہ میرا مولا ہی تھا جس نے لوگوں کے دل میری طرف پھیر دیئے کہ گھر پر رہا تو دوستوں نے تنہائی کا احساس نہ ہونے دیا' اور ہسپتال پہنچا تو اجنبی بن کر نہیں رہا' اور میں امید کرتا ہوں کہ میرا رب مجھے قیامت کی ہولناکیوں میں بھی اکیلا نہیں چھوڑے گا اور اپنے صالح اور مقبول بندوں کی رفاقت نصیب کرے گا۔ (آمین!)

ان سطور کے ذریعے بارگاہ خداوندی میں سجدۂ شکر بھی بجا لانا تھا اور احباب سے اظہار تشکر بھی کرنا تھا۔ اور یہ گزارش بھی مقصود تھی کہ میں اپنے کرم فرماؤں کی دعاؤں کا پہلے سے بھی زیادہ محتاج اور ضرورت مند ہوں' اللہ تعالیٰ کا فضل اور آپ کی دعائیں شامل حال رہیں' تو "قلم برداشتہ" لکھتا رہوں گا۔ اور انشاء اللہ کسی مرحلے میں برداشتہ نہیں ہو پاؤں گا۔

ایک طویل عرصے بعد کچھ لکھتے ہوئے خوشگوار احساس ہو رہا ہے اللہ میرے ملک کی ناگواریوں کو بھی خوشگواریوں میں بدل دے' اور آزمائش کے بظاہر طویل عرصے کو نہایت قلیل ساعتوں میں منتقل کر دے۔ (آمین)

(2 جولائی 1998ء)

Marfat.com

چھوٹے نہ گنہ مجھ سے چھوڑا نہ کرم اس نے

گذشتہ کئی ماہ اس طرح گزرے کہ پوری قوم اور حکومت نئے انتخابات کے انعقاد' نئی اسمبلیوں کی تشکیل اور نئے انتظام کی صورت میں محو رہی' اور خیال تک نہ آیا کہ ہرابرپارہ بغیر برسے گزر جاتا ہے' فضائے نیلگوں گرد و غبار سے مٹیالی ہوئی جا رہی ہے' زمین پیاسی ہے' اور فصل ربیع محتاج باراں۔

نجانے کیسے صدر صاحب کو فرصت ملی اور انہوں نے پوری قوم سے نمازِ استسقاء کی اپیل کر دی' جمعہ کے دن نمازِ استسقاء پڑھی گئی اور اگلے روز سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا' اس کے باوجود بھی ضرورت سے زیادہ "روشن خیال" سلسلۂ علت و معلول کے حد سے زیادہ قائل اور دعا درود کو "توہم" اور "مولویت" قرار دینے والے اکبر کو طعنہ دیں کہ وہ اس زمانے میں خدا کا نام کیوں لیتا ہے؟

تو اس سے بڑھ کر "بوجہلی" اور "بوالعجبی" اور کوئی نہیں ہو سکتی' دعا کی قبولیت اور باران رحمت کا یہ منظر دیکھ کر خیال آیا کہ بندوں کی جسارتیں اور اللہ کی عنائتیں دیکھی جائیں تو بے اختیار لبوں پر تسبیح و تہلیل جاری ہو جاتی ہے' وہ کون سا فکری' سیاسی' اخلاقی' سماجی' فنی' ذہنی' اور قلمی جرم ہے جو اس خطۂ ارض پر نہیں کیا جا رہا' نعمت فکر سے نوازنے والے خدا کے خلاف لوگوں کو ابھارا جا رہا ہے' سیاست کے نام پر طے شدہ اقدار سے بغاوت کی جا رہی ہے' اخلاقیات کو "اضافیات" اور "فضولیات" کہہ کر رد کیا جا رہا ہے' سماج کو تاراج کرنے کا ہر حیلہ بروئے کار لایا جا رہا ہے' فن کی لطافت کو عریانی کی کثافت کا چولا پہنایا جا رہا ہے' اور ذہن و قلم کو ملت کی مستقبل گری کی بجائے جنگ زرگری میں کھپایا جا رہا ہے' لیکن اس سب کے باوجود بندوں نے جب بھی اپنے مولا کو پکارا' اس نے بہت قریب سے ان کی پکار کو سنا اور بہت جلد اس کا جواب دیا' اُجیب دعوۃ الداع اذا دعانِ کاش بندوں نے محض اپنی غرض کے لئے نہ پکارا ہوتا' بندگی کا فرض سمجھ کر اسے

Marfat.com

یاد کیا ہوتا نہ جانے کہ وہ اپنے بندوں کی دعا کا کتنا اکرام فرماتا؟ بندوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ چونکہ اسباب ان کے ہاتھ لگ گئے ہیں اب کاہے کی مناجات اور کیسا احتیاج؟ لیکن قدم قدم پر احساس ہوتا ہے کہ اسباب اپنی جگہ' اصل فیصلہ اور آخری حوالہ مسبب الاسباب کا ہوتا ہے' اللہ اس سے بہت خوش ہوتا ہے کہ بندے اس سے دعا کریں' اور اللہ بہت ناراض ہوتا ہے کہ اس کے بندے اس سے کچھ مانگتے کیوں نہیں؟

اللہ کو وہ آنسو بہت محبوب ہیں جو اس کی یاد میں کسی کی آنکھ سے اُمڈ پڑیں' جہنم کی بھڑکتی آگ جس کو دنیا کے سات سمندر بھی بجھانے پر قادر نہیں' کسی کا چشم نم آلود کا ایک قطرہ اس آتش بے کنار کو بھسم کر دیتا ہے۔

اللہ ان ہاتھوں کا بہت اکرام کرتا ہے جو دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہوں' دنیا کے ہر سماج میں کسی بھی مانگنے اور ہاتھ پھیلانے والے کو حقیر اور گدا کو ذلیل سمجھا جاتا ہے مگر خدا کے راج میں بندۂ محتاج کو بہت تکریم دی جاتی ہے' جو جتنا گڑگڑاتا ہے وہ رب کے ہاں سے اتنا حصہ پاتا ہے' جو خود کو فقیر بنا کر پیش کرتا ہے اللہ اسے ہر ایک سے غنی کر دیتا ہے' جو جتنی لمبی جھولی پسارتا ہے اللہ اس سے اتنا ہی زیادہ پیار کرتا ہے' دنیا کے درباروں میں جانے کے لئے کتنے جتن کرنے پڑتے ہیں' وقت لینا پڑتا ہے' لفظوں کے دروبست کا خیال رکھنا پڑتا ہے' ایوان شاہی میں داخلے کے آداب سیکھنے پڑتے ہیں' اور کچھ درمیان والوں کی خوشنودی حاصل کرنا پڑتی ہے' تب جا کر شرف باریابی ملتا ہے مگر مالک الملک کے ہاں' خدائے بزرگ و برتر کے ہاں' ذاتِ بے ہمتا کے ہاں' اور قادرِ مطلق کے ہاں نہ وقت کی قید' نہ دربار داری کے تقاضے' جب چاہو اس سے ملو اور جتنی دیر چاہو اس سے راز و نیاز کرو' وہ ہر وقت اپنے بندوں سے ملنے پر آمادہ اور ان سے مل کر خوش ہوتا ہے۔ نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند ستاتی ہے' کوئی اسے سانولی شام کو پکارے' کوئی اس کے پاس گھپ رات کو جائے' کوئی شب کے پچھلے پہر اسے یاد کرے' اور کوئی طلوع سحر کو کنڈی ہلائے' درِ فیض باز ملے گا' نہ دربان' نہ چوکیدار' نہ پہرے دار اور نہ چوبدار' اِدھر بندہ اپنے رب کے پاس جانے کا عزم کرتا ہے اور اُدھر براہ راست مولا لبیک کہہ کر متوجہ ہوتا ہے' امیر قالین پر بیٹھ کر مناجات کرے' فقیر خاک فرش پر پیشانی رکھ دے' کوئی عرب فصیح عربی میں مخاطب ہو اور کوئی حبشی صحرائی لہجے میں بات کرے اللہ تعالیٰ دونوں سے برابر کا معاملہ فرماتا ہے' حتیٰ کہ توتلے اور گونگے بھی اپنے انداز میں اس سے کچھ کہیں تو وہ ان کی بات کا رومی و "سعدی" کی مسجع مناجات سے زیادہ بھرم رکھتا ہے۔

Marfat.com

بلکہ وہ ذات تو ارحم الراحمین ہے' اس کا کرم تو ہر ایک پر یکساں ہوتا ہے' لوگ اچھا برا دیکھتے رہ جاتے ہیں' وہ اتنی دیر میں ہر ایک سے کرم کا معاملہ فرما چکتا ہے' اہل وطن نے اپنے رب سے بارش کے لئے رجوع کیا اور اس حال میں رجوع کیا کہ ملکی خزانے کو شیر مادر سمجھ کر ہضم کیا جا رہا ہے' ہر سرکاری اختیار ذاتی تحفظات کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے' اقتدار کو شخصی پندار کا ذریعہ سمجھا جا رہا ہے' انسانی خون کو نالی کے پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے' حرمت انسانی کا ایک ایک تار بکھیرا جا رہا ہے' اور ہر اچھی قدر اور زندگی بخش اصول کو حرف غلط سمجھ کر مٹایا جا رہا ہے' لیکن اس کے باوصف بندوں نے جس حال میں اور جس وقت اپنے مہربان رب کو یاد کیا' اس نے فوراً بات سن لی۔

آج ہمارا ملک جس عہد آشوب میں داخل ہو چکا ہے' اسے گرداب سے نکالنے کے اور بھی طریقے اور قرینے ہیں' لیکن ایک یہ بھی تو ہے کہ ہم اس آشوب کو اللہ کی گرفت سمجھ کر اس سے نکلنے کی تدبیر کریں۔

اگر کوئی اس انتظار میں ہے' کہ آسمان سے فرشتہ اتر کر ہر ایک کے کان میں آ کر بتائے کہ تم اس وقت اللہ کی ناخوشی کا شکار ہو تو یہ بات ہونے سے رہی' قرائن و علامات سے پتہ چلتا ہے کہ کون سی قوم اس وقت صراط مستقیم پر ہے اور کون سی ضلال مبین میں مبتلا!

آخر کوئی سبب تو ہے کہ زمینی' سمندری' دریائی' نہری' زرعی' معدنی' افرادی' اور فنی وسائل رکھنے کے باوجود ہم چوبیس ارب ڈالر کے مقروض ہیں' پکے مکانوں' اونچی فصیلوں' اور بری بحری اور فضائی فوجوں کے ہونے کے باوجود خوف و ہراس کی زندگی بسر کر رہے ہیں' اور ایک خدا' ایک رسول' ایک کتاب' ایک کعبہ ماننے کے باوجود ایک دوسرے کے ہاتھوں جان اور املاک محفوظ نہیں۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے ایک عرصے تک اللہ کو بھلائے رکھا اور آج اس نے ہمیں فراموش کر دیا ہو' اس نے اپنے کلام برحق میں ایک سے زائد مرتبہ انتباہ فرمایا ہے۔

> "تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو فراموش کر دیا سو اس نے بھی ان کو اپنے آپ سے خود فراموش کر دیا۔" (الحشر: ۱۹)

جب کہ سنت الٰہی تو یہ ہے اور حدیث قدسی میں واضح کیا گیا ہے کہ کوئی بندہ اگر اللہ کی طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو وہ ایک گز کے برابر بڑھتا ہے' جو اس کے پاس چل کر آتا ہے اس کی رحمت دوڑ کر استقبال کرتی ہے' جو زمین کے برابر گناہ لے کر اس سے رجوع کرتا ہے وہ اتنی ہی

Marfat.com

مقدار میں رحمت کا اہتمام فرماتا ہے' اور یہ بھی حدیث قدسی ہے کہ جو شخص قربِ الٰہی کی منزل پر آجاتا ہے' تو اللہ اس کی سماعت بن جاتا ہے' جس سے وہ سنتا ہے' وہ اس کی آنکھیں بن جاتا ہے جن سے وہ دیکھتا ہے وہ اس کا ہاتھ بن جاتا ہے جن سے وہ پکڑتا ہے اور وہ پاؤں بن جاتا ہے جن سے بندہ چلتا ہے' اور پھر جو کچھ بھی اس سے مانگا جائے وہ عطا کرنے میں تامل نہیں فرماتا' لیکن شرط قرب ہے۔

اور یہ بھی ارشاد خداوندی ہے۔ "میں اپنے بندے سے اس کے گمان کے مطابق معاملہ فرماتا ہوں۔" یعنی انسان اللہ کے بارے میں جو بھی گمان رکھتے ہوں اللہ ان کا مان نہیں توڑتا' اگر بندے سمجھیں کہ ہمارا رب بہت مہربان ہے تو وہ مہربان ہوتا ہے' اگر وہ گمان کریں کہ اللہ ہماری بات جلد سنتا اور دعا قبول کرتا ہے تو فی الواقع اللہ سمیع و مجیب ہوتا ہے' اگر لوگ کہیں کہ وہ ہمارے بہت قریب ہے تو خداوند کریم ہر حال میں اپنے بندوں کے قریب رہتا ہے' رنج اور خوشی' دکھ اور سکھ' تنگی اور کشادگی ہر حالت میں بہت قریب' اور ایک انسان کے لئے اس سے بڑھ کر ڈھارس اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن لوگ اگر خدا کو بھول جائیں' اس کے سامنے سرکشی پر اتر آئیں' اس کی مرضی کی پروا کرنا چھوڑ دیں' اس سے بہت دور ہو جائیں' اور زندگی کی کسی گھڑی اور روز و شب کی کسی ساعت میں بھی اسے یاد نہ کریں' تو پھر اللہ کے عذاب کا کوڑا حرکت میں آجاتا ہے' اگلی امتوں پر وہ عذاب آئے کہ خدا کی پناہ! بستیاں اوندھی الٹ دی گئیں' مضبوط برج اکھاڑ دیئے گئے' چھتیں اپنے نیچے سونے والوں پر آگریں' سرخ اور سیاہ آندھیاں چلیں' ہرے بھرے کھیت جو رات کو لہلہا رہے تھے صبح ہوتے ہی بھوسے کے ڈھیر میں بدل گئے' میٹھا پانی شور میں بدل گیا ایک آسمانی چیخ نے کانوں کے پردے پھاڑ دیئے' بجلی کی چمک نے بینائی چھین لی' حتیٰ کہ انسانی چہرے مسخ کردیئے گئے' امت مسلمہ پر سے دعائے نبوت کے طفیل اس طرح کا عذاب ہٹا دیا گیا۔ لیکن قانون مکافاتِ عمل اور ضابطۂ تعزیر و جزا تو قیامت تک رہے گا' اللہ تعالیٰ اپنی ناخوشی کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتا ہے' یہ اولوالالباب پر ہے۔ کہ وہ کیا غور کرتے اور کتنی عبرت پکڑتے ہیں؟

اس وقت دو نشانیاں تو بالکل واضح ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری روش سے غیر مطمئن ہے وہ اگرچہ شیوۂ کرم چھوڑنے والا نہیں لیکن کوئی وسیلۂ فضل بھی تو ڈھونڈھئے

ع ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں

ہم ایک نگاہ نظر اپنے ماضی پر ڈالیں اور ایک نگاہ حال پر تو سورۂ النحل کی آیتہ ۱۱۲ سامنے

Marfat.com

آجاتی ہے۔

"اللہ تعالیٰ ایک بستی کی مثال دیتا ہے جس میں امن و امان کا دور دورہ تھا لوگ مطمئن اور فارغ البال تھے انہیں ہر جگہ سے رزق بافراغت میسر تھا اس آسائش نے ان میں کفران کی روش پیدا کر دی اللہ تعالیٰ نے ان کرتوتوں کے سبب انہیں بھوک اور خوف میں مبتلا کر دیا۔"

آج بھوک اور خوف پاکستانی معیشت اور معاشرت کا سرنامہ ہے' یہ بھوک نہیں تو اور کیا ہے' کہ اربوں روپوں تجوریوں میں ہونے کے باوجود ملکی خزانے کی ایک پائی بھی ہاتھ لگتی ہے۔ تو اسے لوٹے بغیر نہیں چھوڑا جاتا اور خوف کا عالم؟ اللہ کی پناہ! مسجدیں' عدالتیں' بازار' چوراہے' مارکیٹیں' حتیٰ کہ گھر اور چار دیواری پر خوف آسیب بن کر لپٹا ہوا ہے اور سیاسی و مذہبی تفرقہ بازی اس پر مستزاد' سورۃ الانعام میں ہے۔

"وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر اور نیچے سے عذاب بھیجے یا تمہیں فرقہ فرقہ کرکے ٹکرا دے۔" (آیہ: ٦٥)

(8 فروری 1997ء)

"عذاب دانش عصر"

دانش عصر آج کے انسان کے لئے ایک گونہ نعمت بھی ہے اور دوسرے پہلوؤں سے بہت بڑی مصیبت بھی ثابت ہوئی ہے' بلاشبہ دانش عصر نے علم کا دروازہ کھولا' لیکن اسے چراغ راہ کے بجائے بنی آدم کی منزل بنا دیا' اور اس علم نے تشکیک تحیر اور تکلف کے ایک ایسے ریگستان میں آدمی کو کھڑا کر دیا ہے کہ قدم اٹھنے سے پہلے دھنس جاتا ہے' دانش عصر نے اجتہاد کا رویہ پیدا کیا لیکن اجتہاد کو اتنا عام کر دیا کہ وہ الحاد کی حدوں کو چھونے لگ گیا ہے' دانش عصر نے ایجاد و اختراع کا ذوق ابھارا لیکن اس بے محابا ذوق نے انسانوں کو حیوانات اور جمادات کے درجے پر پہنچا دیا ہے' دانش عصر نے موضوعی اندازِ فکر کے بجائے معروضی اسلوب متعارف کرایا لیکن یہ اسلوب پسندیدہ تو ہے بشرطیکہ خوب اور ناخوب کی واضح امتیاز کے ساتھ اپنایا جائے' دانش عصر نے کسی حد تک انسان کی کچلی ہوئی خودی اور دبی ہوئی انا کو بیدار کیا لیکن خودی کا اُبھار خدائی کے اظہار تک جا پہنچا اور انا کی بیداری نے خدا بیزاری کا رنگ اپنا لیا ہے' دانش عصر نے ذہنوں پر چڑھا ہوا توہمات کا کلبوت اتارا لیکن بے تحاشا مادیت کا بھوت مسلط کر دیا' دانش عصر نے فہم و خرد پر لگے ہوئے زنگ کو دھویا لیکن زنگ دھونے کے ساتھ ساتھ روحانیت کا رنگ بھی صاف کر دیا' اس دانش کا سرچشمہ کبھی یونان تھا جس نے فیثا غورث' بطلیموس' سقراط' بقراط' ارشمیدس' ارسطو اور افلاطون جیسے لوگ جنم دیئے اب دانش عصر کا نمائندہ اور علمبردار مغرب بنا ہوا ہے' جس طرح یونان کا فلسفہ انسانیت کے لئے ایک معمہ بنا رہا اسی طرح آج مغرب کی دانش بھی آدمیت کے لئے مخمصہ بنی ہوئی ہے' دانش عصر نے انسان کامل کے بجائے ادھورے اور یک رُخ لوگ پیدا کئے ہیں۔

؎ اہل دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہل نظر

اس دانش کا مکروہ اور بھونڈا اظہار ہمارے ہاں مشرق میں ہو رہا ہے' مغرب نے عقل کو کم از کم جہاں بینی تو سکھائی ہے لیکن یہاں کے اہل دانش تو خود بین بھی نہ بن سکے کجا کہ وہ خدا بین ہوتے۔

Marfat.com

دانش عصر اہل مشرق کے لئے بہت بڑی نعمت ثابت ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ یہاں مغرب کے مقلد پیدا نہ ہوں بلکہ فکری اعتبار سے پیدا ہوں' جن کا فکری و تہذیبی اثاثہ ہی مغرب کی تقلید ہو وہ اس پر نگاہ تنقید کیسے ڈال سکیں گے؟ جن کا سارا زور ہی فنون لطیفہ پر ہو وہ ٹھوس علمی رویہ کیسے اپنا سکیں گے؟ جو خود مذمتی کے مریض ہوں وہ خودی و خود اعتمادی کے نقیب کیسے بن سکیں گے؟ جو خاندانی نظام کی تباہی کو تہذیب کی معراج سمجھتے ہوں وہ مشرق کا معاشرتی منہاج کیسے واضح کر سکیں گے؟ جن کی ساری مسابقت غیر مطلوب میدان میں ہو وہ افکارِ اذہان میں کیا انقلاب لا سکیں گے؟ اور جن کی سوچ ہی سطحی ہو ان کا استدلال منطقی کیوں کر ہو سکے گا؟

جنہیں یہاں دانش اندوخت کرنے کا لپکا ہے وہ ارزاں داموں متاع دل فروخت کئے چلے جا رہے ہیں' خرد افروزی بجا مگر دل سوزی وہ سرمایۂ گراں بہا ہے جس سے ہم رفتہ رفتہ محروم ہوتے جا رہے ہیں۔

ہمارے ہاں دو طبقات واضح طور پر سامنے ہیں' ایک قدیم علماء اور دوسرے جدید دانشور' ایک کا سرچشمۂ علم مشرق ہے اور دوسرے کا محورِ فکر مغرب' یہ دونوں دھارے ہم آغوش ہو جاتے تو کیا ہی بات تھی مگر یہ تو دریا کے دو کنارے بن چکے ہیں جو چلتے تو ساتھ ساتھ ہیں مگر ملتے کبھی بھی نہیں' کاش ایسا ہوتا کہ علماء روایات کو آگے بڑھاتے اور دانشور نئی جہات سامنے لاتے' علماء کتابِ دل کا درس دیتے اور دانشور اوراق نظر پلٹتے' اور اسی طرح علماء اصول سمجھاتے اور دانشور اس کی تفصیل میں جاتے' مگر بد قسمتی سے ہوا یہ کہ علماء جنہیں مجدد بننا تھے وہ جامد ہو کر رہ گئے اور دانشور جنہیں مجتہد ہونا تھا وہ متجدد بن گرا تھے' جمود اگر ذہن کو ناکارہ بنا دیتا ہے تو تجدد فکر کو آوارہ کر دیتا ہے' اقبالؒ نے بھی غالباً اسی ناکامی کا مرثیہ کہا ہے۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے پیمانے
یہاں ساقی نہیں پیدا' وہاں بے ذوق ہے صہبا

دانش عصر کے عذاب سے محفوظ رہنے کا ایک یہی طریقہ ہے کہ یہاں متجدد نہیں بلکہ مجدد پیدا ہوں' مجدد وہ ہوتا ہے جو روح عصر کو اسلام سے ہم آہنگ کر دے اور متجدد وہ ہوتا ہے جو اسلامی روایات کو عصری خرافات کے تابع بنانے کی کوشش کرے' اور یہ دھندا آج کل یہاں بہت عام ہے۔

اقبالؒ دانش عصر سے ناواقف نہیں تھا' وہ ہر نئی آن میں ایک نیا جہان پیدا ہونے کا ادراک

Marfat.com

بھی رکھتا تھا' اسے ہر دن رات کی ایک کروٹ میں پرانا نظام تلپٹ ہوتا بھی نظر آ رہا تھا' اور وہ عہد نو کی کمندوں اور فکر جدید کی زقندوں سے بھی آشنا تھا مگر اس کے باوجود اس نے نطشے' گوئٹے' برگسان' سارتر' ڈیکارٹ' ژونگ' ایڈلر' فرائیڈ اور مارکس کو نہیں اپنا مرشد مولانا رومؒ کو بنایا' اور رومیؒ کی یہ نصیحت پلے باندھ لی۔

دست ہر نااہل بیمارت کند
سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

"ہر نااہل کا ہاتھ تجھے علیل کر دے گا' ماں کی جانب پلٹ کہ وہی تیری تیمار داری کر سکتی ہے۔" اقبالؒ کو عصر حاضر سے یہ گلہ رہا۔

عصر من دانندۂ اسرار نیست
یوسف من بہر ایں بازار نیست

اقبالؒ کو پیر حرم سے یہ شکوہ رہا کہ وہ تیرا محراب سو گیا ہے' اور اسیر فرنگ سے اس لئے نالاں رہا کہ وہ مغربی بتکدے میں کھو گیا ہے' دانش عصر سے مغرب کو کم از کم یہ فائدہ تو پہنچا ہے کہ وہاں جمود ٹوٹا ہے مگر ہمارے ہاں تو اس سے ہمارا تہذیبی وجود ہی بکھر کر رہ گیا ہے' دانش عصر سے استفادہ کی ایک ہی بہتر شکل ہے کہ اس کا دام توڑ کر دانہ اُچک لیا جائے یہ کیا ہوا کہ دانہ تو نہ مل سکے اور دام گلے پڑ جائے۔

(23 اکتوبر 1998ء)

Marfat.com

"ایک اُچھوتا تخیل"

میں خود اگرچہ شاعر نہیں مگر شعر پر فریفتہ ہونے والا شخص اور شعراء کا شیدائی ہوں، شعر کی زمین اگر ہموار، ترکیب چست، اور بندش خوبصورت ہو تو پھر نہ پوچھئے پہروں تڑپانے کے لئے ایک شعر کافی ہوتا ہے، نثر کی خوبصورتی اپنی جگہ لیکن شعر کی سحر کاری کا کوئی جواب نہیں، نثر اگر ابوالکلام آزاد کی ہو تو پھر حسرت موہانی کو خود کہنا پڑ جاتا ہے۔

جب سے دیکھی ابو الکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

نثر اگر شبلی نعمانی کے قلم کا شاہکار ہو تو پروفیسر براؤن جیسا فاضل شخص کہہ اٹھتا ہے۔

"میں اب اردو سیکھنے کی تمنا رکھتا ہوں تاکہ شبلی کی "شعر العجم" براہ راست پڑھ سکوں۔"

نثر اگر خواجہ حسن نظامی کا نتیجہ فکر ہو تو پھر علامہ اقبالؒ خود کو یہ کہنے پر مجبور پاتے ہیں۔

"اگر میں خواجہ حسن نظامیؒ جیسی نثر لکھنے پر قادر ہوتا تو شاعری کو کبھی ذریعۂ اظہار نہ بناتا۔"

نثر نگاری کی اس قدر فسوں کاری کے باوصف شعر بہرحال شعر ہے شعر ذوق کو آسودگی بخشتا ہے، خلوت میں انجمن کا رنگ بھرتا ہے، اور دل و دماغ پر جادو کرتا ہے، آپ خود ہی انصاف سے کہیے کہ پنڈت ہری چند اختر کا یہ شعر ایک بار پڑھنے اور عمر بھر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نہیں؟

میرے چمن کی خزاں، مطمئن رہے کہ یاں
خدا کے فضل سے اندیشہ بہار نہیں

اور ایک دوسرے پہلو اور زاویے سے رسا چغتائی کی اس نادر فکری کی داد دیجئے۔

تیرے آنے کا انتظار رہا
عمر بھر موسم بہار رہا

انتظار کی کیفیت کو ہر شاعر نے قیامت کہا ہے مگر رسا چغتائی نے اسے "موسم بہار" بنا دیا ہے،

Marfat.com

غربت، بیچارگی، حسرت اور عسرت کو حفیظ جونپوری نے جس رنگ میں باندھا ہے واقعہ یہ ہے کہ اس مضمون کے لئے ایک پوری کتاب ناکافی ہے، مگر حفیظ نے ایک شعر میں اسے سمو دیا ہے۔

ے بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

شعر کا حسن اپنے اندر اس قدر لطافت رکھتا ہے کہ وہ تشریح کی کثافت نہیں سہار سکتا، صرف قاری کا ذوق اس سے لطف کشید کرتا ہے، جس طرح لالہ محتاج حنا بندی نہیں ہوتا یہ کام فطرت خود بخود کرتی ہے اس طرح شعر بارِ تشریح کا متحمل نہیں ہوتا۔

جوش کا انداز دیکھئے اور اپنے حسن ذوق کو آواز دیجئے اور سر دھنے کا آغاز کیجئے۔

ے ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

یہ تو شعر ہیں بعض اوقات ایک مصرع اپنے دامن میں تاریخ کا پورا دفتر اور زندگی کا خلاصہ لئے ہوتا ہے۔

ے سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ غالباً نظیر اکبر آبادی کا نتیجۂ سخن ہے۔

غالب کا یہ انداز بھی غالباً منفرد ہی کہلائے گا۔

ے کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

فیض کے اس مصرعے میں ایک پورے میخانے سے زیادہ نشہ بھرا ہے۔

ے تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟

میں بات کیا کہنا چاہتا تھا کہ تمہید ہی میں قلم بہتا چلا گیا، میں ان سطور میں یہ کہنے چلا تھا کہ گزشتہ دنوں معروف کالم نگار جناب حسن نثار کی ایک نعت معاصر اخبار میں چھپی، واقعہ یہ ہے کہ اپنے تخیل کے اعتبار سے ایک نادر اور اچھوتی نعت ہے، صدیوں سے نعت پر مضامین بندی اور خیال آرائی ہو رہی ہے اور ہر ایک بزم یار سے نئی خبر لے کر نکلتا رہا اور بقدرِ وسعت خیال و خامہ سوغات پاتا رہا ہے، جب شعر کو ایک الہامی کیفیت کہا جاتا ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ جو بات پوری زندگی ہاتھ نہیں آتی اسے شاعری گرفت میں لے آتی ہے، جس طرح ہزاروں سال سے بشمول سیب ہر پھل پک کر درخت سے زمین پر گرتا آ رہا ہے لاکھوں بار انسان نے یہ عمل دیکھا لیکن نیوٹن

Marfat.com

نے سیب گرتا دیکھ کر "نظریۂ کشش ثقل" دریافت کرلیا اسی طرح ہزاروں مشاہدات و واقعات انسان کے گرد رونما ہوتے اور پھیلتے رہتے ہیں مگر شاعران سے نیا خیال' نیا موضوع' معنی اور نیا مفہوم اخذ کرلیتا ہے اور اسے اس قدر بنا سنوار کر پیش کرتا ہے۔ کہ گویا یہ بات پہلی بار ہو رہی ہے یہی شعر کا حسن اور اس کا سحر ہے۔

اب اس نعت کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور درود شریف سے اپنے ذہن کو معطر کیجیے۔

ترے ہوتے جنم لیا ہوتا
کوئی مجھ سا نہ دوسرا ہوتا

میں کوئی جنگجو عرب ہوتا
جو ترے سامنے جھکا ہوتا

بچہ ہوتا غریب بیوہ کا
سر تیری گود میں چھپا ہوتا

خاک ہوتا میں تیری گلیوں کی
اور ترے پاؤں چومتا ہوتا

پانی ہوتا اداس چشموں کا
ترے قدموں پہ بہہ گیا ہوتا

بت ہی ہوتا میں خانہ کعبہ کا
جو ترے ہاتھ سے فنا ہوتا

مجھ کو خالق بناتا غار حسن
اور مرا نام بھی حرا ہوتا

آپ نے دیکھا کہ بحر مختصر مگر تخیل کتنا نادر ہے' زمین کس قدر ہموار اور تاثر کتنا خوشگوار ہے' لفظوں کی قامت پرانی ہے لیکن نئے تخیل نے انھیں کس قدر باقیمت بنا دیا ہے' شاعر نے کس طرح نئی آرزو کی ہے کہ لفظ و حرف کو نئی آبرو مل گئی ہے۔

(9 دسمبر 1998ء)

"میزان عدل"

ہمارے حکمرانوں اور سیاستدانوں کو یہ تو سوجھتا ہے کہ کالا باغ ڈیم پر ریفرنڈیم کرالیا جائے' سی ٹی بی ٹی کے لئے استصوابِ رائے ہو جائے اور صدارتی یا پارلیمانی نظام کے سلسلے میں لوگوں کی رائے معلوم کرلی جائے' مگر ہمارے خیال میں عوام سے یہ پوچھا جانا چاہیے کہ وہ سب سے زیادہ کس مسئلے کو اہم اور مقدم سمجھتے ہیں' اگر کوئی ایسا انتظام ہو جائے تو ہمارے پختہ اور پہلے سے طے شدہ رائے ہے کہ پاکستانی قوم کی متفقہ آواز یہ ہو گی کہ بنیادی مسئلہ ----- انصاف کی عدم فراہمی اور عدل کی کمیابی--- ہے' شاید ہی کوئی شخص اس باب میں کوئی اختلاف کرے' قانون بھی موجود ہے' اس کے بنانے اور اس میں ردوبدل کرنے والی پارلیمنٹ بھی موجود ہے' اس کی تشریح کرنے والے ادارے بھی موجود ہیں' اور اسے نافذ کرنے والی پارلیمنٹ بھی موجود ہے' اس کی تشریح کرنے والے ادارے بھی موجود ہیں' اور اسے نافذ کرنے والی فورسز بھی موجود ہیں' مگر قانون کی علمبرداری اور بالادستی سرے سے مفقود' اسی طرح عدل کے ضابطے بھی ہیں اور عدل کے ایوان بھی' لیکن عدل یکسر نابود' آخر اس کا سبب کیا ہے؟ کایاں لوگ اس کا سبب قانون میں سقم بتائیں گے' عدالت اسے پولیس کی نااہلی قرار دے گی' اور پولیس اسے نظام کی پیچیدگی سے تعبیر کرے گی' ممکن ہے یہ وجوہ بھی ہوں' لیکن اصل بات یہ ہے کہ میزان عدل جس اصول پر قائم اور مستحکم رہتی ہے وہ اصول یہاں برابر پامال ہو رہا ہے اور وہ انسانی اور اسلامی اصول یہ ہے کہ نظام عدل میں خویش اور غیر' بالا اور پست' قریب اور بعید' غریب اور امیر' محبوب اور معتوب' صغیر اور کبیر کو نہیں دیکھا جاتا جرم کی نوعیت کو جانچا جاتا ہے' عدل کی آنکھ کسی کی محبت میں نم اور کسی کی عداوت میں خشم نہیں ہوتی' وہ مدعی کے رتبے اور مدعالیہ کے حلیے کو نہیں دیکھتی اور اسے کسی کی امارت مسحور اور کسی کی غربت مغرور نہیں بناتی' عدالت پوری دیانت کے ساتھ نالش کو سنتی' فراست کے ساتھ معاملے کو پرکھتی اور استقامت کے ساتھ اپنا فیصلہ صادر کرتی ہے' ہمارے ہاں انصاف کی بربادی اور عدل کی نابودی کی وجہ یہ ہے کہ یہاں بڑوں کے لئے مراعات اور چھوٹوں کے لئے مکافات کا نظام

Marfat.com

چل رہا ہے' جب کہ عدل کے لئے مساوات ناگزیر ہے' جس ملک کے آئین میں حکمرانوں ـــــ عدالتی حاضریوں کے ضمن میں دستوری تحفظات اور بعض فیصلوں میں صوابدیدی اختیارات موجود ہوں وہاں میزان عدل کھڑی ہو ہی نہیں سکتی' یہ اسلام کا انسانیت پر احسان عظیم ہے کہ اس نے معاشرتی زندگی میں مسلمان اور کافر' نیک اور بد' متقی اور فاسق' عالم اور جاہل کی درجہ بندی تو کی ہے اور فرق مراتب روا رکھا ہے مگر قانونی دائرے میں یہ سارے امتیازات نذرِ خاک کر دیئے ہیں' کوئی ولی کامل ہو یا بدوی و جاہل' کوئی رازیؒ و غزالیؒ ہو یا چرواہا اور مالی' کوئی عبد مسلم ہو یا کافر و ملحد' کوئی مجتہد و مفتی ہو یا مالو مصلی' کوئی حاتم طائی ہو یا خانساماں اور دھوبی' یہ سب قانون اور عدل کی نظر میں برابر ہیں' انصاف میں سب کا حصہ برابر ہے' ترکی کے سلطان مراد کو جب ایک تعمیر پسند نہ آئی اور اس نے معمار کے ہاتھ کٹوا دیئے تو قانون مچل اٹھا اور عدل اُبل پڑا' سلطان مراد کو حاضر عدالت ہونا اور قاضی کو اس کے خلاف فیصلہ دینا پڑا' علامہ اقبالؒ نے اس تاریخی فیصلہ کو نظم کرتے لکھا ہے۔

عبد مسلم کمتراز احرار نیست خون شہہ رنگیں تراز معمار نیست

(ایک غلام مسلمان کسی آزاد سے کمتر نہیں اور بادشاہ کا خون معمار سے زیادہ رنگین نہیں ہوتا۔)

یافت مورے برسلیمانے ظفر سطوتِ آئین پیغبر نگر

(قرآن کی نظر میں بندہ اور مولا ایک ہیں اور اسی طرح ٹاٹ کا بوریا اور ریشم کی مسند ایک ہے۔)

عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی میزان نہ کسی کی محبت کے باعث جھکے اور نہ کسی سے عداوت کے سبب اوپر اٹھے بلکہ وہ ہر حال میں مستقیم رہے' گزشتہ برس وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف ایک بار عدالت عظمیٰ کی طلبی پر وہاں پیش ہوئے تھے تو ہفتہ بھر ڈھنڈیا پٹتی رہی کہ وزیر اعظم نے کمال مہربانی سے خود کو عدالت کے سامنے پیش کیا' وزیر اعظم نے ایک عظیم روایت قائم کر دی' ٹی وی لہک لہک کر تصویر دیکھاتا رہا' ریڈیو چہک چہک کر تبصرہ کرتا رہا اور اخبارات لپک لپک کر کالم چھاپتے رہے' حالانکہ ایک مہذب' ایک شہری اور بالخصوص ایک اسلامی ریاست میں یہ معمول کا واقعہ ہے اس سے زائد کچھ بھی نہیں' حضرت عمرؓ اپنی تمام تر سطوت و جلالت کے باوجود مدینے کی عدالت میں کئی بار حاضر ہوئے بلکہ بار تو قاضی مدینہ حضرت زید بن عامر کی عدالت میں آپ پیش ہوئے تو قاضی

Marfat.com

نے احتراماً آپ کو اٹھ کر تعظیم دی آپ نے فوراً کہا کہ "یہ میرے مدعی کے ساتھ پہلی ناانصافی ہے کہ آپ نے مجھے تعظیم بخشی۔" قاضی نے جھینپ کر آپ کو بیٹھنے کے لئے کہاں تو آپ نے فرمایا "یہ دوسری ناانصافی ہے، مدعا علیہ کٹہرے میں بیٹھ کر نہیں کھڑا ہو کر پیش ہوتا ہے۔" اسی طرح ایک بار قاضی شریح نے امیر المومنین حضرت علیؓ کو ان کی کنیت "ابوالحسن" کے ساتھ پکارا تو آپ نے فرمایا "میں اس وقت مدعا علیہ ہوں کنیت کے ساتھ کسی کو بلانا ایک اعزاز ہے عدالت کو یہ طرز تخاطب زیب نہیں دیتا۔" (واضح رہے کہ اس مقدمے میں مدعی ایک یہودی تھا) اور اسی مقدمے میں حضرت علیؓ کے دونوں گواہ حضرت امام حسنؓ بیٹا ہونے اور قنبر ذاتی ملازم ہونے کے سبب ناقابل قبول ٹھہرائے گئے تھے، اور اس کا فیصلہ یہودی کے حق میں ہوا تھا۔

آج قائد ایوان تو کجا کوئی عدالتی اور حکومتی مشینری قائد حزبِ اختلاف کو ہاتھ نہیں لگا سکتی اس لئے کہ اس کا سیاسی اور سماجی مرتبہ آڑے آجاتا اور راستے کی دیوار بن جاتا ہے، اسلام کی نظر میں بے لاگ عدل کا مقام یہ ہے کہ ایک حدیث رسولؐ کے مطابق "اللہ تعالیٰ کفر کی حکومت تو گوارا کرلیتا ہے۔ مگر ظلم کی ہرگز نہیں۔" اور ظلم ظاہر ہے عدل کی ضد ہے، نوشیرواں کی شہرت تاریخ میں ایک عادل حکمران کی ہے اور حضور ﷺ اس امر پر اظہار فخر فرماتے تھے کہ میں ایک عادل حکمران کے دور میں پیدا ہوا ہوں، ایک اچھی حکومت میں مظلوم کو انصاف مانگنا نہیں پڑتا نہ اس کے لئے اسے دھکے کھانے اور وسائل کھپانے پڑتے ہیں بلکہ یہ ریاست کا فرض ہوتا ہے کہ وہ مظلوم کو انصاف اس کی دہلیز پر پہنچائے، تبھی تو گائے کھوئے جانے پر ایک بیوہ عورت نے ملک شاہ سلجوقی جیسے فرمانروا کو ایک پل پر روک لیا تھا اور کہا تھا کہ "ملک شاہ، میرا حساب اس پل پر چکاؤ گے یا اس پل (پل صراط) پر تمہیں پکڑوں؟" سلجوقی یہ سن کر دہل گیا تھا، اور اس کی فوراً داد رسی کی تھی، ہمارے یہاں مظلوم کو انصاف کے ایوانوں تک جا جا کر پاؤں میں آبلے پڑ جاتے ہیں، گھگھیا گھگھیا کر اس کا گلا بیٹھ جاتا ہے، رو رو کر اس کی آنکھیں سوج جاتی ہیں، اور دستک دے دے کر اس کے ہاتھ لال ہو جاتے ہیں، مگر مدعا علیہ اگر خانوادۂ حکومت کا فرد ہے، با اثر ہے، صاحب زر ہے تو اس تک قانون کے ہاتھ پہنچنے تو کجا، اس کے کلف لگے کپڑوں میں کوئی بل، اس کی گردن میں خم اور اس کی نیند میں کوئی خلل تک واقع نہیں ہوتا۔

(28 ستمبر 1998ء)

Marfat.com

بصیرت' عزم' اخلاص

آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارے ملک کی پچاس سالہ تاریخ میں سیاست' معیشت' معاشرت اور نظم و نسق کے حوالے سے ان گنت اقدامات کئے گئے مگر کسی ایک کا بھی وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا جسے ذہن میں رکھ کر یا عوام کو بتا کر وہ اقدام کیا گیا' ایبڈو لگا کر سیاست کو کرپشن سے پاک کرنے کی کوشش کی گئی لیکن سیاست میں کرپشن کا کینسر اپنے ریشے پھیلاتا ہی چلا گیا' معاشی میدان میں نیشنلائزیشن کا اصول اپنایا گیا لیکن معیشت پہلے سے زیادہ دق زدہ اور بیمار ہو گئی' سرداری نظام ختم کرنے سے لے کر عورت کی چادر اور گھر کی چار دیواری کے تقدس کے کئی قوانین اور ضابطے جاری ہوئے مگر نہ وڈیروں کی گرفت ٹوٹی اور نہ چادر اور چار دیواری سلامت رہی' رہ گیا نظم و نسق اسے بہتر بنانے کے لئے آئے روز اکھاڑ پچھاڑ ہوتی رہتی ہے' پھر بھی ہر صوبے کے وزیر اعلیٰ کو گلہ ہی رہا کہ میرے صوبے کے جس قدر اضلاع ہیں کاش اتنے ہی ایماندار ضلعی افسر میسر آجائیں مگر یہ حسرت ہمیشہ ناتمام ہی رہی' کوئی سبب تو ہے کہ قدم اٹھ رہے ہیں فاصلہ نہیں سمٹ رہا' سفر جاری ہے' منزل ہنوز دور ہے' ہمارے نزدیک اس کا بڑا سبب بصیرت کا فقدان' عزم کمزوری اور اخلاص کی کمی ہے' ورنہ کوئی فیصلہ بروقت ہو' عزم کی اس کی پشت پر ہو اور جذبۂ محرکہ صرف اور صرف اخلاص ہو اور نتیجہ یہ نکلے یہ ممکن ہی نہیں' ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ حکمران فیصلوں کی ترجیحات میں اس بصیرت کو بروئے کار نہیں لاتے جو مطلوب ہوتی ہے' مسئلہ درپیش کچھ اور ہوتا ہے ہمارے حکمرانوں کا فیصلہ کچھ اور جب معاشی بحران درپیش ہو تو حکمران سیاست کی گتھیاں سلجھانا شروع کر دیتے ہیں' خالصتاً سیاسی بحران ہو تو حکمران معاشرہ سدھارنے میں لگ جاتے ہیں' لہر علاقائی فتنوں کی چل رہی ہوتی ہے۔ حکمران تعلیم کی اصلاح کا ایجنڈا پیش کر دیتے ہیں' فضا سیاسی اصلاحات کا تقاضا کر رہی ہوتی ہے حکمران اسلامی قوانین کے نفاذ کا اعلان کر دیتے ہیں' بات نظم و نسق کی ہوتی ہے' حکمران عدالتوں سے محاذ آرائی شروع کر دیتے ہیں' یہ ہمارے ہاں ہر دور کے حکمرانوں کا وتیرہ اور شیوہ رہا ہے' صحیح وقت پر صحیح فیصلہ یہ بصیرت ہے غلط وقت ہر صحیح فیصلہ جہالت ہے اور غلط وقت پر

Marfat.com

غلط فیصلہ سراسر حماقت ہے، سختی کے وقت نرم روی اور نرمی کے موقع پر سخت گیری اس کے مظاہرے بے شمار مواقع پر ہوئے اور پھر اس کے نتائج بھی بھگتنے پڑے۔

پچاس کی دہائی تقاضا کر رہی تھی کہ ملک کو صحیح معنوں میں نظریاتی رخ دے دیا جائے اور بنیادی اسلامی قوانین نافذ کر دیئے جاتے کیوں کہ تحریک پاکستان کی فضا ابھی باقی تھی اور لوگوں میں ایک امنگ اور خواہش تھی مگر وہ دہائی سیاسی جوڑ توڑ کی نذر ہو گئی، ساٹھ کی دہائی گذشتہ دس سال کی سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کے خاتمے اور جمہوری عمل کے استحکام کے لئے موزوں تھی مگر اس وقت کے حکمرانوں نے اسے غیر سیاسی اور جماعتی بنا ڈالا، ستر کا عشرہ سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں قومی یکجہتی کا متقاضی تھا مگر اشتراکی نقطۂ نظر سے معاشی اصلاحات کا ڈول ڈالا گیا، اسی کا عشر سیاسی محاذ آرائی کو مفاہمت اور ہم آہنگی میں بدلنے کا عشرہ تھا مگر حاکم وقت نے اسے ارتکاز اختیارات اور فروعی مذہبی مسائل کے لئے استعمال کیا، اب نوے کی دہائی بھرپور معاشی اصلاحات کا مطالبہ کر رہی ہے، مگر حکمران گذشتہ آٹھ سالوں میں "میوزیکل چیئر گیم" میں مصروف ہیں، ان آٹھ سالوں میں آٹھ عبوری اور منتخب حکومتیں بنیں اور بگڑیں، اگر حکومتی ایوانوں کی بصیرت کا یہ عالم ہو تو کوئی صحیح فیصلہ وقت پر ہو ہی نہیں پائے گا۔

دوسرا مسئلہ ہے عزم کا، فیصلہ بروقت ہو یا بے وقت، جزوی طور پر صحیح ہو یا جزوی طور پر غلط، اگر اس فیصلے کو نافذ کرنے کا عزم ہو تو بعض اوقات وہ بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے، اگر عزم نہ ہو تو صد فیصد درست فیصلہ بھی کاٹھ کباڑ کی نذر ہو جاتا ہے، مثلاً فیصلہ ہوا کہ ٹیکس وصول کر کے رہیں گے چار دن کی ہاؤ ہو کے بعد سکوتِ مرگ کا عالم طاری ہے، فیصلہ ہوا کہ سمری کورٹس کے ذریعے جرائم اور مجرموں کی بیخ کنی کی جائے گی، آئینی ترمیم ہوئی، عدلیہ سے بدمزگی ہوئی، سمری کورٹس بن گئیں، مگر معمول کی عدالتوں اور سمری کورٹس کی کارکردگی میں عوام کوئی نمایاں فرق محسوس نہیں کر سکے، حکومت کا جوش و خروش بھی مدت ہوا جھاگ کی طرح بیٹھ چکا ہے اب بھولے سے بھی سمری عدالتوں کا نام زبان پر نہیں آتا، فیصلہ ہوا کہ نادہندگان کے خلاف میجر آپریشن ہو گا اور بغیر کسی رو رعائت کے ڈھائی کھرب کی رقم وصول کی جائے گی، چار دن شورا شوری ہوئی اور پھر مکمل خاموشی! قرضوں کی وصولی کی بات اب اخبارات بھی لکھنا بھول گئے ہیں، فیصلہ ہوا کہ کراچی کو امن کا گہوارہ بنا دیا جائے گا، مذاکرات ہوئے، تاریخیں طے ہوئیں، وزراء آئے گئے اہم اجلاس ہوئے، مہینوں گزرتے چلے گئے، مگر کراچی آج بھی لاوا بن کر پک رہا ہے، علی ہذا القیاس ہر حکومت نے ہر

شعبے میں ہاتھ تو ڈالے لیکن عزم کے فقدان کے باعث سارے فیصلے ادھورے' بے ثمر اور لا حاصل رہے' عزم نہ ہو تو فیصلہ نہیں کرنا چاہیے' فیصلہ کرنا ہے تو پھر عزم ہونا چاہیے' انتظام مملکت ذات اور جماعت کی مصلحتوں کے تحت نہیں چلتا' عوام کے مفاد کو مدنظر رکھ کر چلتا ہے' اور یہی کیفیت حکمرانوں کے اخلاص کی ہے اگرچہ اخلاص کا تعلق نیت سے ہے اور نیت کا حال خدا ہی جانتا ہے' لیکن اقدامات کسی حد تک نیت کا فیصلہ کر دیتے ہیں' مخلص آدمی کے پاس فیصلہ نافذ کرنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے اور قوت بھی! مخلص آدمی چونکہ اپنا کھاتہ صاف رکھتا ہے اس لئے اسے صاف صاف بات کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے' مخلص آدمی چونکہ ہاتھ میں چھلنی نہیں چھاج رکھتا ہے اس لئے اسے چھان پھٹک کرنے میں آسانی ہوتی ہے' مخلص آدمی چونکہ اپنے اور اپنی ذات کے لئے کوئی تحفظ نہ مانگتا ہے نہ رکھتا ہے اس لئے وہ فیصلے کے نفاذ میں کوئی تکلف نہیں برتتا' اس لئے جو حکمران اخلاص سے عاری ہو گا لوگ اس کے فیصلے کو گھاس بھی نہیں ڈالیں گے' مخلص آدمی دائیں بائیں نہیں دیکھتا ناک کی سیدھ چلتا ہے اور خدا بھی اس کی ہر ٹیڑھ کو سیدھا کر دیتا ہے۔

(8 ستمبر 1998ء)

Marfat.com

"فطرت کی آواز"

پوری دنیا اس وقت گھوڑے پر سوار ہے' اور قدرت نے بھی اس کی لگامیں جان بوجھ کر ڈھیلی چھوڑ رکھی ہیں' غالباً وہ دیکھنا چاہتی ہے کہ آخر انسان جاتا کہاں تک ہے؟ انسان دنیا اور ماورائے دنیا کو نچوڑ رہا ہے' کھنگال رہا ہے' چوس رہا ہے' اور ادھیڑ رہا ہے' نہ تو اس کی پہنچ سے سمندروں کے پاتال باہر ہیں اور نہ اس کی دسترس سے فضاؤں اور خلاؤں کے آخری کنارے' اس کی کمندیں اگر ایک طرف مریخ اور چاند پر پڑ رہی ہیں تو دوسری طرف وہ پہاڑوں کی انتہائی برفانی چوٹیوں پر اپنے نقش قدم جما رہا ہے' یہ انگارۂ خاکی اپنی اصل میں جو کچھ بھی ہے لیکن امرواقعہ یہ ہے کہ اس کی بے باکی فرشتوں تک کو دم بخود کئے ہوئے ہے کہ یہ چھلاوہ آخر ہے کیا؟ یہ انسان مٹی' پانی' آگ اور ہوا کا ملغوبہ' اور اس مٹی میں جان؟ پانی کی اس قدر اٹھان؟ آگ کا یہ مچان؟ اور ہوا کی اس طرح اڑان؟ ورنہ تو مٹی بھر اور مٹ جانے والے شئے ہے' پانی بھاپ بن کر اڑ جانے والا مادہ ہے' آگ بجھ کر راکھ بننے والی چیز ہے اور ہوا محض ایک جھونکا' مگر ان چاروں کے مجموعے نے ایک طوفان اٹھا رکھا ہے' ایک ہیجان برپا کر رکھا ہے' اور کارکنان قضا و قدر کو حیران اور خود شور و شعب اور ہاؤ ہو کا ہدف ایک ہی معلوم ہوتا ہے اور وہ ہے فطرت پر مکمل کنٹرول اور پھر ایک پر سکون اور لطف آمیز زندگی! انسان چاہ رہا ہے کہ زمین اس کے لئے سب کچھ اگل دے' آسمان نے جو کچھ قطعوں میں اتارنا ہے وہ ایک ہی بار برسا دے پہاڑ اپنے دفینے یکبارگی ظاہر کر دیں' آسمان سمندروں کے سینے میں جو کچھ ہے وہ فی الفور پیش کر دیں اور فطرت نے مستقبل کے پردے میں جو راز چھپا رکھے ہیں وہ آناً فاناً کھول دے' اس لئے انسان بہت جلدی میں ہے وہ آواز سے تیز رفتار راکٹ تیار کر رہا ہے' ایک ہی صفحے میں وہ جہاں بھر کے علوم سمو رہا ہے' وہ دنیا کی ہست و بود کا سارا نظام ایک ہی بٹن کے سپرد کر رہا ہے' وہ اپنی انگلی کا ایک پورا دبا کر سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے لا کھڑا دیکھنا چاہ رہا ہے' اس سرعت' بے صبری اور جلدی میں انسان وہ کچھ پامال کرتا چلا جا رہا ہے جسے اس کی آباؤ اجداد نے صدیوں میں جا کر استوار کیا تھا' انسان وہ سارے نشانات روند رہا ہے جو

Marfat.com

زندگی اور تہذیب کے سنگ ہائے میل ہیں' انسان وہ سارے رشتے توڑ رہا ہے جنہیں جوڑنے میں زمانے لگے ہیں' انسان وہ ساری بنیادیں اکھاڑ رہا ہے جنہیں جمانے میں کئی نسلیں کھپ گئیں' انسان وہ سب کچھ بہالے جا رہا ہے جنہیں جمع کرنے میں اجتماعی دانش صرف ہوئی اور انسان وہاں سے اٹھنے میں شتابی میں ہے جہاں اس کو بیٹھنے میں بڑی ریاضت سے کام لینا پڑا تھا' دیسی بدیسی بننا چاہتا ہے' ایشیائی یورپی بننا چاہتا ہے' فقیر امیر بننا چاہتا ہے' دیہاتی شہری بننا چاہتا ہے' خاک نشین محل نشین بننا چاہتا ہے' گدڑی پوش مخمل پوش بننا چاہتا ہے زیردست زبردست بننا چاہتا ہے' کوتاہ بے پناہ بننا چاہتا ہے اور قلندر وقت کا سکندر بننا چاہتا ہے' یہ تو ہے انسانی ذہن کا خاکہ اور تانا بانا' مگر خالق فطرت نے "اصول فطرت" اتنے محکم اور پائیدار بنائے ہیں کہ جبرائیلؑ و اسرافیلؑ انہیں پھلانگ نہیں پائے انسان آخر کتنا توڑ پائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص "فطرت" پر انسان کو تشکیل دیا ہے اور اللہ کا کلمہ کبھی تبدیل نہیں ہوتا' اور "کلمۂ الٰہی" کا دوسرا عنوان "فطرت" ہے' آیۂ قرآنی ہے۔ "اللہ کی اس فطرت کا اتباع کرو جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا' اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں' یہی ہے محکم دین' لیکن اکثر لوگ یہ نہیں جانتے۔" (الروم: ۳۰) جب انسان شاہراہ حیات پر بگٹٹ دوڑتے تھک جائے گا' دوڑ لگاتے ہانپ جائے گا' بھاگتے بھاگتے' اس کی سانس پھول جائے گی' جب تھک کر چور ہو جائے گا' جب اس کی خواہش دم توڑ جائے گی' جب اس کا شوق بکھر جائے گا' اور جب اس کی قوت جواب دے جائے گی' تب وہ دوبارہ "فطرت اللہ" کے سائے کی طرف لپکے گا اور وہ زندگی کے فطری راستے کو اپنائے گا' دوبارہ انہی چراغوں کو جلائے گا جنہیں وہ ایک پھونک مار کر بجھا چکا ہے' وہ انہی خیالوں کو آواز دے گا' جنہیں وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے' وہ انہی صداؤں پر کان دھرے گا جنہیں وہ "فقیر کی صدا" سمجھ کر نظرانداز کر چکا ہے' اور ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور عیسیٰؑ و محمد ﷺ کی دعوت کی طرف پلٹے گا جس دعوت کو وہ زمانہ قبل از تاریخ کی بات کہہ کر جھٹلاتا چلا آیا ہے' اس لئے کہ ان لوگوں کی آواز اپنی نہیں "خدا کی آواز" تھی' نوک زبان ان کی ہوتی تھی' لفظ و حرف اللہ کے تھے' یہ صرف پکارنے والے تھے' پکار اللہ کی تھی' وہی اللہ' جو فطرت کا خالق ہے' اور انسان فطرت سے نہیں لڑ سکتا' اور فطرت انسانی کیا ہے؟ اپنے رب سے جڑنا' مانگنا' اس کی پناہ ڈھونڈھنا اور اس کے قرب کا خواہاں ہونا' یہ خدا بیزاری کا رویہ غیر فطری ہے جسے بہرحال ختم ہونا ہے' آج نہیں تو کل' بچہ آخر ماں کی گود میں کتنی دیر دور رہ کر خوش ہو سکتا ہے؟

فطرتِ انسانی یہ ہے کہ وہ مختلف رشتوں میں بندھ کر رہے' ماں' باپ' بھائی' بہن' شوہر'

Marfat.com

بیوی، بیٹا، بیٹی، عہد حاضر میں بیگانگی کا فیشن مصنوعی ہے، اس میناکاری کا ملمع بہت جلد اترنے والا ہے، زیادہ سے زیادہ پچاس سال اور لگیں گے۔

فطرتِ انسانی یہ ہے کہ وہ انسانوں کی طرح رہے، ہنسے، کھیلے، اُچھلے، کودے، مٹی میں گرے، اور مٹی کا رزق کھائے، یہ زرق برق لباس، یہ فلک بوس، ہوٹل، یہ چھوئی موئی طبیعت، یہ لاجونتی مزاج، یہ قدم قدم پر وٹوکول، اور آتش و آہن اور گل و بلبل میں گھر کر رہنے کی عادت، یہ دورِ حاضر کے تکلفات ہیں، اور فطرت تکلف پسند نہیں، یہ زندگی کو دشوار کر دینے کے سامان ہیں، فطرتِ انسانی یہ ہے کہ وہ ابن آدم ہے، اور آدم مٹی سے بنے تھے، شاہ و گدا اور بندہ و آقا کا امتیاز بعد کی بدعات ہیں، اور بدعت کا معنی ہی، "نئی اختراع" ہے اور اختراع میں استحکام نہیں ہوتا، "آدمی" بننے کے لئے آج بھی وہی کچھ درکار ہے جو پہلے "ابن آدم" کے لئے تھا اور یہ جو کچھ آج ہے وہ اس وقت نہیں تھا، لیکن آدم تھا اور آدمی بھی، اور انسان کو پہلے کی طرح آج بھی جو درکار ہے وہ یہ ہے کہ معرفت الٰہی حاصل کرے عرفان نفس کا اہتمام کرے، نظام زندگی کو آسمانی ہدایت کے مطابق مرتب کرے، اور انسان بن کر رہے، نہ خدا بننے کا خبط پالے اور نہ حیوان کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالے، یہ ہدف حاصل کرنے کے لئے نہ فرعون بن کر انا ولا غیری کا نعرہ لگانے کی ضرورت ہے۔ اور نہ سکندر بن کر نصف دنیا کو تاراج کرنے کی حاجت، یہ مقصود پانے کے لئے نہ سات پردوں میں چھپنے کی کوئی وجہ ہے اور نہ بے لباس ہونے کی، یہ نصب العین پورا کرنے کے لئے نہ تاج و کلاہ ضروری ہے۔ اور نہ خدا کے علاوہ کسی کی پناہ لازمی، انسان اسی طرح رہنے کا ڈھنگ سیکھے جس طرح خدا کا سب سے پیارا بندہ ---- محمد ﷺ ---- رہتا تھا، یعنی وہ فرش خاک پر سوتے اور دوسروں کے دکھ پر روتے تھے۔ وہ بازار پیدل جاتے اور سوکھی روٹی کھاتے تھے، وہ بلالؓ کو اپنے برابر بٹھاتے اور اُسامہؓ جیسے غلام زادے کو اپنے کندھے پر اٹھاتے تھے، وہ اپنی رضاعی ماں حلیمہؓ کو اٹھ کر تعظیم دیتے اور نواسوں کا بوسہ لیتے تھے، کچے گھر کے باسی اور نئے عالمی نظام کے بانی تھے، وہ کتابیں نہیں انسان تصنیف کرتے تھے اور وہ دنیا سے اس حال میں رخصت ہوئے کہ خدا ان سے راضی تھا اور وہ اپنے رب سے خوش تھے، یہ ہے فطری زندگی اور زندگی کا حسن۔

(29 دسمبر 1998ء)

Marfat.com

"میرا حسینؓ ابھی کربلا نہیں پہنچا"

یہ عنوان قائم کرنے کا ذہن میں خیال یوں آیا کہ پاکستان مسائل و مصائب کی کربلا بھی بنا ہوا ہے' وسائل کا فرات اگرچہ بہہ رہا ہے لیکن اس پر ایک خاص کلاس کا قبضہ بھی ہے صرف تین دن کے نہیں برسوں کے پیاسے ایک ایک بوند کو ترس گئے ہیں' کربلائے وطن میں باقاعدہ دو کیمپ بھی قائم ہیں' خیمے بھی گڑے ہوئے ہیں' حسینیت کی علمبردار بے شمار جماعتیں بھی برسرکار ہیں' لشکر بھی تیار ہیں' ماشاء اللہ لیڈر بھی قطار در قطار موجود ہیں' لیکن اس کے باوجود مفادات کے طبلے پر تھرکنے اور پھدکنے والے لوگوں کے علاوہ خدا کی مخلوق خاموش ہے اور میدان میں اترنے پر آمادہ نہیں ہو رہی' جبکہ میدان سجنے کا سارا سامان آراستہ ہے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کا تجزیہ ہو کہ حالات کا جبر کسی کو باہر نکلنے نہیں دے رہا' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکومتی فورسز اتنی طاقتور ہیں کہ وہ کسی کو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دے رہیں' اس کا بھی امکان ہے کہ روزمرہ کے مسائل نے پبلک کو اس قدر گھائل کر رکھا ہے کہ عوام کسی تحریک چلانے کی طرف مائل نہیں ہو رہے' اس بات میں بھی ایک گونہ وزن ہے کہ لوگ بسا اوقات اپنے مفادات کے زیر اثر حالات کا رخ دیکھتے ہیں' یہ بھی کسی حد تک درست ہے کہ سابقہ سیاسی تحریکوں کے تجربات کے پیش نظر عوام کے لئے نیا ایڈونچر ناقابل التفات ہو' یہ خیال بھی بہت قابل قبول ہے کہ گردوپیش کے واقعات بھی ملک کے اندر کسی نئی صف بندی کے لئے سازگار نہیں' اور یہ رائے بھی بہت قابل لحاظ ہے کہ ہمارے ہاں سماجی' سیاسی اور معاشی تانا بانا ہی اس طرح بن دیا گیا ہے۔ اور رائے عامہ کو خبر اور تصویر اس انداز میں پہنچائی اور دکھائی جاتی ہے کہ ہر منظر دھندلا دھندلا رہتا ہے کھرے اور کھرے سچے اور جھوٹے' چور اور سادھ' کے بارے میں ذہن اور وژن کلیئر نہیں ہوتا اس لئے دوٹوک فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے' مگر اس سب کے باوجود ہمارے خیال میں لوگوں کے باہر نکلنے' سر پر کفن باندھنے' تن من لگانے اور خیمے جلانے میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ کربلا تو بہرحال برپا ہے لیکن کیسی ----- حسینؓ ----- کے پہنچنے کا انتظار ہو رہا ہے' جوں ہی وہ پہنچ گیا تو بظاہر ابن سعد کے لشکر میں رہنے والے فوراً ----حرؓ---- بن کر سامنے آجائیں گے' اور اپنی وابستگی ظاہر کر دیں گے' اس موقع پر مجھے مرحوم خاور رضوی کا ایک بہت ہی فکر انگیز اور وجد آمیز شعر یاد آرہا ہے۔

مرے جوہر کھلیں گے' خیر و شر جب ہوں گے صف آراء
مثال حرؓ میں ابن سعد کے لشکر میں رہتا ہوں

تمام تر مایوسیوں اور دل شکستگیوں کے باوجود یہاں وہ لوگ بڑی تعداد میں موجود ہیں

Marfat.com

جن کی رائے حق اور ناحق کے بارے میں بالکل واضح ہے، جن کے دامن پیوند آلود تو ہیں گند آلود نہیں، جو نفسا نفسی کے اس دور میں بھی اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر فیصلہ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، جو اپنے مفادات کی وجہ سے نہیں محض حالات کی وجہ سے خاموش ہیں، جو جان لٹانے پر آمادہ ہیں مگر اطمینان کر لینے کے عادی ہیں، کہ دھوکہ نہ ہو جائے، اس سے پہلے بہت بار ذوق گل بوسی میں لوگ اپنی زبانیں لہو لہان کر چکے ہیں۔ لشکر ابن سعد کی تمام تر سطوت وہیبت کے باوجود کئی لوگ اب بھی "حر" بننے کو تیار ہیں بشرطیکہ انہیں آگے کوئی "حسین" دکھائی دے، عباسی سلطنت امام حسینؓ کے نام پر بنی لیکن سب سے زیادہ قافلۂ حسینی پر مظالم توڑے گئے، آج بھی لوگ سوچتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو جیسا کہ اب تک ہوتا آیا ہے، ہماری آج کی لیڈروں کی "بھیڑ" میں کچھ "بھڑ" ہیں اور کچھ "بھیڑیں" ڈنگ مارنے والے اور ڈھیر ہونے والے۔

جب کہ لوگ اسوۂ حسینؓ کے پیرو کار رہنما کی تلاش میں ہیں، ایسا رہنما جو شہر عافیت و رحمت --- مدینۃ النبیؐ---- چھوڑ کر وادی کرب و بلا کو آباد کرے تاکہ قافلۂ انسانی کو رہنمائی اور ہدایت مل سکے ایسا رہنما جو روضۂ رسولؐ کے گنبد و مینار کے سایوں کی جگہ تلوار کی چھاؤں میں نمازِ عشق ادا کرنے کا پختہ ارادہ رکھتا ہو ایسا رہنما جو بھائی، بہن، بھتیجے، بھانجے اور بیٹے تک اپنے قافلے میں ساتھ رکھتا ہو تاکہ وقت آنے پر انہیں سب سے پہلے پیش کرے اور اپنے موقف کی صداقت ثابت کرے نہ یہ کہ بھائیوں کو پرمٹ دے، بہنوں کے نام پر بنکوں میں لاکر کھولے، بھتیجوں کو بنکوں کا چیئرمین بنائے، بھائیوں کو ضلع کونسل کی ممبری دلائے اور بیٹوں کو ایچی سن، کیلیفورنیا اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں میں داخل کرا کر اپنے ملک میں سیاسی بازی گری کے جوہر دکھائے، ایسا رہنما جو لب فرات تین دن تک بھوکا پیاسا رہ کر یزیدیوں سے ہاتھ ملانے پر تیار نہ ہو، ایسا رہنما، جس کو بھائی بازو کٹانے پر، بہن بازارِ شام میں پابجولاں ہونے پر، بھتیجے کے جان لٹانے پر، بھانجے ماؤں کی آغوش سے بچھڑنے پر، اور بیٹے پنگھوڑے میں تیروں سے چھلنی ہونے پر آمادہ و تیار ہوں، ایسا رہنما، جو شہادت کے بعد یہ کہتا ہوا لحد میں اترے۔

کردِ کج جبیں یہ سر کفن، مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن، پس مرگ ہم نے بھلا دیا

جس دن ایسا رہنما ہمارے میدان میں اترا تو ابن سعد کے لشکر سے ایک "حر" نہیں پورا "قافلۂ احرار" بڑے اعتماد اور وقار کے ساتھ نکل کر خیمۂ حسینؓ میں جا پہنچے گا، اور وہ قافلہ سب سے پہلے شہادت پا کر سابقہ تمام مصلحتوں کا کفارہ ادا کر دے گا۔

(5 دسمبر 1998ء)

"حسن"

انسانی جستجو کا آخری ہدف، نگاہ کا مرکز و محور اور سوچ کا حتمی نقطۂ "حسن" ہے، فرد کی زندگی میں حسن آجائے تو زندگی راحت بدوش اور اگر اجتماعی نظام میں "حسن" پیدا ہو جائے تو معاشرہ رحمت بداماں دکھائی دینے لگے، قدرت نے تو انسان کو "احسن تقویم" میں ڈھالا، مگر دو چیزوں نے اسے "اسفل السافلین" میں گرادیا، ایک ہوس زر، اور دوسرے حب جاہ، جب کہ حسن --زر-- میں نہیں نظر میں اور حسن ---جاہ-- میں نہیں نگاہ میں ہوتا ہے، کئی اہل زر دربدر بھیک مانگتے نظر آئے دولت انہیں آنکھ اور دل کی غربت سے نہ بچاسکی، اور کئی منصب دار باوقار انداز نہ اپنا سکے انہیں تخت و تاج بھی غنی مزاج نہ بناسکا۔

تجلیات کی کوئی کمی نہیں ماہر
دعا یہ مانگ کہ آئینہ آبدا رہے

جو لوگ قافلۂ حسن کے ہم رکاب ہوئے ان میں کوئی سقراط ہوا، کوئی افلاطون اور کئی بقراط و ارسطو، دیو جانس کلبی بھی اسی قافلے کا ہم راہی تھا، اور جنیدؒ اور بایزیدؒ بھی، رومیؒ و جامیؒ بھی اس کاروں کے حدی خواں تھے اور سعدیؒ بھی، غزالیؒ اور رازیؒ بھی اس جماعت کے فرد تھے اور شاہ ولی اللہؒ اور اقبالؒ بھی، ان کے گھر نہ کبھی زر آیا اور نہ یہ کسی بڑے منصب پر پہنچے، مگر ان کی عظمت علم، غیرتا فقر اور اسلوبِ سخن کو ایک زمانہ سلام کرتا ہے۔

قصر مرمر سے شہنشاہ نے ازراہ غرور
تیری کٹیا کو جو دیکھا تو بہت شرمایا

رہ گئے ہجوم زر کی خاک پھانکنے والے وہ دارا و سکندر ہوں، یا چنگیز و ہلاکو، وہ قیصر و کسریٰ ہوں یا جمشید و فریدوں، دولت کے انبار تو پا سکے تاریخ میں اعتبار نہ بنا سکے، جام جمشید کا محض کتابوں میں نام رہا ہے مگر سقراط کا زہر کا پیالہ تاریخ عزیمت کا مقدس حوالہ بن چکا ہے، زمین اپنے خزانے اگل دے اور آسمان سے بارش نہیں ہیرے موتیوں کی نوازش ہونے لگے، غربت اور افلاس کا پھر

Marfat.com

بھی خاتمہ نہیں ہو گا جب تک دل کا حرص اور آنکھ کی ہوس ختم نہ ہو' بادشاہ تخت طاؤس بنا کر بھی مطمئن نہ ہو سکے اور فقیر لوگ گھاس پھونس کے بستر پر راضی ہو گئے۔

ے
رئیس ہوں نہ امیر ہوں' نہ میں بادشاہ نہ وزیر ہوں
تیرا عشق ہے میری سلطنت' میں اسی کا ادنیٰ فقیر ہوں

انسان آج بھی "حسن" کو اپنا ہدف بنا لے تو دنیا کو مکروہات سے بچا سکتا اور خود بھی غم سے نجات پا سکتا ہے' زر و جاہ اگر انسان کو پناہ دے سکتے تو ہزاروں برس بعد انسان آج یقیناً --- خوف و حزن --- سے آزاد ہوتا' حسن ہر منظر کو بدل دیتا ہے' کئی لوگوں کو ہجوم میں تنہا دیکھا گیا اور ایسے کئی بھی ہیں جو خلوت سے انجمن کا لطف کشید کرتے ہیں' شرط صرف یہ ہوتی ہے کہ آدمی خود محشر خیال ہو' حسن نظر فریب بھی ہے اور دلآویز بھی' نظر کو بھاتا بھی ہے اور دل کو لبھاتا بھی' حسن جہاں ہو اور جس رنگ میں ہو۔

ے
اہل دل کے لئے سرمایہ ء جاں ہوتا ہے

یہ حسن ہی ہے جو پھول میں نکہت' چہرے میں صباحت اور تبسم میں ملاحت بن کر جلوہ گر ہوتا ہے' یہی حسن کردار میں ہو تو عظمت رویے میں ہو تو شرافت اور نصب العین میں ہو تو عزیمت بن جاتا ہے' یہی حسن شعور کو معرفت' نظر کو فراست اور فکر کی بصیرت عطا کرتا ہے' زبان میں فصاحت' اسلوب میں بلاغت' خیال میں ندرت اور ابلاغ میں سلاست' حسن کے طفیل پیدا ہوتی ہے' یہی حسن جب لہجے میں ڈھل جائے تو حلاوت' آنکھ میں آجائے تو مروت اور دل میں اتر جائے تو محبت کہلاتا ہے' یہ حسن پیشانی سے جھلکے تو سعادت اور پیکر سے چھلکے تو نزاکت کا رُوپ دھاتا ہے' اگر حسن سیاست میں آجائے تو اسے عبادت' قانون میں آجائے تو عدالت اور حکومت میں آجائے تو اسے سراپا خدمت بنا دیتا ہے۔

چال حسین ہو تو شاعر اسے آفت سے تشبیہ دیتے ہیں' انداز حسین ہو تو وہ متانت قرار پاتی ہے۔ اور آواز حسین ہو تو وہ قیامت ٹھہرتی ہے' وسعت نگاہ کا حسن ہے' خطابت زبان کا حسن ہے اور صداقت قلم کا حسن ہے' استدلال کے حسن سے حکمت اور اعمال و اخلاق کے حسن سے طریقت وجود میں آتی ہے' اور اسی طرح جنت زندگی کے حسن اور شہادت موت کے حسن کا دوسرا عنوان ہے۔

سراغ حسن دنیا کے میخانے میں نہیں دل کے پیمانے میں ملتا ہے' میخانے میں ڈوبنے کی نہیں

Marfat.com

پیمانے میں جھانکنے کی ضرورت ہے' جو دروں بینی سیکھ لے سمجھ لیجئے اسے جہاں بینی کا ہنر ہاتھ آگیا ہے۔

؎ دل کے ہر پردے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

انسان بذاتِ خود حسن کا مرقع اور تخلیق کا شاہکار ہے' یہ اگر خود اپنے آپ کو پالے تو گویا اس نے رازِ الٰہی اور رازِ کائنات دونوں پالئے' فلسفیوں' دانشوروں سائنسدانوں اور پیغمبروں میں جوہری فرق یہی ہے کہ پہلے تین طبقوں نے انسان کے گردو پیش کو موضوع فکر و فلسفہ بنایا جب کہ انبیاء نے خود انسان کو اپنا مرکز توجہ قرار دیا' جس سے انسان کو یہ احساس اور ادراک ہوا کہ وہ کل پرزوں کا مجموعہ ایک مشین' اور بوزنے کی اولاد نہیں بلکہ وہ اشرف المخلوقات اور خلیفتہ اللہ فی الارض ہے' اس سوچ سے پورا زاویۂ حیات اور فلسفۂ زندگی بدل جاتا ہے' اور یوں مادی کی بجائے معنوی حسن جستجو کا ہدف بن گیا' ارسطو نے انسان کو "حیوان ناطق" کہا ڈیکارٹ نے اسے "مشین" قرار دیا' روسو انسان کو ایک ایسا "وحشی" کہتا جسے بہرحال سدھایا جا سکتا ہے' تھامس ہابز کے ہاں انسان "ایک دوسرے کے لئے بھیڑیا" ہے ڈارون "بندر کی ارتقائی شکل" کو انسان کہتا ہے' فرائیڈ اولادِ آدم کو "جنسی جبلت کا پیکر" سمجھتا ہے' سارتر کی رائے تو بہت انتہا پسندانہ ہے وہ انسان کو جانور بھی کہتا اور عقل و خرد سے عاری بھی بتاتا ہے' مگر پیغمبروں نے انسان کو "رازِ الٰہی" "خلیفتہ اللہ" اور "روح اللہ" کہہ کر اسے تلاش کے لئے نیا اور روشن افق مہیا کیا' جب تک انسان "رازِ حسن" سے بیگانہ رہا وہ آگ' سورج' چاند' پہاڑ' دریا' اژدہا' دیوی' مورتی اور تصویر کی پرستش میں لگا رہا' جب اسے اپنی خودی کا شعور ملا' تو وہ پوری کائنات سے بلند تر ہو کر صرف خدائے برتر کے حضور جھک گیا' اور یوں اس کی زندگی میں حسن بھر گیا' نٹشے اسے "سپرمین" کہنے پر مجبور ہوا' اقبالؒ نے اسے "مردِ مومن" کے لقب سے یاد کیا' اور عبدالکریم الجیلیؒ کے ہاں وہ "انسان کامل" بن گیا۔

؎ آب و گل میں مدتوں آرائشیں ہوتی رہیں
تب کہیں اِک آدمی کونین کا حاصل بنا

(25 نومبر 1998ء)

Marfat.com

جنابِ وزیر اعظم! کیا آپ نے سوچ لیا ہے؟

۲۸ اگست ۹۸ء کی تاریخ اس لحاظ سے بہت اہم بن گئی ہے کہ وزیر اعظم میاں نواز شریف نے قومی اسمبلی میں خطاب کے دوران قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دینے کا اعلان کیا ہے' اور ساتھ ہی بل اسمبلی میں پیش کر دیا گیا' جو بالآخر کچھ مرحلوں سے گزر کر منظور ہو جائے گا' اس بل کی تیاری پر کتنا غور و خوض کیا گیا؟ کن کن سے مشاورت ہوئی؟ اس کے نتائج و عواقب کا کس قدر جائزہ لیا گیا؟ یہ بل پیش کرنے کا جذبۂ محرکہ کیا ہے؟ حکومتی ارکان اس باب میں کتنے مخلص اور پر جوش ہیں؟ عالمی سطح پر اس کے کیا اثرات ظاہر ہوں گے؟ مذہبی اقلیتیں اسے کس زاویے سے دیکھتی ہیں؟ اور سابقہ تجربات کی روشنی میں اس اقدام سے کیا فوائد اور نتائج متوقع ہیں؟ ان سب پہلوؤں پر کچھ عرصے تک بحث ہوتی رہے گی' لیکن ہمارے نزدیک یہ سارے معاملات فنی ہیں' علمی ہیں اور ساری مباحث نظری اور فکری ہیں' یہ مسئلہ فن اور علم سے نہیں یقین اور اذعان سے تعلق رکھتا ہے' اور یہ معاملہ محض فکر اور نظر کا نہیں ایمان اور نیت کا ہے' ہمارے عقیدے میں اسلام محض ایک ضابطہ نہیں جسے کہیں سے اٹھا کر نافذ کر دیا جائے بلکہ یہ ایک رویہ ہے جب تک یہ رگ و ریشے کا جزو نہ بنے اس کی برکات ظاہر نہیں ہوتیں' اس کے نفاذ سے پہلے کچھ آغاز مطلوب ہوتا ہے۔

دل میں طوفان وفا' آنکھوں میں سیل اشتیاق
عشق سے پہلے مزاج عاشقی پیدا کرو!

بسا اوقات لکھے ہوئے ضابطے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں لیکن دل سے ابلے ہوئے جذبے دنیا میں انقلاب اٹھا دیتے ہیں' ۴۹ء سے جب سے قرار داد مقاصد پاس ہوئی ہے سنتے آ رہے ہیں کہ اسلام نافذ ہو گیا ہے یا ہو رہا ہے مگر عوام جھولیاں پھیلا پھیلا کر تھک گئے ثمر ہاتھ نہیں آیا' دستور اسلامی کی مہم چلی' کمیشن قائم ہوئے' اسلامی تعلیمات بورڈ بنا' اسلامی مشاورتی کونسل بیٹھی' اسلامی نظریاتی کونسل تشکیل ہوئی' اعلانات ہوئے' اقدامات ہوئے' آرڈی نینس جاری ہوئے قانون بنے' حکمران آئے اور چل دیئے' اسلام انتخابی منشور کا حصہ بنا' تقریروں کا موضوع ٹھہرا'

Marfat.com

تحریروں سے گداز پیدا ہوا، نعروں کی گونج اٹھی، جلسے ہوئے، جلوس نکلے، مگر معلوم یہ ہوا کہ۔

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ جو مجھ کو دکھ تھے کچھ لادوانہ تھے

بلاشبہ اسلام ہمارے مسائل کا حل ہے، ہماری قومی عزت اور ہمارے ملی وقار کا ضامن ہے ہمارے ملک کی بنیاد ہے اور ہمارے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہے، شرط صرف یہ ہے کہ سب ادارے تو اس کے ماتحت ہوں ہی سب سے بڑھ کر یہ کہ خود حکمران اپنی ذات اس کے سامنے ڈھیر اور اپنی انا سرنڈر کر دیں اور اسلام کا معنی ہی خود سپردگی ہے، جب تک یہ شان پیدا نہیں ہو گی، نفاذِ اسلام کا عمل اپنی بہار دکھا نہیں پائے گا، سیاست باز اپنی سیاست کریں نکتہ طراز اپنے نکتے نکالتے پھریں، ذہنی غلام یورپ کو مطمئن کرنے میں لگے رہیں اور عادی مجرم اس میں کیڑے ڈالنے کا شوق پالیں ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں، بلکہ ہم تو وزیراعظم کی نیت پر شک بھی نہیں کرتے اس لئے کہ ہم ان کے حریف نہیں لیکن یہ گزارش بے موقع نہیں کہ اسلام کے لئے قانون سازی اتنی اہم نہیں جتنی سوزِ صدیقیؓ کی ضرورت ہے، فنی بحث درکار نہیں مزاج فاروقیؓ کا اظہار ہونا چاہیے، بل پاس بھی ہو جائے کوئی فرق نہیں پڑے گا جب تک اخلاص عثمانیؓ کی جھلک سامنے نہ آئے، اس سلسلے میں امکان کی مطابقت اور معاونت نہیں شجاعت علویؓ مطلوب ہے تب کام چلے گا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ساٹھ ستر برس کے بگاڑ کے بعد دوبارہ نفاذِ اسلام کیا تھا۔ مگر کاغذوں کے پلندے بغل میں داب کر نہیں جذبۂ صادق کو اپنا رہنما بنا کر آگے بڑھے تھے، اور برسوں کا سفر لمحوں میں طے کر لیا، جنابِ وزیراعظم اگر آپ نے سوچ لیا ہے کہ قرآن و سنت کو بالا دست بنانا ہے تو عوام اور بیورو کریسی سے پہلے خود کو قرآن و سنت کو سامنے زیر دست بنا لیجئے، پھر کوئی ملک میں زبردست نہیں رہے گا، اپنی چارپائی کے نیچے ڈانگ پھیر کر دیکھ لیجئے، آپ کے مال و دولت کا کیا عالم ہے؟ آپ کی بود و باش کیسی ہے؟ اولاد کا چلن کس طرح کا ہے؟ بھانجوں بھتیجوں کا مزاج کیا ہے؟ بیوی کا طرز زندگی کیسا ہے؟ اس کا جائزہ آپ کو لینا اور اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہو گا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ آپ کی طرح شہزادے تھے، جس طرح آپ وزیراعظم بننے سے پہلے وزیر اعلیٰ رہے وہ بھی امیرالمومنین بننے سے پہلے گورنر رہے تھے، جس طرح آپ کی خوش لباسی کا شہرہ ہے اسی طرح وہ بھی عرب میں جامہ زیب مشہور تھے، جس طرح آپ کے ہاں دولت کی ریل پیل ہے ان کے ہاں بھی یہی رنگ تھا، جس طرح آپ ہر وقت خوشبوؤں میں بسے رہتے ہیں وہ

بھی جس کوچے سے گزرتے تھے اسے مہکاتے چلے جاتے تھے' مگر جب انہوں نے مسند سنبھالی اور قرآن و سنت کو برتر بنانے کی ٹھانی' دنوں مہینوں میں نہیں چند ساعتوں میں امارت چھوڑ کر غربت اوڑھ لی' امیری کے حصار سے نکل کر فقیری کے حلقے میں داخل ہو گئے' لطف و لذت سے دستبردار ہو کر محنت و عزیمت کی راہ اختیار کر لی' خاندان کو قرآن پر قربان کر ڈالا' دوستوں کی رفاقت کو خدا کی محبت پر نچھاور کر دیا' بیوی بچوں کی آسائش کو اپنے لئے آزمائش سمجھ لیا' ریشمی دوشالے کھدر میں بدل گئے اور شاہی قصر حجرۂ فقر کا سماں پیش کرنے لگے' خلیفہ بنے تو شاہی سواریاں پیش کی گئیں' تو آپ نے فرمایا "میرے لئے خچر کافی ہے۔" آپ دارالخلافہ روانہ ہونے لگے تو کوتوال نے حسب دستور نیزہ اٹھا کر چلنا چاہا مگر آپ نے فرمایا "یہ کروفر آج سے ختم' میں تو مسلمانوں کا ایک معمولی فرد ہوں۔" علماء نے منبروں پر آپ کے نام کا خط پڑھنا چاہا تو فرمایا "میری بجائے سب مسلمانوں کے لئے نیک دعا کی جائے میں اگر سچا مسلمان ہوا تو اس دعا میں میرا بھی حصہ ہو گا۔" شاہی محل اور قصر خلافت میں پہنچے تو فرمایا "میرے لئے باہر خیمہ لگا دو' آج سے یہ محل میرے لئے جہنم ہے میں اس میں جلنے کو تیار نہیں۔" یہ سب مرحلے طے ہو گئے تو چہرے کا رنگ فق ہو گیا' آنکھیں بجھ گئیں اور پیشانی پر لکیریں ابھر آئیں' گھر کی خادمہ نے پوچھا' یا امیر! کیا ماجرا ہے؟ آپ نے فرمایا "آج میں مشرق و مغرب کے ہر یتیم و مسکین اور بیوہ کا جواب دہ بنا دیا گیا ہوں پھر مجھ سے زیادہ قابل رحم اور کون ہو سکتا ہے؟" گھر تشریف لاتے ہی اپنی اہلیہ یعنی خاتون اول سے فرمایا (جو خلیفہ عبدالملک کی بیٹی تھیں۔) اپنا وہ بیش قیمت جواہر جو تمہیں تمہارے باپ نے دیا تھا بیت المال میں داخل کر دو یا مجھ سے اپنا تعلق ختم کر لو" گھر سے مطمئن ہو کر باہر نکلے اور اپنے والد سے لے کر امیر معاویہ کے وارثوں تک کو جا لیا اور تمام جائیدادیں ان سے واگزار کرائیں' کہ یہ سب ناجائز اموال تھے' روپے' اشرفیاں' زیورات' زمینیں سب کچھ اگلوا لیا' حتیٰ کہ حکومت عراق کا خزانہ خالی ہو گیا' اور اخراجات کے لئے دمشق سے رقم منگوائی گئی' بعض "خیر خواہوں" نے مشورہ دیا' حضور! حالات بدلتے دیر نہیں لگتی' کچھ اپنی اولاد کے لئے تو اندوختہ کر لیں؟ آپ نے فرمایا "میں انہیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔" شاہی اصطبل کی سواریاں فروخت کر دیں' شاہی خاندان کے وظیفے بند کر دیئے' سارے کا سارا پروٹوکول درہم برہم کر دیا' اپنی ذات اور سرکاری عمال پر خزانہ خرچ کرنے کے بجائے بیروزگاروں' یتیموں' مسکینوں' محتاجوں' بیواؤں' کے لئے بیت المال کا منہ کھول دیا' بعض گورنروں نے لکھا اس طرح تمام خزانہ خالی ہو جائے گا۔ آپ نے جواباً کہا "جب تک اللہ کا مال

Marfat.com

موجود ہے اللہ کے بندوں کو دیتے چلے جاؤ جب خالی ہو جائے اس میں کوڑا کرکٹ بھر دو۔"

جب مدینے کے گورنر تھے تو ذاتی سامان تیس اونٹوں پر لاد کر لایا گیا مگر خلیفۂ وقت بنے تو تن کے کپڑوں کے علاوہ صندوق میں کچھ نہ رہا انہی کپڑوں میں وفات پائی اور انہی کپڑوں کا کفن نصیب ہوا' یہ محض جھلکیاں تھیں' ورنہ تو کتابوں کا مواد موجود ہے' جناب وزیر اعظم! آپ دیکھ لیجئے کہ یہ سب کچھ کرنے کا آپ کے اندر حوصلہ ہے؟ وزارتِ عظمیٰ کا ٹھاٹ بھاٹھ رکھتے ہوئے' کرسی کا جاہ و جلال موجود ہوتے ہوئے' اور گھر بار کی شان و شوکت کے برقرار رہتے ہوئے قرآن و سنت بالادست نہیں ہو سکتے' آپ کی فیکٹریاں بھی بڑھتی رہیں' نئے سے نئے بنگلے بھی تیار ہوتے رہیں' آپ کے رفقاء احتساب سے بھی بالاتر رہیں' آپ کے بچے اڑن کھٹولوں میں دنیا بھر کی سیر کرتے رہیں' آپ کا خاندان لطف و لذت کے ہر زاویے سے محظوظ ہوتا رہے' آپ کی کابینہ کے ارکان پہلے کی طرح مست ہیں' بڑے لوگ عدالتوں کو چیلنج دیتے پھریں کہ ہمیں گرفتار کر کے دکھاؤ' آپ کے عزیز رشتہ دار ہر کاروبار میں اپنا حصہ ڈالتے رہیں اور پھر بھی قرآن و سنت بالادست ہوں اور نفاذِ اسلام کے ثمرات ظاہر ہوں' ایسا ممکن نہیں' آپ اور آپ کا خاندان سب سے پہلے جھک جائے پھر کوئی "آکڑ خان" نہیں ٹھہر سکے گا۔

(2 ستمبر 1998ء)

"جس روز سب راز فاش ہو جائیں گے"

شیخ ابو القاسم قشیریؒ نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "رسالہ قشیریہ" میں حلقۂ صوفیاء کے امام حضرت جنید بغدادیؒ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ

"میرے ماموں اور مرشد شیخ سری سقطیؒ نے کئی بار اس خواہش کا اظہار کیا کہ کاش میری موت بغداد سے باہر واقع ہو اور میں کسی اجنبی گاؤں کے قبرستان میں دفن کیا جاؤں اور یہ میں اس لئے چاہتا ہوں کہ کہیں میری قبر مجھے قبول کرنے سے انکار نہ کر دے اور میں رسوا ہو جاؤں۔"

یہ لرزا دینے والی بات اس شخص نے کہی جس کے تقویٰ' نیکی' قربِ الٰہی اور پاکبازی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جنید بغدادیؒ جیسا صوفی اور زاہد ان کا مرید تھا' جس کا نام تصوف اور تقویٰ کے ہم معنیٰ' اور دنیا کے لئے ضرب المثل بن چکا ہے' یہ بات وہ شخص کہہ سکتا ہے جسے اپنے عمل پر ناز نہ ہو بلکہ خدا کے فضل پر اعتماد ہو' جسے اس کا احساس ہو کہ خدا کے ہاں کسی کی شخصیت نہیں بلکہ اس کی نیت دیکھی جاتی ہے' جو بخوبی جانتا ہو کہ رب کی بارگاہ میں چہرہ نہیں رویہ مقبول ہوتا ہے' اور جو یہ ادراک رکھتا ہو کہ دنیا میں نقاب کام دے جاتے ہیں آخرت میں ہر حجاب اتر جائے گا۔

انسان زندگی کی دوڑ میں اس قدر تیزی سے آگے بڑھ رہا ہوتا ہے کہ اسے پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی بسا اوقات فرصت نہیں ملتی' یا وہ ایسی زحمت گوارا نہیں کرتا یا پھر اسے بلا ضرورت سمجھتا ہے' ایک انسان اپنے علم کے زور پر لوگوں کو اپنا پیرو کار بنا لیتا ہے' دلائل کے زور پر وہ بڑے بڑوں کو مسحور کر لیتا ہے' نکتہ آرائیوں اور سخن سنجیوں سے ایک زمانے کا دل موہ لیتا ہے' اور حسن کلام سے عوام کو غلام بنا لیتا ہے' اسی طرح کوئی تصوف کی مسند سجا کر لوگوں کی عقیدتوں کا مرکز بن بیٹھتا ہے' ہاتھ میں تسبیح لے کر لوگوں کے جذبات کشید کرتا ہے' عبا اور قبا میں ملبوس ہو کر اپنی بزرگی کا سکہ جماتا ہے' من موہنی باتوں سے آنے والے کا دل لبھاتا ہے اور مسکین سی صورت اور یتیم کی

شباہت بنا کر دنیا سے اپنی بے نیازی کا اشتہار دیتا ہے اور ایسے ہی ایک آدمی لوگوں کی معاشی مجبوریوں کا استحصال کر کے سیاست میں قدم رکھتا ہے' شب و روز گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنے اخلاص کے دعوے دہراتا ہے' سٹیج پر آ کر اپنا سب کچھ اپنے مشن اور عوام کے لئے لٹا دینے کا اعلان کرتا ہے' گرمی سردی میں چھلاوہ بن کر شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک کا کونا کونا گھومتا ہے' زکام اور بخار میں بھی رابطۂ عوام جاری رکھتا ہے' اور اقتدار سے نفرت اور عوام سے محبت کی قسمیں کھاتا ہے' ان مظاہر کے نتیجے میں ہزاروں لاکھوں لوگ جوش عقیدت سے مغلوب ہو کر علم والے کی جوتیاں سر پر رکھتے' صبح و شام اس کے در کی حاضری بھرتے اور اس کا ایک ایک لفظ ریکارڈ اور پھر نشر کرتے ہیں۔

مسند نشین کو پہنچا ہوا بزرگ' خدا رسیدہ صوفی' راہ طریقت کا سالک' اور کامل و برگزیدہ شیخ مان لیتے ہیں' اپنا پیٹ کاٹ کر اس کا لنگر چلاتے ہیں' اپنا آپ بھول کر اسے یاد کرتے ہیں' دل ہی دل میں اس کا تصور باندھتے ہیں' دنیا بھر میں اس کے تذکرے اور چرچے پھیلاتے ہیں' اس کی کرامات سے اپنا گردوپیش سنوارتے ہیں اور جوق در جوق حاضر ہو کر اس کی خانقاہ کی رونق بڑھاتے ہیں۔

سیاستدان کو اپنی امیدوں کا مرکز ٹھہراتے ہیں' اس کی قسموں کا اعتبار کھاتے ہیں' اس کی مورتی دل کے مندر میں سجاتے ہیں' ملک بھر میں اس کے بینر لہراتے ہیں' گلی کوچوں میں اس کے نام کے ہنگامے اٹھاتے ہیں' اس کی باتوں کو ہر جگہ پھیلاتے ہیں' اس کی خاطر جیل جاتے اور کوڑے سہتے ہیں' عوام پورے اخلاص کے ساتھ عالم کا' پیر کا اور سیاستدان کا ساتھ نبھاتے ہیں' لیکن آدمی کو اول تو ہر وقت ورنہ کسی نہ کسی وقت اکیلے بیٹھ کر اپنے آپ پر نظر ڈال لینی چاہیے کہ کیا میں فی الواقع وہی ہوں جو نظر آتا ہوں' اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا تو یہ دھندے مجھے دنیا میں تو کام دے جائیں گے' آخرت کے پھندے سے مجھے کون چھڑائے گا؟ کہا جاتا ہے کہ ایک بزرگ نے کسی فاحشہ سے کہا تھا کہ تجھے ذرا بھی خوف خدا نہیں کہ تو بن ٹھن کر لوگوں کو اپنے جال میں پھانستی اور اپنا مطلب نکالتی ہے' تو فاحشہ نے پلٹ کر اس ظاہری شکل و صورت سے بزرگ نظر آنے والے شخص کو یہ کہہ کر حیرت و ندامت کے دریا میں غرق کر دیا "میں جو کچھ ہوں وہی نظر بھی آتی ہوں مگر یہ فرمائیے کہ آپ جس طرح نظر آتے ہیں۔"

کیا فی الواقع ویسے ہی ہیں؟

انسان اگر گاہے گاہے یہ جائزہ لیتا رہے تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلے گا۔

Marfat.com

"ارے اللہ میرا بھرم رکھ لے۔"

ورنہ منظر کس قدر شدید اور کانٹوں کی باڑھ کی طرح سینے میں آنے والا لمحہ کس قدر تکلیف دہ ہو گا کہ خدائے ذوالجلال کسی عالم' کسی پیر اور کسی سیاستدان کے سارے منصوبے اور راز' ان کے چاہنے والوں کے سامنے کھول دے' کہ اس کی نکتہ آرائی کے پیچھے کیا تھا؟ اس کی عبا و قبا میں کیا چھپا تھا؟ اور اس کے دعوؤں اور نعروں کی حقیقت کیا تھی؟

اس منظر کا تصور کر کے انسان کی ساری سخن سازی' اس کی تقویٰ طرازی اور اس کی سیاست بازی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہے کہ میں اپنے چاہنے والوں' حلقۂ بیعت میں بسنے والوں اور ووٹ دینے والوں کا کس منہ سے سامنا کروں گا' جب بے نیاز خدا میرے چہرے سے ایک نقاب سرکاتا اور پیروکاروں سے کہتا جائے گا کہ لو پہچان لو' یہ ہے وہ "غزالیِ زماں" اور "رازیِ دوراں" یہ ہے وہ "جنید وقت" اور "بایزید عصر" اور یہ ہے کہ وہ "قائد عوام" اور "محافظ جمہوریت"

یہ سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ سو سال کی گذری زندگی اس ایک لمحے کی تاب نہ لا سکے گی' زندگی بھر کی سج دھج اس الٰہی فیصلے کی گھن گرج کے سامنے ماند پڑ جائے گی اور ساری دنیا کی سخن وری ایک ہی نقاب الٹنے سے دھری کی دھری رہ جائے گی۔

اے میرا اللہ' اے میرے فضل عمیم والے رب' اے کریم و رحیم خدا' اے ستار العیوب پروردگار' میں تیری چشم پوشی کا امیدوار ہوں' تیری صرف نظر کا طالب ہوں' تیری معاف کر دینے کی عادت کا منتظر ہوں' اور تیری ڈھانپ دینے کی سنت کا آرزو مند ہوں' بھلا یہ کس انسان میں حوصلہ ہے خواہ وہ قطب ہو یا ابدال' شمس العلماء ہو یا خطیب لاثانی' شیخ المشائخ ہو یا صاحب سجادہ' قائد انقلاب ہو یا رونق مسند حکومت' کہ وہ منظر دیکھ پائے جب بڑے بڑے عالموں کے فلسفے رد کئے جا رہے ہوں گے' جب بڑے بڑے خطیبوں کی زبانوں کو آگ سے داغا جا رہا ہو گا' جب بڑے بڑے پیروں کے جبے چیتھڑے بنا کر ہوا میں لہرائے جا رہے ہوں گے' جب بڑے بڑے صوفیوں کی تسبیح کے دانے ایک ایک کر کے بکھیرے جا رہے ہوں گے' اور جب بڑے بڑے قائد انقلاب اپنا اپنا نقاب الٹے جانے کے انتظار میں کھڑے ہوں گے۔

اے اللہ میرا بھرم رکھ لے اے اللہ میرا بھرم رکھ لے

(1 جون 1999ء)

Marfat.com

میڈے شکوے دا اعتبار نہ کر چلو آپ ڈسامیڈا کیا رہ گے

عوام بہت بے صبری سہی' بڑے ناشکرے سہی' لالچی اور اتھلے سہی' جذباتی اور اتھرے سہی' مگر اے نظام زر کے خداؤ' تم خود ہی بتاؤ' جب غریب ذلت کی حد تک پہنچ جائے' مسائل پوری طرح وسائل پر حاوی ہو جائیں' مفلسی اور بے روزگاری کے باعث شوہر اپنی بیوی سے آنکھیں چرانے اور باپ اپنے معصوم بچوں سے منہ چھپانے پہ آجائے تو صبر کہاں سے آئے اور کلمہء شکر کیسے ادا ہو؟ غرض اور ضرورت بندے کو لالچی اور کم ظرف بنا ہی دیتی ہے اور مایوسی انسان کو جذباتی اور غصیلا کر ہی دیتی ہے۔

وزیراعظم ہوں یا ان کے وزراء اور رفقاء' وہ ایک دن کا ایک لمحہ بھی ان حالات سے نہیں گزرے جن سے کروڑوں انسان زندگی بھر گزر رہے ہیں۔

ارب پتی وزیراعظم کو کیا پتہ کہ اس گھر کا کیا حال ہے جہاں موم بتی بھی نہیں جلتی' کروڑوں میں کھیلنے والے وزراء کو کیا خبر کہ ہزاروں لوگ پکوڑوں کے ساتھ روٹی کھانے کو بھی ترس رہے ہیں' قیمتی اور لمبی کاروں کے مالک مشیروں کو کیا علم کہ بے کاروں' بے روزگاروں اور فاقوں کے ماروں کے دین' ایمان اور عقیدے پر روزانہ کیا قیامتیں گزرتی ہیں؟

عوام کو طعنے دینے والے توند باز وزیروں اور افسروں کو کوئی سمجھائے عوام کی نظریں تمہاری بڑی کرسی پر نہیں ان کا ماتم اپنی کس مپرسی پر ہے' عوام میکڈونلڈ کے برگر اور اطالوی پیزے نہیں مانگتے' انہی پرل کانٹی نینٹل ہوٹل کے ناشتے' اواری کے لنچ اور ہالیڈے ان کے ڈنر کا پکا نہیں' انہیں تازہ پھلوں کے جوس' اور کولڈ کافی پینے کا شوق نہیں' یہ چیخنے چلانے والے عوام صرف اتنی سہولت کے طلبگار ہیں جن سے ان کا بھرم اور عزت رہ جائے' وہ کراموپل ہسپتال میں داخل ہونے اور علاج کروانے کے خواہاں نہیں صرف یہ چاہتے ہیں کہ اتنی طبی سہولت تو میسر ہو کر ان کا لخت جگر محض معمولی بخار کے ہاتھوں جان نہ ہار بیٹھے' اور معمولی سر درد زندگی کا روگ نہ بن جائے۔

جناب وزیراعظم! آپ اور آپ کے وزراء بہت اچھی تقریریں کر لیتے ہیں لیکن راقم الحروف آپ اور آپ کے تمام وزراء کے مقابلے میں بہت اچھا خطیب ہے مگر میری تقریر میرا کچھ نہیں سنوار سکی' تو آپ کی تقریر عوام کا کیا سنوارے گی؟

خود ہی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے' آپ کی طبیعت ذرا بے چین ہو تو ڈاکٹروں کا بورڈ آپ کے سرہانے کھڑا ہوتا ہے کوئی آدمی بیمار ہو تو اس کے لئے دس روپے کے ہسپتال کی پرچی دل میں برچھی بن کر لگتی ہے' آپ کی دیکھ بھال کے لئے سپیشلسٹ ڈاکٹر' ہومیوپیتھ فزیشن اور

Marfat.com

مایہ ناز یونانی طبیب سرکاری خرچ پر ہمہ وقت دستیاب ہیں' اور عام آدمی کے لئے ۱۰۴ء ڈگری بخار کے باوجود محلے کے ڈاکٹر کو ڈھونڈنا حضرت خضرؑ کو تلاش کرنے کے برابر ہے' پچاس سال سے ہر حکومت یہ کہتی چلی آرہی ہے کہ بس ذرا صبر اور تھوڑا انتظار کرو' ملک خوشحال ہونے والا ہے' اچھا دور آنے والا ہے' اور سب مسائل حل ہونے والے ہیں' اس امید میں ایک نسل کھپ چکی ہے' اس انتظار میں کئی آنکھیں پتھرا چکی ہیں' اور اس خیال میں کروڑوں انسان بدحال ہو چکے ہیں مگر صورت یہ ہے کہ اس عرصے میں ایک روپے سیر والا آٹا آٹھ روپے کلو ہو چکا ہے دس روپے کلو گھی' پچاس روپے تک پہنچ چکا ہے' آٹھ آنے کلو والے پیاز دس روپے کلو تک آچکے ہیں' دو روپے کلو چینی کا بھاؤ بیس روپے تک چڑھ چکا ہے' اور پانچ روپے کلو ملنے والی دال تیس روپے کلو میں دستیاب نہیں' صبر کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے؟

جناب وزیراعظم' گذشتہ دنوں آپ کی طبیعت ذرا ناساز ہوئی تو آرام کے لئے آپ ہوائی جہاز میں اسلام آباد سے اڑ کر لاہور پہنچ گئے اور اپنے ساٹھ کنال کے رائے ونڈ والے گھر میں پورا دن آرام فرماتے رہے' وزیراعظم پنجاب کو نزلہ زکام ہوا تو مری کے ریسٹ ہاؤس میں شفٹ ہو گئے' عام آدمی کیا کرے؟ اور کہاں جائے؟ عام آدمی تو کنویں میں گرے ہوئے اس اندھے کی مانند ہے جو کہیں جانا بھی چاہے تو نہیں جا سکتا' اندھا آخر جائے گا تو کہاں جائے گا کھلی اور بھری دنیا میں اسے نظر تو پھر بھی کچھ نہیں آتا' کہیں جا کر کیا کرے گا؟

عام آدمی ایک ایسے صحرا میں کھڑا ہے جہاں کوئی دیوار بھی نہیں کہ سر ٹکرا کر مر جائے' وہ ایسے قبر نما گھر میں رہتا ہے جہاں ذرا پاؤں پسارے تو اس کے گھر کا حدود اربعہ ختم ہو جاتا ہے' مہنگائی کے اس دور میں ہر عیالدار آدمی کو ایک مہینے میں کم از کم بیس ہزار روپے گھر چلانے کے لئے درکار ہیں' لیکن اسے بیس سو روپے میں گزارا کرنے کی تلقین کی جاتی ہے جب کہ ان تلقین کرنے والوں کے لاڈلے پچیس ہزار روپے صرف جیب خرچ لیتے ہوں گے۔

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اس نظام زر کے ناخداؤں اور ملک کے فرمانرواؤں کا ایک ایک ڈرائنگ روم اور اس میں سجے ہوئے نوادرات اور نمائشی ظروف اس ملک کے کم از کم ایک ہزار عام آدمی کے مکان سمیت مجموعی اثاثے سے زیادہ قیمتی ہیں' ایسے میں لوگوں کو وعدوں سے بہلانا' تقریروں سے تسلی دینا اور صبر کی تلقین کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ عوام کا شکوہ بچگانہ ہی سہی حکمرانوں کا رویہ بھی تو انتہائی ظالمانہ ہے۔

(3 ستمبر 1999ء)

Marfat.com

سیاسی انحطاط کا مرثیہ

یوں تو ایک عرصے سے ہماری سیاست طوائف کی طرح تماش بینوں میں گھری ہوئی ہے لیکن پچھلے چند سالوں سے تو عجب مضحکہ خیز صورت حال دیکھنے کو مل رہی ہے' سیاست جو کسی زمانے میں پیغمبری مشن کا درجہ رکھتی تھی وہ رفتہ رفتہ اس موڑ پر آگئی ہے کہ مسخرے اس میدان کے شہسوار اور نظریاتی لوگ اس کوچے سے بے دخل ہو کر رہ گئے ہیں' کوئی بااصول' سنجیدہ اور بالغ نظر آدمی بھول کر اس گلی میں قدم رکھ بیٹھے تو اس کا حشر وہی ہوتا ہے۔ جو لڑکوں بالوں کی محفل میں کسی سفید ریش کا۔

سیاست سوچ بچار کا نام تھا اب محض مار دھاڑ ہو کر رہ گئی ہے' سیاست نظریہ و کردار کا نام تھا اب فقط اکھاڑ پچھاڑ ہے' سیاست اصولوں کا پیشہ تھا اب ابو الفضولوں کا مشغلہ بن چکی ہے' سیاست علم کی ایک شاخ تھی اب ماتھے کا داغ ہو چکی ہے' سیاست حالات سدھارنے کی تدبیر تھی اب اہل وطن کے لئے تعزیر کا درجہ اختیار کر چکی ہے' سیاست ایک فلسفہ تھا اب ایک لطیفہ کی سطح پر آگئی ہے' سیاست قوم کے فکری ارتقاء کی راہ تھی اب عوام کے لئے عقوبت گاہ ثابت ہو رہی ہے۔

جس طرح افراد اور اقوام کو زوال آتا ہے اس طرح بعض اصطلاحات بھی اس کی زد میں آجاتی ہیں' اس وقت ہمارے ملک میں سیاست ایسے ہی کسی گردابِ زوال اور طوفان انحطاط میں ہے' حالت یہ ہو گئی ہے کہ جو ایم بی بی ایس ہے وہ ڈاکٹر' جو یونیورسٹی یا کالج میں پڑھائے' وہ پروفیسر' جو قرآن و حدیث اور فقہ کا ماہر ہو وہ عالم' ان میں سے کوئی سیاستدان کہلانے کا حقدار اور ہم اسے سیاستدان ماننے کے روادار نہیں' اور جو لوگ (الا ماشاء اللہ) بلیک میلر' سمگلر' رسہ گیر' صاحب جاگیر' تھانوں کے ٹاؤٹ' مفرور ملزم' جگا ٹیکس وصولنے کے ماہر' منافقت کے چمپئین' پارٹیاں بدلنے کے عادی' ٹیکس چور' کمیشن خور' موگے کاٹنے والے' علم دشمن اور بینک لوٹنے والے ہیں وہ سب "سیاستدان" کے لقب سے ملقب ہیں' یہ فقرہ زبان زد عام ہے کہ "ملک کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو رہا۔" ظاہر ہے جو لوگ مسائل کی جڑ ہوں ان سے مسائل کے حل کی توقع بلی سے دودھ کی رکھوالی

Marfat.com

کرنے والی بات ہو گی' آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے سیاست کرنے والے لوگ بھی فرشتے نہیں تھے لیکن ایسے "شطرے" بھی نہیں تھے جن سے ان کے بعد قوم کا پالا پڑا ہے ان کی طرزِ سیاست سے اختلاف کے باوجود بہرحال یہ ماننا پڑتا ہے' کہ ان میں سے اکثر صاحب علم تھے' وہ دماغ رکھتے تھے' ملکی و بین الاقوامی امور کے ماہر نہ سہی واقف ضرور تھے' ان کے چال ڈھال میں شہدہ پن نہیں تھا' کچھ سوچ کر سیاست میں آئے تھے' اصول و نظریات کو بازاری جنس نہیں سمجھتے تھے' ان کی کچھ اقدار تھیں' کچھ روایات تھیں' محض دشنام طراز اور گردن فراز نہیں تھے' وہ کسی حادثے کی پیداوار نہیں بلکہ سیاسی عمل کا معتبر حصہ تھے' انہیں مرقع خوبی نہ بھی کہا جائے تاہم وہ مجموعۂ خرابی نہیں تھے' بات صرف یہ ہے کہ اوسط نکالنے سے ان کی خوبیوں کا پلڑا بھاری نظر آتا ہے' اور آج جو ٹیم میدان سیاست میں ہے ان کے عہد میں جینا یوں محسوس ہوتا ہے کہ جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں۔ بہت دور کی نہیں ربع صدی قبل کی بات ہے کہ سیاست ایک چلہ تھا' مسیں بھیگ رہی ہوتی تھیں کہ کوئی سیاسی کارکن بنتا تھا' لویں سفید ہو جاتی تھیں تب کہیں سیاسی عہدہ ملتا تھا اور بال دودھ ہو جاتے تھے کہ ایک اعتبار اور مقام بنتا تھا اور اب دولت جیب میں اور کلاشنکوف ہاتھ میں ہو تو چوتھے دن وزارت قدموں میں ہوتی ہے یہ سیاست ہے' بیوپار ہے یا غنڈہ گردی؟ سکندر مرزا بڑا آمر تھا' جابر تھا' عیار تھا' مگر ہمہ مقتدر ہونے کے باوجود صدارت سے علیحدگی کے بعد لندن میں ایک ہوٹل پر ملازم ہوا اور آج ایک ایم پی اے چاہے تو ایک ہی ٹرم میں زندگی بھر پیرس اور لندن میں خاندان سمیت شاندار زندگی بسر کر سکتا ہے۔

ذرا ماضی پر نظر ڈالیں تو ارباب سیاست سے اختلاف کے باوجود کتنے قابل احترام لوگ تھے جو اس صف میں نظر آتے ہیں' مولانا محمد علی جوہر' مولانا ابو الکلام' لیاقت علی خاں' خواجہ ناظم الدین' مولانا مودودی' چودھری محمد علی' مفتی محمود' نوابزادہ نصر اللہ خان' حسین شہید سہروردی' ممتاز دولتانہ' قاضی محمد عیسیٰ' مولوی فرید احمد' نور الدین' محترمہ فاطمہ جناح' مقصد تمام نام گنوانا نہیں ان میں سے کسی کے نظریۂ سیاست سے اختلاف کے باوجود ان کے بارے میں یہ گمان نہیں گزرتا کہ یہ سیاست کو تجارت سمجھتے تھے' تاش کی بازی سمجھ کر سیاست کھیلتے تھے۔ ان لوگوں نے زندگی کے قیمتی ادوار اس دشت نوردی میں صرف کئے تھے' حکومت مناصب کا چارٹ بھی اٹھا کر دیکھ لیا جائے' تو زوال و انحطاط کا مفہوم سمجھ میں آجائے گا' ایک دور میں لیاقت علی خاں' چودھری محمد علی' حسین شہید سہروردی جیسے لوگ وزارتِ عظمیٰ پر فائز رہے' اس کے بعد کیا ہوا؟ تفصیل جان

Marfat.com

کر شرمندگی ہوتی ہے۔

عبدالرب نشتر پنجاب کے گورنر رہے' پھر یہ گورنری کس کس کے پاس آئی' اہل علم بخوبی واقف ہیں' سر فضل حسین اور ممتاز دولتانہ جیسے لوگ وزرائے اعلیٰ اور ایس ایم ظفر جیسے لوگ وزیر قانون ہوا کرتے تھے' اور پھر چشم بددور چودھری امیر حسین جیسے لوگ بھی وزیر قانون بنے' ایک دور میں ذوالفقار علی بھٹو اور شریف الدین پیرزادہ جیسے شہ دماغ وزیر خارجہ رہے اور ایک وقت آیا کہ زین نورانی بھی وزیر خارجہ بن گئے' کبھی غلام اسحاق خان وزیر خزانہ اور غلام فاروق خان وزیر تجارت ہوا کرتے تھے' محمد شعیب اور این ایم عقیلی ان مناصب پر رہے اور بعد ازاں یٹین وٹو جیسے "ماہر مالیات" اس منصب پر فائز ہوئے' علامہ اقبالؒ نے ان حادثوں سے پہلے مصرع موزوں کیا تھا۔

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

شائد ان کی دیدہ وری مستقبل میں جھانک رہی تھی' آج کا ہر دوسرا سیاستدان "الطاف حسین" ہے جسے اپنی ذاتی محرومیاں سیاست میں لے آئیں' جو خادم بننے سے پہلے مخدوم بن بیٹھا' جو احترام کی روائت کے مقابلے میں انتقام میں دلچسپی لیتا ہے' جس کی نظر عوام کی مجبوریوں پر کم اور سیٹھوں کی تجوریوں پر زیادہ ہے۔ جو "پیر" کہلانے کا شوقین تو ہے مگر پیر مغاں جیسا مردِ خلیق نہیں' آج کا سیاستدان وہ ہے جس کو نلک نے خواجگی تو بخش دی ہے مگر آدابِ بندہ پروری سے اب تک واقف نہیں ہو سکا' جس ملک کی سیاست کے قافلے کا ہر دوسرا راہی "الطاف حسین" اور "آصف زرداری" ہو اس قافلے کو راہزن سے نہیں راہبر سے بچاؤ کی تدبیر کرنی چاہیے' اور واقعہ یہ ہے کہ قصور الطاف اور زرداری کا بھی نہیں اس سیاسی نظام کا ہے جس کے شکم میں جب بھی دردِ زہ ہوتا ہے ایسے ہی پوت جنم دیتا ہے' ہلدی کی گانٹھ ملنے پر پنسار کی دکان سجا لینے والے سبھی لیڈر ایسے ہی ہوتے ہیں' خواہ ان کی پارٹیاں اور نام مختلف ہوں' ہم بھی تو اسے ہی فوراً لیڈر مان لیتے ہیں' جو بگولے کی طرح اٹھے اور آندھی کی طرح چھا جائے حالانکہ وقت کی گرد بیٹھ جانے کا انتظار کر لینا چاہیے۔

(11 اکتوبر 1998ء)

Marfat.com

"اور زمین اپنے سب بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی"

صحیفۂ انقلاب قرآن حکیم کے آخری پارے کی سورۂ "الزلزال" اس وقت میرے پیش نظر ہے، جس کا نمبر شمار ۹۹ ہے، اور اس وقت اتفاق سے پوری دنیا اور ہم ۹۹ء سے گزر رہے ہیں، سورۂ مبارکہ کا ترجمہ اور مفہوم کچھ اس طرح ہے۔

"جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی، اور زمین اپنے اندر کے سب بوجھ نکال کر باہر اُگل دے گی اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہو رہا ہے؟ اس روز وہ اپنی ساری داستان کھول کر بیان کر دے گی کیونکہ تیرے رب کا یہی حکم ہو گا، اس دن لوگ تن تنہا نکلیں گے تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھائے جائیں، پس جس نے رائی برابر نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہو گی وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔"

اس سورہ میں اگرچہ ظہورِ قیامت کا خاکہ پیش کیا گیا اور اس کے مناظر کی سنگینی اور ہولناکی کو واضح کیا گیا ہے، لیکن اس سورۃ کی تلاوت کرتے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے ارض وطن کا نقشہ گھوم رہا ہے، اس سورۃ کو زلزلے کا نام اسلئے دیا گیا ہے کہ غافل لوگوں کے لئے قیامت کا اچانک وقوع ایک زلزلے سے کم نہیں ہو گا، وہ لوگ جو زمین میں بڑے سکون سے رہ رہے تھے زمین کا اچانک تھرا اُٹھنا ان کے حواس گم کرنے کے لئے کافی ہو گا، جنھوں نے اپنے دفینے اور خزانے بڑے اطمینان سے دبا رکھے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ انکی ہوا تک کسی کو نہیں لگے گی وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ جائیں گے کہ زمین نے وہ سب کچھ لمحوں میں اگل ڈالا ہے جو انہوں نے برسوں اور کئی پشتوں سے جوڑا اور چھپایا تھا، جو لوگ چور دروازوں سے حکومت اور دولت حاصل کرتے اور سازشوں سے اُسے محفوظ بناتے تھے زمین ان کی ساری کہانی بیان کر دے گی، وہ لوگ جو نعرے باز کارکنوں کے ہجوم میں گھرے رہتے اور خود کو مامون و محفوظ سمجھتے تھے، جن کی پشت پر بڑی بڑی برادریاں تھیں، جنھوں نے لسانی، صوبائی اور علاقائی بنیادوں پر بڑے بڑے لشکر اور جتھے تیار کر رکھے تھے، اور

Marfat.com

جنہوں نے بہت پر فریب نعرے اور پروگرام دے کر عوام کو ہمنوا بنالیا تھا' قیامت کے روز الگ الگ اور تن تنہا قبروں سے نکلیں گے' نہ استقبالیہ ہجوم' نہ ہار پہنانے والوں کا رش' نہ جلسۂ عام' نہ پر جوش مظاہرے' نہ دورویہ قطاریں' نہ سلامی کے چبوترے' نہ گارڈ آف آنر' نہ چپ راست کرنے والے مستعد فوجی دستے' نہ دھمال ڈالنے والی ٹولیاں' نہ گلپاشی کرنے والے جیالے' نہ زندہ باد کے ہانگرے اور نہ واہ واہ کے ڈونگرے' بس اکیلا انسان ہو گا اور چار سو پھیلی ہوئی تنہائی' دل کھا جانے والا سناٹا اور سینہ چیر دینے والی اجنبیت' یہ سب کچھ اس لئے ہو گا تاکہ انسان اپنا نامۂ اعمال بڑے آرام سے اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ سکے' دنیا میں یہ غافل' یہ ظالم' یہ باغی یہ طاغی' یہ مفسد یہ عیار اور نافرجام اور کوڑھ اندام لوگ اپنا ہر جرم اپنے حواریوں کے نعروں میں چھپالیتے تھے' اپنی ہر خرابی کا جواز زر خرید دانشوروں کے ذریعے ڈھونڈ لیتے تھے' اپنے ہر بگاڑ کی توجیہ اپنے مشیروں سے کروا لیتے تھے' اور اپنے ہر ظلم کو مظاہرین کے جوش میں دبا لیتے تھے لیکن قیامت کے روز ان کے کرائے کے بلوائی تو کیا ماں جائے بھائی بھی ان کے ساتھ نہیں ہوں گے' جب میں یہ سورہ پڑھ چکا تو پاکستان کی صورت پر غور شروع کر دیا اور ذہن میں آیا کیا اس وقت ارض وطن بھی ایک ایسے زلزلے کی زد میں نہیں؟ جو حالات سب کچھ اُگل دے؟ جتنی سازشیں' جتنے جوڑ توڑ' جتنے مکرو فریب' اور جتنی عیاریاں اس ملک میں روا رکھی گئیں ہیں کیا وہ وقت آنہیں گیا کہ زمین ساری کہانیاں سارے خفیہ گوشوں اور رازوں سمیت کھول دے؟ سرزمین وطن خیر سے خالی نہیں' حد سے بڑھی ہوئی مایوسی بھی بہتر نہیں اور لوگوں میں تبدیلی پیدا کرنا بھی مناسب نہیں لیکن کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ پچاس سالوں میں جن کے پاس اقتدار رہا وہ سب کچھ تھے مگر اس کے اہل نہ تھے' ذہین تھے' مگر امین نہ تھے' عیار تھے مگر پرہیز گار نہ تھے' ہنرور تھے' مگر وسیع النظر نہ تھے' صاحب مال تھے مگر صدق مقال نہ تھے' اپروچ والے تھے مگر اونچی سوچ والے نہ تھے' اور کیا یہ ناخوشگوار حقیقت نہیں کہ یہاں کے وڈیرے نے ہاری کا خون بھی نوچا اور اس کی عصمت کو بھی لوٹا؟ یہاں کے سرمایہ دار نے مزدور کا ہڈ تن جلا دیا مگر پیٹ بھر کر روٹی نہ دے سکا؟ یہاں کے ہر افسر نے ہر سائل کو بے عزت بھی کیا اور خالی ہاتھ بھی لوٹایا؟ یہاں کے مقتدر طبقوں نے جی بھر کر ملکی وسائل کو اس قدر کھنگالا کہ ملک کو کنگال کر کے رکھ دیا؟ اگر یہ سب حقائق ہیں اور بہت تلخ ہیں تو پھر اس واقع کے ظہور میں بہت زیادہ تاخیر نہیں لگتی' جو کچھ دنوں کی بات رہ گئی ہے' اور وہ حادثہ ہونے والا ہے جو لحیم شحیم لوگوں کو بکھرے ہوئے پتنگوں میں بدل ڈالے گا' جو پہاڑ قامت جاگیرداروں کو دھنکی ہوئی

Marfat.com

روئی کے گالے بناڈالے گا' جو اپنی زور دار ٹاپوں کی بڑی توند والوں کو گرد و غبار میں ڈھال دے گا' ان کے پیٹ کی قبریں سب کچھ اُگلنے اور ان کے سینوں کے صندوق کھلنے پر مجبور کر دیئے جائیں گے' تخت الٹتے اور تاج اچھلنے پر کوئی اپنی آنکھوں سے دیکھے گا' نہ خوش کلامی کام آئے گی نہ نازک اندامی۔

فرعون کو بڑا غرور تھا کہ میں مصر کے انہار و اشجار کا مالک ہوں مگر خدائے قہار نے اس کا سارا اعتبار و وقار دریا برد کر دیا' قارون کو بڑا ناز تھا کہ اس کے خزانے کی چابیاں کئی لوگ مل کر اٹھاتے ہیں مگر خدائے عادل کے ایک فیصلے نے اس کا بھٹہ بٹھادیا' اور ولید بن مغیرہ کو بڑا مان تھا کہ وہ بڑی برادری کا سرپنچ ہے' اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے؟ مگر خدائے وحدہٗ لاشریک نے ایسا انتظام کیا کہ اس کا خاندان بان باٹنارہ گیا اور ولید حسرت و یاس میں ہونٹ کاٹتا نظر آیا۔

ابو جہل کے اس گھمنڈ سے بھی ایک زمانہ آگاہ ہے کہ اس کے سر پر غرور پر کوئی ٹوپی پوری نہیں آتی تھی مگر دو نوعمر بچوں معاذؓ اور معوذؓ نے اس کے سر کو فٹ بال کی طرح اچھال کر اس کی ساری نخوت ریت کا ڈھیر بنادی' یہی کہانی خسرو پرویز کی ہے' یہی داستان قیصر روم کی ہے' یہی کتھا زارِ روس کی ہے' اسی حشر سے ایران دوچار ہوا اور اسی انجام کے گھاٹ مار کوس اُترا' لیکن اللہ کا یہ کہا بھی کتنا سچ ہے کہ عبرت صرف اہل بصیرت حاصل کرتے ہیں۔ اربابِ حکومت تو جب تک سانس حلق تک نہ آجائے رب موسیٰؑ اور ہارونؑ پر ایمان نہیں لاتے۔"

ہمارا عیش پرور اور لذت اندوز طبقہ جو آج ہزاروں ایکڑ کا مالک ہے ایک مرلے کو بھی اپنے خلاف گواہی سے نہیں روک سکے گا' اور ہماری رولنگ کلاس جو خود کو رعایا کی زندگی اور موت کا مالک سمجھتی ہے وہ اپنی آنکھ' کان اور اپنے ہاتھ پاؤں کی شہادت کو نہیں جھٹلا سکے گی' اس لئے کہ قیامت کا دن ہو یا یوم انقلاب' اس روز کسی موروثی یا جمہوری حکمران کا نہیں خدائے احکم الحاکمین کا حکم چلتا ہے' ایسا حکم جو نہ بدلتا ہے اور نہ ٹلتا ہے۔

(17 مئی 1998ء)

Marfat.com

اے خیالِ یار اُس دنیا میں پہنچا دے مجھے

اِرد گرد اگر جان کا وبال بن جائے تو پھر خیال ہی ہوتا ہے جو لمحے بھر کو سہی طبیعت کو نہال کر دیتا ہے اور اسی طرح اگر معاشرہ عذاب ہو جائے تو کچھ خواب رہ جاتے ہیں' جو کسی درجے میں انسان کو شاداب رکھتے ہیں' خیال ذہن کا ایک اُبال ہی سہی وقتی طور پر دل کا ملال دھو دیتا ہے اور خواب نقش بر آب ہی سہی منظر کو لمحاتی تب و تاب دے ہی جاتا ہے' دامن فکر اگر خیال و خواب سے بھی خالی ہو جائے تو باقی متاع فقیر کیا رہ جاتی ہے؟

اہل اقتدار نے زندگی کو بار بنا رکھا ہے' اہل زر نے سچی قدروں کو دربدر کر رکھا ہے' اور دانش خام نے ہر آرزو کو ناتمام چھوڑ رکھا ہے' ایسے میں انسان خواب و خیال کا بھی سہارا نہ لے تو وہ بے چارہ بے موت مارا جائے گا' لکھنے والوں نے اپنا سارا ذہن قلم کی نوک کے ذریعے نچوڑ کر رکھ دیا' دل والوں نے اپنا درد اس "بیدردی" کے ساتھ بیان کیا کہ درد ہی دل کا پتہ بن گیا۔

ے
درد اُٹھ اُٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانہ دل کا

اور اہل زبان نے پورا زورِ خطابت صرف کر ڈالا' مگر خدا سمجھے اُن لوگوں سے جن کے ہاتھ میں زُمام کار تھی' انہوں نے ہر تمنا اور دُعا "بیکار" کر ڈالی' اہل فکر کی تجویزیں کوڑے دان کی نذر ہوئیں' لوگوں کے نعرے دم گھٹ کر رہ گئے' عوام کی امیدیں مایوسیوں کی دُھند میں گم ہو گئیں اور خلق خدا کے سہارے ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے۔

تہی دامنوں کے پاس خواب رہ جاتے ہیں' شکر ہے ایک تو خوابوں پر ابھی پابندی نہیں لگی' اور دوسرے خواب دولت سے خریدے نہیں جا سکتے' ورنہ یہ بھی کسی بڑی حویلی اور اونچے بنگلے کی ملکیت قرار پا چکے ہوتے۔

غنیمت ہے جو خواب ابھی زندہ ہیں' افلاطون ہر اعتبار سے ایک بڑا آدمی تھا' بڑا نام' بڑا دماغ اور بڑا حوالہ' اس نے بھی Utopia لکھ کر کچھ خواب ہی جمع کیے تھے' گو کہ اب تک تشنۂ تعبیر ہیں' جو شخص "مال مست" اور "کھال مست" نہیں' وہ ضرور خواب دیکھے گا اور خیال پالے گا' اور

ایک بڑا سا ---- کاش ---- اس کے ہر جملے کا آغاز قرار پائے گا' اور "یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔" اس کی ہر بات میں شامل ہو گا' صرف اپنے لئے نہیں' سب کے لئے پورے معاشرے کے لئے میری بھی کچھ حسرتیں خواب بن کر خیالوں میں ڈھلتی رہتی ہیں' خوش بھی رکھتی ہیں اور تنگ بھی کرتی ہیں' میں نے یہ تو کبھی نہیں سوچا کہ میرے نیچے بھی پچیس فٹ لمبی گاڑی ہو' گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لئے ملازم مامور ہو' ایکڑ بھر کا بنگلہ ہو' کانوں سے ہر وقت موبائل فون چپکا ہوا ہو' ٹریولز چیک اور کریڈٹ کارڈز سے جیب ہر وقت بوجھل ہو' ہوائی جہاز ہمہ وقت سٹینڈ بائی ہو' سرما گرما کے الگ الگ Huts ہوں' اور ہر محفل میں اونچی کرسی میرے لئے وقف ہو' اگرچہ ایسے خواب دیکھنے والوں کی بھی کمی نہیں لیکن یہ خواب بالآخر سراب اور مخلوق خدا کے لئے عذاب بن جاتے ہیں۔

؎ خدا مجھ کو ایسی خدائی نہ دے
کہ اپنے سوا کچھ سجھائی نہ دے

البتہ یہ خواب وقت کا بہت سا حصہ لے جاتے ہیں' کبھی دماغ اُبل پڑتے ہیں' کبھی قلم سے ٹپک پڑتے ہیں' کبھی خیال میں مچل اٹھتے ہیں' اور کبھی نوک زبان پر تڑپ اٹھتے ہیں' میں کچھ اس طرح کے خواب دیکھتا ہوں۔

- کاش ہمارا معاشرہ اس طرح کا بن جائے کہ کبھی کسی خالی پیٹ شریف کو بڑی توند والے کمینے کے پاس اپنی ضرورت لے کر نہ جانا پڑے۔
- کسی اہل علم کو صاحب مال کا ماتحت نہ ہونا پڑے۔
- کسی کو جان و تن کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے اپنی عزت نفس گروی نہ رکھنی پڑے۔
- کسی باپ کو اپنی بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے امداد کی غرض سے اخبار میں اشتہار نہ دینا پڑے۔
- کسی ماں کو بیٹے کے علاج کے لئے زکوۃ دینے کی اپیل نہ کرنی پڑے۔
- کسی خود دار کو اپنی وضعداری کا بھرم رکھتے ہوئے ایسا مرحلہ پیش نہ آئے کہ اسے موت کی آرزو کرنی پڑے۔
- کسی بھائی کو اپنی یتیم بہنوں کی کفالت کے لئے لوگوں کی گاڑیاں صاف کرنے' جھوٹے برتن مانجھنے' سرما کی ٹھٹھرتی راتوں میں "گرما گرم انڈے" کی صدا لگانے' اور علی الصبح خالی پیٹ ہاتھ میں رنگ کا ڈبہ اور کوچی پکڑ کر کسی سٹاپ پر روزگار کے انتظار میں بیٹھنے اور ہر ایک کی

Marfat.com

طرف طلب بھری نظروں سے دیکھنے کی نوبت نہ آئے۔

- ایسا نظام قائم ہو جائے جس میں کسی کی پگڑی کا طرہ' نسب کا شجرہ' حکومتی عہدہ اور کسی جاگیر اور فیکٹری کا حوالہ نہ دیکھا جائے' بلکہ ہر ایک کی متاع انسانیت' ذاتی شرافت اور علمی قابلیت کو ملحوظ رکھا جائے۔
- یتیم کے آنسو آنکھ سے گرنے' بیوہ کی چیخ فضا میں ابھرنے' محتاج کی ضرورت شرمندگی کی سلوٹ بن کر پیشانی پر اُترنے' اور بے بس کی فریاد لب پر آنے سے پہلے آنسو پونچھنے' چیخ روکنے' حاجت پوری کرنے اور فریاد سننے کا اہتمام ہو جائے۔
- کسی کا منصب اور کسی کی دولت دیکھ کر اس کی عزت اور خوشامد کرنے کا کلچر ختم ہو جائے' عزت صرف علم اور عظمت صرف کردار کے لئے وقف ہو جائے۔
- ایسا انقلاب آئے کہ کسی کی عزت اچھالنے والوں کے سر اچھال دیئے جائیں' لوگوں کے پیٹ کاٹنے والوں کے پیٹ پھاڑ دیئے جائیں' اور سیاسی' سماجی اور معاشی تمام "مہاشے" سرعام "تماشے" بنا دیئے جائیں' تاکہ استعداد اور انصاف واحد معیار رہ جائے۔

ے
خواب میں جو کچھ نظر آئے غنیمت جان لو
جاگنے کے بعد یہ منظر کہاں رہ جائیں گے

(11 فروری 1999ء)

Marfat.com

"ایک یہ حکمران ہیں' ایک وہ حکمران تھے۔"

ہمارے اگلے پچھلے حکمرانوں کی تقریریں اور باتیں پڑھ کر دیکھ لیجئے' یہ لوگ عوام کی عقیدت کا استحصال کرنے کے لئے یا تو خلفاء راشدین اور یا پھر غریب پاکستانیوں کو مرعوب کرنے کے لئے یورپ اور امریکہ کا ذکر بکثرت کرتے ہیں' لیکن یہ بات ہمیشہ فہم سے بالاتر رہی کہ یہ اپنے طرزِ عمل سے نہ خلفائے راشدین کے پیرو نظر آتے ہیں اور نہ اپنے انداز و اطوار میں یورپین اور امریکن حکمرانوں جیسی تبدیلی لاتے ہیں' ہمارے حکمرانوں کو ہیروئن کے نشے کی حد تک جس چیز کا لپکا ہے وہ ہے اپنی ذات کو طاقت کا سرچشمہ بنانا اور خود کو قانون سے ماوراء سمجھنا اور دوسرے ہر بات میں نمود و نمائش اور پروٹوکول' اس بیماری کا اصل سبب یہ ہے کہ ان لوگوں کو فلک نے غلط بخشی کر کے خواجگی تو دے دی ہے مگر روش بندہ پروری سے یہ لوگ ابھی تک آگاہ نہیں ہو سکے' یہ سمجھتے ہیں کہ کروفر سے آدمی لوگوں میں معتبر ٹھہرتا ہے' بڑا بننے کے لئے بڑی گاڑی' بڑا محل اور بڑا پروٹوکول لازمی ہوتا ہے' طاقتور ہونے کے لئے سب سے پہلے قانون کو کمزور کرنا ضروری ہے' اور تاریخ میں نامور کہلانے کے لئے صاحب زر ہونا چاہیے' مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ شہرت اور عزت میں زمین آسمان کا فرق ہے' شہرت تو ظالم کی بھی ہو سکتی ہے مگر عزت صرف عادل کی ہوتی ہے' شہرت تو کسی صاحب زر جاہل کی بھی ہو سکتی ہے مگر عزت صرف عالم فاضل کی ہوتی ہے' شہرت تو کسی قاتل کی بھی ہو سکتی ہے مگر عزت صرف رحم دل کی ہوتی ہے' شہرت تو ہر صاحب اقتدار کی ہوتی ہے مگر عزت صرف صاحب کردار کی ہوتی ہے' چنگیز نے ایک بار اپنے ساتھیوں سے پوچھا تھا۔

"کیا میرا نام تاریخ میں زندہ رہے گا؟"

بہت سے چپ رہے ایک بول اٹھا "آپ کسی کو زندہ چھوڑیں گے تو کوئی یاد کرنے والا باقی رہے گا۔" یہی حال نمائشی حکمرانوں کا ہوتا ہے یہ عوام کو سہولت دیں گے تو عزت پائیں گے' رہ گئی شہرت تو وہ ہر دور کے فرعون' قارون اور ہلاکو کو حاصل رہی ہے' خواہش نمود بڑے بڑوں کو نیست و نابود کر دیتی ہے لیکن کام بہرحال نیک نام بنا دیتا ہے' خلفاء راشدین کا ورد کرنے والے حکمرانوں کو

Marfat.com

معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی عزت محلات میں رہنے سے نہیں رات کو پہرہ دینے سے بڑھی' حضرت ابو بکرؓ کو کپڑے کے تھان کندھے پر رکھ کر بیچنے میں کوئی عار نہ تھی' حضرتِ عمرؓ کو بیت المال کا گم شدہ اونٹ بنفس نفیس ڈھونڈھنے میں کوئی تامل نہ تھا' حضرتِ عثمانؓ کو امارت سے غربت کے سفر میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی' اور حضرتِ علیؓ کو ایک یہودی کی نالش پر عدالت میں پیش ہونے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ تھی' رہ گئے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تو ان کی پہلے سالانہ آمدنی پچاس ہزار اشرفیاں تھی' امیرالمومنین بنے تو آمدن دو سو اشرفی رہ گئی' جب کہ ہمارے ہاں کنگال آتے ہیں اور مال دار ہو کر جاتے ہیں' عمر بن عبدالعزیزؒ خلافت سے پہلے دو ہزار درہم کا جوڑا زیب تن کرتے تھے۔ خلیفہ بنے تو پانچ درہم کے لباس پر اکتفاء کیا' تبھی تو ان کے انتقال پر قیصر روم نے یہ تبصرہ کیا تھا کہ "کوئی راہب دنیا چھوڑ دے تو کوئی تعجب نہیں حیرت تو اس پر ہے جس کے قدموں میں دولت دنیا بچھی تھی مگر اس نے فقیرانہ زندگی بسر کی۔" اسی طرح امریکہ کا وظیفہ پڑھنے والے حاکموں کو خبر ہونی چاہیے کہ ریگن' بش اور کلنٹن امریکہ کا طرۂ امتیاز اور نشان اعزاز نہیں بلکہ امریکہ کو طاقت اور عزت جارج واشنگٹن نے دی ہے جس نے امریکی قوم میں "رعیت" کا تصور ختم کر کے "شہری" کا شعور پیدا کیا' جو خود کو امریکہ کا صدر کہلوا کر نہیں بلکہ جمہوریہ کا پہلا شہری کہلوا کر خوش ہوتا تھا' قوم نے اسے تاحیات صدر رہنے کی درخواست کی مگر وہ تیسری بار صدر بننے پر کسی صورت آمادہ نہ ہوا اور اپنی آخری عمر کاشتکاری کرتے ہوئے گزاری' امریکہ کا تیسرا صدر تھامس جیفرسن جب قلمدان صدارت سنبھالنے ایوان صدر میں داخل ہوا تو اکیلا اور پیدل چل کر آیا' سٹیج پر اونچی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے حاضرین میں بیٹھا

یہ حقیقت میں بڑے لوگ تھے' یہ شہرت کے بھوکے نہیں عزت کے طالب تھے اور تاریخ نے انہیں ان کا حق دیا اور جی بھر کر اور دل کھول کر دیا ہے' انہیں "آنریبل" لکھوانے "ہز ایکسیلنسی" کہلوانے "رستم ثانی" منوانے اور "زندہ باد" کے نعرے لگوانے کا بخار نہیں تھا' بگھی میں سوار ہونا' ہیلی کاپٹروں میں اڑنا' حفاظتی دستوں کے جلوس میں چلنا' زرنگار کرسیوں پر بیٹھنا' زرق برق لباس پہننا' موٹروے پر لمبی ڈرائیو کا لطف لینا' قصیدہ گوؤوں کی محفلیں سجانا' اور دو دو سو حواریوں کے وفود لے کر دنیا جہاں کا سیر سپاٹا کرنا ان کے شوق میں شامل نہیں تھا' تاریخ ماضی کی سیاست ہوتی ہے اور سیاست حال کی تاریخ' جسے چاہیں بنا لیں۔

(20 ستمبر 1999ء)

Marfat.com

اپنی ہستی پہ نہ اِترائے کوئی کوہ غرور

ہم گوشہ نشین نہ کسی کے حلیف سخن ساز اور نہ حریف دشنام طراز' ہم کسی کے جانے پر ٹسوے بہانے اور کسی کے آنے پر شادیانے بجانے والے بھی نہیں' یہ کام انہیں مبارک جن کا رزق اس سے وابستہ ہے کہ وہ جانے والے کے عیب چنتے اور آنے والے کے لئے سر دُھنتے ہیں' ہم ان "جیالوں" میں بھی نہیں جو رخصت ہونے والے پر الزام تراشی اور تشریف لانے والے کی راہ میں گل پاشی کرنے کو اپنا "فرض منصبی" اور اپنی کامیاب "حکمت عملی" سمجھتے ہیں' بحمد اللہ ہمارے قلم نے نہ کسی حکام کی "رحلت" پر "مرثیہ" لکھا اور نہ کسی کی "ولادت" کا قصیدہ پڑھا' نہ کبھی دارا و سکندر کی "منقبت" پڑھی اور نہ کبھی بابر و اکبر کی حکایت لکھی' نوک قلم بس ایک جگہ اٹکی رہی' کہ یہ زمین خدا کی ہے اور اُس نے کسی کو پٹے پر نہیں دے رکھی' نہ اس پر کسی کلنٹن کا اجارہ ہے اور نہ یلسن کا پہرہ' نہ بھٹو کے نام گروی ہوئی ہے اور نہ شریف فیملی کے نام رجسٹری' حاکم صرف خدا ہے باقی سب خادم' جو "حاکمیت" اور "خدمت" کا فرق بھول جاتا ہے اس کی مہلت ختم کر دی جاتی ہے۔ اور یہی سنت الٰہی ہے' حاکم بدلتے رہیں گے' ایوان حکومت بجھتے اور بگڑتے رہیں گے' آئین بنتے اور ٹوٹتے رہیں گے' نظام ابھرتے اور ڈوبتے رہیں گے' تخت بچھتے اور اُلٹتے رہیں گے' تاج ادلتے اور بدلتے رہیں گے' محل اٹھتے اور گرتے رہیں گے' فرامین شاہی چلتے اور مٹتے رہیں گے' اور سلطنتوں کے کنارے پھیلتے اور سمٹتے رہیں گے لیکن نہ خدا بدلے گا اور نہ اس کی سنت تبدیل ہو گی۔

یبقٰی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام اور "لا تبدیل لکلماتِ اللّٰہ"

یہ دو قرآنی آیتیں ہیں اور ازلی و ابدی صداقتیں' خدا کا چہرہ (اقتدار) اور خدا کا کلمہ (سنت) دائمی ہے' باقی جو کچھ ہے یا فریب نظر ہے یا فریب نفس! کلی کا نقطۂ تکمیل یہ ہوتا ہے کہ وہ پھول بن جائے' چکور کی معراج یہ ہوتی ہے کہ وہ چاند تک پہنچ جائے' قطرے کی آرزو یہ ٹھہرتی ہے کہ وہ دریا ہو جائے اور ذرہ چاہتا ہے کہ وہ صحرا میں ڈھل جائے' یہ ساری خواہشیں جائز ہیں لیکن بندہ بھی یہ سوچنے لگ جائے کہ وہ خدا بن بیٹھے' تو ایسا نہ ہوا ہے نہ خدا ہونے دیتا ہے' بندہ بہت زور آور ہو تو رستم و سہراب بن جائے گا' دنیا بھر کی دولت سمیٹ لے تو قارون تک جا پہنچے گا' اپنی سلطنت کو جتنا بھی وسیع کر لے سکندر کا رتبہ پا لے گا بہت کروفر سے کام لے گا تو جمشید و فریدوں کا ہم پلہ ہو جائے گا' گردن بہت ہی اونچی کر لے تب بھی فرعون سے ٹکر کھائے گا' اور حد سے زیادہ نیک ہو جائے تو جنیدؒ و بایزیدؒ کی صف میں جا بیٹھے گا'

Marfat.com

اس سے زیادہ نہ بندے کی حیثیت ہے اور نہ اس سے آگے بڑھنے کی اسے اجازت ہے' جہاں جبریلؑ کو قدم دھرنے اور پر مارنے کی جرأت نہیں وہاں پیکر خاکی کو ہاتھ بڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر برا ہو ہوس کی ناتمامی اور آرزو کی تشنہ کامی کا' انسان بعض اوقات اس کنارے پر بھی جا پہنچتا ہے جہاں آگے ڈوبنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔

بڑے بڑوں کے "نقارے" خاموش ہو گئے' "میاں" اور "بی بی" کے نعرے کب تک گونجتے؟ عبرت کے ہزاروں نشان موجود ہیں لیکن حیرت ہے کہ دھیان کوئی نہیں دیتا' میاں نواز شریف کے اقتدار سے اس طرح رخصت ہونے کی بیسیوں وجوہ گنوائی جا سکتی ہیں' لیکن سب سے بڑی وجہ ان کا "لمن الملک" کا کوس بجانا ہے' یعنی کون ہے جو میرے سامنے ٹھہرنے کا دعویٰ کرتا یا یارا رکھتا ہے؟ بجا کہ موجودہ آئین وزیراعظم کو بہت بااختیار بناتا ہے لیکن وہ بھول گئے کہ یہ اختیارات بھٹو صاحب نے اپنے لئے سمیٹے تھے' لیکن ان کا اپنا بوریا سمٹ گیا' بعد میں آنے والے کیوں غلط فہمی کا شکار ہو گئے؟ "اختیار" کسی کو کچھ نہیں بناتا "اعتبار" فیصلہ کن ہوتا ہے' اعتبار نہ رہے تو اختیار مٹھی میں بھری ہوئی ریت ہے جو پھسلتے دیر نہیں کرتی' بندہ بھی کتنا کم ظرف ہے ذرا اختیار ہاتھ لگے تو بے کنار ہونے لگ جاتا ہے' اور اس کا دل کرتا ہے کہ وہ عزت و ذلت اور حیات و موت کے سارے فیصلے آپ ہاتھ کر لے' اگر اللہ کی سنت میں یہ ہوتا تو آج کے حکمرانوں کے مقابلے میں فرعون اور شداد' چنگیز اور ہلاکو' ہٹلر اور مسولینی اس کے زیادہ حقدار تھے' لیکن سنت الٰہی یہ نہیں' سنت الٰہی یہ ہے کہ وہ اقتدار کسی کو یا تو انعام کے طور پر دیتا ہے یا امتحان میں ڈالنے کے لئے' انعام پانے والوں کو شکر کرنا چاہئے اور امتحان میں ڈالے جانے والوں کو صبر' اور اسی کے مطابق اجر ملتا ہے' لیکن جو شخص حکومت کو اپنی "ملکیت" اور اقتدار کو اپنا "ذاتی خدمت گار" بنا لے' تو وہ اپنے اس انجام کے لئے تیار ہو جائے جو ایسے لوگوں کے لئے سنت الٰہی کے مطابق طے ہے' بڑے بڑے ستونوں والے شہر اوندھے ہو گئے' اونچی گردنوں والے سرنگوں ہو گئے' آہنی فیصلوں والے مٹی کے ڈھیر میں دب گئے' زر و جواہر سے کھیلنے والے کوچۂ غربت میں دھکیل دیئے گئے' یہ الگ بات کہ ان میں سے ہر ایک سربلند بھی تھا اور قلعہ بند بھی!

اِک شخص کہ پہلے جو یہاں تخت نشیں تھا
اُس کو بھی خدا ہونے کا اِتنا ہی یقیں تھا

ہر عہد کے حکمران کو چاہیے کہ وہ انسان بن کر رہے نہ دیوتا بننے کا خواب دیکھے اور نہ خدا کہلانے کا ارمان پالے' اکثر خواب تشنۂ تعبیر رہ جاتے اور بہت سے ارمان پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔

(4 نومبر 1999ء)

Marfat.com

ایمان اور زندگی

زندگی تو ہر شخص کرتا ہے خواہ وہ مومن ہو یا کافر' کسی نصب العین کا آدمی ہو یا بے ہدف انسان' کھانا پینا' اوڑھنا بچھونا' جاگنا سونا' چلنا پھرنا' اٹھنا بیٹھنا' ہنسنا رونا' یہ ہر انسان کے مشترک معمولات ہیں' ان میں کسی اہل عقیدہ اور بے عقیدہ کی تمیز اور تخصیص نہیں' اسی طرح خوشی اور رنج کے لمحات سے گزرنا' کامیابی کی سرشاریوں اور ناکامی کی مایوسیوں سے دوچار ہونا یہ بھی ہر ایک کے لئے روز مرہ کی بات ہے' لیکن ان کیفیات میں جہاں ایک جوہری فرق واقع اور مختلف اثر ظاہر ہوتا ہے وہاں یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں کیا حد فاصل ہے؟ ایک باخدا شخص اور ایک ایمان کی لذت سے محروم مرد تلخ و شیریں مراحل میں کیا رد عمل ظاہر کرتا ہے؟ اس کے محسوسات کیا ہوتے ہیں اور اس کے ذہن و وجدان پر کیا تاثرات مرتب ہوتے ہیں؟

طبعی زندگی تو ہر ایک کی یکساں دکھائی دیتی ہے خوشی ملے گی تو ہر ایک خوش ہو گا رنج پہنچے گا تو لامحالہ رنجیدہ ہو گا' پھول نظر پڑے گا تو بشاشت کا احساس ہو گا کانٹا چبھے گا تو ٹیس اٹھے گی' گھر میں بارات اترے گی تو چہرہ شاداب ہو گا' گھر سے جنازہ اٹھے گا تو دل ملول ہو گا' مگر ایک بندۂ مومن اور صاحب عقیدہ شخص کو یہ ترجیح اور فوقیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ وفورِ جذبات میں کبھی بھی آپے سے باہر نہیں ہوتا' خوشی کی گھڑی میں وہ اتراتا نہیں اور رنج کی ساعت میں گھبراتا نہیں' اور یہی کیفیت بندے کو ہمیشہ متوازن رکھتی ہے' اور توازن حسن حیات اور لطف زندگی ہے۔

ایک بار حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا "بندۂ مومن رنج اور خوشی دونوں حالتوں میں فائدے میں رہتا ہے۔" صحابہ کرام نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ! خوشی میں فائدے کی بات تو سمجھ میں آ گئی مگر رنج میں فائدہ؟ یہ بات ذرا واضح فرما دیجئے۔" آپ نے جواباً ارشاد فرمایا "جب صاحب ایمان کو دکھ پہنچتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور اگر اسے سکھ ملے تو وہ شکر کرتا ہے۔ صابر اور شاکر بندوں کے لئے اللہ نے جنت کا انعام رکھا ہے۔"

فی الواقع یہی وہ چیز ہے جو صاحب عقیدہ کو ممتاز مقام عطا کرتی ہے' خوشی میں تو کوئی رد عمل

زیادہ نوٹ نہیں کیا جاتا لیکن غمی میں انسان خود بھی اور دوسرے بھی ایک ایک لمحہ گنتے ہیں اور ہر لمحہ اعصاب شکن اور زہرہ گداز ہوتا ہے' البتہ بندۂ مومن اس پل صراط سے سرخرو ہو کر گزرتا ہے' کوئی آدمی طویل بیماری سے گزر رہا ہو' علاج بھی کارگر نہ ہو رہا ہو' وقت کے جالینوس تھک ہار چکے ہیں اور آبِ حیات اس کے لئے ماہ حمیم بن رہا ہو ایسے میں سوائے مایوسی اور دل گرفتگی کے اور اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟ مگر بندۂ مومن اس صبر آزما مرحلے میں دل تنگ اور بے ڈھنگ نہیں ہوتا بلکہ اس کے ہاتھ میں یہ رشتۂ امید موجود رہتا ہے کہ "جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی (اللہ) مجھے شفا دیتا ہے۔" بیماری کی کلفت اپنی جگہ لیکن عقیدہ کم از کم انسان کو ذہنی و روحانی اذیت سے بچالیتا ہے اور یہ کسی نعمت سے کم نہیں۔

اسی طرح آلام و مصائب زندگی کا لازمہ ہیں' آدمی ایسے میں بے خود ہو جاتا ہے۔ اور گھبراہٹ میں پل پل دل گھٹتا ہے لیکن ایک سچا مسلمان اس وقت بھی اس عقیدے کے زور پر ہر غم کو زندگی کا محرم بنالیتا ہے۔ کہ "بے شک ہر دکھ کے ساتھ ایک سکھ ہے۔" یوں وہ اللہ کی طرف سے دکھ کے بعد سکھ ملنے کا آرزو مند رہتا ہے۔

بعض اوقات انسان حالات کے دائرے میں گھر جاتا ہے' نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کی حالت میں گرفتار ہو جاتا ہے' واپسی کا راستہ بند اور آگے نکلنے کی گنجائش یکسر معدوم! اس جکڑ بندی میں بجز خودکشی اور گھٹ کر مرجانے کے کوئی امکان باقی نہیں رہتا لیکن یہاں بھی باخدا انسان نہ سلسلۂ امید توڑتا ہے اور نہ دیوار سے سر پھوڑتا ہے۔ بلکہ اسے حضرتِ موسیٰؑ کی وہ کیفیت یاد آجاتی ہے جب آپ فرعون کی فوجوں اور دریا کی موجوں میں گھر کر رہ گئے تھے مگر اس وقت بھی انہوں پورے اعتماد یقین کے ساتھ کہا تھا "میرا رب میرے ساتھ ہے وہ ضرور میرے لئے راستہ نکالے گا۔" اور پھر ایک نہیں ان کے لئے بارہ راستے نکل آئے تھے' اسی دریا کی موجیں فرعون اور اسکی ذریت کے لئے مگرمچھ کا منہ اور حضرتِ موسیٰؑ کے لئے سفینۂ نوح بن گئی تھیں' موت' زندگی کا ہولناک انجام' اس کے ہر ذی روح دوچار ہوتا ہے' اس سے کسی کافرد مومن کو مفر نہیں' کوئی سینہ پھلا کر اس جانب بڑھے یا منہ بنا کر' جانا تو بہرحال ہے' عقیدے سے محروم آدمی نجانے اس سفر پر نکلتے ہوئے کس اذیت سے دوچار ہوتا ہو گا' زندگانی' سامان زندگی' اسبابِ عیش و راحت سے دستبرداری' ناتمام آرزوؤں کا خون' حسرتوں کا انبار' کیا کیا کچھ اسے یاد نہیں آتا ہو گا' اور وہ کس بوجھل دل سے رخصت ہوتا ہو گا' لیکن عبد صالح کی شان یہاں بھی نرالی ہوتی ہے وہ زندگی کو خدا کا

Marfat.com

عطیہ سمجھ کر گزارتا اور موت کو اللہ کا فیصلہ جان کر خوش آمدید کہتا ہے اسے گزرے لمحوں کی فکر نہیں آئندہ ساعتوں کا انتظار ہوتا ہے' اسے دنیا چھوڑنے کا صدمہ نہیں اپنے رب سے ملنے کا خوشگوار جذبہ اس پر طاری ہوتا ہے' حضرت بلالؓ نے اپنی آخری سانسیں ایک ویرانے میں لیں' بجز ان کی رفیقۂ حیات کے سرہانے کوئی نہیں تھا' جب آخری ہچکیاں شروع ہوئیں تو اہلیہ کی زبان سے نکلا واکرباہ (کیا تکلیف دہ مرحلہ ہے) آپ نے اپنی بچی کھچی قوت مجتمع کر کے فرمایا' میری رفیقۂ حیات! یوں نہ کہو بلکہ وہ کہو واطرباہ' (کیا خوشگوار گھڑی ہے) کہ میں اپنے مہربان رب سے تھوڑی دیر میں ملنے والا ہوں' موت جیسی الم انگیز کیفیت کو تبسم ریز رنگ دے دینا ایک بندۂ مومن کا کام ہے ورنہ رنگینی دنیا کس کو عزیز نہیں ہوتی' موت جیسی کالی بلا کو رشک سلمٰی عقیدہ بناتا ہے اور آخری ہچکی کو گلبانگ مسیحا نظریہ بناتا ہے' اگر عقیدہ و نظریہ نہ ہو تو موت سے بڑھ کر روح فرسا چیز اور کیا ہو سکتی ہے؟

آج ہر دوسرا شخص اگر ڈپریشن کا شکار ہے آج سب کچھ ہوتے سوتے زندگی اگر تلخیوں اور مایوسیوں کا اشتہار ہے اور ہر ایک دوسرے سے مصروف پیکار ہے تو صرف اس لئے کہ بے ہدف زندگی انسان کو ہزار وجدانی اور روحانی لذتوں سے محروم کر دیتی ہے' خود آزار اور مردم بیزار انسان تنگ آکر زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ بند غم سے نجات پانے کے لئے قید حیات سے چھٹکارا پالے لیکن

؎ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

والی کیفیت آگے بھی پیش آجائے تو پھر وہ کیا کرے گا؟ مگر بندۂ مومن اس مناقشے سے بے نیاز ہوتا ہے' وہ کانٹوں پر چل کر بھی پھولوں کی روش پر خرام کا لطف لینے کا ہنر جانتا ہے' وہ مایوسیوں کی گھٹاٹوپ میں بھی آس کی بجلیوں کے کوندے پر نظر جمائے رکھتا ہے' وہ زندگی کو سوہان اور تاوان سمجھ کر سر سے اتارنے کی فکر نہیں کرتا ایک خاص آن اور شان کے ساتھ اسے گزارتا ہے' وہ موت کو اندھی وادی اور گہری غارِ جان کر پیچھے نہیں ہٹتا بلکہ اسے وصال یار کا وسیلہ سمجھ کر اس سے ہمکنار ہوتا ہے۔

جہاں ایمان اور زندگی کے سرے آکر مل جائیں تو لطف زندگی دوبالا ہو جاتا ہے' اس کی لذت ان سے پوچھیئے جو زندگی کو آبرو کا صدقہ سمجھ کر داد دیتے ہیں۔

؎ کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

Marfat.com

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں

مشہور مثال ہے "سوتے کو ہر ایک جگائے بھلا جاگتے کو کون جگائے؟" یہ مثال اس لئے یاد آئی کہ فرقہ واریت اور مذہب کی آڑ میں پر تشدد واقعات کی روک تھام کے لئے محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی سربراہی میں جو کمیٹی قائم کی گئی تھی ابھی اس کے دوسرے اجلاس کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی اور کمیٹی کے سربراہ نہ صرف اس کی صدارت سے بلکہ اس کی رکنیت سے بھی مستعفی ہو گئے ہیں' وجہ کچھ بھی نہیں صرف طبائع کی نازکی اور مزاجوں کی برہمی۔

نازک تھا تعلق اُلفت کا آپس کی کشاکش کیا سہتے
وہ ہم سے کھنچے' ہم ان سے کھنچے بس بیچ سے ناطہ ٹوٹ گیا

علماء کرام جن کا صبح و شام کام ہی وعظ و نصیحت کرنا ہے' مجھ جیسا شخص انہیں وعظ کرنے بیٹھ جائے تو بات جاگتے کو جگانے والی ہو جاتی ہے۔

ایک تو ہمارا پورا معاشرہ روٹھے ہوؤں کا معاشرہ بنا ہوا ہے جسے دیکھو بھویں کھینچے ہوئے ناک سکیڑے ہوئے اور منہ بسورے ہوئے ہے اوپر سے فقیہ شہر کی برہمی سنبھالی نہیں جاتی' علماء کو عوام سے یہ تو گلہ ہے کہ وہ ان کی بات نہیں سنتے یا سنتے ہیں تو مانتے نہیں' لیکن علماء بھی تو اپنے طرز عمل پر غور فرمائیں وہ کب لوگوں کے احساسات کا خیال رکھتے ہیں؟ ہر وہ پاکستانی جسے کسی بھی درجے میں دین کی آبرو مطلوب ہے' علماء دین کا وقار ملحوظ ہے اور وہ ملک میں رواداری اور امن کا خواہاں ہے اس کی یہ آرزو لبوں سے پھوٹی پڑتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح فرقہ واریت کے نام پر ہونے والی خونریز جنگ بند ہو' مسجدوں پر پولیس کے پہرے ختم ہوں اور ہر جلسہ اور تقریب خوف و ہراس کی فضا سے پاک ہو' ملی یکجہتی کونسل' کی شکست و ریخت کے ایک عرصہ بعد موجودہ کمیٹی تشکیل پذیر ہوئی اور اہل اسلام نے سکون کا سانس لیا کہ شائد علماء کا مل بیٹھنا ان کے پیروکاروں کے لئے عافیت کی خبر لائے مگر کیا خبر تھی کہ بستر بچھانے سے پہلے مرزا غالب کو بستر لپیٹنے کی فکر لگ جائے گی اور بیٹھنے سے پہلے نکلنے کی راہ ڈھونڈھنی پڑ جائے گی۔

میں ان لوگوں میں شامل ہوں جن کی شعوری عمر کا تمام تر نہیں تو اکثر حصہ اس کوشش اور خواہش میں بسر ہوا ہے کہ کسی نہ کسی بہانے حاملان دین کا معاشرے میں وقار نہ صرف بحال بلکہ دو

Marfat.com

چند ہو' انہیں فروعات میں الجھنے کے طعنے دینے والوں کے منہ بند ہوں' پوری سوسائٹی فکری و عملی رہنمائی کے لئے ان کی طرف دیکھے' علماء اپنے طرزِ عمل سے خود کو مسند قیادت کا جائزہ حقدار ثابت کر سکیں اور یہ سب کچھ حاصل کرنے کی شرط اول یہ ہے کہ علماء آپس میں رواداری پیدا کریں' اصول و فروع کی تقدیم و تاخیر کو سامنے رکھیں' اہم اور غیر اہم کے فرق کو ہر وقت نمایاں کریں اور اپنے آپ کو بلند تر نصب العین کے لئے گروہی مفادات کی قربانی کے لئے ہمہ وقت تیار رکھیں' اگر یہ کچھ نہیں کریں گے تو جو رہی سہی ہے اسے بھی کھونے کے لئے ذہنی طور پر آمادہ رہیں' مگر میں کیا کروں۔

ے   وہ مرے خیال کی بات تھی یہ مرے نصیب کی بات ہے

بھلا کب کس کا خیال پورا ہوا ہے جو میرا خواب پورا ہوتا' اس کمیٹی کے قیام میں جس وسعت فکری کا مظاہرہ کیا گیا اسے ناکام کرنے میں اتنی ہی جلد بازی کا اہتمام کیا گیا۔

اندر کی کیا بات ہے یہ تو ارکان کمیٹی جانیں یا پھر خدا کی ذات عالم الغیب ہے' بظاہر اس کمیٹی کے اس قدر جلد تحلیل ہونے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا' آخر ایک ہفتے میں ڈاکٹر اسرار احمد کیسے متنازعہ ہو گئے؟ اس دوران کون سے بنیادی اختلافات اٹھ کھڑے ہوئے؟ وہ کون سے اہم فیصلے ہو چکے تھے' جن پر عملدرآمد نہ ہونے کے سبب رنجش بڑھی؟ اور ملک میں وہ کون سی اچانک تبدیلی واقع ہو گئی کہ اس کمیٹی کو مزید چلانا غیر مفید ہو گیا تھا؟

حالانکہ ہم سے زیادہ خود علماء کرام اس سے آگاہ ہیں کہ پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ میں ایک سے زائد بار مختلف فرقوں کے علماء نے بڑے ایثار و اخلاص کا مظاہرہ کر کے مشترکات پر جمع ہونے کا ثبوت فراہم کیا اور ان کا یہ اتحاد قوم کے لئے ہر پہلو سے خیر کا موجب بنا "قائداعظمؒ" کی سیاسی جدوجہد میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (دیوبندی) حضرت خواجہ قمرالدین سیالوی (بریلوی) حضرت مولانا داؤد غزنوی (اہلحدیث) اور علامہ ابن حسن جارچوی (شیعہ) پہلو بہ پہلو دکھائی دیتے رہے' اسلامی ریاست کے خدوخال اور دینی نظام کی توضیح و تشریح کے ضمن میں اکتیس علماء کے متفقہ بائیس نکات کا چرچا آج تک ہوتا ہے' اور یہ اکتیس علماء چاروں مکاتب فکر کے نمائندہ تھے' ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت ایک ممتاز اور محترم بریلوی عالم دین مولانا ابوالحسنات قادریؒ کی قیادت میں چلی' ۷۴ء کی تحریک ختم نبوت کی سربراہی نامور دیوبندی عالم دین مولانا محمد یوسف بنوری کے حصے میں آئی ۷۷ء کی تحریک نظام مصطفےٰؐ کے قائد نیک نام دیوبندی عالم مولانا مفتی محمودؒ تھے' باقی

Marfat.com

مکاتب فکر کے علماء نے ان مواقع پر کھلے دل کے ساتھ تعاون کیا اور ہر آزمائش میں ساتھ دیا' ۹۵ء میں قائم ہونے والی ملی یکجہتی کونسل بھی علماء کی نمائندہ تنظیم تھی اور اس کے صدر مولانا شاہ احمد نورانی (بریلوی) منتخب کئے گئے' اور کچھ عرصے تک یہ پلیٹ فارم مثالی اتحاد کا نمونہ بنا رہا' اب اگر ایک بار پھر ایسی صورت پیدا ہوئی تھی تو اسے ایک قابل رشک تجربہ بننا چاہئے تھا' نہ یہ کہ یہ کمیٹی مضحکہ بن جاتی۔

ہم چھوٹے دماغ کے لوگ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس کمیٹی کی ناکامی سے دین کا کون سا اہم ستون گرنے سے بچ گیا ہے؟ ملک کو کون سا عظیم فائدہ حاصل ہوا ہے؟ ملت کا کون سا وسیع تر مقصد حاصل ہوا ہے؟ اور علماء کے سینے پر آویزاں تمغوں میں کس سنہری تمغے کا اضافہ ہوا ہے؟ دانش و تدبر کا تقاضا یہ تھا کہ کچھ عرصے تک اس کمیٹی کو چلنے دیا جاتا' یہ کوئی لائحہ عمل مرتب کر لیتی' کسی نتیجے پر پہنچ جاتی اور پھر اگر کوئی عملی رکاوٹ پیدا ہوتی تو اختلاف رائے کیا جاتا اور تفصیلی بحث کا تقاضا کیا جاتا' ممکن ہے اس طرح اصل ہدف سو فیصد داغدار نہ ہوتا' ہم "مریدین اور معتقدین" تو جس عذاب سے گذر رہے ہیں سو گزر رہے ہیں لیکن حضراتِ علماء والاشان بھی ذہن میں اتنا ضرور رکھیں کہ اکثر اوقات ہاتھوں کی گرہیں دانتوں سے کھولنا پڑ جاتی ہیں۔

(18 اپریل 1999ء)

Marfat.com

"خود انحصاری سے پہلے خود اعتمادی"

۲۸ مئی ۹۸ء کو پاکستان کی طرف سے کئے جانے والے بھارت کے جواب میں ایٹمی دھماکوں نے پورا نظام تبدیل کر دیا ہے' سیاست زیر و بم میں ہے اور معیشت درد زہ کی کیفیت میں' انہی علامتوں پر قوموں کے عروج و زوال کے فیصلے ہوتے ہیں' حکومت کی طرف سے خود انحصاری کی مہم کا چرچا ہے' تاکہ ان اثرات کا ازالہ ہو سکے جو ایٹمی دھماکوں کے پس منظر میں مغربی ممالک اور امریکہ کی طرف سے ملک پر مرتب ہونے والے ہیں۔

اہل فکر و نظر کے ہاں خود انحصاری سے پہلے خود اعتمادی کا مرحلہ آتا ہے' اس لئے کہ "انحصار" وسائل کا محتاج ہوتا ہے اور "اعتماد" کا سرچشمہ قلب و ذہن' بے نیازی وسائل سے نہیں آتی اس کی پرورش قلب و ذہن سے ہوتی ہے۔

کئی کروڑ پتی لوگوں کو دل اور آنکھ کا زبردست بھوکا دیکھا گیا ہے اور کئی فاقہ مستوں کو خوش نظر اور خوش ادا پایا گیا ہے' دماغ ارسطو کامل جائے تو کئی سکندر چل کر آتے ہیں' یونان کا مشہور مجذوب فلسفی دیو جانس کلبی ٹپ میں پڑا رہتا تھا اور اسی سے مسند نشینی کا لطف لیتا تھا' سکندر اعظم جب اپنے لاؤ لشکر سمیت اس خود نگر فلسفی کے پاس حاضر ہوا اور اپنی طرف سے ہر خدمت بجالانے کی پیش کش کی تو دیو جانس نے اس سے صرف دو مختصر باتیں کیں' ایک یہ کہ جب تک میں خود تم سے ملنے کی خواہش نہ کروں براہ کرام میرے حال میں خلل نہ ڈالا کرو اور دوسرے یہ کہ تم نے اس وقت میری دھوپ روک رکھی ہے مہربانی کر کے ایک طرف ہو جاؤ اور مجھے چمکتی دھوپ کا مزا لینے دو' یہ باتیں وہی شخص کہتا ہے جو وسائل کی دولت سے نہیں فضائل کی نعمت سے مالا مال ہو' وسائل برف کی ڈلی کی طرح ہتھیلی کی معمولی آنچ سے پگھل کر پانی کی طرح ہاتھوں سے کھسک جاتے ہیں' مگر فضائل لوح سنگ کا نقش ہوتے ہیں جو قسمت کی لکیریں بن جاتے ہیں' بلاشبہ وسائل بہت بھاری ہوتے ہیں' مگر تاریخ میں پلڑا ہمیشہ فضائل کا جھکا رہا ہے' تاریخ قارونوں کا ریکارڈ نہیں رسولوں' فلسفیوں' دانشوروں' اور خودی کے پیکروں کے تذکرے سے معمور اور معتبر ہے' آج

Marfat.com

امریکہ پاکستان کے گرد دائرہ تنگ کر رہا ہے' آئی ایم ایف تمام اقتصادی اخلاقیات پامال کر کے نئی شرائط عائد کر رہا ہے' ورلڈ بنک یورپ کے اشارہ ابرو کے انتظار میں ساکت و جامد کھڑا ہے' اور ایشیائی ترقیاتی بنک اپنے آقایان ولی نعمت کی جنبش مژگاں کو دیکھ رہا ہے' یہ بالکل وہی کیفیت ہے جو پانی سے آدھ بھرے گلاس کو دیکھ کر دو آدمی اپنے رائے دیتے ہیں' ایک کے نزدیک آدھا گلاس خالی اور دوسرے کے خیال میں آدھا گلاس بھرا ہوا ہوتا ہے' میں دوسرے گروہ کا آدمی ہوں' یہ جھڑکیاں' یہ گھرکیاں' یہ پھبتیاں' یہ دھمکیاں کم ظرفوں کو لرزاں ترساں اور نگاہ بلندوں کو "آکڑ خاں" بنا دیتی ہیں' ہمیں "آکڑ خاں" بننے کے لئے اس سے زیادہ مناسب وقت اور موزوں ماحول شائد پھر نہ مل سکے۔

سائیں توکل شاہ انبالویؒ بیان کرتے تھے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ایک مجذوب ہوتا تھا جس کا نام "میاں ڈڈھاؒ" تھا' وہ ہمہ وقت شاہ سے دور' شاہی دربار سے مغرور' شاہی قرب سے نفور اور اپنے حال میں مسرور رہتا تھا' عالمگیر کی ہمیشہ خواہش رہی کہ وہ میاں ڈڈھاؒ سے ملے' مگر مجذوب میاں ہمیشہ طرح دے جاتا اسی کشمکش میں برسوں گزر گئے' عقیدت مند پوچھتے رہتے کہ "میاں ڈڈھا۔ رب کیویں لبھا" ایک بار میاں ڈڈھاؒ جذب میں تھے اور جوش میں آکر اس راز کو فاش کر دیا' بتانے لگے کہ رب کیسے ملتا ہے؟ پھر انھوں نے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو استعارہ بنا کر یہ رمز کھول دی فرمانے لگے کہ اورنگ زیب جب مجھ سے ملنے کے ہر حربے میں ناکام رہا تو اس نے درباریوں کو حکم دیا کہ جہاں میں رہتا ہوں اس پورے علاقے کو گھیرے میں لے لیا جائے لامحالہ میاں ڈڈھاؒ وہاں سے نکلنے کی کوشش کرے گا' صرف ایک راستہ کھلا رکھا جائے' اور وہاں میں خود بیٹھ جاؤں گا اس طرح میاں ڈڈھاؒ مجھ سے ملنے پر مجبور ہو گا' سو ایسا کیا گیا' شاہی حکم کے مطابق اس مجذوب پر ادھر ادھر جانے کا ہر راستہ بند کر دیا گیا' میاں ڈڈھاؒ یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے بتانے لگے کہ جب میں اسی راستے سے نکلنے لگا جو کھلا تھا تو وہاں پر اورنگ زیب عالمگیر سے ملاقات ہو گئی' اور یہی طریقہ ہے رب سے ملنے کا' جب دنیا نے مجھ پر سارے راستے بند کر دیئے تو رب تعالیٰ نے میرے لئے اپنا راستہ کھول دیا اور یوں میں نے اپنے رب کو پالیا' واقعہ بھی یہی ہے کہ دنیا جب کسی پر اپنا ہر راستہ بند کئے چلی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنا راستہ کھول دیتا ہے' اہل زر بندشوں کو دیکھ رہے ہوتے ہیں مگر اہل نظر کشادگیوں کو تاڑ لیتے ہیں۔

؎ طوفان کر رہا تھا میرے عزم کا طواف
دنیا سمجھ رہی تھی کشتی بھنور میں ہے

آج اسی کیفیت سے پاکستان گزر رہا ہے' راستے کی مشکلات بجا مگر امریکہ "قاضی الحاجات" تو نہیں' آج عالم اسلام کا بیشتر حصہ اور بالخصوص پاکستان جن پریشانیوں اور بندشوں کا شکار ہے' اس کا تجزیہ سطح بینی سے کیا جاتا ہے' اور تان یہاں آکر ٹوٹتی ہے کہ عالمی اقتصادی جنات سے ان کی شرائط پر مصالحت اور ان کے تقاضوں سے مفاہمت کرلی جائے جس کے نتیجے میں یہ عالمی طاقتیں اگلوں کو ریشم کا کیڑا بنا دیتی ہیں جو اپنے جسم کے ریشم کے تار برابر اگلتا اور خود ان میں لپٹا رہتا ہے بالآخر دم گھٹ کر مرجاتا ہے۔ بات اخراجات کے لئے قرضوں سے شروع ہوتی ہے اور پھر قرضوں کی ادائیگی کے لئے مزید قرضوں تک پھیل جاتی ہے پھر نہ زندگی بھر قرض ادا ہوتا ہے اور نہ وفاداری کا حق! حالانکہ اقبالؒ کے ہاں

؎ سب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

بے زری سے تو پھر بھی زندگی کے دن کٹ جاتے ہیں مگر اپنی ہی نظر میں اپنی بے قدری سے قومیں مٹ جاتی ہیں' کیا پوری اسلامی تاریخ میں مسلمان ملت پر شعب ابی طالب سے بھی کڑا اور بھاری وقت آیا ہے؟ محاورۃً نہیں واقعۃً پتے کھا کر گزارا کیا گیا' پورا مکہ ایک طرف اس کے اعیان و صناویہ ایک طرف اور گھاٹی کے صرف بیاسی (۸۲) محصورین دوسری طرف تھے' اہل مکہ اپنے خزینے پر انحصار کر رہے تھے لیکن شعب ابی طالب کے محصور لوگ اپنے پیغمبرؐ کی قیادت میں اپنے عقیدے پر اعتماد کر رہے تھے' آج ابو طالب کی وہ گھاٹی تاریخ کا مقدس اور محترم حوالہ ہے جس نے اپنے دامن میں شکم پر روح اور دل کو ترجیح دینے والوں کی پناہ دی تھی' اور اس کے مقابلے میں ابو جہل اور ابولہب کی حویلیاں وقت کی گرد میں گم ہو گئی ہیں جن کی فصیلوں اور جن میں دبے ہوئے دفینوں پر رؤسائے مکہ کو بڑا ناز تھا۔

علامہ اقبالؒ کشمیری تھے اور حسن اتفاق سے وزیراعظم نواز شریف بھی کشمیری ہیں' علامہؒ سے کوئی بڑی ذہنی و فکری نسبت نہ سہی وزیراعظم کو اقبالؒ کا وہ شعر تو ازبر ہونا اور مد نظر رکھنا چاہیے جو آج بھی مزار اقبالؒ پر درج ہے۔

Marfat.com

ے
زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاک راہ کو میں نے بتایا راز الوندی

وزیراعظم کے چھوٹے بھائی شہباز شریف حاکم پنجاب ہیں' ''شہباز'' تو علامہؒ کا مرغوب اور محبوب استعارہ رہا ہے۔

ے
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تو' تو نہیں خطرۂ افتاد

ہمارے متشرع اور متدین صدر مملکت لاہور ہی میں جوہر ٹاؤن کے رہائشی ہیں' اس ٹاؤن کا پورا نام ''محمد علی جوہر ٹاؤن ہے۔'' انہی مولانا جوہرؒ کا کہنا ہے۔

ے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

(3 اکتوبر 1998ء)

Marfat.com

اختلاف رائے کا سلیقہ

اختلاف----- بظاہر ایک منفی تاثر کا حامل لفظ ہے‘ لیکن در حقیقت ایسا نہیں‘ بات صرف اس سلیقے اور قرینے کی ہے جسے اختیار کر لیا جائے تو اختلاف سے حسن کشید کیا جا سکتا ہے‘ پھول اور کانٹے کا جنم جنم کا ساتھ ہے‘ قدرت کی سکیم میں شامل ہے کہ پھول بھی ہوں اور کانٹے بھی‘ اور اسی تضاد اور تخالف سے پھولوں کا حسن نکھرتا ہے‘ خواجہ نظام الدین دہلویؒ فرمایا کرتے تھے کہ "لوگ شکوہ کرتے ہیں کہ قدرت نے نرم و نازک پھولوں کے ساتھ نوکیلے کانٹے لگا دیئے ہیں جبکہ میں اس بات پر قدرت کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے نوکیلے کانٹوں کے ساتھ پھول اُگا دیئے ہیں۔" آپ نے دیکھا کہ ایک صاحب نظر اور وسیع الظرف بزرگ نے کس طرح بات الٹا کر اُسے فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیا ہے‘ اسے سلیقہ اور قرینہ کہتے ہیں۔

اختلاف کہاں نہیں اور کس شعبے میں نہیں؟ تکوینی دنیا میں اختلاف شب و روز ہے‘ اور یہ برا نہیں دن کام کو اور رات آرام کے لئے‘ موسموں کا اختلاف تاکہ لوگ ہر ایک سے محظوظ ہوں‘ گرمی ہو تو چھاؤں کا لطف اٹھائیں‘ سردی میں دھوپ تاپیں‘ خزاں میں پتے جھڑتے اور بہار میں نئے شگوفے پھوٹتے دیکھیں‘ فصلوں کا اختلاف بھی ایسے ہے‘ کبھی گندم کے سنہری خوشوں سے آنکھیں مسرور ہوں‘ کبھی دھان کی سوندھی خوشبو سے مشام مسحور ہوں‘ کوئی آموں سے دل بہلائے تو کوئی انگوروں سے حظ حاصل کرے‘ یہی حال برسات اور خشکی کا ہے۔

یکسانیت کوئی خوبی ہوتی تو قدرت خود اس کا اہتمام کرتی‘ بوقلمونی ہی حسن حیات ہے‘ طبعی دنیا میں بھی اختلاف کے بے شمار مظاہر ہیں‘ مختلف رنگ‘ مختلف نسلیں‘ مختلف زبانیں‘ مختلف تہذیبیں‘ یہ سب تنوع کی مظہر ہیں‘ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب آدمی ان مظاہر کو مناظرے کا رنگ دے دے‘ گورا کہے کہ میں کالے سے افضل ہوں‘ اور عربی کہے کہ میں عجمی سے برتر ہوں‘ قریشی دعویٰ کرے کہ میں خدا کا اوتار ہوں‘ اور دوسرے میرے پاؤں کی پیداوار ہیں‘ اسی پر قیاس کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے کہ دنیا میں طریقہ ہائے علاج مختلف ہیں‘ پہناوے جدا جدا ہیں‘ کھاجے

Marfat.com

الگ الگ ہیں، لہجے فرق فرق ہیں، بولیاں وکھری وکھری ہیں اور تلفظ علیحدہ علیحدہ، قدرت نے انسانی شکلوں میں بھی امتیاز روا رکھا ہے، لانبے قد بھی ہیں اور چھوٹے بھی، ناک ستواں بھی ہے اور چپٹی بھی، رنگ سرخ بھی ہیں، سفید بھی اور زرد بھی، ہر نظر کے لئے الگ ساماں، اور ہر منظر کے لئے الگ نگاہ، اسی طرح چٹیل میدانوں کی وسعت بھی دلفریب ہے اور پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیاں بھی نظر نواز! دریاؤں کی دھرتی کا اپنا حسن ہے اور صحراؤں کی زمین کا اپنا جادو، ممکن ہے دنیا کا ایک رنگ ہوتا تو آدمی اکتا جاتا اور ایک لہجہ ہوتا تو انسان بھنا جاتا، خدا کی وسیع کائنات کو وسیع تناظر میں دیکھنا چاہیے اور خدا کی عظیم سکیم کو بلند ذہن سے سوچنا چاہیے، اس طرح کائنات کا اختلاف منفی تاثر نہیں دے گا، جب تکوینی و طبیعی دنیا میں اختلاف ناگزیر ہے تو آخر تشریعی و فکری دنیا میں اختلاف سے گریز کیوں کیا جائے؟ اصل مسئلہ موافقت پیدا کرنا ہے۔

ذوق و مشرب میں اختلاف ہے تو ہوتا رہے فقط یہ اہتمام کیا جائے کہ ذوق بیہودہ اور مشرب آلودہ نہ ہونے پائے، اسی طرح فکر و نظر میں فرق ہے تو کوئی عیب نہیں، بس یہ کیا جائے کہ فکر قباحت اور نظر کراہت سے پاک ہو جائے، زاویۂ نظر ہی کسی منظر کو قبیح اور حسین بناتا ہے۔

ؔ تم کو ملے ہیں قریۂ مہتاب میں گڑھے
ہم کو تو پتھروں میں بھی رعنائیاں ملیں

ایک مکھی گندگی پر بیٹھی ہے اور ہیضہ پھیلاتی ہے اور دوسری پھولوں کا رس نچوڑ کر شہد بناتی ہے، اپنے اپنے ذوق اور مشرب کی بات ہے، ایک بھنورا ہے جو باغ میں نئے سے نئے پھول تلاش کرتا ہے اور دوسرا کیڑا ہے جو اسی باغ میں گوبر ڈھونڈھتا اور اس میں گھستا ہے، باغ ایک ہے مگر محورِ نگاہ مختلف، اسی طرح شاہین بھی فضا میں اڑتا ہے اور کرگس کی پرواز بھی فضا میں ہوتی ہے، مگر ایک کی نظر افلاک پر رہتی ہے اور دوسرے کی خاک پر، پرندے ایک جیسے ہیں لیکن ذوق پرواز جداگانہ۔

یہی حال فکر و نظر میں اختلاف کا ہے ایک اس میں موافقت کا پہلو ڈھونڈھ لیتا ہے اور دوسرا مخالفت کرید لیتا ہے، اختلاف رائے کا مطلب یہ ہے کہ اختلاف کو مانا جائے، اور دوسرے کی رائے کو سنا جائے اور مخالفت کا مفہوم یہ ہے کہ اختلاف کو رد کیا جائے، اور رائے کو بد بتایا جائے، اختلاف رائے اس وقت مخالفت کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے جب اس اصول کو نظر انداز کر دیا جائے کہ حسن ظن کے لئے محض خوش گمانی درکار ہوتی ہے اور سوءِ ظن کے لئے دلیل قطعی! جو معاشرہ اس روش سے ہٹ جائے وہ اختلاف اور مخالفت کے درمیان قائم باریک سی لکیر کو مٹا دیتا

Marfat.com

ہے' اگر ہر عالم اور مفکر اس قول زریں کو اختیار کر لے تو کبھی بھی اختلاف افتراق کی حدوں کو نہ پہنچ پائے اور وہ یہ کہ "میری بات صحیح ہے مگر اس میں غلطی کا احتمال ہے اور دوسرے کی بات غلط ہے مگر اس میں صحت کا امکان ہے۔" احتمال کا یہ فلسفہ انسان کو وسیع الخیال اور امکان کا یہ نکتہ آدمی کو خوش بیان بنا دیتا ہے' بندہ وسیع الخیال اور خوش بیان ہو تو وہ زہر کو قند و نبات اور ماءِ حمیم کو آبِ حیات بنا دیتا ہے۔

یہ خواہش بھی اختلاف کو مخالفت کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے کہ ہر ایک شخص ایک ہی طرح سوچے اور ایک ہی بات کہے' اگر ہر کوئی ایک طرح سوچنا شروع کر دے تو اس کا معنی یہ ہوا کہ لوگوں نے سوچنا چھوڑ دیا ہے اور اگر ہر کوئی ایک ہی بات کہنے لگے تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ ہمکلامی کے بجائے خود کلامی کا شکار ہو گئے ہیں' انسانوں کی دنیا میں ہمکلامی سے حسن ہے خود کلامی سے نہیں' اختلاف کو نصیحت کی حد تک لے جانے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ لوگ الجھنے کے لئے پوچھتے ہیں' سمجھنے کے لئے سوال کو وتیرہ نہیں بناتے' بات کو الجھانا مخالفت کی دلیل ہے اور مسئلہ کو سلجھانا اختلاف رائے کی علامت ہے' اختلاف رائے میں مذاکرہ ہوتا ہے جب کہ مخالفت میں مجادلہ' لوگ مذاکرے اور مجادلے کے فرق کو ہمیشہ نظرانداز کر دیتے ہیں ورنہ قیل و قال اور جدال میں زمین آسمان کا فاصلہ ہے' قیل و قال سے ذہن کا اشکال دور ہوتا ہے جب کہ جدال سے دل میں زیغ و ضلال آتا ہے' ایک جید عالم' ایک درد مند مبلغ' ایک خوش کلام متکلم اور ایک مخلص داعی انسان کے اندر کی خیر کو اپنا ہدف بناتا ہے جب کہ ایک گور نظر مناظر اور ایک کوڑھ مغز مجادل دوسرے کے باطن کے شر کو مدعو کرتا ہے جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ متکلم کی نیت اور خواہش کے مطابق سامنے آئے گا' ایک ہی دور میں مختلف فقہی دبستانوں' تصوف کے زاویوں' علمی درسگاہوں' فلسفیانہ اکیڈمیوں' اور طبی لیبارٹریوں کا وجود اختلاف رائے کے حسن کی سب سے بڑی دلیل ہے' یہ نہ ہو تو ارتقاء کا سارا عمل رک جائے۔

(24 ستمبر 1998ء)

Marfat.com

"اندازِ حکومت"

عوام کم از کم ایک عشرے سے ایسے جبر کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں کہ ان کے پیچھے اگر کنواں ہے تو آگے کھائی ہے' آسمان سے گرتے ہی کھجور میں اٹک جاتے ہیں' خارش اور کھجلی سے تنگ آ کر جب بھی سر منڈاتے ہیں تو اوپر سے اولے پڑنے شروع ہو جاتے ہیں' اہل فارس نے تو یہ محاورہ اپنے کسی حوالے سے وضع کیا تھا مگر اس کا مصداق ایک لمبے عرصے سے ہم بنے ہوئے ہیں' یعنی "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عوام پیپلز پارٹی کے کنویں سے خلاصی پاتے ہیں تو میاں نواز شریف کی کھائی میں جا گرتے ہیں' ہمارے بعض نیک نیت دانشور' دردِ دل رکھنے والے کالم نگار اور وطن کے خیر خواہ سیاسی کارکن میاں اور بی بی میں بہت فرق بتاتے ہیں' ممکن ہے شخصی اعتبار سے فرق ہو' سیاسی سوچ کے حوالے سے فرق ہو' جذبے اور ارادے سے فرق ہو مگر دس برس کے تجربے سے یہ طے ہے کہ اندازِ حکومت میں کوئی خاص فرق نہیں ملا' ہر وعدے میں بے شمار رنگینی مگر ہر فیصلے میں بے اندازہ ڈھلمل یقینی' ہر وعدہ ایسا کہ اگر اعتبار ہو تو مرنے کو جی چاہتا ہے اور ہر فیصلہ ایسا کہ سامنے آئے تو دیوار میں سر مارنے کو دل کرتا ہے' لیکن عوام کیا کریں کہ مرتے اس لئے نہیں کہ وعدے کے ایفاء کا اعتبار نہیں اور سر اس لئے نہیں پھوڑتے کہ دشت یاس میں کوئی دیوار نہیں۔

دراصل ہر حکومت نے عوام کا "ٹریک ریکارڈ" سامنے رکھ کر یہ طے کر لیا ہے کہ عوام خوشنما نعروں اور ہوش ربا وعدوں پر قناعت کرنے والی مخلوق ہے سو اسے اس طرح راضی رکھا جائے' اور تکلف بر طرف عوام بھی اس باب میں کچھ زیادہ ہی فراخ دل واقع ہوئے ہیں ورنہ جتنی بار حکومتوں نے وعدے توڑے اور دلوں اور آرزوؤں کے آبگینے پھوڑے ہیں تو حکمران اس لائق نہیں کہ وہ قصر و ایوان میں بیٹھیں بلکہ انہیں جزائر انڈیمان ہونا چاہئے جسے انگریزی دور میں "کالے پانی کی سزا" کہا جاتا تھا۔

عوام تو یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت کرنا بڑے بڑے تجربے' بڑی مہارت' بڑے دل گردے اور

Marfat.com

بڑی ذہانت، بڑے جگرے اور بڑی بصیرت کا کام ہے، لیکن نتائج دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے۔ کہ بچوں کے ہاتھ کھلونے لگے ہوئے ہیں، جن سے بہلنے اور بہلانے کا کام لیا جاتا ہے، جب ہمارا کوئی حکمران ٹی وی پر آکر تقریر کرتا ہے تو سامعین اور ناظرین یوں محسوس کرتے ہیں کہ ہو نہ ہو آج کی گھڑی زمین اور آسمان کے قلابے مل جائیں گے، راتوں رات تارے آسمان سے ٹوٹ کر زمین پر گر پڑیں گے، بارش کی ہر بوند سونے کی ڈلی بن کر ارض وطن پر اترے گی اور زمین کا ہر ڈھیلا ہیرا بن کر چمک اٹھے گا، مگر بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ کمال حکمران مقرر کا نہیں بلکہ یہ ہنر تنخواہ دار تقریر نویس کا ہے، کبھی کبھی تو دل سے ہوک اٹھتی ہے کہ جس طرح خدا نے قارون کو زمین دوز کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کا سارا خزانہ اس کے سر پر رکھ دیا تھا اور وہ اسی کے بوجھ سے زمین میں دھنس گیا تھا، اس طرح عوام کو موقع ہاتھ لگے تو وہ حکمرانوں کی تقریروں کے پلندے اٹھا کر ان کے سر پر مڑھ دیں جو انہیں پاتال تک پہنچا آئیں، ویسے تو نجی سطح پر بھی مشاورت کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن اجتماعی اور حکومتی سطح پر تو اس کی اہمیت دو چند بلکہ کئی چند ہے مگر لاکھوں روپے پانے والے پیشہ ور مشیر حکومت کو ایسے مشورے دیتے ہیں جن سے حکومت کا تو ستیاناس ہوتا ہی ہے عوام کا سو ستیاناس ہو جاتا ہے اور یہ عمل برسوں سے جاری ہے، آخر جس مشیر نے جنرل ضیاء الحق کو سائیکل سواری کا مشورہ دیا ہو گا اس کے علم، اس کی بصیرت اور اس کے اخلاص کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے اس نے کہا ہو گا جناب! آپ ایک بار سادگی اور کفائیت شعاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سائیکل سوار تو ہوں عوام خود اپنے کندھوں پر آپ کو مدتوں سوار کئے رکھیں گے، ضیاء صاحب نے یہ نہ سوچا کہ وہ جس لمحے سائیکل سے نیچے اتریں گے اسی گھڑی وہ عوام کے دل و دماغ سے اتر چکے ہوں گے، آخر اس پاکھنڈ کو کون ذی ہوش پسند کر سکتا ہے؟ اس سے پہلے بھٹو صاحب نے وزراء کی وردی بدل کر قوم کی تقدیر بدلنے کا سوچا تھا، مشیروں نے کہا ہو گا، حضورِ والا آپ وزراء کو بینڈ ماسٹروں والی یونیفارم پہنا کر تو دیکھیں، عوام خوشی سے از خود باجے بجانے شروع کر دیں گے، اور پھر دنیا نے دیکھا کہ وہ باجے بجے کہ پوری حکومت کے کان بج اٹھے تھے، یہی حال ہمارے میاں صاحب کا ہے، کبھی وہ کچھ آبادی میں جا کر اپنے ہاتوں سے اینٹ گارا لگانا شروع کر دیتے ہیں، کبھی شلوار کے پائینچے اوپر کر کے بارش کے پانی میں گھس جاتے ہیں، اور کبھی وہ کابینہ کے اجلاس کے اختتام پر خود دال کھانے اور وزراء کو دال کھلانے کا شغل فرماتے ہیں، لیکن ہر انداز فرمائشی اور ہر اقدام نمائشی بھلا کبھی اس سے بھی حکومتوں کو استحکام اور عوام کو آرام نصیب ہوا ہے؟ ایک طرف یہ شوشے اور دوسری طرف

Marfat.com

شاہانہ فیصلے' خود وزیر اعظم کے بقول کراچی سے پشاور تک جی ٹی روڈ نئے سرے سے دو رویہ بنائی جاتی تو ستائیس ۲۷ ارب درکار تھے مگر انہوں نے لاہور' اسلام آباد موٹروے پر تقریباً چالیس ارب لگا دیئے' عوام سے ریفرنڈم کرالیا جاتا تو پتہ چل جاتا کہ دونوں میں سے کون سا کام مقدم اور اہم تھا کہا جاتا ہے کہ بیچارے چھوٹے لوگ ان بڑے منصوبوں کو کیا سمجھیں؟ واقعی یہ درست ہے جس کے دستر خوان پر مرغ پلاؤ کی قاب سجی ہو سویٹ ڈش اسے سوجھتی ہے مگر جس کے ہاں سوکھی روٹی کے ٹکڑے ہوں وہ چٹنی کا سوچے گا' اب اربوں روپے کی لاگت سے اسلام آباد اور لاہور ائرپورٹ زیر تعمیر ہیں' کیا یہ مغلیہ اندازِ حکومت نہیں؟ اس سے کہیں بہتر تھا کہ یہ اربوں روپے کسی ہاؤسنگ سکیم پر خرچ ہوتے جس سے چھوٹے ملازم طبقے کو سستے داموں مکان مہیا ہوتے' حال ہی میں وزیر اعظم نے شریعت بل اس طرح پیش کیا اور اس موقع پر اس انداز میں تقریر کی کہ ادھر بل پاس ہو گا اور اُدھر ابرو کی جنبش کے ساتھ انصاف سستا ہو جائے گا' امن و امان قائم ہو جائے گا' اور کراچی سے پشاور تک اور طورخم سے گوادر تک ایک نیا معاشرہ وجود میں آجائے گا' کچھ ایسی ہی تقریر سمری کورٹس کے قیام کے وقت کی تھی لیکن وہ عدالتیں اب بھولی بسری داستان بن کر رہ گئی ہیں' ہر موقع پر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ حکومت نتائج پیدا کرنے کے لئے اقدام کم کرتی ہے اور پریشر ریلیز کرنے اور داد و تحسین وصول کرنے کے لئے زیادہ پر جوش ہوتی ہے' جتنے وقتی اور سستے اقدامات کئے گئے ان کی جگہ اگر ان سے آدھے بلکہ اس سے کم مگر سنجیدہ اور پائیدار فیصلے کئے جاتے تو شائد حکومت کا وقار بھی بڑھتا اور عوم کو امن و قرار بھی نصیب ہوتا۔

(20 ستمبر 1998ء)

Marfat.com

نگاہ روبرو' باادب باملاحظہ ہوشیار

انہی دنوں ملکہ برطانیہ نے ہماری سرزمین پر قدم رنجہ فرمایا' جس دن ملکہ کا جہاز چکلالہ ائیر پورٹ پر اترا اس دن سے ہمارے حکمران ہواؤں میں اڑنے شروع ہوئے' ملکہ کے پاؤں زمین پر لگے اور ہمارے اربابِ اقتدار کے پاؤں کہیں ٹکنے میں نہیں آرہے تھے' ملکہ نے کچھ وقت اسلام آباد میں گزارا' ایک دن کے لئے کراچی گئیں' ایک ڈیڑھ دن لاہور کو سرفراز کیا' اس پورے عرصے میں ہماری پوری انتظامیہ ایک ہی کام میں لگی رہی کہ ملکۂ عالیہ کے نیاز کیسے حاصل کئے جائیں اور انکا دل کیسے خوش کیا جائے؟ مجھے معلوم ہے کہ مہمانداری اور مہمان کی تعظیم و تکریم اسلامی فریضہ بھی ہے' اور مشرقی رویہ بھی' لیکن مہمانداری اگر خودداری مجروح کرنے کی قیمت پر ہو تو اسے خوشامد کہا جاتا ہے آدابِ معاشرت نہیں' ابھی چند دن گزرے ہیں ہمارے وزیراعظم امریکہ کے مہمان بن کر گئے' کیا انہیں بھی یہی پروٹوکول ملا؟ آخر میاں صاحب بھی ایک ملک کے سربراہ حکومت اور مہمان تھا' صدر کلنٹن نے ورکنگ لنچ پر ملاقات کی' اور وہ بھی چند منٹ! ملکہ معظمہ کے لئے صدر مملکت' وزیراعظم' سینٹ کے چیئرمین' قومی اسمبلی کے سپیکر' چاروں صوبوں کے گورنر اور قومی اسمبلی کا مشترکہ اجلاس بلایا گیا' اٹھارہ منٹ کا خطاب ایک رسمی خطاب تھا' نہ اس 'میں جان' نہ نکتہ آفرینی البتہ ملکہ معظمہ نے یہ انکشاف فرمایا کہ ڈیرہ غازی خاں صدر کا شہر ہے اور لاہور وزیراعظم کا' شکر ہے کچھ تو قوم کی معلومات میں اضافہ ہوا' مشترکہ سیشن بلانے پر سرکاری اخراجات کے علاوہ' انتظامی امور اور ارکان کی آمد و رفت پر ڈیڑھ کروڑ سے کم کیا خرچہ اٹھا ہوگا اور اس کا حاصل ملکہ کی ایک اچاٹ سی تقریر اور سپیکر کا یہ دلآویز جملہ کہ پاکستان کا قیام برطانیہ عظمیٰ کے سیاسی تدبر کا کرشمہ اور حکومت برطانیہ کی عنایت ہے' ڈالٹس کے سامنے بیٹھے ہوئے زندہ لاشوں کا تو کیا ردعمل تھا وہ معلوم نہیں البتہ قبروں میں لیٹے ہوئے زندہ ضمیر رہنماؤں اور کارکنوں نے ایک بار ضرور جھرجھری لی ہوگی کہ یہ سب کچھ برطانیہ کے سیاسی تدبر اور اس کی عنائتوں کا ثمر ہے تو ہم لوگ خواہ مخواہ کالے پانی کی سزائیں بھگتتے رہے' چوکوں میں پھانسی لٹکتے رہے' جو راہوں میں کوڑے

Marfat.com

کھاتے رہے' جلیانوالہ باغ میں گولیاں سہتے رہے' سینوں پر بھاری بوٹوں کا بوجھ برداشت کرتے رہے اور آزادی کے حق میں آواز اٹھاتے رہے' اصل المیہ وہی ہے جس کا ذکر پلٹ پلٹ کر کیا جاتا ہے کہ آزادی کے بعد لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو نفسیات مختلف ہوتی' جب انگریزوں کے پروردہ ہی یکے بعد دیگرے کرسی سنبھالتے رہے تو انہیں قوم کی پگڑی اچھالنے سے کیا دریغ ہو سکتا ہے؟ ملکۂ عالیہ کے دورے کی تصویری رپورٹ بھی اخبارات میں آتی رہی ہر ملاقاتی کا ہاتھ ملانے کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ آزادی کی گولڈن جوبلی کے تازہ تازہ نشے کے باوجود ان کی خوئے غلامی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی

حجر اسود کو بوسہ دینے کے لئے آدمی جتنا جھکتا ہے اتنا ہی ہر ایک نے جھک کر آداب پیش کیا' ملکہ نے اچھا کیا کہ سارا وقت دستانے پہنے رکھے' تاکہ ہر ملنے والے کو احساس ہو کہ غلام خواہ کچھ بن جائے اسے آقا کے ہاتھوں کا براہ راست لمس حاصل کرنا کارِ دشوار ہے' میاں صاحب اپنی ہر تقریر میں مالیاتی حوالے سے کشکول توڑنے کی بات کرتے ہیں ہاتھوں میں دکھائی دینے والا کشکول توڑنا ہی کافی نہیں جو گدائی کی علامت ہے' ذہنوں میں رکھا ہوا کشکول توڑنا اس سے پہلے ضروری ہے جو غلامی کی دلیل ہوتا ہے' شیر باقی جانوروں سے کوئی بڑا اور گرانڈیل جانور نہیں وہ ہاتھی کے ایک پاؤں کی داب کی مار ہے۔ لیکن اس کی --- انا---- اس کو شیر بناتی ہے وہ بھوکا مر جاتا ہے مگر گھاس نہیں چرتا' وہ فاقے سہہ لیتا ہے مگر کسی کا جھوٹا نہیں کھاتا' وہ عمر کے ہاتھوں کچھار تک محدود ہو جاتا ہے مگر اس کی گھن گھرج نہیں جاتی' اسی طرح مردان احرار لوہے کے بنے ہوئے نہیں ہوتے جو ہر ایک سے ٹکرا جاتے ہیں' ان کی ہڈی پسلیاں بھی ہوتی ہیں جو دوسروں کی طرح چٹختی ہیں' ان کاسۂ سر پر خود چڑھا ہوا نہیں ہوتا' ان کے ہاتھ آہنی پنجے نہیں ہوتے گوشت پوست کے ہوتے ہیں اس کے باوجود ظالم کے گریبان تک جا پہنچتے ہیں' ان کی آنکھوں میں پتلیاں ہوتی ہیں' آگ کے انگارے نہیں ہوتے اس کے باوجود ان سے غیرت کے شرارے پھوٹتے ہیں' ان کے منہ میں بھی عام لوگوں جیسی زبان ہوتی ہے کوئی خنجر فٹ نہیں ہوتا لیکن ان کے حروف و لفظ تیروں کا کام کرتے ہیں۔

مسئلہ صرف اندرونی کیفیت اور نفسیات کا ہوتا ہے' ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ملکہ جب پارلیمنٹ ہاؤس میں داخل ہوتیں تو ان کے قدم لڑکھڑا جاتے کہ وہ ایک آزاد ملک کے سب سے

محترم اور بڑے ادارے میں داخل ہو رہی ہیں لیکن جب اسی ایوان کے معزز ارکان ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑے نظر آئے تو ان پر کیا ہیبت طاری ہوتی؟ ایلزبتھ جب لاہور میں شاہی قلعہ پہنچتیں تو مبہوت ہو کر رہ جاتیں کہ یہ قلعہ مسلمانوں کی عظمت و شوکت کی زندہ علامت ہے مگر جب اس قلعہ کے مہتمم اور عظمت رفتہ کے وارث فرشی سلام کرنے پر اتر آئیں تو انہیں مسلمانوں کے جاہ و جلال کا کیسے احساس ہوتا؟ کبھی کبھار تو میرے لب پر انتہائی یاس کے عالم میں یہ الفاظ بھی آجاتے ہیں کہ ہم جیسے حشرات الارض کو جنم دینے کے بجائے مائیں بانجھ ہی رہتیں جب کبھی ان کی کوکھ ہری ہوتی تو صرف خالد بن ولیدؓ کو جنم دیتی' سلمان فارسیؓ کو گود پالتی' طارق بن زیادؒ ان کے پیٹ میں پرورش پاتا' محمد بن قاسمؒ ان کے دودھ کا حقدار بنتا' صلاح الدین ایوبیؒ سینے کی گرمی کا لطف لیتا' نور الدین زنگیؒ ان کی لوریاں سنتا' سلطان ٹیپوؒ کے کان اذان آشنا ہوتے' سراج الدولہؒ کو مائیں دودھ کی دھاریں پلاتیں اور اقبالؒ قائدؒ ہی دنیا میں آنکھیں کھولتے اگر ایسا ہوتا تو آج کسی کی آنکھ جھکی ہوئی نہ ہوتی۔

(13 اکتوبر 1997ء)

Marfat.com

"مثالی حکمران"

یہ شوق ہمارے حکمرانوں کو گاہے گاہے چٹکیاں کاٹتا ہے کہ ہم ملک میں خلافت راشدہ کا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں' اور انہیں یہ گدگدی بھی ہوتی رہتی ہے کہ ہم فاروقیؓ عدل کی میزان کھڑی کرنا چاہتے ہیں لیکن غالباً یا تو انہوں نے خلافت راشدہ اور خلفاء راشدین کے مزاج کا مطالعہ نہیں کیا' یا وہ صرف عام مسلمانوں کے جذبات کا کوئی ایسا خاکہ ہے جس سے ان کے ایوان عشرت کی رونق بھی کم نہیں ہوتی' دستر خوان کی لذت میں بھی فرق نہیں آتا اور زندگی کی زینت بھی متاثر نہیں ہوتی اور ساتھ ہی خلافت راشدہ بھی قائم ہو جاتی ہے' ورنہ جس نے بھی خلفاء راشدین کی شخصیت اور ان کے طرزِ حکومت کے بارے میں پڑھ رکھا ہے وہ کرسی سے بدکتا ہے اس کی طرف لپکتا نہیں' ایک حضرت عمرؓ ہی کو دیکھ لیجئے' دس برس اس انداز میں حکومت کی' کہ چہرے کا رنگ فق رہا' دل کی دھڑکن تیز رہی' سانس پھولی رہی' اعصاب ٹوٹے رہے' آنکھیں پتھرائی رہیں' سینہ خدشوں سے معمور رہا' احساسات غم اور جذبات درد میں ڈوبے رہے' اس لئے کہ جس کو فرات کے کنارے بکری کے بچے کی بھی فکر ہو وہ آرام سے کیسے رہ سکتا ہے' اور یہاں یہ عالم ہے کہ حکمران خوشیوں میں جھولتے اور عوام آہوں میں ڈوبتے دکھائی دیتے ہیں' آگ کے دریا میں ڈوب کر گزرنے کا نام خلافت راشدہ ہے' ہر دم کلی کی طرح چٹکنے اور پھول کی طرح مہکنے رہنا آج کل کے حکمرانوں کا شیوہ ہے خلفاءِ راشدین کا یہ رویہ نہیں تھا' ہمارے حکمرانوں کو چاہئے کہ وہ خلافت راشدہ کا نام لینے سے پہلے بار بار خلفائے راشدینؓ کے حالاتِ زندگی پڑھیں' بات محض نظام کی نہیں منتظم کی ہوتی ہے' کہنے کو تو خلیفہ ولید بھی رہا اور سلیمان بھی' معتصم بھی خود کو خلیفہ کہلاتا رہا اور جعفر بھی! دیکھنے کو خلفاء کی ایک قطار نظر آتی ہے مگر خلافت کا اعتبار صرف چار کی ذات سے بڑھا وہ صرف اس لئے کہ

؎ کہ در شہنشاہی فقیری کردہ اند

رہواز اور فارس کا گورنر ہرمزان جب شکست کھا کر مدینہ منورہ لایا گیا تو اس نے حضرتِ عمرؓ

Marfat.com

سے ملاقات کے لئے بڑی تیاری کی' ایرانی رئیسوں کو ہمرکاب کیا' دیبا کی قبا زیب بدن کی' مرصع تلوار کمر سے لگائی اور بڑی آن بان سے مسجد نبوی کے قریب پہنچا' پوچھا' امیرالمومنین کہاں ملیں گے؟ اس کا خیال تھا کہ جس شخص کے دبدبے نے ایک دنیا میں غلغلہ ڈال رکھا ہے اس کا دربار بڑی شان کا ہوگا' ایک بدوی نے اشارے سے بتایا "وہ ہیں ہمارے امیر" اور حال یہ کہ امیرالمومنین اس وقت صحن مسجد میں فرش خاک پر لیٹے ہوئے تھے۔

ایک صحابی حضرتِ عمرؓ کے اعمال حسنہ کا ذکر بڑے فرط اور جذبے سے بیان کرنے لگے' تو حضرتِ عمرؓ نے انہیں ٹوکتے ہوئے کہا۔ "میرے بھائی' میرے لئے بس اتنی دعا کرو کہ خدا مجھے کوئی بڑا انعام نہ دے فقط برابر سرابر چھوڑ دے میرے لئے یہی کافی ہے۔"

لوگوں نے آپ کے کرتے میں بارہ بارہ پیوند گنے' آپ کی بیٹی ام المومنین سیدہ حفصہؓ نے کہا "ابا جان نیا کرتہ بنوا لیجئے' آخر کتنے پیوند لگائیں گے؟" آپ نے فرمایا "جان پدر' میں مسلمانوں کے مال میں اس سے زیادہ تصرف نہیں کر سکتا۔"

یہ وہ شخص ہے جس کے دور میں قیصر کا تاج اُچھلا اور کسریٰ کا تخت اُلٹا' مگر کسی بھی حال میں عمرؓ کا مزاج نہیں بدلا۔

یہ واقعہ تو صفحۂ تاریخ پہ ثبت ہو چکا ہے کہ جب حضرتِ عمرؓ بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہوئے اور یروشلم کی چابیاں وصول کرنے تشریف لے گئے تو غلام اونٹ پر سوار تھا اور امیرالمومنین باگ تھامے ہوئے تھے' ایک بار شام کے سفر کے دوران ایک خیمے میں رُکے ایک بیوہ سے ملاقات ہوئی آپ نے پوچھا "بی بی آپ کو کچھ معلوم ہے کہ امیرالمومنین کہاں ہے؟" بیوہ نے بڑی بے رخی سے کہا "سنا ہے وہ شام سے چل پڑا ہے۔" آپ نے فرمایا "امیرالمومنین کے حالات سے اتنی بے خبری؟" بڑھیا نے پلٹ کر کہا "جب امیرالمومنین کو ہماری خبر نہیں تو ہمیں اس کے حالات سے کیا غرض؟" آپ نے فوراً اس کی ضروریات پوری کیں' اور اپنے رفقاء کو اس کی خبرگیری سے متعلق ہدایات دیں' آپ کا یہ رویہ دیکھ کر بیوہ بولی۔ "کاش' عمر کی جگہ تم امیرالمومنین ہوتے۔"

اس واقعہ کے بعد حضرتِ عمرؓ فرمایا کرتے تھے "خلافت کا مفہوم مجھے شام کی بڑھیا نے سمجھایا تھا۔" یعنی جو امیر رعایا کے حالات سے بے خبر ہو اسے امارت کا کوئی حق نہیں پہنچتا' جب آپ کا وقت شہادت قریب آیا تو رفقاء نے کہا کسی کو اپنا جانشین نامزد کر دیجئے اور نہیں تو اپنے بیٹے عبداللہ ہی کو جانشین بنا دیجئے' آپ نے بڑی بے پروائی سے فرمایا "کیا میں اسے مسلمانوں کا امیر بنا دوں جسے

Marfat.com

اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ڈھنگ بھی نہ آیا۔" (واضح رہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیک وقت تین طلاقیں دی تھیں یہ طریقہ شریعت میں ناپسندیدہ سمجھا گیا ہے۔) جب زیادہ اصرار کیا گیا تو آپ نے فرمایا "اگر تو خلافت ایک نعمت تھی تو عمرؓ اور اس کے خاندان نے وافر حصہ پالیا اور اگر آزمائش ہے تو میں اپنی اولاد کو اس آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا۔" یہ کہہ کر پہلو بچالیا کیا ہمارے حکمرانوں کے ذہن میں خلافت راشدہ کا یہ نقشہ ہے یا اس کے مختلف کوئی اور تصور؟ حضرتِ عمرؓ دنیا سے رخصت ہو گئے 'کیا کوئی مؤرخ یہ نشاندہی کر سکتا ہے کہ آپ نے اپنی میراث میں کوئی جائیداد چھوڑی ہو؟ کوئی بنگلہ چھوڑا ہو؟ کوئی باغ چھوڑا ہو؟ کوئی حویلی چھوڑی ہو؟ کوئی نقدی چھوڑی ہو؟ کوئی زیورات چھوڑے ہوں؟ ان میں سے کچھ بھی چھوڑ کر نہیں گئے ایک جانشین رسول کا انداز چھوڑ گئے' خدمت عوام کا طریقہ چھوڑ گئے اور عدل کا ایک معیار چھوڑ گئے' اور یہی چیزیں کسی کو مثالی حکمران بناتی ہیں' یہ سوال عبث ہے کہ اس زمانے میں ایسی ہی سادگی اور ایسا ہی بدویانہ طرزِ زندگی ہوتا تھا' دائیں بائیں روم اور ایران تھے' قیصر و کسریٰ کے محلات کا ہر سو چرچا تھا'

امراء کی آن بان سب کو معلوم تھی' شاہی درباروں کے آداب کا ہر ایک کو علم تھا' اور رئیسانہ ٹھاٹ بھاٹھ سے ارد گرد آشنا تھا مگر ان میں سے کوئی بھی چیز نہ حضرت عمرؓ پر اثر انداز ہو سکی اور نہ ان کے اندازِ حکومت کو متاثر کر سکی۔

(13 ستمبر 1998ء)

”نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے“

آج دنیا بھر میں امریکہ کی عظمت، قوت، سطوت، اور قیادت کا ناقوس بج رہا ہے، امریکہ کو اپنی آئیڈیالوجی پر بڑا ناز ہے، اپنی ٹیکنالوجی پر بڑا گھمنڈ ہے، اپنی صنعت پر بڑا مان ہے، اپنی عسکری صلاحیت پر بڑا فخر ہے اور اپنی دانش و حکمت پر بڑا غرور ہے، دنیا بھی اس کے لہک لہک کر قصیدے گا رہی ہے اور اس کی طرف لپک لپک کر بڑھ رہی ہے، امریکہ کا ایک سحر ہے جو سب پر طاری ہے اور ایک طلسم ہے جو بہت ہوشربا ہے، امریکہ دنیا کی قیادت کا علمبردار اور عقل کل ہونے کا دعویدار ہے، اس کا ویزا عام آدمی کے لئے خوش بختی کی علامت اور سیاستدانوں اور حکمرانوں کے لئے اسکا دورہ کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے، کسی ملک کے لئے امریکہ کی حمایت اس کے لئے سعادت اور مخالفت اس کے لئے شامت تصور کی جاتی ہے، امریکہ کی جنبش لب کو آج تقدیر مبرک کا درجہ حاصل ہے اور اس کے ماتھے کی شکنیں اقوام عالم کی صفیں درہم برہم کر دیتی ہیں، آج امریکہ بیک وقت کئی گدیاں سنبھال کر بیٹھا ہے وہ خود کو عصر حاضر کا بقراط اور افلاطون بھی سمجھتا ہے کہ علم و حکمت کا سرچشمہ اس کی سرزمین سے پھوٹتا ہے، وہ ثانی نوشیرواں بھی ہے کہ میزان عدل اس نے قائم کر رکھی ہے وہ حاتم طائی بھی ہے کہ ایک زمانہ اس کے دستر خوان کا خوشہ چین ہے، وہ رستم و سہراب بھی ہے کہ اس کی پہلوانی کے چار سو ڈنکے بج رہے ہیں، وہ قارون بھی ہے کہ زمانے بھر کی دولت اس نے دبا رکھی ہے، وہ چنگیز و ہلاکو بھی ہے کہ اس کی وحشت و بربریت نے ایک عالم کو مبتلائے آزاد کر رکھا ہے، اور وہ جالینوس بھی خود کو قرار دیتا ہے کہ ہر دکھ کا مداوا اس کے پاس ہے، لیکن اس سب کے باوجود گذشتہ دنوں امریکہ کے صدر کلنٹن کے اخلاق و کردار کا جو نمونہ سامنے آیا، تو ہر ذی ہوش چونک اٹھا، کہ ایک ”عالمی قائد“ کا پیمانۂ اخلاق اور معیارِ کردار یہ ہے؟ بلاشبہ سیاسی لیڈر بھی ایک انسان ہوتا ہے اور کوئی انسان بشری لغزشوں اور انسانی کمزوریوں سے بالا اور معرا نہیں ہوتا، لیکن اسے بہرحال ایک محتاط اور ذمہ دار شخص ہونا چاہئے، دنیا بھر کے سماج کا یہ متفقہ نظریہ اور درست خیال ہے کہ ایک لیڈر کو خواہ وہ دینی پیشوا ہو یا سیاسی رہنما، اسے صاحب علم

ہونا چاہیے' بلند فکر ہونا چاہیے' مضبوط اعصاب کا مالک ہونا چاہیے' معتدل مزاج ہونا چاہئے' متوازن طبع ہونا چاہئے' قوتِ فیصلہ کا حامل ہونا چاہئے' صاف دل' پاک نظر اور نیک نیت ہونا چاہئے' یہی بنیادی انسانی اخلاق اور قائدانہ کردار کا تقاضا ہے' یہودیت' عیسائیت' بدھ مت' ہندو مت' جین مت' اشتراکیت اور اسلام میں قیادت کے لئے یہ پیمانے اور تقاضے متفق علیہ ہیں' مگر جب سے دنیا پر مغربی تہذیب کا غلبہ ہوا ہے' پرانے سانچے ٹوٹ کر رہ گئے' اور نئے زاویے ابھر کر سامنے آگئے ہیں' چنانچہ یہ فقرہ آج بہت پاپولر ہو چکا ہے' ''نہیں جی' یہ فلاں کا نجی معاملہ ہے۔''

جب کہ اسلام اس معاملے میں بڑا واضح رویہ اختیار کرتا ہے اس کے ہاں خلوت اور جلوت کا تضاد منافقت ہے اور منافق آدمی کو معاشرے کا رہنما بننے کا کوئی حق حاصل نہیں' اسلام میں زنا' شراب نوشی' قمار بازی یا سب اخلاقی برائیاں ہیں اور وہ کسی بدکردار انسان کی قیادت کا منصب سونپنے کو روا نہیں رکھتا' یورپ کی دیکھا دیکھی یہ وبا ہمارے ہاں بھی رفتہ رفتہ عام ہو رہی ہے کہ لیڈر کی شخصیت کو نہیں دیکھا جاتا صرف اس کے اندازِ سیاست کو سامنے رکھا جاتا ہے' اس کے سیاسی نعروں پر توجہ دی جاتی ہے' اس کے پارٹی منشور پر غور کیا جاتا ہے اور اس کے خوش کن دعووں اور وعدوں پر نظریں جمائی جاتی ہیں' حالانکہ لیڈر صرف کرسی حکومت سنبھالنے کے لئے نہیں ہوتا' بلکہ اس کے طرزِ سیاست اور اندازِ حکومت کا عوام کے اخلاق و کردار اور مزاج و اطوار پر براہ راست اثر پڑتا ہے' انسانی معاشرت محض اس کا نام نہیں کہ ہر ایک کو روٹی مل رہی ہے' سڑکیں شاندار ہیں' ٹریفک رواں دواں ہے' تعمیرات زوروں پر ہیں' چمنیاں دھواں اگل رہی ہیں' ایکسپورٹ ترقی پر ہے' بجٹ خسارے سے پاک ہے' اور روزگار کے مواقع عام ہیں' بلکہ انسانی معاشرت میں اخلاق و کردار کو ایک بنیادی پتھر کا درجہ حاصل ہے' انسانی معاشرت میں مندرجہ بالا چیزوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جاتا ہے اور دیکھا جانا چاہئے' کہ معاشرت میں غیرت کس قدر ہے؟ جرأت کا کیا عالم ہے؟ نیکی کی شرح کی کیا کیفیت ہے؟ فکر و نظر کی پاکیزگی کا کیا حال ہے؟ شائستگی کس درجے میں ہے اور آبروئے آدم کا کس قدر لحاظ و پاس ہے؟

اگر ان چیزوں کا انسانی معاشرت میں کہیں ذکر اور دخل نہیں تو پھر وہ حیوانوں کا باڑہ ہے جہاں ہر ایک کی لگام کھلی ہے اور ہر ایک کھونٹے سے بے نیاز ہے' قیادت کا یہ فرض ہوتا ہے کہ اپنی قوم اور فرزندانِ وطن کو اپنا بہترین اخلاقی نمونہ پیش کرے تاکہ قوم میں اچھی اخلاقیات پرورش پائیں' وہ بلند نگہی کا مظاہرہ کرے تاکہ عوام کی نگاہیں خرافات میں کھو کر نہ رہ جائیں' مسٹر کلنٹن

Marfat.com

اس وقت عالمی قیادت کے منصب پر فائز ہیں' وہ ایک عالم کو اپنے کردار سے کیا پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ایک لیڈر کو اپنا دفتر بد کرداری کے لئے استعمال کرنا چاہیے اور قوم کو اس پر خواہ مخواہ واویلا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں؟ وائٹ ہاؤس کے بیشتر فیصلے دنیا کے لئے مصیبت اور بے برکت کیوں ثابت ہوتے ہیں؟ اس کا سبب اب سامنے آیا ہے کہ جہاں اس نوع کے مشغلے جاری ہوں وہاں کے فیصلے یقیناً مکروہ اور بے فیض ہوں گے' امریکہ اور اہل مغرب کی ذہنی سطح اور اخلاقی روش بھی اس قدر پست ہو گئی ہے کہ جس دن کلنٹن اور مونیکا کا وڈیو ٹیپ آئن آئر آرہی تھی اسی وقت صدرِ امریکہ جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس سے خطاب کر رہے تھے پورا مغرب ٹی وی پر ٹوٹا پڑا تھا کہ جنسی تفصیلات سے پوری طرح بہرہ اندوز ہو سکے' اسے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ اقوام متحدہ اس وقت کیا بحث کر رہی ہے؟ اور جنرل اسمبلی کس عالمی ایشو پر توجہ مرتکز کئے ہوئے ہے؟ یورپ کی تقلید میں ہمارے ہاں بھی ایک طبقہ اس نوع کی سوچ کا حامل بنتا جا رہا ہے جسے بجز خرافات' اچھل کود' بیہودہ میوزک اور بے ہنگم طرزِ زندگی کے کسی دوسرے کام سے دلچسپی نہیں ہے' کلنٹن پر بھی جو دباؤ جیوری اور عوام کی جانب سے پڑا ہے وہ جنسی بے راہروی کے باعث نہیں بلکہ اس عمل سے انکار اور جھوٹ بولنے کی وجہ سے پڑا ہے گویا بد کرداری معمولی چیز ہے اور جھوٹ بولنا بہت بڑی برائی' جب کہ یہ دونوں باتیں لائق نفرین اور باعث لعنت ہیں' یہ سب نئی تہذیب کے شاخسانے ہیں' جس پر ایک دنیا فدا ہو رہی ہے' اگر اس کی اِسی طرح پذیرائی اور حوصلہ افزائی ہوتی رہی تو اس کا مطلب واضح ہے کہ کل کو سیاست بے راہروی' قیادت بد چلنی اور معاشرت قحبہ گری کی شکل اختیار کر جائے گی' کیوں کہ ہر ایک یہی کہے گا کہ "یہ میرا نجی معاملہ ہے۔"

(3 اکتوبر 1999ء)

"حکمران کا اندازِ معاشرت"

۱۹۹۸ء کی ایک تازہ ترین رپورٹ کے مطابق ہیومن ڈویلپمنٹ کے اعتبار سے پاکستان ۱۳۸ ویں نمبر پر ہے' جب کہ کینیڈا پہلے' فرانس دوسرے' ناروے تیسرے' امریکہ چوتھے اور برطانیہ چودھویں نمبر پر ہے' چین ۳۵ نمبر پر ہے۔

ہیومن ڈویلپمنٹ کا مطلب ہے کہ کوئی معاشرہ صنعتی ترقی' معاشی انصاف' معاشرتی اقدار' انسانی حقوق کے معیار' روزگار کے مواقع اور دیگر بنیادی سہولیات کے لحاظ سے کس مقام پر کھڑا ہے؟ اب یہ کوئی انکشاف نہیں بلکہ معلوم حقیقت اور معروف مشاہدہ ہے کہ پاکستان کی صنعت اس وقت عالم نزع میں ہے' معاشی انصاف کی حالت یہ ہے کہ چالیس فی صد آبادی غربت کی انتہائی حد (Povertyline) سے نیچے زندگی بسر رہی ہے' معاشرتی اقدار سخت بحران کی زد میں ہیں' انسانی حقوق کا معیار بہت پست ہے' روزگار کے مواقع پر برسوں سے پابندی عائد ہے' رہ گئی دیگر بنیادی سہولیات تو ان کا ذکر دل دکھانے کو کافی ہے' ہسپتال بذاتِ خود بیمار ہیں' سکول ناکافی' سڑکیں خستہ اور ٹرانسپورٹ علیل ہے' تقریباً پندرہ کھرب روپے (تیس ارب ڈالر) کا قرضہ سر پر ہے' ہر سال بجٹ کے لئے تین کھرب روپے ادھار لینے پڑتے ہیں' لیکن اس کے باوجود ہمارے حکمرانوں کا طرزِ معاشرت یہ پتہ دیتا ہے کہ یہ لوگ ایک ایسے ملک کے حکمران ہیں جس کے دریاؤں میں گدلا پانی نہیں شیریں اور شفاف دودھ بہتا ہے' جس کے درختوں پر پتے نہیں روپے اگتے ہیں' جس کے موسم برسات میں سونے اور چاندی کی بارش ہوتی ہے' اور جس میں آنے والے سیلاب دنیا جہاں کی نعمتیں سمیٹ کر یہاں بکھیر دیتے ہیں' اسسٹنٹ کمشنر ہو یا ڈپٹی کمشنر' کمشنر ہو ہو گورنر اور وزیر اعلیٰ ہو یا وزیر اعظم سب کا اندازِ معاشرت ملک کے افلاس اور عوام کی غربت کی ہلکی سی چغلی بھی نہیں کھاتا' اے سی کو دیکھ کر قطعاً اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی دور افتادہ تحصیل کا حاکم ہے' ڈی سی سے مل کر بالکل احساس نہیں ہوتا کہ وہ کسی پسماندہ ضلع کا سربراہ ہے' کمشنر کی طرزِ زندگی سے ماشہ برابر یہ نہیں جھلکتا کہ وہ کسی مسائل زدہ ڈویژن کا انچارج ہے' وزیر اعلیٰ کی شان و شوکت سے

Marfat.com

یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کسی غریب صوبے کا مقتدر ہے اور نہ ہی وزیراعظم کے قرینۂ زیست سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی مقروض ملک کا چیف ایگزیکٹو ہے' نمائشی اقدامات کی بات نہیں ہو رہی جو سادگی کے حوالے سے یہاں اکثر و بیشتر کئے جاتے ہیں بلکہ اس مسلسل طرزِ عمل کی بات ہو رہی ہے جو برسوں سے ہمارے حکمران اختیار کئے ہوئے ہیں' اسمبلیوں کا کوئی جاندار اور نتیجہ خیز کردار نہیں لیکن پارلیمنٹ ہاؤس دوسرے چوتھے سال نیا تیار ہو جاتا ہے' صدر صاحب فیتے کاٹنے سے آگے اختیار نہیں رکھتے' لیکن ایوان صدر کی شوکت شاہانہ کے کیا کہنے' گورنر محض ایک رسمی دستوری عہدہ ہے لیکن گورنر ہاؤس شہر کا سب سے مہنگا محل ہے' مشاورت نام کی کوئی چیز نہیں لیکن ڈیڑھ درجن مشیروں کا خرچہ سرکاری خزانے کے سر ہے' بینک "بینکرپٹ" ہو چکے ہیں لیکن ان کے سربراہوں کی تنخواہیں اور مراعات لاکھوں میں ہیں' کسی بڑے افسر کے دفتر اور گھر کو دیکھ کر کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا کہ یہ ملک غریب یا مقروض ہے' یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک کے پاس اتنے وسائل نہیں کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے' یہ بھی ممکن نہیں کہ حکومت ہر شخص کو سرکاری ملازمت فراہم کر سکے' یہ بھی معلوم ہے کہ وسائل کی عدم دستیابی کے باعث تعلیم مفت نہیں دی جا سکتی' یہ بھی تسلیم ہے کہ ہر شخص کا علاج موجودہ وسائل میں حکومت کے لئے بہت مشکل ہے' یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ہر خاندان کو حکومت رہائشی سہولتیں مہیا نہیں کر سکتی' اور یہ بھی ماننا چاہئے کہ غربت اور فلاکت کے باعث عوام کا معیار زندگی ناروے اور سویڈن کے عوام کے برابر حکومت نہیں لا سکتی' دوسرے لفظوں میں یہ تو نہیں ہو سکتا کہ حکومت عوام کو اونچا معیارِ حیات فراہم کر سکے لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ حکمران اپنا معیار زندگی نیچے لے آئیں' آخر غریب عوام کے لئے امیر حکومت کیوں لازم قرار دے دی گئی ہے؟

ویسے جس ملک کی گندم اپنی ہو' کپاس اپنی ہو' گنا اپنا ہو' چاول اپنا ہو جو ملک دال اپنی بوئے' سبزی اپنے اگائے' پھل اپنے پیدا کرے' جس ملک میں وافر زمین بھی ہو' زمین کے دامن میں دریا بھی ہوں' نہروں کا جال بھی ہو' درختوں کے ذخیرے بھی ہوں' اور جس دھرتی کے پیٹ میں تیل بھی ہو' لوہا بھی ہو' تانبہ بھی ہو' جست بھی ہو' اور جس کی پیٹھ پر فلک بوس پہاڑ بھی ہوں اور مٹی کے بڑے بڑے تودے بھی ہوں' اس ملک کو اس قدر مفلس اور مقروض ہونا نہیں چاہئے' ہوتا صرف یہ ہے کہ بہت سے خزانے اور وسائل تو حکومت نگل جاتی ہے عوام کے لئے مسائل نہیں بچیں گے تو اور کیا ہو گا؟ اس طرح دودھ کی ساری بالائی تو "طبقۂ بالا" اتار کر لے جاتا ہے' باقی اہل

Marfat.com

وطن چھاچھ ہرگز گوارا نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے؟ ہمارے حکمرانوں نے جس دن "قرض اتارو ملک سنوارو" مہم میں اپنے پورے خاندان کی طرف سے --- ایک کروڑ روپے--- کی "خطیر اور کثیر" رقم دینے کا اعلان کیا تھا کاش وہ اس روز رائیونڈ میڈیکل سٹی اور ایجوکیشن کمپلیکس پر اٹھنے والے چوہتر کروڑ روپے قرض اتارو سکیم میں شامل کرنے کا اعلان کر دیتے تو شائد لورالائی' تھرپارکر' چولستان اور درگئی کی کٹیا نشین ہماری مائیں اور بہنیں اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں اور بیٹیوں کے جہیز تک اس فنڈ میں دے دیتیں' لیکن جب لوگ دیکھتے ہیں کہ ہمارے حکمران اور امراء محض اپنے ذوق دہن کے لئے دس ارب روپے کا اناناس درآمد کرتے ہیں جس سے ان کے لئے کیک اور پیسٹریاں تیار ہوتی ہیں' تو ان کی آرزوئیں مریض ہجر کی طرح طلوع صبح سے پہلے دم توڑ جاتی ہیں اور ان کی خوش فہمیاں چراغ مفلس کی مانند سر شام ہی بجھ جاتی ہیں۔

عوام یہ نہیں چاہتے اور نہ ہی وہ اتنے کودن اور بد مغزے ہیں کہ وہ حکومت سے مطالبہ کریں کہ آج کے دور میں صدر مملکت کہیں خیمہ گاڑ کر بیٹھ جائیں' نہ وہ وزیراعظم کو کسی کچے گارے کی کوٹھڑی میں بٹھانا چاہتے ہیں' اور نہ ہی وہ سرکاری دفتروں کو گھوڑوں کے اصطبل میں منتقل کرنے پر اصرار کرتے ہیں' عوام صرف یہ چاہتے ہیں' کہ وطن کی غربت کے مطابق اندازِ معاشرت ہونا چاہئے' ملک کے افلاس کو دیکھ کر حکمرانوں کو عیاش ہونا چاہئے' پاکستان پر چڑھے ہوئے قرضے دیکھ کر اپنے بیرونی اور اندرونی دورے ترتیب دینے چاہئیں' عوام کی مفلسی کے حساب سے اپنی پبلسٹی پر خزانہ خرچ کرنا چاہئے' اور مجموعی قومی مسائل دیکھ کر وسائل کا صرفہ ہونا چاہئے' عوام کا معیار زندگی پست ہوتا چلا جائے اور حکمرانوں کے قصر و ایوان بلند تر ہوتے جائیں یہ کہاں کا انصاف ہے؟ بیرونی امداد بند ہوتی جائے اور وزیروں اور مشیروں کی تعداد بڑھتی جائے یہ کون سی دانشمندی ہے؟ لوگوں کو کفن کے لئے کپڑا نصیب نہ ہو اور حکمرانوں کو خیر مقدم کے لئے ریشمی تھانوں کے بینر لہرا رہے ہوں یہ کس طرح کی ہمدردی ہے؟ بات صرف یہ ہے کہ آمد اور خرچ میں توازن پیدا کیا جائے' وسائل اور مسائل میں فرق مٹایا جائے' درآمد اور برآمد میں اعتدال لایا جائے' ملکی معیشت اور حکومتی معاشرت میں ہم آہنگی سامنے آئے' اور عوام کی خواہشوں اور حکمرانوں کی آسائشوں میں موجود بے پناہ فاصلہ دور کیا جائے۔

(25 ستمبر 1998ء)

Marfat.com

اعلیٰ دماغ اور غنی مزاج رہنما کی ضرورت

لیڈری کا شوق پالنے کو تو ہمارے ہاں ہر دوسرا آدمی تیار ہے بالخصوص جاگیردار طبقہ اور نودولتیے اس کے لئے ہروقت کمربستہ رہتے ہیں اس لئے کہ روٹی روزگار کے غم سے وہ آزاد ہوتے ہیں' انہیں کسی شغل کی تلاش ہوتی ہے سووہ قوم کے لیڈر بن جاتے ہیں' اور اسی قماش کی لیڈر شپ نے ملک کو الٹے پاؤں سفر کرنے پر مجبور کر رکھا ہے' قائداعظمؒ کے بعد کوئی شخص ایسا نہ اٹھا جو سیاسی میدان میں معجزہ کر دکھاتا' قدرت نے قائداعظمؒ کو دماغ اعلیٰ اور مزاج غنی دے رکھا تھا' جب کسی نے علامہ اقبالؒ سے پوچھا کہ آخر قیادت کے ضمن میں آپ کی نگاہ انتخاب محمد علی جناح کی طرف کیوں اٹھی؟ تو انہوں نے دو حرفی مگر بہت خوبصورت اور جامع جواب دیا تھا' انہوں نے کہا کہ یہ شخص دو خوبیاں رکھتا ہے ایک یہ کہ یہ شخص Un Parchase Able (ناقابل خرید) ہے اور دوسرے (In Corrupt Able) (آلودہ نہ ہونے والا) ہے' اور یہ دو صفات اعلیٰ انسانی اخلاق اور بلند پایہ قیادت کی دلیل اور مظہر ہیں' کچھ اچھے لوگ اگر میدان سیاست میں آئے بھی تو لوگوں کی تیکھی نگاہوں نے انہیں ابھرنے نہ دیا' اس لئے کہ ہم زر اور زود کی سیاست کے خوگر ہو چکے ہیں' علم و فضل اور اخلاق و کردار ثانوی حیثیت رکھتے ہیں' آج پوری قوم اپنے طرزِ عمل اور لیڈروں کی فردِ عمل کا خمیازہ بھگت رہی ہے' ظاہر ہے جو شخص کروڑ پتی ہو اور سیاست میں آئے یا سیاست میں آنے کے بعد کروڑ پتی بن جائے وہ کروڑوں کے "مروڑ" سے کب نجات پا سکے گا؟

لیڈر بننے میں کشش تو بہت ہے' زندہ باد کے نعروں کی گونج کس کو مدہوش نہیں کرتی' نشتر پارک اور موچی گیٹ کے جلسے کس کا دل نہیں لبھاتے' ہوائی اڈوں پر کارکنوں کا ہجوم کس کو نہیں بھاتا' جہازی حجم کے پوسٹر اور قد آدم پورٹریٹ کس کو مسحور نہیں کرتے' اخبارات میں آٹھ کالمی انٹرویو کس کی چٹکیاں نہیں لیتے اور ٹی وی سکرین پر رنگین تصویر کس کے سینے میں ہلچل نہیں مچاتی' مگر یہ سب کھلونے ہیں جو اس سے دل بہلائے اور خوش ہو جائے وہ ابھی بچہ ہے لیڈر نہیں' یہ باتیں بہت دلفریب ہیں پھر بھی۔

Marfat.com

ے نمازِ عشق میں گو دل کشی بہت ہے مگر
جگر کا گرم لہو چاہئے وضو کے لئے

لیڈر کو اعلیٰ دماغ اور غنی مزاج ہونا چاہئے' اعلیٰ دماغی انسان کو وژن عطا کرتی ہے اور غنی مزاج لیڈر کو اس کی ذات' خاندان کے مفاد اور ہوس مال و جاہ سے اوپر اٹھا دیتی ہے' جو لوگ تاریخ میں امر ہوئے ہیں' رشوت اور سفارش کی بنیاد پر نہیں اہلیت اور کڑی آزمائش کے زور پر ہوئے ہیں' ورنہ تاریخ کے سفر میں کسی کو گرد کی طرح بیٹھنے' بتاشے کی طرح پگھلنے' دھوئیں کی طرح اڑنے' بلبلے کی طرح پھٹنے' ہوا کے جھونکے کی طرح گزرنے اور پانی کی لکیر کی طرح مٹنے میں کتنی دیر لگتی ہے؟

ہمارے ہاں اکثر و بیشتر لیڈر اپنی تصویر دیکھ کر اور چوکھٹے میں چھپی اپنی خبر پڑھ کر خوش ہونے والے ہیں' یہ چیزیں ان کے لئے آکسیجن کا کام دیتی ہیں' کمال تو ان لوگوں کا ہے جن کے زمانے میں نہ اخبار تھے' نہ ریڈیو تھے' نہ ٹی وی' نہ فیکس' نہ انٹرنیٹ' نہ ہوائی جہاز' نہ ٹیلی فون' اور نہ اخبار مگر سینۂ ہستی پر نقش اور لوحِ جہاں پر رقم ہو کر رہ گئے ہیں' وہ حرف مکرر نہیں تھے کہ مٹا دیئے جاتے بلکہ ہمیشہ قند مکرر بن کر رہے جن کی یاد سے زمانہ بار بار لطف لیتا ہے۔

اوروں کو چھوڑیئے ایک عمر فاروق اعظمؓ کو لے لیجئے' ابن خطابؓ کو تاریخ کس کس القاب سے یاد نہیں کرتی' ان کا عدل ایک مثال بنا' حق و باطل میں واضح فرق ان کا مزاج ٹھہرا' شجاعت ان کی فضیلت اور غیرت ان کی سیرت قرار پائی' وہ چہرے کے میک اپ اور کپڑوں کے انتخاب میں ہر وقت الجھے رہنے والے نہیں تھے' نہ ہی صوفوں اور قالینوں کی رنگت اور بنت میں انہیں استغراق تھا' وہ ماضی میں اپنے اونٹ چرانے کے ذکر پر شرماتے نہیں بلکہ فخر کرتے تھے' بیت المال کا اونٹ گم ہو جاتا تو اسے بنفس نفیس ڈھونڈنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے تھے' پیوند لگا کرتا پہن کر وہ کسی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوتے تھے' کسی بیوہ کے گھر چولہا جلاتے ہوئے راکھ سے ان کی داڑھی اٹ جاتی تھی تو کسمساتے نہیں تھے' غلام اونٹ پر سوار ہوتا اور وہ مہار پکڑے پیدل چل رہے ہوتے تھے تو دبدبۂ فاروقی میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے' رات کو اکیلے گشت پر نکل کھڑے ہوتے تو ان کی امارت خطرت میں نہیں پڑ جاتی تھی' ہمارے یہاں کا کم و بیش ہر لیڈر نمود و نمائش' آسائش و آرائش اور طعام و رہائش کے تارِ عنکبوت کو توڑنے کی جرأت نہیں کر رہا جو ایک ہلکی سی پھونک بھی نہیں سہہ سکتا' وہ جو کسی نے شاعرانہ رنگ میں کہا ہے۔

Marfat.com

ترک تعلقات کو اِک لمحہ چاہئے
لیکن تمام عمر یہی سوچنا پڑا

ہمارے لیڈروں نے لمحوں کے سفر کو صدیوں کا سفر بنا کر قوم کے لئے بہت بوجھل کر دیا ہے' اعلیٰ دماغ اور غنی مزاج ایک لمحے میں صدیوں کو اپنی مٹھی میں کر لیتا ہے اور تھڑدلے لوگ لمحوں کو پھیلا کر صدیوں میں بکھیر دیتے ہیں' پھر ان کو سمیٹنے میں عمریں لگ جاتی ہیں' پھر بھی کبھی ہاتھ نہیں آتا' ویسے تو پوری کی پوری ملت اسلامیہ اس بات میں تہی دامن ہے کہ کوئی اونچا' بڑا اور کھرا رہنما اسے میسر نہیں' اگر ہوتا تو یہ بونے کب کے کونے سنبھال چکے ہوتے اور کون انہیں لیڈر ہونے دیتا' لیکن پاکستان تو ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کسی ایسے شخص کو دیکھ رہا ہے جو اپنی ذات کی چاہت اولاد کے مستقبل کی ضمانت' مال و زر کی وسعت اور اقتدار کی شان و شوکت سے بہت بالاتر ہو کر رہنمائی کا فریضہ انجام دے' کوئی تو ہمارا رہنما ایسا ہو جو صدیق اکبرؓ کی طرح اقتدار سنبھالنے کے دوسرے دن کپڑے کا تھان کندھے پر اٹھا کر بازار نکل کھڑا ہو کہ حکومت تو کروں گا لیکن اپنی روزی آپ کماؤں گا' کوئی تو ہو جو فاروق اعظمؓ کی طرح بدو کی طرف سے کرتے کا حساب مانگنے پر خدا کا شکر ادا کرے کہ جب تک ایسے لوگ موجود ہیں عمرؓ راہ حق سے نہیں بھٹک سکتا' کوئی تو ہو جو عثمان غنیؓ کی طرح اپنی ذات کو امت میں تفرقے کا باعث نہ بننے دے اور واضح طور پر کہہ دے میری جان جاتی ہے تو جائے امت کی رائے کو منقسم نہیں ہونا چاہئے کوئی تو ہو جو علی المرتضیٰؓ کی طرح اپنے قاتل کو دودھ کا پیالہ پیش کرنے کا اپنے اندر حوصلہ رکھتا ہو' اور کوئی تو ہو جو امام حسنؓ کی طرح اقتدار کو امت کے مفاد کے لئے قربان کرنے کی جرأت رکھتا ہو' بڑے نام کے لئے اونچا مزاج اور بڑے کام کے لئے اعلیٰ دماغ درکار ہے' اور بدقسمتی سے بازارِ قیادت میں یہی جنس نایاب ہے۔

(11 ستمبر 1998ء)

Marfat.com

بت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے

آج کل رجال دین مغرب اور مغرب زدگان کی خصوصی "کرم فرمائیوں" اور "عنایات" کا ہدف ہیں، وجہ وہی پرانی کہ کباب میں ہڈی کسی کو اچھی نہیں لگتی، کیونکہ خواہ مخواہ گلے کی پھانس بن جاتی ہے۔

اہل مغرب کا رویہ تو قابل فہم ہے کہ وہ دنیا بھر میں بے خدا تہذیب اور مادر پدر آزادی کو غالب دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن مغرب زدگان کا انداز بہت الجھا ہوا ہے، وہ ہیں تو مسلمان لیکن ہر بند سے آزاد رہنا، انہیں مرغوب ہے نمائندگی وہ مشرقی معاشروں کی کرتے ہیں لیکن بندگی کا رشتہ وہ مغرب سے استوار رکھنا چاہتے ہیں، سانس تو مسلم سوسائٹی میں لیتے ہیں لیکن آب و ہوا انہیں مغرب کی راس آتی ہے، شوق حکمرانی تو وہ مسلم ممالک میں پورا کرتے ہیں لیکن ذوق، حکمرانی ان کا مغربی ہے، مشہور مغربی مورخ ٹائن بی کے بقول یہ "دوغلی نسل" ہر مسلم ملک میں موجود اور مغربی مفادات کی چوکیدار ہے یہ کشمکش اگرچہ ہر جگہ دیکھنے میں آرہی ہے مگر وطن عزیز پاکستان میں اس کا رنگ ذرا "چوکھا" نظر آرہا ہے۔

وزیر اعظم پاکستان نے ادیبوں اور دانشوروں کی بین الاقوامی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو انہوں نے آکسفورڈ میں پڑھا تھا ان کی گفتگو کا کلائمکس وہ حصہ تھا جب علماء ان کی زینت سخن بنے، اس موقع پر ایک پیراگراف نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے انہوں نے فرمایا "انگریز نے ملاؤں کو پیسے دیئے کیوں کہ وہ لڑاؤ اور تقسیم کرو کی سیاست کرتے تھے انہوں نے مولویوں کو ان قوم پرست سیاستدانوں کے خلاف استعمال کیا جو برطانوی تسلط سے آزادی چاہتے تھے دوسری جنگ (عظیم) کے اختتام کے ساتھ نو آبادیاتی نظام کا بھی خاتمہ ہو گیا یاٹ کی کانفرنس کے ساتھ سرد جنگ کا آغاز ہو گیا جہاں برطانوی سامراج کا خاتمہ ہوا وہاں سے سی آئی اے نے آغاز کیا سی آئی اے کو مذہبی لیڈروں کی ضرورت تھی تاکہ وہ کمیونزم کا مقابلہ کر سکیں اس کے لئے انہیں فنڈ بھی دیئے گئے لیکن جب افغانستان کی سرزمین پر آزاد فریق کے حق میں جنگ جیت لی گئی تو مذہبی لیڈروں کو گرم آلوؤں کی طرح ایک طرف پھینک دیا گیا بے نظیر بھٹو نے کہا کہ جن مذہبی عناصر کو

Marfat.com

مغربی ممالک نے فنڈز اور بندوقیں فراہم کیں وہی اب مغرب کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تا کہ وہ توجہ حاصل کر سکیں وہ جمہوریت کے راستے میں اقتدار حاصل نہیں کر سکتے جو بھی جمہوریت کی سیاست کرتا ہے اسے مغرب نواز قرار دے دیا جاتا ہے در حقیقت یہ آمریت کے لئے راستہ ہموار کرنے کی ایک کوشش ہے میں اور پیپلز پارٹی مذہبی سکالروں اور ملاؤں کے درمیان واضح فرق محسوس کرتی ہوں۔" (روزنامہ "نوائے وقت" یکم دسمبر ۱۹۹۵)

اس اقتباس میں کوئی کاٹ چھانٹ نہیں کی گئی اور نہ ہی بریکٹ میں اپنی طرف سے کوئی جملہ بڑھایا گیا' آزادی کی تحریک سے لے کر افغان جہاد اور موجودہ فوجی بغاوت (؟) تک کے تمام معاملات پر اختصار سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے' ایک مضمون ظاہر ہے ساری باتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا تاہم اسی اختصار کے ساتھ ہم بھی یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتے ہیں کہ تحریک آزادی میں "ملاؤں" نے تو انگریز سے پیسے لے کر قوم پرست رہنماؤں کی مخالفت کی لیکن جس طبقے سے محترمہ کا تعلق ہے اور جس خاندان کی وہ چشم و چراغ ہیں وہ طبقہ اس وقت کہاں کھڑا تھا؟

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہو یا تحریک پاکستان دونوں مواقع پر انگریز کی جیلوں میں کون تھے اور انگریز کے جوتوں میں کون "تشریف فرما" تھے؟ مالٹا کے زندانوں میں کون تھا اور فرنگی دستر خوانوں پر کون تھا؟ جزیرہ انڈیمان میں کس کا جنازہ لوگوں کے کندھوں پر تھا اور کون انگریز کے جوتے سروں پر رکھے ہوئے تھا؟ کون جلیانوالہ باغ میں گولیاں کھا رہا تھا اور کون اس وقت انگریز کے کتے نہلا رہا تھا؟ کون اپنے جسم پر گرم استری پھروا رہا تھا اور کون انگریز سے پیمان وفا باندھ رہا تھا؟ اس خطے کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ

جیلوں میں سڑنے والے' زندانوں کو آباد کرنے والے' جیل سے جنازہ اٹھوانے والے' جنرل ڈائر کی گولیاں کھانے والے اور گرم استری پھروانے والے یہی "ملا" تھے اور فرنگی کے چرنوں میں بیٹھنے والے انگریزی دستر خوان کی ہڈیاں چچوڑنے والے' انگریز کے جوتوں کو سر کا تاج سمجھنے والے' انگریزوں کے کتے نہلانے والے اور انگریز سے پیمان وفا باندھنے والے جاگیردار تھے جو آج ملک کے وارث' ملکی خزانے پر قابض اور "ملاؤں" کو بے نقط سنانے والے بنے ہوئے ہیں' بلاشبہ آپ ملا کو "بھک منگا" کہہ سکتے ہیں تاہم اس نے خدا اور رسول کے نام پر بھیک مانگی ہے انگریز کے دربار عالی میں جھولی نہیں پھیلائی' بے دریغ آپ ملا کو غریب اور نادار کہیں مگر اس نے غربت میں غیرت نیلام نہیں کی اور ناداری میں اپنی وفاداری نہیں بدلی' بے شک آپ ملا کو مفلسی کا طعنہ دیں

Marfat.com

مگر اس نے وائسرائے کے دربار میں کرسی حاصل کرنے کی کبھی درخواست نہیں کی۔

انگریز کی عنایات ہوں یا سی آئی اے کے فنڈز' امریکہ کی نوازشات ہوں یا برطانیہ کی کرم فرمائیاں ان سب کا مستحق وہ طبقہ رہا ہے جن کی سینوں پر آج بھی تمغے سجے ہیں وہ ملا بیچارا کس قطار میں جس کے دامن میں آج بھی پیوند لگے ہیں۔

یہ تو فلک کج رفتار کی غلط بخشیاں اور گردش دوراں کی مہربانی ہے' کہ کل جو مخبری کرتے تھے آج "چودھری" بنے ہوئے ہیں' کل جو انگریز کے سائیس اور ساربان تھے آج "خان" کہلاتے ہیں' کل جو گورے صاحب کی چوکھٹ کے پھیرے لگاتے تھے آج "وڈیرے" ہیں اور کل جو اپنی قوم کے غدار تھے آج "سردار" کا لقب اپنائے ہوئے ہیں' ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کا سرکاری ریکارڈ دیکھ لیا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ کس کا کیا شجرۂ نسب ہے؟

یہ لغاری اور مزاری اور یہ دریشک اور کھوسے' کیا تھے؟ سرکاری ریکارڈ میں سب کچھ موجود ہے' ۱۸۸۷ء میں محمد خاں لغاری کو نواب کا لقب دیا گیا تاج برطانیہ کی جوبلی تقریبات کے موقع پر انھوں نے اپنی تمن داری کی تقریب منعقد کی۔

سردار امام بخش مزاری نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کا ساتھ دیا' انہیں ۱۸۵۹ء میں آنریری مجسٹریٹ بنایا گیا پھر سر کا لقب ملا ۱۸۸۸ء میں انہیں "نائٹ ہڈ" (Knight Hood) کا خطاب ملا' بعد ازاں صوبائی درباری رہنے' نواب دریہن خان دریشک کو ۱۹۱۰ء میں خان بہادر کا خطاب عطا ہوا' کوڑا خاں کھوسہ نے سکھوں کے خلاف انگریز کی مدد کی اور تحفے میں ایک باغ پایا اور ۲۲۰۰ روپے سالانہ پنشن حاصل کی' ان میں کوئی بھی بحمد اللہ ملا نہیں تھا۔

یہی حال امیران بہاول پور' اور نوابزادگان خاں گڑھ' کا تھا' ملتان کے قریشیوں کو بھی جو اعزاز نصیب ہوا وہ علم و روحانیت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ ۱۸۶۰ء میں جب لاہور میں وائسرائے کا دربار لگا تو مخدوم شاہ محمود کو ان کی خدمات کے عوض لاہور کا بھنگی باغ اور ڈیڑھ سو روپے وظیفہ عطا کیا گیا موصوف ۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے' آٹھ کنوؤں پر مشتمل زمین سرکار برطانیہ کی طرف سے بخشش ہوئی' گرویزیوں کے بڑے جناب مراد حسین شاہ پر بھی انگریزی کی نظر کرم رہی اور ۱۸۹۹ء میں انہیں "خان بہادر" کا اعزاز عطا ہوا' لاہور کے ممدوٹ ہوں یا قزلباش' کالاباغ کے نواب ہوں یا مظفر گڑھ کے گورمانی' اٹک کے کھٹڑ ہوں یا گوجرانوالہ کے چٹھے سبھی پروردگان آغوش فرنگ ہیں' بیچارے ملا فضل حق خیر آبادیؒ تو کالے پانی کی سزا کاٹتے کاٹتے دنیا سے چل بسے' ملا احمد اللہ شاہ

Marfat.com

مدراسی ؒ کو تو سور کی کھال میں سی کر آگ لگا دی گئی' ملا کفائیت اللہ کافی ؒ کا تو بدن لوہے کی گرم استری سے کباب بن گیا' ملا شیخ الہند محمود الحسن ؒ تو مالٹا میں سڑتے رہے' ملا عبید اللہ سندھی ؒ تو ایک تاریک سرنگ میں دو سال تک قید رہے اور کمر سیدھی نہ کر سکے' ملا محمد علی جوہر ؒ تو ہندوستان کی آزادی یا پھر مدفن مانگتے رہے' اور مولانا حسرت موہانی ؒ تو چکی پیس پیس کر زندگی کا دورانیہ پورا کرتے رہے۔

جو حال پنجاب کی "چودھراہٹ" کا ہے وہی قصہ سندھ کے وڈیرے کا ہے' کچھ ایسی ہی رام کہانی سرحد کے قوانین کی ہے اور ملتی جلتی داستان بلوچستان کے سردار کی ہے' ان میں کچھ متشنیات ہوں گی' اور ہو سکتا ہے کہ ملاؤں میں بھی کچھ ایسے ہوں جنہوں نے منبر و محراب کی آبرو داغدار کی ہو' لیکن تھوک کے حساب سے انگریز کی غلامی کا طوق ان کے گلے میں نظر آتا ہے جو آج ملاؤں کو انگریز کا نمک خوار کہتے ہیں' سچ کہا ہے مولانا روم ؒ نے کہ قلم (فیصلے کا اختیار) اگر کسی نانجار کے ہاتھ میں ہو تو منصور کے لئے لازماً پھانسی کی سزا ہی ہو گی۔

ے سورج کو لگے دھبہ فطرت کے کرشمے میں
بت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے

(19 دسمبر 1995ء)

بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

کہتے ہیں کہ کسی محلے میں دو آدمی رہتے تھے' لیکن اہل محلہ سے دور دور اور الگ تھلگ' نہ کسی سے بول چال نہ سلام کلام' نہ میل جول اور نہ ہی کسی کے آنا جانا' گم سم اور چپ چاپ' اہل محلہ نے سوچا کہ ان دونوں سے مل کر اس خاموشی کی وجہ پوچھی جائے' ممکن ہے انہیں ہم سے کوئی شکایت ہو' یا کسی مشکل سے دوچار ہوں' بہر کیف کچھ لوگوں نے ان دونوں سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا' چنانچہ ایک صاحب سے جا کر ملے اور لاتعلقی اور خاموشی کی وجہ پوچھی' اس نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ اصل فتنے کی جڑ زبان ہوتی ہے' اور بہت سے مسائل اسی زبان سے پیدا ہوتے ہیں میں نے سوچا کہ نہ کسی سے بات کی جائے اور نہ ہی کسی کو گلہ شکوہ ہو گا' زیادہ بول چال سے کسی کی غیبت ہو جاتی ہے' کسی کے بارے میں نازیبا جملہ نکل جاتا ہے اس آفت سے بچنے کے لئے میں نے یہ طریقہ اپنا لیا کہ کسی سے بول چال رکھی ہی نہ جائے۔

اہل محلہ اسی شخص کی گفتگو سے مطمئن بھی ہوئے اور متاثر بھی! دوسرے کے پاس گئے اور اس سے چپ رہنے کا سبب دریافت کیا' اس نے کوئی پتے کی بات نہ کی تو اہل محلہ نے اصرار کیا کہ آپ ہم لوگوں سے ملا جلا کریں' اور ہم سے علیک سلیک رکھیں' کہ یہی محلے داری کا تقاضا ہے' اس پر وہ صاحب بولے "گویا آپ چاہتے ہیں کہ میں ضرور ہر ایک سے بول چال رکھوں؟" انہوں نے کہا "یقیناً ہماری یہی خواہش ہے" تو اس پر وہ صاحب گویا ہوئے کہ "اچھا یہ بتائیے کہ اگر میں روزہ رکھوں تو افطار کس وقت کروں؟" لوگوں نے کہا "جب سورج غروب ہو جائے۔" تو وہ شخص بولا "اگر سورج آدھی رات تک غروب نہ ہو تو میں بھوکا مرتا رہوں۔" اس پر اہل محلہ نے کہا۔ "آپ مہربانی کر کے خاموش ہی رہیں۔ تو بہتر ہے۔"

اس موقع پر یہ مکالمہ ہمیں اس لئے یاد آیا کہ ایک معاصر اخبار میں ممتاز سیاستدان اور معروف دانشور جناب اجمل خٹک کی ایک تقریر رپورٹ ہوئی ہے جو انہوں نے پشتو شاعر خان عبدالغنی خاں کی یاد میں منعقد ہونے والے سیمینار میں کی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے۔

"عبدالغنی علامہ اقبالؒ سے بڑے شاعر تھے۔"

Marfat.com

یہی وہ موقع ہوتا ہے جب آدمی کا نہ بولنا' اس کے بولنے سے زیادہ بہتر اور مفید ہوتا ہے' دراصل کچھ عرصے سے ہمارے ہاں یہ ہو رہا ہے کہ ہر حوالے سے کنفیوژن پیدا کیا جائے'۔

مذہب ہو' سیاست ہو یا ادب' یہ سارے شعبے کنفیوژن کی زد میں ہیں' اس کا مقصد اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے کہ اس (بدقسمت) قوم کو اور اس کے ذہن کو مرکزیت نصیب ہی نہ ہو' ملت کا ایک جاندار تصور تھا اس کو قومیت کے ذریعے پارہ پارہ کیا گیا' امت کا ایک رعب تھا اسے فرقہ واریت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا' اس قوم کا ایک سیاسی قومی نصب العین تھا جو حصول پاکستان میں معاون ثابت ہوا اسی نصب العین کے ذریعے استحکام اور تعمیر پاکستان کا کام سرانجام پانا تھا' سو اس نصب العین کو وقتی سیاسی مفادات کی حامل سیاسی پارٹیوں اور ٹکڑیوں نے غارت کر کے رکھ دیا' اب چھوٹے چھوٹے گروہی مفادات ہی سیاسی جماعتوں کا مرکز نگاہ اور محور توجہ بن کر رہ گئے ہیں۔

یہی حال ادب کا ہے اس کا بھی کوئی رُخ اور قبلہ نہیں رہنے دیا گیا' اور اس شعبے میں کوشش ہو رہی کہ نئے چہرے معتبر بنائے جائیں تاکہ ایک بار اگلوں کا اعتبار تو ختم ہو نئے لوگوں پر کسی کا اعتماد قائم ہو گا تو دیکھا جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ عبدالغنی خاں بڑے شاعر ہوں گے کسی کو کسی شخص کے بڑے شاعر ہونے سے کیا کہ اور حسد ہو سکتا ہے لیکن اسے بڑا شاعر ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ علامہ اقبالؒ سے اس کا مقابلہ اور موازنہ کیا جائے؟

ایک زمانے میں یہ کوشش ہوئی کہ فیض صاحب کو علامہ اقبالؒ کا ہم پلہ شاعر ثابت کیا جائے' تو خدا مغفرت کرے مرحوم فیض کی انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ایک طویل انٹرویو میں بڑی عقیدت اور بڑی صراحت کے ساتھ کہا کہ میں اس صدی کا سب سے بڑا شاعر اقبالؒ کو سمجھتا ہوں اور میں ان کا خوشہ چین ہوں' تب جا کر فیض کے برخود غلط مداحوں کی زبان بند' کوششیں ماند اور مزاج کی تسلی ہوئی ورنہ فیض اور اقبالؒ کو ایک بار دوبدو کر دیا گیا تھا' سندھی قوم پرستوں نے بھی مہم چلائی کہ شیخ ایاز جیسے شاعر کے مقابلے میں اقبالؒ کی کیا حیثیت ہے؟ لیکن تابہ کے؟ کس اہل ذوق ادب کے قدر دان کو فیض کے بڑا شاعر ہونے سے انکار ہے؟ اور کون شیخ ایاز کی شاعری کا منکر ہے؟ مگر درمیان میں اقبالؒ کو لا کھڑا کرنا نہ ادب کی خدمت ہے اور نہ ہی اچھے ذوق کی علامت ہے' خٹک صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ " اقبال اور ٹیگور میں ایک جہاں جاتا اس جگہ سے متاثر ہو جاتا مگر یہ غنی خاں تھے جنہوں نے ساری زندگی سیاحی کی مگر کسی نے بھی متاثر نہیں کیا۔" ٹیگور صاحب

Marfat.com

کا کیا معاملہ تھا؟ وہ جانیں اور ان کے مداح رہے اقبالؒ وہ جہاں گئے' اس جگہ سے متاثر ہوئے تو یہ کوئی عیب نہیں بلکہ اہل نظر کے ہاں ہنر ہے' جو شخص ذہن کے کواڑ اور دل کے دریچے کھلے رکھے گا' وہ ہر اچھی اور اونچی بات اور قدر سے متاثر ہو گا' نرگسیت کا مریض اس سے مستثنیٰ ہوتا ہے' جسے اپنے چہرے کے علاوہ کسی کا چہرہ اچھا نہیں لگتا' اور خود کلامی پر سو جان سے قربان ہوتا رہتا ہے' ورنہ تو

حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے
اہل دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

دس پندرہ برس پہلے اس نوع کے مضامین بھی شائع ہوئے تھے کہ اگر اقبالؒ پنجابی میں شاعری کرتے تو ان کے کلام میں آفاقیت ہوتی' ایک تو "بدنصیب آفاقیت" ہر ایک کے ہتھے چڑھ گئی ہے' مفہوم معلوم ہو نہ ہو یہ لفظ ہر ایک بے دریغ استعمال کرتا ہے' کوئی ان سے پوچھتا وہ کلام کیسے آفاقی ہو سکتا ہے جو مخصوص زبان میں کہا جائے؟ اصل میں پیغام آفاقی ہوتا ہے خواہ اسے پیرایہ اور لباس عربی کا ملے یا فارسی کا' وہ پیغام اردو میں ہو یا انگریزی میں' یا اسے پنجابی میں ادا کیا جائے یا سندھی میں پہنچایا جائے' اقبالؒ نے ایک مقام پر شکوہ اور فریاد کے انداز میں کہا ہے۔

مرا یاراں غزلخوانے شمردند

فی الواقع ان کا یہ شکوہ بجا اور فریاد برحق تھی' تبھی تو ان کا موازنہ کبھی فیض سے کیا جاتا ہے کبھی ایاز سے اور کبھی فراز سے!

واقعہ یہ ہے کہ اقبالؒ کی شاعری فنی میزان میں تولنے والی نہیں وجدان اور عرفان کا پیمانہ شائد اسے پرکھ سکے۔

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے' شاعری کیا ہے

جو شخص ایقان و عرفان سے ہٹ کر اقبالؒ کا مطالعہ کرے گا تو وہ یقیناً اسی مخمصے میں پڑے گا جس میں اجمل خٹک صاحب اور ان کی قبیل کے دوسرے لوگ مبتلا ہیں' میر و انیس کا موازنہ تو سمجھ میں آتا ہے' مومن و غالب کا آمنا سامنا بھی قابل فہم ہے مگر اقبالؒ کو ان باتوں میں تولنا نہ صرف ناانصافی ہے بلکہ پرلے درجے کی بدمذاقی ہے' عبدالغنی خاں کی شاعری ہم نے نہیں پڑھی اور اگر وہ پشتو میں ہے تو ہم پڑھ بھی نہیں سکیں گے ان کے مداحوں کا فرض ہے کہ وہ اسے سامنے لائیں تاکہ

Marfat.com

معلوم ہو خاں مرحوم کا پیغام کیا ہے؟ پیرایۂ اظہار کیسا ہے؟ فکری افق کتنا بلند اور روشن ہے؟ نگاہ کتنی رسا اور طبیعت کتنی حقیقت آشنا ہے؟

خٹک صاحب نے تو غنی خاں کی مدح کے پردے میں اقبالؒ کے ذم کا پہلو نکالا ہے' مگر ہم بخدا غنی خان کے ناقد یا معاند نہیں' ہمیں تسلیم ہے وہ بڑے مجسمہ ساز تھے' بڑے دانشور ہوں گے' بلند پایہ شاعر ہوں گے لیکن انہیں اقبالؒ کے پہلو میں بٹھانے کے لئے بہرحال ایک معیار سامنے رکھنا پڑے گا' فقط ایک سیمینار سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا' ہمارے جدید دانشوروں کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ان کے نزدیک خدا' رسول' اسلام' ملت' خودی' عرفان' نصب العین' اور عشق رسولؐ تو مقامی نوعیت کے موضوعات ہیں مگر گیسو و کاکل' گل و بلبل' چشم سیاہ' رنگین ادا' سرمہ و غازہ' جام و صبا' عارض و رخسار' اور قمار و خمار بین الاقوامی بلکہ آفاقی مضامین' جو اپنی شاعری کو انہی حوالوں سے مزین نہیں کرتا وہ بڑا اور عالمی شاعر بن ہی نہیں سکتا۔

یہ استعارے تو پھر بھی اپنے اندر لطافت رکھتے ہیں آج کل جس لہجے میں بات ہو رہی ہے ایک ہی لفظ پڑھتے اور سنتے آنکھوں میں جلن سی ہونے لگتی ہے اور ناک پر رومال رکھنے کو دل کرتا ہے۔

یہ رجحان بہرحال منفی ہے کہ فلاں شاعر اگر فلاں قوم میں پیدا ہوتا تو اس کی پوجا کی جاتی' فلاں ادیب' فلاں ملک میں ہوتا تو اس کی نوبت کی صدا سے زمین و آسمان گونج اٹھتے' گویا کسی کی شاعری اور ادب کوئی اہمیت نہیں رکھتی بس لوگ ہوتے ہیں جو کسی کو بانس پر چڑھاتے ہیں' علم' فن اور ہنر ایسی چیزیں ہیں جو مشک کی طرح چھپائے نہیں چھپتیں' ان کی مہک بالآخر شام تک پہنچ ہی جاتی ہے جس طرح عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نہ جانے کتنے ارسطو اور افلاطون ہیں جو ہمارے اردگرد رہتے ہیں مگر لوگ ان کی قدر نہیں کرتے اور وہ خاک ہو جاتے ہیں' بلاشبہ زمانے کی بے قدری اور معاشرے کی بے مہری ایک تلخ حقیقت ہے لیکن اگر روزانہ اور ہر جگہ اتنی بڑی تعداد میں ارسطو اور افلاطون پیدا ہونے شروع ہو جائیں تو پھر وہ ارسطو اور افلاطون نہیں کوئی اور لوگ ہوں گے' جن لوگوں کو قدرت کچھ عطا کر کے بھیجتی ہے' کوئی لاکھ چاہے ان سے اِباء نہیں کر سکتا' رومیؒ و سعدیؒ نے کون سے "لابسٹ" مقرر کئے تھے کہ ان کے نام سے ایک زمانہ گونج رہا ہے' میر اور غالب اپنے پیچھے کون سی جماعتیں چھوڑی ہیں کہ ان کا ہر طرف چرچا ہے' زمانے بدل گئے' زمانے کی قدریں بدل گئیں' لوگوں کے انداز و اطوار بدلے اور مزاج و شعار بدلے مگر اس طرح کے لوگوں

Marfat.com

کا کوئی بدل پیدا نہ ہو سکا' ان کی عظمت اور شہرت کے چراغ ہزار آندھیوں کے باوجود گل نہ ہو سکے' بے شمار طوفان اور جھکڑ آئے لیکن ان کے فن اور کمال کے خیمے اُسی طرح گڑے رہے۔

اقبالؒ بھی انہی لوگوں میں شامل ہیں' کہ وہ کہیں بھی پیدا ہوتے' کسی بھی زبان میں اظہارِ خیال کرتے' اور کسی بھی ماحول میں سانس لیتے' یہی کچھ ہوتے جو آج ہیں' اس لئے کہ اقبالؒ نے وہ بات کہی ہے جسے لوگ نہیں کہہ پائے اور انہوں نے وہ موضوعات چنے ہیں جن تک باقی لوگوں کی رسائی نہ ہو سکی' سوال شاعری کا نہیں شعر کے جوہر کا ہے جس سے اقبالؒ کا دامن مالا مال نظر آتا ہے' کسی کے کہنے سننے سے اور پراپیگنڈے سے کوئی "لیڈر" تو بن سکتا ہے مگر "دیدہ ور" نہیں بن سکتا' نرگس کو اپنی بے نوری پر ہزاروں سال گریہ کرنا پڑتا ہے۔ پھر جا کر۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(11 مئی 1996ء)

Marfat.com

ملک تو بن گیا، قوم نہ بن سکی

وطن عزیز کی آزادی کی سالگرہ منائی جارہی ہو، ہر طرف سرخوشی کا عالم ہو، روشنیوں کا سیلاب امڈا ہوا ہو، جھنڈے جھنڈیوں کی بہار آئی ہو، ملک کے گوشے گوشے ترانوں اور نغموں سے گونج رہا ہو، اور حکومت بھی اپنی بعض ندامتیں دھونے کے لئے بوجوہ یوم آزادی معمول سے زیادہ جوش و خروش سے منانے کی تیاری میں ہو۔

۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کی سہانی صبح کو ملک تو وجود میں آگیا اور ایک ذمہ دار، دیانت دار اور اصولوں کی پاسدار قیادت کی بدولت یہ سفر سات برس میں طے ہوا، جب کہ ہندو کی منافقت اور انگریز کی طاقت سے لڑنا اتنا آسان نہ تھا، مگر بدقسمتی سے بعد کے باون سالوں میں ابنائے وطن ----- قوم ---- نہ بن سکے، حالانکہ تحریک پاکستان کی بنیاد --- دو قومی نظریہ --- تھا۔ دو قومی نظریہ کیا ہے؟ مسلمانوں کو ایک علیحدہ، باقاعدہ اور ثابت شدہ قوم ہونے کا علمی و عملی نظریہ، جس کی وکالت قائداعظمؒ نے بڑے علم و ایقان کے ساتھ کی اور کامیاب وکالت کی، انہوں نے ایک سے زائد بار کہا کہ ہم ہر دلیل اور معیار کی رو سے ایک جداگانہ قوم ہیں، یعنی قوم رسول ہاشمیؐ اور ہماری ساخت دنیا کی ہر قوم سے جدا اور منفرد ہے، ہم چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کے تنگ دائروں اور رنگ و نسل کے تاریک غاروں کے باسی نہیں، بلکہ "ملت بیضا" ہیں، اسی بنیاد پر ایک الگ وطن کی ضرورت محسوس ہوئی، مگر وطن تو مل گیا اور قوم کہیں درمیان میں گم ہو گئی، قائد کی زندگی میں بنگالی زبان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اور بالآخر بنگلہ دیش بن گیا، سندھ میں بھی لسانی بل نے مہاجروں اور مقامیوں میں دیوار کھڑی کر دی، وقت نے دیوارِ برلن تو گرادی، مگر سندھی مہاجر کی دیوار روز بروز اوپر اٹھ رہی ہے، دوسری طرف بلوچستان میں ایک سے زائد بار --- عظیم تر بلوچستان ---- کے نعرے سنے گئے، اور وفاق گریز مظاہرے دیکھنے کو ملے۔ کئی بلوچ رہنما بلوچستاں کو ایک حقیقت اور پاکستان کو کل کی پیداوار کہتے ہوئے پائے گئے، کالا باغ ڈیم ایک قومی ضرورت اور نیشنل ایشو نہیں بلکہ سیاسی اور علاقائی مسئلہ بن کر رہ گیا ہے، پورا ملک بنجر ہوتا ہے تو ہوتا رہے کسی کا سیاسی کھیت نہ سوکھنے پائے، یہ

ساری علامات قوم نہ ہونے کی ہیں۔

ملت یا قوم ایک وسیع المشرب' وسیع الظرف اور وسیع الذہن ادارے کا نام ہے' اس کے ہاں تنگ دلی' تنگ ظرفی اور پست خیالی کا گزر نہیں ہوتا۔

قوم رسول ہاشمیؐ کے ہاں تو براعظموں کے فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے کہ کجا صوبے سے آگے نظر نہ جاسکے' مدینے چند ہزار نفوس اور ساڑھے چار مربع کلومیٹر پر مشتمل ابتدائی اسلامی ریاست میں اتنی ذہنی بلندی اور روحانی وسعت تھی' کہ حجاز' نجد' فارس' روم' بازنطین' حبش کے باشندے اور قریش' بنو ہاشم' اوس' خزرج' بنو تمیم' بنو کلب' اور انصار و مہاجرین کے نمائندے مسجد نبویؐ کی کھجور کے تنے اور چھال کی چھت تلے مؤاخات کا روح پرور مظاہرہ کررہے تھے جب کہ چودہ کروڑ افراد اور تین لاکھ سات ہزار مربع میل پر پھیلے ہوئے پاکستان کا دامن اس قدر سمٹا اور سکڑا ہوا ہے کہ چار صوبے اور چار فقہی مسالک مؤاخات نہ سہی محض برداشت کے جذبے کے تحت ہی ایک ساتھ گزارا نہیں کرپا رہے۔

جس طرح مکان سنگ و خشت کا مجموعہ ہوتا ہے اس کا اصل شرف اس کے مکین سے ہوتا ہے اسی طرح ملک ایک مخصوص حدود اربعہ' رقبے' اور طے شدہ سرحد کا نام ہوتا ہے' اس کی شناخت' عزت اور بین الاقوامی برادری میں حیثیت اس میں بسنے والی قوم کے ذریعے متعین ہوتی ہے' اگر وہ قوم ایک ہجوم میں بدل کر رہ جائے تو اس ملک کا شکوہ اور دبدبہ مجروح ہو جاتا ہے۔

گذشتہ پچاس سالوں میں ہم نے نئے سے نئے محکمے تصنیف کرڈالے' بڑے بڑے پلازے کھڑے کردیئے' طرہ طراز اور گردن فراز لیڈر پیدا کرلئے' ایک سے ایک بڑھ کر خوش فریب نعرے گھڑ لئے' سرزمین وطن کی جنت ارضی بنا دینے کے منشور لکھ لئے' بول چال' بود و باش اور زبان و بیان میں انگریز بننے کے گر سیکھ لئے' اور لوگوں کی سادگی و سادہ لوحی کا استحصال کرنے کے نت نئے ڈھنگ اپنا لئے۔

مگر اس عرصے میں اپنے پیروکاروں کے اندر---- ملت اور قوم ---- بننے کا جذبہ نہ ابھار سکے' آج لنڈی کوتل سے کراچی تک کا سفر کرکے دیکھ لیجئے' آپ کو فاٹا کے ملک' یوسف زئی' ترین' عباسی' جاٹ' گجر' کانجو' گردیزی' میرانی' جتوئی' دریشک' مزاری' مینگل' بگتی' مگسی' اور بجرانی تو ملیں گے پاکستانی نایاب نہ سہی کمیاب ضرور ہوں گے' یہی حال مذہبی دنیا کا ہے' حالانکہ مذہبی دنیا کے ذمے سب سے اہم فریضہ ملت کے تصور کو اجاگر کرنا تھا تاکہ ہر رنگ پر الٰہی رنگ اور ہر جمعیت پر

Marfat.com

اُمت غالب آجائے۔

آج جو ہر کونے سے فتنے حشرات الارض کی طرح یلغار کرتے ہوئے نکلتے چلے آ رہے ہیں، دو چار دن کا المیہ نہیں نصف صدی کی غفلت کا نتیجہ ہے۔

؎ برسوں پرورش کرتا ہے وقت

حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

آج اگر ملک سونے کی کان میں بدل جائے پھر بھی ہوس اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اس سے چند لوگوں کا پیٹ بھرے گا باقی لوگ بھوکے ہی رہیں گے، آج اگر ملک اسلحے میں خود کفیل ہو جائے تو یہ اسلحہ اپنوں کی چھاتیاں داغنے کے کام آئے گا، آج اگر وسائل کا سمندر ابل پڑے تو ہر صوبہ اور ہر طبقہ خود ہی ہڑپ کرنے کو آگے بڑھے گا اور آج اگر گلشن وطن میں بہار اتر پڑے تو ہر ایک دوسرے کے لئے خزاں کی آرزو کرے گا جہاں ملت نہیں ہو گی وہاں جمعیت کہاں سے آئے گی؟ اور جہاں جمعیت نہ ہو وہاں قدرت کا دست رحمت کیسے ظاہر ہو گا؟

(15 جولائی 1997ء)

لمحۂ موجود کا "محمود غزنوی" اور وائٹ کالر کرائمز

صدر مملکت فاروق احمد خاں لغاری ایک سے زائد بار مختلف مواقع پر اس امر بلکہ اپنی بے بسی کا اظہار کر چکے ہیں کہ عوام کی توقعات کے برعکس جرائم کا کھوج لگانے، مجرموں کو گرفت میں لینے اور احتسابی عمل کے غیر موثر اور سست ہونے کا ایک بڑا سبب کرپٹ عناصر کی وہ تکنیک اور چابکدستی ہے جسے صدر "وائٹ کالر کرائمز" کا عنوان دیتے ہیں، یعنی ایسے جرائم جو اتنی صفائی، مہارت اور چالاکی سے کئے جاتے ہیں کہ بڑے سے بڑا سراغ رساں ان کا کھوج لگانے میں ناکامی کی حد تک مشکل محسوس کرتا ہے۔ یہ بات بہت حد تک درست ہے لیکن عوام کی طرف سے یہ سوال بھی اپنی جگہ برمحل اور جائز ہے کہ جن جرائم کی ٹوہ لینے میں حکومتی اداروں کی عقابی نگاہیں ناکام رہی ہوں بے چارے عوام کی پتھرائی آنکھیں ان کا سراغ کیسے لگا اور ان کے ثبوت کیوں کر مہیا کر سکتی ہیں؟ اس اعتبار سے چیف احتساب کمشنر، عدلیہ، حکومت اور خود جرائم پیشہ کا افرادِ عوام سے یہ تقاضا اور مطالبہ بے معنی ہو جاتا ہے کہ عوام آگے بڑھ کر ان لوگوں کے خلاف ثبوت احتسابی کمیشن، عدلیہ اور حکومت کو فراہم کریں تاکہ احتساب کی رفتار ان کی امنگوں کے مطابق تیز کی جا سکے، ہمارے خیال میں "وائٹ کالر کرائمز" کی ایک بڑی وجہ وہ مجموعی حکمت عملی ہے جو نصف صدی سے "ڈکیت گینگ" نے اختیار کر رکھی ہے۔

مولانا رومؒ نے اپنی شہرہ آفاق مثنوی میں ایک نہایت چست تمثیل کے ذریعے اس حکمت عملی سے پردہ اٹھایا ہے، مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

کسی علاقے میں نقب زنوں کا ایک گروہ تھا، اور اس گروہ میں شامل ہر فرد اپنے اپنے فن میں طاق اور یکتا تھا، ریاستی ادارے ان نقب زنوں کو پکڑنے اور ان کے جرائم روکنے میں ناکام ہو چکے تھے، ایک رات سلطان محمود غزنوی بھیس بدل کر بذاتِ خود گشت پر نکلا، اتفاق سے اُس گروہ تک جا پہنچا، نقب زن کسی واردات کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

جب انہوں نے ایک اجنبی کو اپنے پاس دیکھا تو وہ چونکے مگر محمود نے بڑی حکمت سے انہیں باور کرایا کہ میں خود حالات کا مارا ہوا ہوں، اور ایسے گروہ کی تلاش میں ہوں جو مجھے اپنے ساتھ رکھے تاکہ میں بھی اپنا دھندا کر سکوں، اور مجھ میں ایک آدھ خوبی ایسی ہے جو تمہارے لئے بڑی کارآمد اور اس کاروبار کے لئے بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے، وہ لوگ اس پر مطمئن ہو گئے، ان سب نے ایک دوسرے سے کہا کہ ہر ایک اپنا اپنا کمال فن بیان کرے تاکہ واردات کے

Marfat.com

لئے نکلا جا سکے کہیں ایسا نہ ہو کہ رات ڈھل جائے' وقت کم رہ جائے اور کوتوال شہر جاگ جائے۔

چنانچہ ہر ایک نے اپنی اپنی مہارت کا باری باری ذکر کیا' ان میں سے ایک بولا "میرے اندر یہ خوبی ہے کہ میں مٹی سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ یہاں کیا دفن ہے؟ سونا' چاند' نقدی یا کچھ اور" دوسرے نے بتایا "کہ میں کسی کھرپے اور پھاوڑے کی مدد کے بغیر اپنے ہاتھوں سے نقب لگا لیتا ہوں۔" اگر اس دوران کتا بھونکے تو میں اس کی بولی سمجھ جاتا ہوں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟" چوتھے نے اپنا کمال یہ بیان کیا کہ "اُسے یہ مہارت حاصل ہے کہ وہ کسی کو اگر رات کے گھپ اندھیرے میں دیکھ لے تو اس کو دن میں پہچاننے میں کوئی مشکل نہیں آتی۔" جب یہ سب لوگ اپنے اپنے اوصاف بیان کر چکے تو انہوں نے اپنے نووارد ساتھی (محمود غزنوی) سے پوچھا' تم بتاؤ تمہارا کمال کیا ہے؟ محمود نے جواب دیا' "میرا وصف یہ ہے کہ اگر میں اپنی داڑھی ہلا دوں تو قتل کے مجرم بھی چھوٹ جاتے ہیں۔" وہ سب بہت خوش ہوئے کہ یہ شخص تو بڑا "مشکل کشا" ہے۔

چنانچہ اس گروہ نے اپنے ٹھکانے سے نکل کر واردات کا پروگرام بنایا' ایک گھر کے سامنے پہنچ کر اپنے اس ساتھی سے کہا جو مٹی سونگھ کر خزانے کا کھوج لگانے کا ماہر تھا کہ وہ سونگھ کر بتائے کہ یہاں کچھ ہے یا نہیں؟ اس نے زمین سونگھی اور کہا یہ ایک مالدار بیوہ کا گھر ہے اور اس گھر کے فلاں کونے میں خزینہ دفن ہے' ہاتھ سے نقب لگانے کے ماہر سے کہا گیا کہ وہ اپنا کام کرے' اس نے نقب لگالی' اتنے میں کہیں کتے کے بھونکنے کی آواز آئی' سب نے چونک کر اپنے ساتھی سے پوچھا بتاؤ کتا کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے تھوڑی دیر کتے کی آواز پر کان دھرا اور وہ کہتا ہے "ڈاکہ ڈالتے ہوئے ذرا سوچ لو وقت کا حاکم تمہارے درمیان موجود ہے۔" یہ سن کر سب نے اس کا مذاق اڑایا کہ تمہاری مہارت جعلی نکلی ہے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بادشاہ یہاں کھڑا ہو' المختصر اس گروہ نے واردات کی اور ہر ایک اپنا اپنا حصہ لے کر اپنے گھر چلا گیا' صبح ہوئی' سلطان محمود نے دربار لگایا اور اپنے کارندے بھیج کر ان سب مجرموں کو پکڑ لیا' جب وہ مجرم کے دربار میں پیش کئے گئے تو ان کا وہ ساتھی بول اٹھا جسے رات میں ملنے والے شخص کو دن کے وقت پہچان لینے میں مہارت حاصل تھی' کہ تخت پر بیٹھا ہوا شخص وہی ہے جو رات ہمارے ساتھ تھا' اس وقت ان مجرموں کو اپنے ساتھی کی اس بات پر یقین آ گیا جس نے کتے کی آواز سن کر بتایا تھا کہ وقت کا حاکم تمہارے درمیان موجود ہے' بادشاہ نے ان کے جرم کے بارے میں استفسار کیا۔

سب نے کہا' جہاں پناہ! ہم میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کر لیا ہے'

Marfat.com

مٹی سونگھنے والے نے خزانے کا صحیح پتہ دیا' ہاتھ سے نقب لگانے والے نے محض انگلیوں کی مدد سے فصیل نما دیوار میں شگاف ڈال دیا' کتے کی آواز پہچاننے والے نے رات کو درست اطلاع دی تھی' اور اب رات کے دیکھے شخص کو دن میں پہچان جانے والے نے ہمیں بتلا دیا ہے کہ رات کا ساتھی ہی تخت شاہی پر جلوہ افروز ہے "حضورِ والا! اس وقت صرف آپ کے کمال کے ہم منتظر ہیں کہ آپ داڑھی ہلا دیں تو ہم سب کو رہائی نصیب ہو سکتی ہے۔" مگر محمود نے داڑھی کے بجائے سر نفی میں ہلا دیا' مولانا رومؒ کی یہ حکایت اس سارے پس منظر کو واضح کر دیتی ہے کہ ہمارے ہاں جرائم ہوتے ہیں لیکن سراغ نہیں ملتا' اور مجرم پکڑے جاتے ہیں مگر سزا یاب نہیں ہوتے یہاں شروع دن سے یہ ہوتا آیا ہے کہ یہاں کا ہر مجرم اپنے فن میں طاق تھا' ان میں جو بھی کسی منصب پر فائز ہوا کرسی سونگھ کر اسے معلوم ہو جاتا تھا کہ اس کے پاؤں میں کتنا خزانہ دبا ہوا ہے؟ خواہ وہ پارلیمنٹ کی سیٹ ہو یا افسرانہ کرسی! پھر ہر ایک کے ہاتھ اتنے "لمبے اور مضبوط" تھے کہ بڑے سے بڑے اور محفوظ محل میں بھی نقب لگاتے ہوئے انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئی' اگر انہیں کسی اخبار' کسی دانشور' کسی دیوانے کی آواز نے چونکایا بھی تو یہ مطمئن رہے کہ حاکم وقت بھی ان کے ساتھ کھڑا ہے' اور اگر یہ لوگ پکڑے گئے تو انہیں اونچی کرسی پر وہی رات کا ہمراہی بیٹھا ہوا نظر آیا' اور ہر بار اس نے داڑھی ہلا کر ان کی مشکل آسان کر دی۔

صرف ایک محمود غزنوی نے اپنا سر نفی میں ہلایا تو چھٹکارا مشکل ہو گیا' اس وقت بھی وہی منظر ہے' ویسے ڈاکو اور چور ہیں' ویسے ہی "کمالات" اور "کرامات" رکھنے والے ہیں' اور انہیں حاکم وقت سے پہلے جیسی توقع ہے تبھی تو ڈال ڈال پہ چہکتے اور بھاڑ کے چنے کی طرح پھدکتے پھر رہے ہیں' اب لمحہ موجود کے "محمود غزنوی" پر منحصر ہے کہ وہ اپنا سر نیچے کی طرف ہلاتا ہے یا گردن نفی میں گھماتا ہے۔

اگر سر ----- ہاں----- میں ہل گیا تو سارے کمالات کار آمد ثابت ہوں گے اور انہی کمالات کو "وائٹ کالر کرائمز" کہا جاتا ہے اور اگر گردن ----ناں--- میں گھوم گئی' تو سب "کرشمے" نرے واہمے ثابت ہوں گے۔

ہمارے نزدیک کوئی جرم "وائٹ کالر" نہیں ہوتا ہر جرم "بلیک کلر" ہوتا ہے' سیاہ کو سفید کرنے میں کچھ طے شدہ کمالات کا "ہاتھ" ہوتا ہے۔

(21 جنوری 1997ء)

مومن ---- دھوکہ دیتا ہے اور نہ دھوکہ کھاتا ہے

دھوکہ دینا رذالت اور دھوکہ کھانا حماقت کی دلیل ہے' مومن نہ سفلہ ہوتا ہے اور نہ ابلہ' دھوکہ دینے اور دھوکہ کھانے کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملی ہوتی ہیں' دھوکہ دینے اور دھوکہ کھانے کا عمل ایک ہی کیفیت کے تحت رونما ہوتا ہے کسی شخص کو جب بہت زیادہ اعتماد حاصل ہو یا وہ کسی پر بے محابا اعتماد کرنے لگے تو یہیں سے دھوکہ دینے اور دھوکہ کھانے کی کیفیت کا آغاز ہو جاتا ہے۔

اس وقت بلاشبہ میاں نواز شریف کو بے پناہ عوامی اعتماد حاصل ہیں' ڈر لگتا ہے کہ کچھ لوگ میاں صاحب کو حاصل اس بے پایاں اعتماد کے باعث اور اعتبار بنانے اور ان کا دربار سجانے کی کوشش کریں گے' اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا' تو وزیراعظم عوامی اعتماد کو دھوکہ دینے کے مرتکب اور خود دھوکہ کھانے کے مستوجب قرار پائیں گے' بے پایاں حمد صرف ذاتِ خدا کو زیبا ہے اور کروڑوں درود و سلام صرف رسول خداؐ کے لئے شایان ہیں' باقی جس نے بھی اپنے لئے "حمد و نعت" کی خواہش کی اس نے خوشامدیوں کی دنیا سنوارنے کے بدلے اپنی عقبیٰ برباد کی' اور ان "عقبیٰ برباد" قسم کے لوگوں کی ایک لمبی فہرست ہے' جو تاریخ کے ہر چوراہے پر آویزاں ہے' فرعون کسی مالیخولیا میں مبتلا نہیں تھا کہ خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا' کچھ درباری لوگ تھے جو اسے رزق' عزت و ذلت اور موت و حیات کا مالک باور کراتے تھے اور وہ اس زعم میں گرفتار ہو گیا کہ فی الواقع مصر کی نہریں اس کے حکم سے جاری ہیں' اور موسیٰؑ کا خدا واہمے کے سوا کچھ نہیں' قارون بھی چنگا بھلا سیانا تھا' اس کے ریزہ چینوں نے بات بڑھائی کہ یہ جو بھی خزانہ ہے آپ کی ذہانت اور مہارت کا نتیجہ ہے' موسیٰ کے خدا کی دین نہیں قارون کے کان میں یہ الفاظ رس بن کر گھلنے لگے' اور بول اٹھا کر موسیٰؑ کا خدا مجھ سے حسد کرنے لگا ہے' خدائے قہار و جبار نے بالآخر قارون کو اس کے خزانے سمیت زمین میں دھنسا دیا' شداد بھی کوئی مخبوط الحواس شخص نہیں تھا کہ خواہ مخواہ رب کی جنت کے مقابلے میں اپنی بہشت بنانے کی ٹھان لی' کچھ لوگ تھے جنہیں خدا کی جنت میں داخل ہونے کا قرینہ نہیں آتا تھا' انہوں نے سوچا "بہشت شداد" میں عیش اڑانے کا فن آزمایا جائے اور وہ کامیاب رہے' اور

Marfat.com

شداد کو خدا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔

اسطرح کے مسخرے ہر دربار میں پائے جاتے ہیں اور ہر دور میں ڈھونڈھے جا سکتے ہیں، لیکن یہ لوگ ہمیشہ بزم طرب کی رونق رہتے ہیں، عہد کرب میں اسی طرح غائب ہو جاتے ہیں جس طرح اندھیرے میں سایہ، لیکن ان لوگوں کا کمال یہ ہے کہ انکی ضرورت ہر دربار میں رہی اور یہ اپنی ضرورت منوانے میں کامیاب رہے، مگر جب فی الواقع انکی ضرورت پڑی تو انکی صورت کہیں دکھائی نہیں دی، آج کوئی کسی کا کیا قصیدہ لکھے گا جو مغلوں کے عہد زوال میں قصیدہ نویسوں نے لکھ ڈالے، اگر قصیدوں کے زور پر حکومت چلتی تو آج بھی برصغیر پر خاندان تیمور کا نقش ثبت ہوتا، جریدۂ عالم پر صرف وہی لوگ نقش دوام رقم کر پائے جنہوں نے اقتدار کو اللہ کی عنائیت اور عوام کی امانت تصور کیا، اللہ کی عنایت پر شکر کرنے میں بخل سے اور عوام کی امانت انہیں لوٹانے میں کسی مکر سے کام نہیں لیا بات عرصۂ حکومت کی نہیں احساس فرض اور جذبۂ دیانت کی ہوتی ہے۔

ابھی کل کی بات ہے ملک غلام محمد اپنے وقت کا افلاطون بھی تھا، ارسطو بھی تھا، نوشیرواں بھی تھا اور جالینوس بھی تھا، اس کے منہ سے ہر وقت رال اور جھاگ بہتی تھی لیکن درباری اُسے کوثر و تسنیم کے چھینٹے قرار دیتے تھے، کسی کی شہادت ریکارڈ پر نہیں کہ اس نے کہا ہو کہ جناب والا فاتر العقل اور مخبوط الحواس ہو چکے ہیں، اس کے زوال کے بعد ہر ایک نے گرہ لگائی اور طرحی مشاعرہ برپا کیا، اور کچھ لوگوں سے داد بھی پائی۔

اسی طرح یاروں نے سکندر مرزا کو تو نام کی مناسبت سے "سکندر اعظم" بنا ڈالا اور حکومتوں کی حکومتیں فتح کرتے چلے گئے، پتہ اس وقت چلا جب "سکندر" رخصت ہوا تو دونوں ہاتھ خالی تھے، اور کوئے یار میں دو گز زمین بھی میسر نہ آسکی، اسی سے ملتا جلتا احوال فیلڈ مارشل ایوب خان کا ہے، ماہرین فن خوشامد کا "ڈپلومیٹک ڈسپیچ" آج بھی توشۂ خانۂ سرکار میں موجود ہوگا جس میں انہوں نے باقاعدہ "خاندان ایوبی" کی بادشاہت قائم کرنے کا مشورہ دیا تھا، اور پھر سرکاری و حکومتی زبان بالائے طاق رکھتے ہوئے ایوب خاں کو "ڈیڈی" کہہ کر متوجہ کیا جاتا، عہد ایوبی میں ڈیگال فرانس کے صدر تھے ان کی بصیرت و فراست کا چرچا تھا اور وہ خود کو بدرجۂ فرانس سمجھتے تھے ایوب خاں کے زلہ رباؤں نے موصوف کو باور کرانا شروع کیا کہ جناب بلا تکلف انچی ٹیپ لے کر اپنا قد ناپ لیں اور ڈیگال کے قد کی پیائش منگوا لیں حضور والا کا قد ایک آدھ انچ ڈیگال سے نکلتا ہوا ملے گا، اس دن سے ایوب خان بھی، ڈیگال کی طرح خود کو "پاکستان" کہلوانے کا شوق پالنے لگے، یادش بخیر مرحوم بھٹو کی قامت زیبا پر کون سے لقب کی عباء مزین نہیں کی گئی، کہنے والوں

نے انہیں "قائد عوام" "فخر ایشیا" لیڈر آف دی تھرڈ ورلڈ کہا لکھنے والوں نے "دیدہ ور" لکھ دی۔

سننے والوں نے انہیں سقراط اور برک سے بڑا خطیب قرار دے ڈالا' دیکھنے والوں نے ان کی مورت چاند میں ڈھونڈھ نکالی' اور جب وقت آیا تو "وعدہ معاف گواہ" تھوک کے حساب سے سامنے آ گئے۔

جنرل ضیاء الحق بھی اپنے شوق سے نہیں عشاق کے اصرار پر "امیرالمومنین" بننے اور کہلانے پر رضامند ہوئے تھے' محمد خاں جونیجو نے خود کو ہمیشہ پچھلی صفوں میں رکھا مگر جمہوریت کے عشق میں مبتلا پروانوں نے انہیں "قائد جمہوریت" اور "محافظ پاکستان" کے منصب پر سرفراز کیا' مگر جب ان کی حکومت ٹوٹی تو نگران عبوری حکومت میں ان کی آدھی کابینہ شریک تھی اور وہ باقی ماندہ عمر بڑی مشکل سے مسلم لیگ کی صدارت کے تنے ہوئے رسے پر چلتے رہے' یہی حاشیہ نشین تھے جنہوں نے بے نظیر بھٹو جیسی آکسفورڈ کی گریجویٹ اور القاب و خطابات سے بے نیاز مغربی مزاج کی حامل شخصیت کو "دختر مشرق" لکھنے پر مجبور کیا' اور انہیں "جون آف آرک" کے ہم پلہ قرار دیا' اور نتیجہ چند ہی سالوں میں آ گیا' اور حالات کے جبر نے موصوفہ کو لاڑکانے کی "وزارتِ عظمیٰ" تک محدود کر دیا۔ جنابِ وزیراعظم! آپ کی امتحان بھی شروع ہو چکا' کئی زبانیں خود کو رواں رکھنے کے لئے گھی سے تر ہو چکی ہیں' کئی قلم کانوں پر سج چکے ہیں' خوبصورت الفاظ لغات سے چھانٹے جا چکے ہیں' مسحور کن مثالیں ازبر کی جا چکی ہیں' زبان و قلم سے نکل کر تیر کی طرح دل میں کھب جانے والے جملے نوک پر تھرک رہے ہیں' اور یہ متاع بے بہا آپ کے حضورِ نذر کی جا رہی ہے اور کی جائے گی' ثانی قائداعظم تو آپ ہو چکے مزید القاب "خوشامد کی ٹکسال" میں ڈھالے جا رہے ہوں گے' آپ کو اسی سیڑھی پر چڑھایا جائے گا جو آپ کے پیش رو حکمرانوں کے لئے ہمیشہ سولی ثابت ہوئی ہے' لیکن آپ "پرائم منسٹر" اور "قائد" بن کر نہیں ایک مومن کے طور پر اس دام ہم رنگ زمین کو درہم برہم کر دیجئے کائنات کے سب سے سچے انسان رسول اکرم ﷺ کے ارشاد کو اپنا "اسم اعظم" اور "رہبر" سمجھئے کہ "مومن نہ دھوکہ دیتا ہے اور نہ دھوکہ کھاتا ہے۔"

آپ نے عوام کے بے حد و حساب اعتماد حاصل کیا ہے اگر یہ مجروح ہوا تو عوام سے دھوکہ ہو گا اور اگر کچھ لوگوں نے آپ کا اعتماد اور قرب حاصل کرنے کے لئے خوشامد کا وطیرہ اپنایا تو یہ آپ سے دھوکا ہو گا۔

(11 مارچ 1997ء)

دو دن کو اے جوانی' دے دے اُدھار بچپن

بچپن تھا تو یہ آرزو دل میں اُٹھتی تھی کہ کاش جلد بڑے ہو جائیں تا کہ ہر کام کا اختیار اپنے ہاتھ میں ہو' جیب پیسوں سے پر ہو' جس چیز پر دل آئے لے لیں' بڑوں کی طرح تعظیم و تکریم سے پکارے جائیں' ہر محفل کی زینت بنیں' سیانی باتیں کریں' شہر شہر گھومیں اور اپنی مرضی سے اُٹھیں اور بیٹھیں' مگر جوانی آئی اور جوانی ڈھل رہی ہے' تو بچپن کو یاد کر کے ایک ہوک سی دل سے اُٹھتی اور پہروں اُداس رکھتی ہے' اور اب دل کی تمنا یہ ہے کہ کاش بچپن لوٹ آئے' جس کا ہر لحہ شگفتہ' اور جس کی ہر ساعت ایک جنت تھی' یوں لگتا ہے کہ بچپن کیا کھویا مفت کی جنت ہاتھ سے کھو دی' بڑے ہو کر اختیار تو ہاتھ آیا ہے مگر بے ساختہ پیار کی دولت چلی گئی' پیسے تو جیب میں آ گئے' معصوم ولولے سینے سے نکل گئے' دینوی ساز و سامان خریدنے پر تو قدرت ہے مگر دل کے ارمان تشنہ رہے جاتے ہیں' سیانے کیا ہوئے ہیں کہ ہر ایک سے بیگانے ہو گئے ہیں' پر ہجوم شہروں کی رونق تو دیکھ لی لیکن دل کی نگری ویران کر بیٹھے ہیں' اپنی مرضی سے اٹھنے بیٹھنے کا شوق بھی پورا کر لیا مگر اب پتہ چلا کہ اس آزادی کے پاؤں میں کتنی زنجیریں ہیں اصل "شہنشاہی" تو بچپن میں تھی' یہ شان بچپن کی ہوتی ہے کہ بچہ کھیل رہا ہو تو پوری کائنات محو رقص ہوتی ہے' وہ مسکرا دے تو فطرت کھل اُٹھتی ہے' وہ سو جائے تو اس کے معصوم چہرے کی حوریں بلائیں لیتی ہیں' بہل جائے تو گردش دوراں سنبھل جاتی ہے' خدا کی امان اور ماں کا دامان بچپن کی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے' بڑا بن کر بڑائی تو آجاتی ہے سچائی رخصت ہو جاتی ہے' اسی لئے تو اہل نظر نے یہ نتیجہ درست اخذ کیا ہے "جب دیکھو بچے جھوٹ بولنے لگے ہیں تو سمجھ لو قیامت آنے والی ہے۔ بڑے بننے کی خواہش ایک گونہ پوری تو ہوئی' مگر آج کی ہزار دانائیاں بچپن کی ان شوخیوں پر نثار جو معصومانہ تھیں' آج کی ہزار حکمتیں اُن شرارتوں پر قربان جو طفلانہ تھیں' اس معصومیت کے مقابلے میں یہ بقراطیت اب زہر لگتی ہے' اور اس طفلگی کے سامنے یہ فرزانگی بے کیف سی معلوم ہوتی ہے۔

Marfat.com

ے کم فہم تھے تو کم تھے پریشانیوں میں ہم
دانائیوں سے اچھے تھے نادانیوں میں ہم

ظاہر ہے ہر جوان کبھی بچہ تھا سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ دے یہ عہد جوانی اچھا یا وہ دورِ نادانی بھلا؟ فائیو سٹار ہوٹل کے ریشمیں صوفوں پر بیٹھ کر بلوریں فنجان میں چائے پینا بہت مسحور کن سہی مگر اس لمحے کا کیا جواب، جو بچپن میں گھر کی کچی دہلیز پر بے فکری کے ساتھ "مرونڈا" کھانے میں لطف ملتا ہے، سکندر اعظم آدھی دنیا فتح کر کے بھی ناخوش رہا بچپن میں لڈو کی آدھی قاش تسخیر کائنات سے کم نہ تھی، بڑے ہوئے تو ہمیں چاند پر پہنچنے کی فکر ہے، قربان جایئے، پر جب ہم خود ہی "چاند" کہلاتے تھے، آج گز بھر کا خطبۂ استقبالیہ ہمیں تسکین نہیں دیتا بچپن میں لوری کے دو بول دل و نگاہ کے آنگن میں پھول کھلا دیتے تھے، بڑے کیا ہوئے ہیں کڑے امتحان میں پڑ گئے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا کا حسن یا پیغمبر کشید کرتا ہے یا بچہ کہ دونوں فطرتاً معصوم ہوتے ہیں، چاروں طرف پھیلی ہوئی افراتفری، بکھری ہوئی بے نمکی، اور کاٹتی ہوئی بے لطفی بچپن کی یادوں کو اور اُبھار دیتی ہے۔

ے جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا

"بڑا" بننے کا بڑا شوق تھا اور حاصل؟ خوف، نفرت، طمع اور ہوس، فصیلوں میں محصور ہو کر بھی خوف کا سایہ دُور نہیں ہوا، ذرا سی بات پر دل معمورۂ نفرت بن جاتا ہے، کوئی پوری دُنیا جھولی میں اُلٹا دے تو پھر بھی تھوڑی لگتی ہے اور "آج" سب کچھ دستیاب ہونے کے باوجود "کل" کی ہوس جوان رہتی ہے، اور انہی "سوغاتوں" نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اگر یہ چار چیزیں جو بچوں میں ہوتی ہیں بڑوں میں آجائیں تو ولی بن جائیں۔ ایک یہ کہ ماں باپ بچے کو لاکھ جھڑکیں وہ پلٹ کر انہی کی گود میں جا گرتا ہے، اللہ والوں کا بھی یہی معمول ہوتا ہے۔ حالات خواہ کچھ ہوں ان کی آخری پناہ گاہ اللہ کا دامن ہی ہوتا ہے۔

دوسری یہ کہ بچے آپس میں جتنا چاہیں لڑیں مگر دل میں کینہ نہیں رکھتے، ایک لمحہ پہلے دست و گریبان اور دوسری گھڑی شاداں فرحاں اور ایک ساتھ رواں دواں۔

تیسری یہ کہ بچے کو جو کچھ اور جتنا کچھ مل جائے اسی پر قناعت کرتا اور خوش رہتا ہے، ایک روپیہ، مٹھائی کا بھورا، روٹی کا ٹکڑا اور پیار بھرا لہجہ۔

چوتھی یہ کہ بچے کو جو آج ملتا ہے وہ اسے کل کے لئے جوڑ کر نہیں رکھتا۔

Marfat.com

یہی تو ولایت کی نشانیاں ہیں، پہلی کیفیت ""رجوع الی اللہ"" کی ہے، دوسری صفت ""وسیع الفرانی"" کہلاتی ہے، تیسری حالت ""قناعت"" کی ہے اور چوتھی بات ""شان توکل"" ہے۔

بچپن کی کس کس بات کو یاد کیا جائے نہ اردگرد تکلف کا ہالہ تھا نہ تصنع کا جالا، نہ خاندانی برتری کا شعور، نہ دولت کا غرور، نہ حسب نسب کا غرور اور نہ جاہ و منصب کا نشہ، یہ سارے شاخسانے ""بڑے"" بننے کے ہیں، ورنہ بچے کی لوح فطرت ان دھبوں سے پاک ہوتی ہے، خواہ بچہ شہزادہ ولیم ہو یا مجھ غریب کا بیٹا احمد ہو، ذہنوں میں فرق یہ فتور زدہ نظام ڈالتا ہے، ملکہ ایلزبتھ کا لخت جگر بھی کھیلنے کو ""چاند"" نہیں دو روپے کا غبارہ مانگتا ہے، وہ خود کو موتیوں میں تولنا نہیں چاہتا مٹی میں کھیلنا چاہتا ہے، وہ خلعت شاہی کا خواہاں نہیں ہوتا میلے کپڑوں میں بھی خوش رہتا ہے، وہ انسان کے کندھوں پر سوار ہونے کا شوق نہیں رکھتا وہ ننگے پاؤں دوڑنے میں راضی رہتا ہے، وہ لوگوں سے سلامیاں لینے کا آرزومند نہیں ہوتا وہ تو نوکر زادوں کے ساتھ کھیلنا اور جھپیاں ڈالنا پسند کرتا ہے، ہر بچے کا چلن اور ہر بچپن کا بھبن ایک جیسا ہوتا ہے، خواہ کوئی بچہ قصر مرمریں جنم لے یا کچے چھپر میں سانس لے، فطرت بھی ایک، دل بھی ایک، ارمان بھی ایک اور قرینۂ اظہار بھی ایک، ممکن ہے آپ کہیں کہ یہ کیا دیوانگی کی باتیں لے بیٹھا ہوں، مجھے یہ دیوانگی منظور ہے، میرا سارا فن خطابت بچپن کی ایک معصوم شرارت پہ قربان، اور مجلسوں کی صدارت ایک بے تکلف مسکراہٹ پہ نثار۔

ے
وہ کاغذ کی ناؤ، وہ بارش کا پانی

(19 جنوری 1999ء)

Marfat.com

جیویں دل آکھی ودا کر سرور میڈے پیار تے پر الزام نہ ڈے

سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن نے اپنی کتاب Seiz The Moment میں ہمیں یعنی مسلمان قوم کو ان پڑھ، مقروض، منتشر اور مریض کے "القاب" دے کر یاد فرمایا ہے، صرف انہی پر موقوف نہیں، اور ایک کتاب پر منحصر نہیں، ہر چوراہے پر مسلمان ٹکٹکی سے بندھے ہوئے ہیں اور ہر تیر انداز مشق ستم میں مصروف ہے، اور ہر ایک کو میں سمجھتا ہوں کہ اس کا حق پہنچتا ہے کہ اس لئے کہ مرے ہوئے کو مارنے سے شاہ مدار باز نہیں آتا تو کوئی دوسرا اس "ثواب" سے کیوں محروم رہے؟

اس سے بھلا کیا مفر ہے کہ آج مسلمان قوم مجموعی طور پر لخت لخت ہے، علم سے دامن کش ہے، قرض کی مے پی کر مست ہے اور جسمانی ہی نہیں کئی روحانی امراض میں بھی مبتلا ہے البتہ ہم اس طرح "تھے" نہیں، ہاں اب یہی کچھ ہیں، حال سے پریشان ضرور ہیں مستقبل سے مایوس نہیں گو کہ ہم خاکستر ہو گئے ہیں لیکن چنگاری دبی ہے بجھی نہیں، عرب کے ریگزار اور عجم کے لالہ زار موجود ہیں اور کسی رومیؒ کے اٹھنے کے انتظار میں ہیں، ہم مٹی کا ڈھیر ضرور ہیں لیکن نمی ابھی باقی ہے، عقابی روح مر نہیں گئی بس ذرا صحبت زاغ نے اسے خراب کر رکھا ہے، بال و پر جھڑے نہیں ذرا گیلے ہوئے ہیں، رنگ رُوپ تو بگڑا ہے جوہر فطرت نہیں کجلایا، دماغ بت خانہ ہوا ہے دل نکتۂ توحید سے بیگانہ نہیں ہوا، سلطنت روم و شام ہاتھ سے گئی ہے اذان بلالؓ ابھی سلامت ہے، ملانے شہروں کا رُخ کر لیا ہے، ورنہ کوہ و دمن اب بھی اُسے پکار رہے ہیں، کبھی یہ چنگاری سلگ اٹھی، کبھی رومیؒ نے جنم لے لیا، کبھی مٹی زرخیز ہو گئی، کبھی عقابی روح بیدار ہو گئی، کبھی جوہر فطرت چمک اٹھا، کبھی نکتۂ توحید آشکار ہو گیا، کبھی اذان بلالؓ گونج اٹھی اور کبھی کوہ و دمن نے انگڑائی لے لی، تو پھر اندلس کا ساحل ہو گا اور طارق بن زیادؒ ہو گا، دیبل کی بندرگاہ ہو گی اور محمد بن قاسمؒ ہو گا، سرنگا پٹم کا قلعہ ہو گا اور ٹیپو سلطانؒ ہو گا، صلیب کا نشان ہو گا، اور صلاح الدین ایوبیؒ ہو گا، طب کا میدان ہو گا اور بو علی سیناؒ ہو گا، فلسفۂ یونان ہو گا اور امام غزالیؒ ہو گا، مغرب کی منطق ہو گی اور رومیؒ کی بصیرت

ہو گی، نٹشے کا فلسفۂ تکرارِ ازلی ہو گا اور اقبالؒ کا فلسفۂ خودی ہو گا' اور پھر اس ٹوٹے ہوئے تارے کو مہ کامل بنتے ہوئے ایک دنیا دیکھے گی "مسلمانوں کا یہ پہلا جنم نہیں نیا جنم ہو گا' قبل ازیں زمانہ آج کی ان پڑھ مسلمان قوم کے جوہر دیکھ چکا ہے اسی قوم میں ابن خلدون جیسا فلسفۂ تاریخ و تمدن کا بانی' طبری' واقدی' مسعودی' جیسے مؤرخ' الفارابی جیسا ماہر عمرانیات' غزالیؒ جیسا متکلم قرطبی' رازی اور زمخشری جیسے مفسر امام مالکؒ امام بخاریؒ امام مسلمؒ' امام ترمذیؒ' امام نسائیؒ' اور امام ابوداوٗدؒ جیسے محدث' شیخ عبدالقادر جیلانیؒ' جنید بغدادیؒ' فضیل بن عیاضؒ' شہاب الدین سہروردیؒ اور خواجہ معین الدین اجمیریؒ جیسے صوفی' ابن العربیؒ جیسے شیخ اکبر' عمر خیام جیسے ریاضی دان' ابن الہیثم جیسے بصریات کے ماہر' فرغانی جیسا فلکیات کا اُستاد' جابر بن حیان جیسا کیمیا دان بو علی سیناؒ جیسا نابغۂ طب و حکمت' ابن رشد جیسا فلسفی' حافظ' فردوسی' اور سعدی جیسے شاعر' خالد بن ولیدؓ سعد بن ابی وقاصؓ اور عمرو بن العاصؓ جیسے سپہ سالار خوارزمی جیسے منجم' یعقوب الکندی جیسا مہندس' رومیؒ جیسا دانا و حکیم' اور ہارون و مامون جیسے عظیم حکمران' مسلمان قوموں کی آغوش کے پروردہ ہیں' اور یہ وہ دور ہے جسے یورپ اپنی کتابوں میں Dark Age یعنی "عہد تاریک" کا نام دیتا ہے' جب کہ یہی وہ عہد تھا جب لندن اندھیروں میں ڈوبا ہوا اور پیرس کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا' یہ تعریض کی نہیں تاریخی تحقیق کی بات ہے' یہ مفروضہ نہیں سچا واقعہ ہے' یہ محض طعنہ نہیں ثابت شدہ حوالہ ہے' یہی وہ زمانہ تھا جب ابھی یورپ غاروں کی زندگی بسر کر رہا تھا اور مسلمان اشبیلیہ میں "القصر" اور غرناطہ میں "الحمراء" جیسے محل تیار کر رہے تھے' یورپ دستخط سیکھنے کے عمل سے گزر رہا تھا اور عالم اسلام میں الملل و النحل کے مصنف ابن حزم کے ہاتھوں چار سو کی تعداد میں تصانیف نکل رہی تھیں' یورپ ابھی توتلی زبان میں بات کرتا تھا اور عالم اسلام سے جادو و بیان خطیب اکناف عالم کو مسحور کر رہے تھے' یورپ نے اس زمانے میں ابھی گنگنانا نہیں سیکھا تھا مسلمانوں میں امیر خسروؒ جیسا عظیم موسیقار اپنا فن لٹا رہا تھا' یورپ پنی بیماریوں کا علاج ٹونے ٹوٹکوں سے کر رہا تھا اور اُدھر مسلمانوں کی صف میں بو علی سیناؒ جیسا امام طب "القانون" اور "الشفا" جیسی شاہکار طبی کتابیں قلمبند کر چکا تھا اور اسے خود مغرب سولھویں صدی عیسوی تک "انجیل طب" کہتا تھا' بو علی سیناؒ کی "القانون" پندرھویں صدی میں سولہ بار اور سولھویں صدی میں بیس بار شائع ہوئی' پورے پانچ سو سال یورپ کی میڈیکل سائنس نے "القانون" کی فضا میں سانس لیا' جب یورپ ابھی منہ دھونے کا عادی اور میلا لباس اتار کر نیا لباس پہننے کا روادار نہیں تھا عالم اسلام اقلیدس' بطلیموس' بقراط' ارشمیدس اور جالینوس

Marfat.com

کے فلسفہ و منطق کا علمی جواب دے رہا تھا۔

انصاف کی دہائی ہے وہ زمانہ کس کے لئے تاریک تھا؟ عالم انسانی کے لئے دنیائے اسلام کے لئے یا خود یورپ کے لئے؟ امریکہ بہادر کا وجود تو ابھی گمنامی کی گہری دُھند میں تھا یہ "صاحب" تو کہیں بعد میں برآمد ہوئے ہیں، ہم مانتے ہیں کہ اس وقت ہم عہد حاضر کے کٹہرے میں مجرم کے طور پر کھڑے ہیں، اقبال جرم بھی کرتے ہیں، ساری شہادتیں بھی ہمارے خلاف جاری ہیں، کئی "وعدہ معاف گواہ" بھی موجود ہیں، وکلائے استغاثہ کی پوری کھیپ ہے، وکیل صفائی ایک بھی نہیں، تماش بین بھی بیگانے ہیں، حتیٰ کہ جج بھی ڈنڈی مارنے والے ہیں، اس سب کے باوجود۔

ے حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے

آندھیوں کے باوجود ہمارے روشن چراغوں کا دھواں اب بھی دیکھا جا سکتا ہے، سیلابوں کے باوجود ہمارے قدموں کے نشانی باقی ہیں، بجلیوں کے باوجود ہمارے نشیمن کے تنکے ابھی بھی کسی ٹہنی سے چمٹے ہوئے ہیں، زلزلوں کے باوجود ہماری بنیادیں قائم ہیں، اور طوفان کے باوجود ہمارے پتوار سرنگوں نہیں ہوئے، میرے عزیز قارئین ذرا کوشش کرکے سرور کربلائی کا یہ بند ضرور پڑھیئے۔

"میڈے جذب جنون دا خالق سن، میکوں ہرگز قرب دوام نہ ڈے،
رکھ سقر ستم وچہ بند میکوں کوئی رحم نہ کر آرام نہ ڈے،
میکوں پل پل آب حمیم پلا، بن زہر زقوم طعام نہ ڈے،
جیویں دل آکھی ودا کر سرور، میڈے پیار تے پر الزام نہ ڈے

(26 جنوری 1999ء)

؎ اب کے بھی دن بہار کے یونہی گذر گئے

بہار کے آتے ہی اور کچھ ہو نہ ہو دو چیزوں کا احساس ضرور ہوتا ہے' ایک تبدیلی اور دوسرے تازگی' موسم نیا پیرہن بدلتا ہے' سردی میں ٹھٹھرے ہوئے لوگ انگڑائی لیتے ہیں اور سردی سے سکڑے ہوئے تن بدن میں فراخی اور کشادگی محسوس کرتے ہیں' کلیجہ کباب کردینے والی گرمی اور جسم جھلسادینے والی لو کا خوف تو آدمی کو رہتا ہے لیکن موسم گرما آنے سے پہلے بہار کے ان چند دنوں میں لوگ اپنی آنکھوں میں شگفتہ نظارے سمولینا چاہتے ہیں' اور لب و رخسار پر تازگی کا غازہ لگالینا چاہتے ہیں' بہار کا موسم آتے ہی انسان تو کیا پرندے اور پھول بوٹے سبھی خوش و خرم اور مست الست نظر آتے ہیں' پرندوں کی چہچہاہٹ پہلے کی نسبت بڑھ جاتی ہے' نرم اور فرحت بخش ہوا کی اٹھکیلیاں زیادہ ہو جاتی ہیں' مرجھائے ہوئے پودے اٹھلانے لگتے ہیں' ٹنڈ منڈ درخت نئے برگ و بار سے آراستہ ہونے لگتے ہیں' خشک ٹہنیاں' گنجی بالیں' اور بے رونق شاخیں پھر سے ہری بھری' صحتمند اور خوشی سے معمور نظر آنے لگتی ہیں' سبزۂ پامال نونہال ہونے لگتا ہے' زمستانی ہوا کے تھپیڑے سبک اور خرام جھونکے بنتے چلے جاتے ہیں' بجھے بجھے انسانی چہرے اُجلے اُجلے محسوس ہوتے ہیں' اور سہمے منظر کھلنے لگتے ہیں' موسم بہار میں کوئی ایسا جادو تو ہے جو سرچڑھ کر بولتا ہے' نثری ادب ہو یا شعری' دو تہائی اسی بہار کے لئے وقف ہے فارسی ادب ہو یا شعری' دو تہائی اسی بہار کے لئے وقف ہے' فارسی ادب ہو یا اردو اور ہندی یا پھر پنجابی اور سرائیکی سبھی پر اسی کا سحر طاری ہے' بہار کے چلے جانے کا غم' بہار کے آنے کا انتظار' بہار کے دنوں میں وصل کی امید' بہار میں شگوفے پھوٹنے کے ساتھ گریباں چاک ہونے کی بات' غرضیکہ پہلو بدل بدل کر ذکر بہار کا ہوتا ہے۔ جشن بہاراں' ابر بہاراں' رنگ بہاراں' یہ سب بہار' بداماں نقش ہیں۔

؎ روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں۔

اسی طرح

؎ گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے

ایک دوسرے انداز میں

ے ریاض زیست ہے آزردۂ بہار ابھی

یا پھر

ے بہار حسن پہ پابندی جفا کب تک؟

یہ سب مصرعے بہار ہی کے حوالے ہیں۔

ے دوستو بزم سجاؤ کہ بہار آئی ہے
کھل گئے زخم' کوئی پھول کھلے یا نہ کھلے

نثر و نظم کا یہ سارا احسان بہار کے دم سے قائم ہے' فرزانے تو کیا دیوانے بھی لطف بہار لینے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے' اِدھر موسم بدلا' رُت گدرائی اور اُدھر دیوانے اپنے گریباں چاک کرنے لگے' یعنی خوشی میں بے خود ہو گئے' اور سینہ کھل کر بہار سے ہم آغوش ہونے کے لئے بے قرار ہو گئے۔

موسم بہار کی سحر آفرینی' دلفریبی اور جادوگری اپنی جگہ مسلم ہے اس بہار کو معلوم نہیں کیا بغض ہے ہماری فصل سیاست سے کہ وہ یہاں نہیں اترتی اور اُسے کیا دشمنی ہے ہمارے گلشن معیشت سے کہ وہ اس میں پڑاؤ نہیں ڈالتی۔

بہار کے دنوں میں کوئی بھی شخص کسی پارک' سیر گاہ' باغیچے کھیت' حتیٰ کہ اپنے گھر کے لان میں ذرا جھانک کر دیکھے تو اسے ہر شاخ اور پتے پر رنگ بہار دکھائی دے گا' نئی کونپلیں' تازہ شگوفے' ہریالی' سرسوں کے پھول' اور شاداب روشیں اس کے دل و نظر کو شادابی عطا کرتی ہیں۔

مگر ہماری سیاست ہے کہ اُس پر ہر موسم میں خزاں لپٹی رہتی ہے' وہی مکروہ چہرے' وہی یبوست زدہ لوگ' وہی استحصالی روش اور وہی فریب کارانہ انداز!

قانون فطرت کے تحت ہر سال موسم اپنا پیرہن بدلتا ہے' درخت اپنے دامن سے بوسیدہ پتے جھاڑ دیتے ہیں' عمر رسیدہ پھول نئی کلیوں کے لئے خود ہی شاخ سے الگ ہو جاتے ہیں' اور زرد پتے ہار مان کر زمین پر گر پڑتے ہیں' لیکن ہمارے ہاں کا سیاسی قانون اور معاشی ضابطہ بے حس اور ڈھیٹ واقع ہوا ہے کہ کوئی سیاستدان اپنا آہنگ نہیں بدلتا' کوئی سیاسی جماعت اپنے دامن سے چمٹی ہوئی چیچڑیوں کو نہیں جھاڑتی' کوئی قریب المرگ سیاسی لیڈر نئے لوگوں کے لئے جگہ خالی نہیں کرتا اور کوئی کمزور اور ہارا ہوا سیاسی جغادری بساط چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

Marfat.com

وطن عزیز آج تک پچاس بہاریں دیکھ چکا ہے' لیکن اس وطن کے باسی ابھی تک جشن بہار نہیں منا سکے۔

اس دوران بلاشبہ حکومتیں بدلی ہیں لیکن ان کے دن نہیں بدلے' چہرے ضرور تبدیل ہوئے ہیں لیکن مثبت رویے تشکیل نہیں پائے' انتظامی نقشوں میں ردوبدل ہوا ہے لیکن افسروں میں جذبۂ عمل نہیں اُبھرا۔

جب ہر بار موسم بہار میں سب کچھ بدل جاتا ہے تو کچھ بگڑتا نہیں بلکہ ماحول اور بھی سنور جاتا ہے اسی طرح اگر ہمارے نظم سیاست و معیشت میں تبدیلی آتی رہے تو اس سے کون سا طوفان اٹھ کھڑا ہو گا؟

اہل نظر تو جنت کی یکسانی' پر ابھی سے شکوہ کناں ہیں بھلا سیاست کی یکسانی پر کون صاحب دل خوش رہ سکتا ہے؟

پچاس سالہ ریکارڈ سامنے رکھ لیجئے' ایک ہی بات چبا چبا کر بار بار کہی جا رہی ہے' مجال ہے جو ذائقے میں تبدیلی آئی ہو' ہر سال ایک ہی باتیں' اور ایک ہی طرح کی گھاتیں' ہر سیاستدان اور حکمران یہی کہتا نظر آتا ہے کہ ہم امریکہ کے حلیف ہیں امریکہ ہمارا قابل اعتماد دوست ہے' ہم غریبوں کی تقدیر بدل دیں گے' ملک کو ناقابل تسخیر بنا دیں گے' قانون کو ہر حال میں بالادستی حاصل رہے گی' امن کا قیام اور سستا انصاف حکومت کا فرض اولین ہے' وغیرہ لیکن بجز چند نواب زادوں' کچھ وچولوں اور کچھ نعرہ بازوں کے' عوام کو بہار اور خزاں میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا۔

پچاس سال سے کلاہ خواجگی ان کے سروں پر ہے جو سرے سے روش بندہ پروری سے آگاہ نہیں ملکی دولت ان کی دسترس میں ہے جن کا شیوہ فقط خیانت ہے اور زمام کار ان ہاتھوں میں ہے جو فطرتاً مردم بیزار اور آدمیت آزاد ہیں' ہر موسم بہار میں سہانے خواب نظر آتے ہیں' لیکن تعبیر ملنے پر ہر شخص کہہ اٹھتا ہے۔

؎ اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے

(9 اپریل 1996ء)

قانون سازی یا انسان سازی؟

جس طرح کوئی شخص محض دوائیوں اور انجکشنوں کے زور پر زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا اس کے لئے اپنی خوراک کو بہتر بنانا' سیر کرنا' سونے اور جاگنے کے معمول کو بدلنا وغیرہ ضروری ہوتا ہے' اسی طرح کوئی معاشرہ بھی فقط قانون کے بل بوتے پر زندہ نہیں رہ سکتا' معاشرے کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے عادات واطوار اور رویوں میں مثبت تبدیلی لائے تب جا کر وہ ایک نارمل اور مہذب معاشرہ بن سکتا ہے' مگر ہمارے ہاں سارا زور نئے سے نئے ضابطے گھڑنے' قانون بنانے اور آرڈی نینس جاری کرنے پر صرف ہو رہا ہے' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر معاشرتی' تہذیبی' سیاسی اور روحانی مرض اور زیادہ سنگین اور مزمن بنتا جا رہا ہے' نجانے کتنے زخم ہیں جو ہماری سوسائٹی کو لگ چکے ہیں اور ناسور بن کر رِس رہے ہیں' کتنے روگ ہیں جنہیں ہر فردِ معاشرہ ''بھوگ'' رہا ہے' کتنی خرابیاں ہیں جن کی جڑیں پاتال تک اتری ہوئی ہیں' لیکن ہمارے ہاں کسی زخم پر پھاہا رکھنے' کسی روگ کی روک تھام کرنے اور کسی خرابی کو جڑ سے اکھاڑ دینے کا دستور نہیں بلکہ ہر مرض کی ایک ہی دوا دریافت کرلی گئی ہے اور وہ یہ کہ ہر روز نیا قانون وجود میں آجاتا ہے' حالانکہ تاریخ اور اقوام کی نفسیات کا مشاہدہ اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ معاشرے میں ضابطے نہیں بلکہ رویے فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں' مثلاً ہمارے ہاں کرپشن کی روک تھام کے لئے انٹی کرپشن کا محکمہ بنادیا گیا' پھر اس انٹی کرپشن کے لئے انسپکشن کا قانون بنایا گیا' اور حاصل یہ کہ' کرپشن بھی زوروں پر ہے' انٹی کرپشن ڈیپارٹمنٹ بھی منہ زور بنا ہوا ہے' اور انسپکشن ٹیموں کی ''پھرتیاں'' بھی اپنا پورا زور دکھا رہی ہیں' یہی حال ہر محکمے کا ہے' پولیس ڈیپارٹمنٹ کو دیکھئے تو ملک بھر میں پولیس افسروں اور جوانوں کی اتنی نفری نہیں جتنے اس محکمے کو فعال' فرض شناس' خدمت گزار اور نتیجہ خیز بنانے کے قوانین کا انبار ہے' محکمانہ ضوابط سازی الگ' اسمبلیوں کے ذریعے قانون سازی الگ اور آرڈی نینسوں کا اجرا الگ' مختلف حوالوں سے قائم کمیٹیوں کی سفارشات الگ' بنے بنائے قوانین اور ضابطوں میں ترامیم کا سیلاب الگ' صوابدیدی اور تعزیری اختیارات الگ' گویا قوانین بنانے کی

Marfat.com

فیکٹریاں ہیں جو شب و روز قواعد و ضوابط "مینو فیکچر" کر رہی ہیں' اور عملاً صورت حال یہ ہے کہ مچھر چھاننے کا خیال حکومتی اداروں پر اتنا حاوی ہو چکا ہے کہ ہاتھی نگلے جانے کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا' ٹونٹیوں کو صاف کرنے اور مانجھنے میں محویت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ نل بدلنے کی طرف توجہ ہی نہیں ہو رہی' ہر محکمے کے سر پر قوانین کا اتنا بوجھ لاد دیا گیا ہے کہ وہ صرف اسے سہارنے میں لگا ہوا ہے' کارکردگی دکھانے کا مرحلہ خدا معلوم کب آئے گا؟

اگر کوئی مریض آکسیجن لگوانے پہ آجائے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کا فطری نظام تنفس تقریباً ختم ہو چکا ہے' اسی طرح کوئی سوسائٹی اگر قانون کے سہارے چلنے لگے تو اِس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور چلنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہے۔

جس طرح سرجری کسی بھی مرض کا آخری اور ناگزیر علاج ہے اور اسی طرح قانون بھی کی معاشرے کی آخری بیساکھی ہوتی ہے جس کی ٹیک لے کر وہ کھڑا رہنے کا تاثر دے سکتا ہے۔

ایک صحتمند انسان کو اگر روزانہ وافر مقدار میں تازہ ہوا میسر آتی رہے تو اُسے آکسیجن لگوائے کی کیا ضرورت؟ اور اگر کسی کی ٹانگیں سلامت ہیں تو اسے بیساکھی اور لاٹھی پکڑنے کی کیا خواہش ہو سکتی ہے؟ بعینہٖ جو معاشرہ مثبت رویوں کا حامل ہو' افرادِ معاشرہ حسن تربیت سے آراستہ ہوں اور ماحول کثافت سے پاک ہو تو اس معاشرے کو قانون کے شکنجوں میں کسنے اور ضابطوں کے پنجے میں جکڑنے کی نوبت کیوں آئے؟

آئین ساز مجالس' قانون ساز ادارے اور سفارشات کمیٹیاں بنانے کے بجائے اگر انسان سازی پر زور دیا جائے تو ملک میں بیک وقت قانون وضع کرنے کی رفتار اور جرائم کی شرح گھٹ جائے گی' قانون آخری چارۂ کار ہوتا ہے ہمارے ہاں آغازِ کار ہی قانون سے ہوتا ہے اس کا بدیہی مفہوم یہ ہے کہ عوام کو حکومتی اداروں پر اور حکومتوں ایوانوں کو عوام پر کوئی اعتماد نہیں رہا' عوام گویا غچہ دینے پر اور حکمران بدلہ لینے پر تل گئے ہیں۔

ہماری تمام حکومتیں شروع دن سے اس روش پر چل نکلیں کہ ان کی ذمہ داری عوام کی تربیت نہیں بلکہ مظاہرۂ قوت ہے اور ہر چیز طاقت کے تابع ہوتی ہے' حالانکہ کوئی بھی تہذیب نہ قانون کے زور پر اُبھری ہے اور نہ اس لئے ڈوبی ہے کہ اُس معاشرے میں ہربات کے لئے قانون موجود نہیں تھا۔ بلکہ گرانڈیل تہذیبیں اس لئے پیوند خاک اور زمین بوس ہو گئیں کہ قانون تو تھا قانون کا احترام نہیں تھا' اور قانون کا احترام حکومت کی قوت سے نہیں افرادِ معاشرہ کی تربیت سے

پیدا ہوتا ہے، حکومتوں نے ہمیشہ فنی، انتظامی اور کاروباری تربیت کا اہتمام تو کیا ہے جبکہ ضرورت اخلاقی اور ذہنی تربیت کی تھی، ہم نے اخلاقی اور ذہنی تربیت کو "مولویت" سمجھ لیا، اور انتظامی مہارت کو "سیاست" قرار دے لیا، جس کے ثمرات آج پورا معاشرہ چکھ اور اثرات پورا تمدن بھگت رہا ہے۔

ہم نے آج تک یہی سمجھا ہوا ہے اور ہمیں یہی سمجھایا گیا ہے کہ بس ایک ڈاکٹر کو قابل ڈاکٹر انجینئر کو ماہر انجینئر، سیاستدان کو کامیاب سیاستدان اور افسر کو اعلیٰ افسر، ہونا چاہئے، حالانکہ ترجیح اس امر کو حاصل ہونی چاہئے تھی کہ کوئی ڈاکٹر ہو، یا انجینئر، افسر ہو یا سیکرٹری وزیر ہو یا سفیران سب کو ایک اچھا اور مسلمان ڈاکٹر اور افسر ہونا چاہئے، تاکہ اس کی اچھائی معاشرے کو سراپا خیر اور اس کی اسلامی روح معاشرتی قالب کو صحت مند بنا دے۔

دنیا کبھی علم کے بحران میں مبتلا نہیں ہوئی اسے عمل کے بحران نے ہمیشہ نقصان پہنچایا ہے، اور عمل علم سے فیض نہیں پاتا یقین (Conviction) سے روشنی اور قوت حاصل کرتا ہے، اور یقین حسن تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے، ابوبکرؓ و عمرؓ اور سلمانؓ و بلالؓ کسی مکتب کی کرامت نہیں تھے نگاہ تیقن کا حسن انتخاب تھے۔

قانون صرف گردن ناپ سکتا ہے، دل کے ارادے نہیں بھانپ سکتا، صالح اور صحت مند سوسائٹی صرف گردنیں جھک جانے کا نظارہ نہیں کرتی بلکہ وہ دل کی دنیا بدلنے کا تقاضا کرتی ہے، قانون اپنی قوت سے صرف سروں کو جھکا سکتا ہے دل میں چھپی ہوئی خواہشوں پر پہرہ نہیں لگا سکتا، جو جب بھی مچلتی ہیں طوفان اٹھا دیتیں ہیں، قانون صرف گلی کوچوں میں باوردی چوکیدار کھڑے کر سکتا ہے، دل و دماغ کے فتور پر پہرے دار نہیں بٹھا سکتا، ملکی قوانین کا دبدبہ اپنی جگہ مگر اصل خوف اُس رب العالمین کا درکار ہے جس نے ہر انسان کے دونوں کندھوں پر کراما کاتبین بٹھا رکھے ہیں جو اعلانیہ اور خفیہ جرائم کا ریکارڈ تیار کرتے رہتے ہیں، دراصل اس احساس کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے، یہ احساس نیپا سول سروسز اکیڈمی اور کاکول کے ذریعے پیدا نہیں ہوتا تعلیماتِ خدا اور رسولؐ کے ذریعے ابھرتا ہے جسے ہم نے اپنے نصابِ زندگی سے خارج کر رکھا ہے، آج جرائم کی روز افزوں شرح خود اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ قانون کی ہیبت کے باوجود جرم سے نفرت کا رویہ مفقود ہے، جرم سے نفرت نہ ہو تو قانون کی گرفت سے بچنا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا، یہ عذر اپنی جگہ کہ بیروزگاری نے جرائم کی شرح میں اضافہ کر دیا ہے، مگر گریڈ بائیس کا افسر کس بیروزگاری کا شکار ہے

کہ وہ گردن تک کرپشن میں پھنسا ہوا ہے؟ قانون سے ناواقفیت اور جہالت اگر جرائم کی بڑھوتری کا سبب ہے تو خود قانون ساز اداروں کے ارکان کی آغوش میں جرائم اور مجرم کیوں پرورش پاتے ہیں؟

انبیاء کرام جن کو مصلحین عالم میں سب سے بڑا اور اونچا مقام حاصل ہے انہوں نے قانون سازی کے زور پر نہیں بلکہ انسان کے ذریعے بڑی بڑی تہذیبوں اور عالی شان تمدنوں کی بنیاد رکھی' اور انسانیت' احترام آدمیت اور اطاعت قانون کے وہ قابل رشک نمونے تیار کئے' جو آج تک بلکہ رہتی دنیا تک روشنی کے مینار بنے رہیں گے' اور وہی روشنی عالم انسانی کی امیدوں کا سہارا ہے۔

آج ملک میں سب سے زیادہ ضرورت ایسے تربیتی اداروں اور اخلاقی مراکز کی ہے جن کے ذریعے اس طرح کے ذہن تیار ہوں کہ قانون کا کوڑا حرکت میں نہ آئے اور معاشرہ سراپا خیر و برکت بن جائے' مدینے میں قائم اولین اسلامی ریاست قانون کی بنیاد پر نہیں اخلاق کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی' اور وہاں کے باسیوں کے رویے اس طرح بدلے کہ بقول جسٹس سید امیر علی ''مدینے کے گلی کوچوں میں چلنے پھرنے والے لوگ بظاہر انسان نظر آتے تھے مگریوں محسوس ہوتا تھا کہ آسمان سے قدسی اتر کر مدینے میں آباد ہو گئے ہیں۔''

قوم عاد ہو یا ثمود' بازنطینی تہذیب ہو یا ایرانی' ان کا زوال اس لئے نہیں ہوا کہ قانونی ضابطے بر سر عمل نہیں تھے بلکہ ان کے اخلاقی رویے اس طرح کے ہو گئے کہ ان کا استحقاق زندگی ختم ہو کر رہ گیا' یہ کیا بات ہوئی کہ ووٹر سے لے کر اسمبلی کے ممبر تک ہر شخص کے لئے ہر قدم پر کوئی نہ کوئی قانون بنا ہوا ہے' اور ہر محکمہ قوانین و قواعد کی پوٹ نظر آتا ہے اس سے تو روبوٹ سوسائٹی کا نقشہ سامنے آتا ہے' زندہ و بیدار اور صالح و توانا سوسائٹی کا کوئی تاثر نہیں اُبھرتا' دوسرے لفظوں میں بارہ کروڑ عوام کے لئے بارہ کروڑ قوانین کی ضرورت ہے تاکہ ہر شخص کے لئے ایک قانون ہو اور وہ اس کا پابند رہے' اور ہر فرد کے سر پر ایک قانون نافذ کرنے والا آدمی مسلط رہے تاکہ کوئی قانون کی خلاف ورزی نہ کر سکے' اس کے مقابلے میں ذہنی و اخلاقی تربیت ایک ایسا وسیع مگر مضبوط دائرہ ہوتا ہے کہ پوری کی پوری قوم اس دائرے میں مکمل آزادی اور اختیار کے ساتھ محو گردش رہتی ہے مگر کوئی شخص دائرے توڑنے اور پھلانگنے کی کوشش نہیں کرتا اس لئے نہیں کہ وہ دائرہ توڑ نہیں سکتا بلکہ وہ اخلاق و حدود کا دامن چھوڑنا نہیں چاہتا۔

اہل نظر یہ دیکھتے اور اہل دل یہ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ ہمارے حکمران اپنے عوام اور نئی نسل کی تربیت کا کیا اہتمام کر رہے ہیں؟ نصابِ تعلیم مرتب ہوتا ہے تو صرف لفظ و حرف کو مد نظر

Marfat.com

رکھا جاتا ہے، فکر و نظر کا کہیں گزر نہیں ہوتا، ٹیلی وژن ہے تو وہ بچوں اور بچیوں کو "فنکار" بنانے پر تلا ہوا ہے، گویا اس قوم کے تمام معاشی و سماجی اور سیاسی و تعلیمی مسائل حل ہو چکے ہیں صرف "فن کا فروغ" باقی رہ گیا ہے، جس پر ساری صلاحیتیں صرف ہونی چاہئیں، بڑے بڑے کار پردازان حکومت یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ موسیقی مضطرب معاشرے کو سکون بخشتی ہے، روح کی غذا ہے، گھٹن کا علاج ہے اور ہر درد کا دارو ہے، یہ نسخہ جالینوس کے مجربات میں تو درج نہیں ملتا معلوم نہیں ان کے ہاتھ کس مسیحا کی بیاض لگی ہے، کہ انہیں ہر مرض کا معالجہ اس "فن لطیف" میں نظر آیا ہے۔

نت نئے شوق ہمارے لئے روگ بنتے جا رہے ہیں، اور ساکنان شہر تازہ ہوا لینے کے خبط میں اتنے در اور روزن بناتے اور کھولتے چلے جا رہے ہیں ڈر لگتا ہے کہ کہیں دیوار ہی نہ گر پڑے، خلاصہ یہ ہے کہ ملک میں نئے سے نئے ادارے بھی بنیں، ہر سطح پر کمیٹیاں بھی بنیں، اونچے اونچے پلازے بھی بنیں، عمدہ سے عمدہ قانون بھی بنیں یہ سب کچھ بجا مگر اصل ہدف یہ ہونا چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ اچھے انسان بنیں، اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہو سکا تو کچھ ہی عرصے بعد رنگین و روشن ایوان "بھوت بنگلے" بن جائیں گے اور عالی شان محلات چڑیلوں اور جنات کا مسکن نظر آئیں گے۔

(12 مارچ 1996ء)

Marfat.com

عوام کے نام کھلا خط

برسوں سے لوگوں کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ اپنے اجتماعی اور انفرادی مسائل متعلقہ حلقوں تک پہنچانے کے لئے کھلے خط کا سہارا لیتے ہیں' اور آئے روز صدر مملکت' وزیراعظم' چیف جسٹس' چیف آف آرمی سٹاف' گورنرز' وزرائے اعلیٰ اور مختلف محکموں کے سربراہوں کے نام "کھلا خط" کے عنوان سے مسائل و مشکلات کو پیش کیا جاتا ہے' اسی طرز پر سیاسی لیڈروں کے نام بھی کھلے خط شائع کرائے جاتے ہیں' جب پارٹی ورکروں کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے تو وہ یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں' علاقے کے ووٹرز اپنے نمائندے کی بے رخی کی توجہ بھی کھلے خط کے ذریعے مبذول کراتے ہیں' بعض حوالوں سے علماء کرام کے نام بھی کھلا خط چھپوایا جاتا ہے' لیکن آج ہم کسی صدر' وزیراعظم' گورنر' وزیراعلیٰ' رکن اسمبلی اور سیاسی لیڈر کے نام نہیں بلکہ عوام کے نام کھلا خط لکھ رہے ہیں' شائد عوام اپنے "پیٹی بھائی" یعنی ایک عام آدمی کی درخواست پر ہمدردانہ بلکہ رحمدلانہ غور فرمائیں' اور تمام مسائل و معاملات کی وہ شاہ کلید جو برسوں سے عوام گم کر چکے ہیں' یا کسی نے چرالی ہے یا ان سے زبردستی چھین لی گئی ہے' واپس انہیں مل جائے' اور شائد اس طرح ہر دوسرے چوتھے دن اپنی فریاد کو کھلے خط کے ذریعے اشتہار بنانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

واجب الاحترام حضراتِ عوام! ہم سب کو اس امر کا بخوبی علم بھی ہے احساس بھی ہے اور یقین بھی! کہ ہمارے پچانوے فیصد ذاتی' شہری' کاروباری' تجارتی' سفری' محکمہ جاتی' تعلیمی اور اخلاقی مسائل و مصائب صرف اس لئے پیدا ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں کہ ہم برسہا برس سے ایک ذمہ دار شہری حکومت' صاف ستھری انتظامیہ اور عدل و انصاف پر مبنی سیاسی نظام سے محروم چلے آرہے ہیں' ہمارا نظام حکومت اداروں کی بنیاد پر نہیں بلکہ شخصی پسند و ناپسند کے معیار پر قائم رہتا ہے' انتظامیہ کی پرورش و پرداخت جذبۂ خدام کے تحت نہیں ہوئی' بلکہ غرورِ حاکمیت اس کے خمیر میں شامل ہے' اعلیٰ حکومتی عہدیدار ہمارے خدمت گار نہیں "سلطان وقت" کے وفادار ہوتے ہیں' اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے' کہ آج ملک نشو و ارتقاء تو کیا اپنے وجود اور اپنی بقاء کے حوالے سے

Marfat.com

اعتماد و استحکام سے محروم نظر آتا ہے اور ہر دشمن اس کی شکست و ریخت کے خواب دیکھتا اور سینے میں اس کی تباہی کی آرزوئیں پالتا ہے' زندگی کا کوئی ایک شعبہ ایسا نہیں جسے صحت مند کہا جاسکے اور کوئی گوشہ ایسا نہیں جسے محفوظ اور مامون سمجھا جاسکے' مہنگائی سے لے کر بے روزگاری تک' مہنگے اور سست انصاف سے لے کر انتظامی جبر تک بدامنی سے لے کر قتل و غارت تک' سفارش سے لے کر رشوت' تک اور کام چوری سے لے کر ڈسپلن کے خاتمے تک ہمارے وجود کو اتنے روگ لگ چکے ہیں کہ زمین کی پشت پر چلنا پھرنا ایک معجزہ نظر آتا ہے اس کی کوئی وجہ اور دلیل سمجھ میں نہیں آتی۔

عالی مقام عوام کرام! جس طرح بارش یک دم نہیں برستی' پہلے کچھ آثار و قرائن نمودار ہوتے ہیں' موسم میں تغیر آتا ہے' بادل اٹھتے ہیں' گرج چمک ہوتی ہے تب برسات آتی ہے' جس طرح ناسور پہلے دن نہیں بنتا' پہلے چوٹ لگتی ہے' زخم آتا ہے' یا معمولی پھنسی نکلتی ہے' پھر بے احتیاطی' پرہیز کے فقدان اور مناسب دوا اور دارو سے گریز کے بعد وہ زخم ناسور بنتا ہے اور پھر مستقل روگ بن جاتا ہے' اسی طرح یہ مسائل ایک دن میں پیدا نہیں ہوئے' ایک عرصے تک آپ اس سے غافل رہے' اپنی کھال میں مست رہے' زشت و خوب کی تمیز سے عاری رہے' نیک و بد کے امتیاز پر توجہ نہ دی اور مخلص و غیر مخلص کی پہچان نہ کی تب جا کر یہ سارے روگ جان کو لاگو ہوئے' کہنے کو آپ سے کہا جاتا رہا کہ مہنگائی بین الاقوامی مسئلہ ہے' بیروزگاری ہم سے بھی زیادہ ہمسایہ ممالک میں ہے' افراط زر کا تعلق بین الاقوامی کرنسی سے ہے' جہالت اور بیماری وسائل کے باعث ہے' اور بدامنی اور دہشت گردی میں دشمن کا ہاتھ ہے' وغیرہ لیکن آپ نے غور نہ فرمایا اور جواب میں یہ تک نہ کہا کہ جہاں مہنگائی ہے وہاں حکومت سبسڈی بھی دیتی ہے' جہاں بیروزگاری ہے وہاں الاؤنس بھی ملتے ہیں' جہالت اور بیماری دور کرنے کے اگر وسائل نہیں تو حکمرانوں کے علاج معالجے اور ان کے بچوں کی تعلیم کے اخراجات کہاں سے نکل آتے ہیں؟ بدامنی اور دہشت گردی میں دشمن کا ہاتھ سہی ہماری ایجنسیاں وہ ہاتھ توڑنے کی صلاحیت کیوں کھو بیٹھی ہیں؟

عوام والا کرام! کہیں ایسا تو نہیں کہ ان مسائل کے پیدا کرنے اور فروغ دینے میں خود ہمارا بھی ہاتھ ہو اور وہ یوں کہ شائد ہم نے ان لوگوں کو اپنی قیادت کے لئے چنا ہو' جن کا کردار ہمیشہ سے راہبر کا نہیں راہزن کا رہا ہے' ہم نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا ہو جو صرف انگریز کی مجلس میں بیٹھنے کے عادی رہے' ہم نے انہیں چوکیدار بنایا ہو جو چور چکار قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں' ہم نے انہیں

Marfat.com

عزت بخشی ہو جو دوسروں کو ذلت میں دیکھنے کے آرزو مند ہوں' ہم نے انہیں قانون ساز اداروں میں بھیجا' جن کا مشغلہ قانون شکنی ہو' ہم نے انہیں اپنا چارہ گر سمجھا ہو جو پرلے درجے کے ستمگر ہوں' اور ہم نے انہیں اپنا طبیب بنایا ہو جن کے سبب ہمارے نصیب پھوٹے ہیں' اگر فی الواقع ایسا ہے تو ہم سو طعنے اگر حکمرانوں کو دیں تو ایک آدھ ملامت کا اپنے آپ کو بھی سزاوار سمجھ لیں' ممکن ہے خدا اس ندامت کے باعث ہماری توبہ قبول کر لے' عوام ذی احتشام! بلاشبہ آپ بھولے بھالے ہیں' سادہ لوح ہیں' صاف دل ہیں' پاکیزہ نیت ہیں' زیادہ باریکیوں میں جانے والے نہیں' بال کی کھال اتارنے کے ماہر نہیں' اور جس کو چاہتے ہیں خمار میں چاہتے ہیں' اور جس سے عشق ہوتا ہے آپ مجنوں سے بھی آگے نکل جاتے ہیں' اور کچے گھڑے پر بیٹھ کر آپ کو چناب عبور کرنے کا شوق بھی رہتا ہے' لیکن کیا یہ سادگی و سادہ لوحی صرف اجتماعی معاملات کے لئے وقف ہے؟ یا آپ اپنے نجی معاملات میں بھی ایسے ہی بے پروا' ایثار پیشہ' دریا دل' حاتم طائی' اور مست موالی قسم کے واقع ہوئے ہیں؟ آثار بتاتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے' تو پھر اس قدر کوتاہی فطرت کے قانون کے مطابق اغماض کے قابل نہیں رہتی' گرفت کے لائق ہو جاتی ہے۔

مانا کہ آپ کسی کی آنکھ کا تنکا نہیں دیکھتے لیکن آپ کو کسی فریب کار کی آنکھ کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا؟ تسلیم کہ آپ کسی کی نیت پر شک نہیں کرتے لیکن آپ کو چور کی داڑھی میں تنکا کبھی دکھائی نہیں دیتا؟ بجا کہ ٹکے پیسے کا آپ شمار نہیں کرتے لیکن بنکوں کے بنک اجڑ جائیں' تب بھی اس کا آپ حساب نہیں رکھتے؟ یہ درست ہے کہ آپ اپنے لیڈروں کے عہد توڑنے اور ووٹروں کا دل توڑنے کا نوٹس نہیں لیتے' لیکن ملک توڑنے کا بھی ان سے جواب نہیں مانگتے؟ یہ سب کچھ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوا' دن دیہاڑے ہوا' کھلے بندوں ہوا اور ڈنکے کی چوٹ پر ہوا مگر آپ نے "عفو عام" کا وہ مظاہرہ کیا کہ نہ صرف وہ لوگ سزا سے بچ گئے بلکہ دوبارہ انہیں کے لئے حکومت تخت سج گئے۔

عوام لائق صد تحسین و انعام!

جب آپ مسائل کی جڑ معلوم کر چکے ہیں' اور بیماری کی تشخیص بھی ہو چکی ہے تو پھر اپنی قیادت کے لئے آپ ان لوگوں کو کیوں آگے لاتے ہیں جن کے ذاتی اور اجتماعی مسائل تو نام کو نہیں البتہ "جناتی اور کرشماتی" وسائل کا ان کے ہاں انبار ہے' آج تک جو لوگ آپ نے لیڈر کے طور پر چنے ہیں' اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے ان میں سے کسی نے آپ کی دلجوئی کا اہتمام کیا ہے؟ عجیب بات

Marfat.com

ہے کہ وزارت کا حلف وہ اٹھاتے ہیں بھنگڑا آپ ڈال رہے ہوتے ہیں' بچہ ان کے ہاں ہوتا ہے لڈو آپ بانٹتے ہیں' جرائم وہ کرتے ہیں ان کو بچانے کے لئے خودسوزی آپ کرتے ہیں۔

آپ کے لیڈر ٹھنڈے یخ کمروں میں محو استراحت ہوتے ہیں اور آپ کڑی دھوپ میں سڑک کے کنارے ان کی جھلک دیکھنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں' حکومتی ادارے احتساب ان کا کرتے ہیں' واویلا آپ مچاتے ہیں۔

آخر اس کا سبب کیا ہے کہ جب بھی آپ کسی کو لیڈر بنانے کے لئے انتخاب کرتے ہیں تو آپ اس کا بنگلہ' گاڑی بنک بیلنس' باڈی گارڈز کی فوج ظفر موج' اور تھانے کچہری سے اس کے تعلقات کو مدنظر رکھتے ہیں کبھی یہ بھی دیکھ لیں کہ وہ اہل علم ہے یا نہیں؟ صاحب بصیرت ہے کہ نہیں؟ دیانتدار اور امانت دار ہے کہ نہیں؟ خدا ترس اور نیکوکار ہے یا نہیں؟ آخر یہ صفات اور خوبیاں آپ کی نظر میں پیسے کے مقابلے میں اتنی حقیر اور ناقابل التفات کیوں بن گئی ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میاں محمد بخشؒ نے اسی پس منظر میں یہ بات کہی ہو۔

؎ ککرتے انگور چڑھایا ہر گچھا زخمایا

جب آپ کو اپنی منزل کے لئے راہنما کے انتخاب کا موقع ملتا ہے تو آپ راہزن کو آگے کر دیتے ہیں' اور اس کے بعد آپ ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں' لیکن یہ فغان و فریاد بے وقت ہوئی ہے۔

؎ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

(20 اگست 1996ء)

؎ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کہا جاتا ہے کہ مرحوم جنرل محمد ضیاء الحق کسی وجہ سے اس وقت کے وزیر اعلیٰ بلوچستان جام غلام قادر آف لسبیلہ سے خفا ہو گئے' اور وہ کسی بہانے جام صاحب کو اس منصب سے ہٹانا چاہتے تھے' کسی موقع پر ملاقات ہوئی تو مرحوم جنرل نے جام غلام قادر سے کہا کہ "جام صاحب! آپ کے خلاف بہت سی شکایات مل رہی ہیں' یا تو ان کا ازالہ کیجیے یا پھر ہمیں کڑوا گھونٹ بھرنا پڑے گا۔"

اس لب و لہجے سے جام غلام قادر کو اندازہ ہو گیا کہ جنرل صاحب کے کیا ارادے ہیں' انہوں نے بڑی متانت لیکن گہری فطانت کے ساتھ جواب دیا۔

"سر! بے عیب ذات ایک تو اللہ کی ہے اور ایک آپ کی' باقی رہے ہم جیسے لوگ تو بندہ بشر ہیں کوئی نہ کوئی غلطی تو ہو ہی جاتی ہے' فرمایئے میں کس طرح ازالہ کروں تاکہ دوبارہ کوئی شکایت کا موقع پیدا نہ ہو۔"

کچھ ایسا ہی عقیدہ پیپلز پارٹی کے افراد کا مرحوم بھٹو کے بارے میں ہے' کہ بھٹو صاحب تو عمر بھر ہر عیب اور غلطی سے مبرا رہے' کہیں ایسی صورتحال پیدا بھی ہوئی تو وہ مخالفین کا قصورِ فہم تھا' یا پارٹی کے باقی جملہ لیڈروں اور کارکنان کی کوتاہی تھی یا پھر پاکستانی عوام نے ٹھوکر کھائی ہو گی۔

؎ رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

یعنی بھٹو مرحوم سکندر مرزا جیسے آمر اور چالباز شخص کی کابینہ میں شامل ہوئے تو یہ کوئی غلطی نہیں تھی دراصل لوگ اس حکمت کو سمجھ نہیں پائے' پھر سکندر مرزا کے خلاف ایوب خان نے مارشل لاء لگایا اور جب نئی کابینہ تشکیل ہوئی تو بھٹو صاحب اس میں بھی موجود تھے' یہاں بھی عوام اور مخالف سیاسی لیڈر سیاسی اسرار و رموز سے ناواقف ہونے کی بناء پر اس فیصلے کو بھٹو کی غلطی قرار دیتے ہیں' ورنہ یہ کوئی غلط فیصلہ نہیں تھا۔

بعد ازاں بھٹو صدارتی الیکشن کے موقع پر ایوب خاں کے چیف پولنگ ایجنٹ اور محترمہ فاطمہ جناح کے سخت ترین ناقد رہے' یہ بھی کوئی غلط بات نہ تھی' دراصل لوگوں کی اجتماعی بصیرت دھوکہ کھا گئی جو اس حکمت کو سمجھ نہیں پائی' اور یہی بھٹو صاحب تھے جنہوں نے ۷۰ء کے الیکشن

Marfat.com

کے بعد دو ایوانوں کی تجویز پیش کی' ایک بہت بڑے جلسہ عام میں ان ارکان اسمبلی کی ٹانگیں توڑنے کی بات کی جو ڈھاکہ میں منعقد ہونے والے دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہونا چاہتے تھے' اور ایک موقع پر مرحوم نے کھلم کھلا "اِدھر ہم اُدھر تم" کا "نعرۂ مستانہ" لگا دیا لیکن ان مواقع پر بھی بھٹو صاحب کا موقف درست اور برحق تھا' مخالف سیاسی رہنماؤں اور عوام کی مت ماری گئی تھی کہ وہ اس موقف کی گہرائی اور سچائی کا اندازہ نہ کرپائے' اس کے بعد مرحوم بھٹو برسر اقتدار آگئے انہوں نے مارشل لاء جاری رکھنے کے لئے اپنی پارٹی اور دوسرے حلیف اور ارکان اسمبلی کی بھاری اکثریت کے دستخط لئے اور سب سے بڑے جمہوری ادارے کو مارشل لاء کے اجراء اور جواز کے لئے استعمال کیا' ایک موقع پر حزبِ اختلاف کے ارکان کو اس کے لیڈر سمیت باقاعدہ سارجنٹ ایٹ آرمز کے ذریعے قومی اسمبلی سے باہر سیڑھیوں پر پھنکوا دیا' یہاں بھی قصور یا تو قومی اسمبلی اور اس کے ارکان کا تھا یا پھر حزبِ اختلاف کا ورنہ بھٹو صاحب نے جو کچھ کیا وہ عین حق اور ملک' عوام اور جمہوریت کے مفاد میں تھا' کوتاہ بین نظریں اور چھوٹے دماغ ان بلیغ فیصلوں کا احاطہ و ادراک نہ کرپائے' غرضیکہ ایک پوری تاریخ ہے لیکن ہر جگہ تاریخ نے ٹھوکر کھائی ہے ورنہ "تاریخ ساز" بھٹو صاحب کسی کوتاہی اور غلطی کے مرتکب نہیں ہوئے۔

مگر خدا خدا کرکے پہلی بار بھٹو کی ایک غلطی سامنے آئی اور اس کا اعتراف بھی مرحوم کی صاحبزادی وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے کیا ہے اگر کوئی دوسرا یہ جسارت کر بیٹھتا تو یقیناً اُسے دماغ اور آنکھوں کا علاج کرانے کا مشورہ دیا جاتا جو اتنی واضح حقیقت کو سمجھنے اور موٹی سی بات کو دیکھنے سے قاصر ہو۔

وزیراعظم بے نظیر نے فرانس کے ایک ہفت روزہ "پوائنٹ ڈی ویو" کو ایک طویل انٹرویو دیا جس میں انہوں نے سیاسی اور ذاتی حوالے سے بڑی دلچسپ اور فکر انگیز باتیں کہیں اور اسی انٹرویو میں انہوں نے فرمایا۔

"پاکستان کو مغرب زدہ بنانا میرے والد کی غلطی تھی' ۷۷ء میں اسی کا ردعمل ہوا۔"

(رپورٹ' نوائے وقت ۹ جون ۹۶ء)

ورنہ گذشتہ بیس سالوں میں پیپلز پارٹی کے ہر چھوٹے اور بڑے لیڈر نے یہی کچھ بتلایا کہ ۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰؐ امریکہ کی اٹھائی ہوئی تھی' پی این اے کے سارے لیڈر عوام دشمن اور امریکہ کے ایجنٹ تھے' عوام ڈالر لے کر جلوس میں شریک ہوتے تھے' وغیرہ اب تقریباً دو عشروں

کے بعد پی پی کے کسی یونٹ انچارج' یا "بھونپو" قسم کے رہنما نے نہیں بلکہ پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن' اور وزیر اعظم نے یہ اعتراف کیا ہے (اگرچہ اس اعتراف کو ہمارا دل نہیں مانتا کیوں کہ یہ بھٹو فیملی کے مزاج کے خلاف ہے مگر کیا کیا جائے کہ اس اخباری رپورٹ کی تردید نہیں آئی۔) کہ ۷۷ء کی تحریک میں جہاں دیگر عوامل کار فرما تھے وہاں ان کے والد کی یہ سنگین غلطی بھی شامل تھی کہ انہوں نے پاکستان جیسے انتہائی مذہبی وابستگی رکھنے والے اور مشرقی روایات کے حامل ملک کو مغرب زدہ بنانے کی کوشش کی اور جلد بازی کا مظاہرہ کیا' جس کے نتیجے میں زبردست ردعمل ابھرا اور ۷۷ء کی تحریک اسی ردعمل کی مظہر تھی۔

ہمارے نزدیک یہ محض حقیقت کا اعتراف نہیں بلکہ بہت بڑا انکشاف ہے اس انکشاف نے کم از کم ۷۷ء کی تحریک کے مطلع پر چھائی ہوئی دھند کو کسی حد تک صاف کرنے میں مدد دی ہے' ورنہ اچھے خاصے معقول لوگ اس شش و پنج میں رہے ہیں کہ بھٹو صاحب نے اپنے پورے دورِ اقتدار میں کوئی غلط تو نہیں کی تھی' پھر ۷۷ء میں تحریک کیوں چل پڑی؟ ہو نہ ہو یہ پی این اے کی امریکہ سے سازباز تھی یا پھر عوام پر پاگل پن کا دورہ پڑا تھا' لیکن وزیر اعظم کے اس اعتراف نے کچھ تو پی این اے کے لیڈروں کی ساکھ رکھ لی اور کچھ عوام کے "خلل دماغ" کی نفی بھی ہو گئی' ورنہ آج تک لاکھوں عوام "مجسم حماقت" اور قائد عوام "مجسم حکمت" سمجھے جا رہے تھے۔

ایک بڑی غلط فہمی کے کسی حد تک ازالے کے باوجود ہمارے خیال میں ہر دوسرے حکمران کی طرح ایک بار پھر وزیر اعظم نے ملک کے پورے تہذیبی اور سیاسی منظرنامے کو غلط رخ سے دیکھنے کی غلطی کی ہے ایک ان کے انٹرویو سے یہ بات جھلکتی ہے کہ انہوں نے بھٹو صاحب کی اس روش کو غلط کہا کہ مرحوم نے پاکستان کو مغرب زدہ بنانے میں جلد بازی سے کام لیا "گویا" مغرب زدہ بنانا" کوئی غلط کام نہیں بلکہ اس میں عجلت اختیار کرنا ایک غلطی تھی' جو بھٹو کو نہیں کرنی چاہیے تھی' اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستانی عوام بہت رجعت پسند اور روایت پرست ہیں۔ انہیں ابھی مغرب کی روشن خیالی ہضم نہیں ہو پاتی اس لئے یہ کام نسبتاً دھیرے دھیرے ہونا چاہئے تھا' وزیر اعظم دوسری غلطی یہ کر رہی ہے کہ جس طرح ہر دور کا حکمران نوشتۂ دیوار پڑھنے سے عاجز و معذور رہا ہے اور ہر بار اپنے خلاف ردعمل کو بیرونی سازش' لوگوں کا پاگل پن' اخبارات کی مبالغہ آرائی' یا مخالفین کی ہرزہ سرائی قرار دیتا رہا' بھٹو صاحب اور ان کے جانشینوں نے ہمیشہ یہی باور کرانے کی کوشش کی مگر بہت دیر بعد حکمرانوں اور ان کے حواریوں کو اندازہ ہوتا ہے کہ "زبان خلق" ہمیشہ "نقارۂ خدا"

Marfat.com

ہوتی ہے' کان بند کر لینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا' محترمہ وزیراعظم کہیں آج اُسی غلطی کا اعادہ تو نہیں کر رہیں جس کا ارتکاب ان کے پیش رو حکمران کرتے چلے آئے ہیں؟

اور تیسری بات یہ ہے کہ موجودہ حکومت نے اپنے ذرائع ابلاغ اور انداز و اطوار سے مغرب زدگی کی جو لہر اٹھا رکھی ہے اس کا عشر عشیر بھی مرحوم بھٹو کے دور میں نہیں تھا' تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جیسے عمل کا ۷۷ء میں تو ردعمل ہو اور ۹۶ء میں نہ ہو؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ چند برس بعد کسی اور حکمران کو یہ تجزیہ اور انکشاف کرنا پڑے کہ محترمہ نے ۹۶ء میں فلاں غلطی کی تھی جس کا انہیں خمیازہ بھگتنا پڑا' بہرکیف مسز بے نظیر نے یہ انکشاف کرکے ہم جیسے لوگوں پر دو طرح کا احسان کیا ہے ایک تو بھٹو صاحب کی غلطی واضح کرکے ہمیں اس ذہنی کشمکش سے نجات دلا دی ہے' کہ اب تک ہم یہی سمجھتے چلے آرہے تھے کہ کروڑوں عوام یک بیک "خبطی اور مراقی" ہو جاتے ہیں' ورنہ "لیڈر" تو "ملکوتی مخلوق" ہوتا ہے اس سے غلطی کا صدور کیسے ممکن ہے؟ شکر ہے اب یہ "متھ" ٹوٹ گئی ہے' دوسرا احسان یہ ہوا کہ بیس برس بعد سہی بہرحال محترمہ کے اس اعتراف کو ہم "زود پشیمانی" ہی کہیں گے' کچھ عجب نہیں کہ تھوڑے عرصے بعد بہت سے اور بھی اعترافات سامنے آجائیں' آنکھ کھلے گی تو یقیناً خواب بکھریں گے ورنہ اقتدار کے نشے میں سہانے سپنے ہی نظر آتے ہیں۔

(31 جولائی 1999ء)

Marfat.com

؎ شیخ میخانے میں آنے کو مسلماں آیا

محترم اور ممتاز صوفی شاعر بابا ذہین شاہ تاجی نے ایک مدت ہوئی خوبصورت شعر کہا تھا۔

؎ شیخ میخانے میں آنے کو مسلماں آیا
کاش میخانے سے نکلے تو مسلماں نکلے

آج ملک کی موجودہ سیاسی صورتحال دیکھ کر یہ شعر بے ساختہ ہمارے قلم کی نوک پر آگیا' کہ صدر لغاری نے اسمبلی توڑنے کو تو توڑ دی ہے دیکھنا یہ ہے کہ جس پس منظر میں اور جن الزامات کے تحت حکومت کو برخاست کیا گیا ہے آیا اس کے بعد منظر بدلتا ہے اور الزامات دھلتے ہیں یا نہیں؟ ۲۷ اکتوبر ۵۸ء کے ایوب خانی مارشل لاء سے لے کر ۵ نومبر ۹۶ء کی اسمبلی کی تحلیل تک ایک ہی ماڈل کا گراموفون بج رہا ہے' اور اس میں ایک ہی کیسٹ چل رہی ہے صرف وقفے وقفے سے آواز بدل جاتی ہے' نہ راگ بدلا ہے' نہ سر بدلا ہے' نہ گانا بدلا ہے۔

اگر ایوب خاں کی نشری تقریر کا ریکارڈ دستیاب ہو اور اسے دوبارہ سن لیا جائے تو ٹھیک وہی جملے اور فقرے سننے کو ملیں گے جو ۲۶ مارچ ۶۹ء کو یحییٰ خاں نے ایوب حکومت کو برخاست کرتے اور مارشل لاء لگاتے وقت ریڈیو' اور ٹیلی وژن پر اپنی تقریر میں ادا کئے تھے' ایک بار پھر ۵ جولائی ۷۷ء میں جب مرحوم ضیاء الحق نے بھٹو حکومت کا تختہ الٹا اور شام کے وقت قوم نے اپنی آنکھیں اور کان ٹی وی اور ریڈیو پر گاڑ دیئے تو جنرل ضیاء نے جملوں کی دروبست میں معمولی تغیر و تبدل کے ساتھ وہی تقریر کی جو یحییٰ خاں نے زمام اقتدار سنبھالتے وقت کی تھی۔

تاریخ نے اپنے آپ کو دہراتے ہوئے ایک مرتبہ پھر قوم کو یہ منظر دکھایا کہ ضیاء الحق ۲۹ مئی ۸۸ء کی شام ٹیلی ویژن پر جلوہ افروز تھے اور ویسی ہی چارج شیٹ مرحوم جونیجو کے خلاف پیش کر رہے تھے جو انہوں نے قبل ازیں مرحوم بھٹو کے خلاف پیش کی تھی' ایسا ہی منظر ۶ اگست ۹۰ء کو اہالیان پاکستان نے ٹی وی پر سہ پہر کے وقت دیکھا جب غلام اسحاق خاں بے نظیر حکومت کو برطرف اور اسمبلی کو برخاست کر چکنے کے بعد اپنے اقدام کا جواز پیش کر رہے تھے' اور پھر یہی غلام اسحاق خان تھے' یہی پیارا پاکستان تھا' یہی عوام تھے' یہی ٹیلی وژن تھا' ۱۸ اپریل ۹۳ء تھا' رات اپنا نصف

حصہ گزار چکی تھی' اور جنابِ صدر تھکے لہجے' بجھے چہرے' خشک ہونٹوں اور پامال لفظوں کے ساتھ قوم سے مخاطب تھے اور اسمبلی اور نواز شریف حکومت کی برخاستگی اور معطلی کے احکام جاری کر رہے تھے' ۵۸ء سے ۹۳ء تک الزامات کی نوعیت یکساں رہی اور حکومتوں کے توڑنے کی وجہ جواز ایک جیسی! بس معمولی زیر زبر اور نقطے اور شوشے کے فرق کے ساتھ' یعنی بدامنی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے' معاشی صورتحال ابتر ہے' ہر ادارہ بدامنی کی لپیٹ میں ہے' لوگوں کے بنیادی حقوق پامال ہو رہے ہیں' عوام کے جان و مال اور آبرو کا تحفظ کرنے میں حکومت ناکام ہو گئی ہے' ملکی سلامتی خطرے میں پڑے گئی ہے' اور حکومت کو آئین کے مطابق چلانا محال ہو رہا ہے' اسلئے اسمبلی توڑی جاتی ہے اور حکومت کو ڈسمس کیا جاتا ہے' ٹھیک انہی الزامات کے تحت اور ایسی ہی صدارتی تقریر کے ساتھ ۵ نومبر ۹۶ء کو بے نظیر حکومت برطرف کی گئی ہے' دو سال کم چالیس برس کی اس مشق میں ہر چیز ایک دوسرے سے مماثل ہے' الزامات' حکومت برطرفی کا جواز' نئے وعدے وعید اور یقین دہانیاں' حتی کہ یہ بات بھی کہ حکومتوں کو برطرف کرنے والے لوگ اپنے پیش رووں کے منظور نظر اور لاڈلے تھے' ایوب خاں جنابِ سکندر مرزا کا انتخاب تھے' مرزا صاحب نے فیلڈ مارشل کو اپنی کابینہ میں رکھا' انہیں وزیراعظم بنایا اور پھر مارشل لاء لانے کی دعوت دی' یحیٰی خاں کو بھی ایوب مرحوم نے کمانڈر انچیف بنایا' اور انہیں پیشہ ور سپاہی قرار دیا' جنرل ضیاء الحق بھی بھٹو صاحب کا حسن انتخاب تھے' جونیجو کو ضیاء نے ہی جھاڑ پونچھ کر وزیراعظم ہاؤس کی زینت بنایا تھا' غلام اسحاق خاں کو خود بے نظیر بھٹو نے اپنے دیرینہ جمہوری اور سیاسی ساتھیوں پر ترجیح دیتے ہوئے صدر منتخب کرایا تھا اور میاں نواز شریف بھی غلام اسحاق خاں کی گود کے پالے ہوئے تھے' اور آج صدر لغاری کسی دوسرے کے نہیں بے نظیر بھٹو کی چوائس ہیں' پیپلز پارٹی کے دیرینہ کارکن' بھٹو فیملی کے بااعتماد فرد اور سرد و گرم حالات کے ساتھی' ہر ایک کا اپنا ہی --- حسن انتخاب---- اُسے چارج شیٹ کرے تو عوام یہ باور کرنے میں حق بجانب ہیں کہ کوئی لاکھ پاکی داماں کی حکایت بیان کرے لیکن اسے اپنے دامن اور بند قبا کو ضرور دیکھ لینا چاہئے' اگر گھر کو آگ گھر کے چراغ ہی سے لگ جائے تو ہمسایوں کو دوش دینا دانشمندی نہیں۔

جب فریقین ایک دوسرے کو ہدف ملامت بناتے ہیں' اور اپنے اپنے احسانات جتاتے ہیں تو لوگ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ دونوں فریق دراصل ایک دوسرے کو یہ پیغام دے رہے ہوتے ہیں کہ تم اگر مجھے "حاجی" کہتے رہتے تو ہم بھی تمہیں "غازی" کے نام سے یاد کرتے'

Marfat.com

دوسرے لفظوں میں یہ کہ جب کھیر مل کر پکائی ہے، تو ایک زیادہ حصہ کیوں لے؟ مل بانٹ کر کھانے ہی میں عافیت تھی۔

قوم اپنے پچاس سالہ تجربے کی بنیاد پر یہ کہہ سکتی ہے کہ مقتدر لوگوں پر کبھی عوام کی آہ و فغاں کا اثر نہیں ہوا، انہیں "قوم کا وسیع مفاد" صرف اس وقت نظر آیا جب ان کا اپنا "طے شدہ حصہ" خطرے میں پڑا، اگر یہ سارے اقدامات اخلاص، احساس فرض، آئین اور ملک کے ساتھ وفاداری اور جذبۂ اصلاح کے ساتھ ہوتے تو پھر اس کا کیا سبب ہے کہ اس کے بعد حالات سنورے نہیں بلکہ بگڑے ہیں۔

جس خویش نوازی کو الزام بنا کر پیش کیا گیا اسی چیز کو اپنے لئے کیوں روا رکھا گیا؟ ذاتی پسند اور ناپسند کو نگران حکومتوں میں کیوں دخیل کیا گیا؟ اور خاص قسم کے چہروں کو آگے لانے کی کیوں کوشش کی گئی؟ ۵۸ء سے لے کر ۹۶ء تک ایک ہی عمل کو بار بار کیوں دہرایا اور ایک ہی کلاس کو ہر بار آزمایا گیا؟

ہم نہ حکومت برطرف کرنے والوں کے "اٹھائی گیر" ہیں اور نہ برطرف ہونے والوں کے "قلمی مجاور" کہ ایک کو خراج عقیدت پیش کریں اور دوسرے سے اظہارِ تعزیت! صرف یہ مطلوب ہے کہ جب بھی جس بنیاد پر کسی حکومت کو برطرف کیا گیا وہ بنیاد ہمیشہ پانی پر کیوں رکھی گئی؟ اور اس پر ریت کی دیوار کیوں اٹھائی گئی؟ کیوں کہ آج تک وہ تعمیر قوم نے نہیں دیکھی جس کے لئے یہ ساری تخریب کی جاتی ہے؟

یہ الفاظ لکھتے ہوئے ہمیں بدگمانی کا کوئی دورہ پڑا ہوا نہیں، بقائمی ہوش و حواس اور پورے احساس غیر جانبداری کے ساتھ یہ سطور قلم بند کی جارہی ہے کہ تین سال گزرنے میں کتنی دیر لگی ہے جو تین ماہ گزرنے میں لگے گی، ہمارے نزدیک آئندہ سہ ماہی کا ایک ایک پل صدر اور نگران حکومت کے لئے "پل صراط" ہے جس پر سے انہیں گزر کر سرخرو ہونا ہے مرغابی کے لئے یہ مشکل نہیں کہ وہ پانی میں چوبیس گھنٹے ڈوبی رہے اصل بات یہ ہے کہ اس کے پر گیلے نہ ہوں، بازار سے گزرنا کونسا مشکل کام ہے اصل چیز تو جنس بازار کا خریدار نہ بننا ہے، کلمہ پڑھنے اور دہرانے میں کتنی دیر لگتی ہے، مسئلہ تو اس کے مطابق زندگی گزارنے کا ہوتا ہے، اسی طرح اسمبلی توڑنا اور حکومت کو اکھاڑنا کوئی کارنامہ نہیں بلکہ ان رخنوں کو بند کرنا ہے جنہوں نے پورے معاشرے کو فساد میں بدلا ہوا ہے، اگر تو حکومت کی برطرفی کے بعد ایجنڈا صرف ------ انتخابات---- ہیں نہ

Marfat.com

درمیان میں کوئی احتساب' نہ جھوٹ سچ کی تمیز' نہ ظلم اور عدل میں امتیاز' نہ کھرے کھوٹے کا فرق' اور نہ اصلاح احوال کی تمیز تدابیر' تو ابھی اسے ہر کوئی اپنی کتاب میں لکھ لے' کہ نہ چہرے تبدیل ہوں گے اور نہ نظام' ایک بار مجھے محمد طفیل مرحوم (مدیر نقوش) نے خط لکھا جس میں انہوں نے کہا "کہ آپ کا خط مل گیا تھا لیکن غالباً اسکا جواب آپ کو نہیں ملا ہو گا ظاہر ہے کہ جب خط کا جواب لکھا ہی نہ گیا ہو تو مکتوب الیہ تک کیسے پہنچے گا؟

ٹھیک یہی کچھ ہمارے مقتدر حلقے کرتے ہیں کہ جب ان کا ارادہ ہی نہیں کہ اصلاح احوال ہو تو پھر اصلاح کیسے ممکن ہے؟ احتساب کرتے ہی نہیں تو چوراہے میں کسی کا لاشہ کیسے لٹکا ہوا نظر آئے؟

تبدیلی نظام کا مطلب افسروں کا تبادلہ نہیں بلکہ ایک خاص طبقے اور ذہنیت پر ضرب لگانا ہے' چور مار دینا ایک کام تو ہے لیکن اس سے چوری بند نہیں ہو گی اس کے لئے چور کی ماں مارنا ضروری ہے تاکہ چور جنم دینے والی کوکھ نہ رہے' اس سمت اٹھنے والے قدم ایک نہ ایک دن منزل پر پہنچیں گے ورنہ سفر تو نصف صدی سے جاری ہے لاحاصل اور رائیگاں۔

(16 نومبر 1996ء)

Marfat.com

بدلنا ہے تو مے بدلو‘ نظامِ میکشی بدلو

اسے لطیفہ کہیے‘ مضحکہ سمجھیے یا عوام کے ساتھ دھوکہ گردانیئے لیکن ہے یہ عجوبہ کہ اور تو اور حکمران بھی روز و شب یہ راگ بھیرویں الاپ رہے ہیں ”نظام بدلنا ہو گا“ موجودہ نظام ناکارہ ہو چکا ہے‘ ”خرابیوں کی جڑ رائج نظام ہے۔“ ”نظام بدلے بغیر چارہ نہیں“ یہ اور اس طرح کے ملتے جلتے جملے وزیراعظم اور وزیرِاعلیٰ کی نوک زبان پر رہتے ہیں‘ اب یہ خدا کو معلوم ہے یا خود ان حضرات کو علم ہے کہ یہ باتیں وہ کیوں اور کس دل سے کرتے ہیں؟ کم از کم میرا دل نہیں مانتا کہ وہ لوگ فی الواقع اور پورے شعور کے ساتھ نظام بدلنے کی بات کر سکتے ہیں جن کی سیاست کا اُبھار‘ جن کی شخصیت کا نکھار اور جن کی کرسی اقتدار کا سرچشمہ یہی نظام ہے جس کو اکھاڑنے اور بدلنے کی وہ بات کر رہے ہیں‘ ہاں یہ ممکن ہے کہ ان کی تبدیلی نظام کا فہم ہی یہ ہو کہ وہ داغ دوزی اور بخیہ گری کو تبدیلی نظام سمجھتے ہوں‘ یعنی برگد اپنی جڑوں سمیت قائم رہے محض شاخوں کی تراش خراش سے سارا نقشہ تبدیل ہو جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ پنجاب ہو یا سندھ اور سرحد ہو یا بلوچستان‘ طورخم سے گوادر تک اور اٹک سے تھرپارکر تک اس پر لوگوں کا اجماع نظر آتا ہے‘ کہ سسٹم کو بیخ و بن سے اُکھیڑے بغیر نہ اصلاح ممکن ہے اور نہ فلاح‘ اسی آوازۂ خلق کو سیانے لوگوں نے نقارۂ خدا کہا ہے اگرچہ یہ اجماع محض نظری اور فکری حد تک ہے ابھی عملی سطح پر نہیں پہنچا‘ یہ بھی غنیمت ہے‘ پہلے تو یہ بھی نہیں تھا بلکہ عوام تو بار بار حضرتِ میر کی طرح عطار کے اُسی لڑکے سے دوا لینے پر مصر تھے جس کے سبب وہ بیمار ہوئے۔

تجاہل‘ تغافل‘ تبسم‘ تکلم
یہاں تک تو پہنچے وہ مجبور ہو کر

بات ہو رہی تھی اربابِ اقتدار کی طرف سے نظام بدلنے کے دعوے اور نعرے کی‘ پشاور سے کراچی تک اربابِ حکومت اور پوری سیاسی قیادت پر نظر ڈال لیجئے اور پھر اپنے دل سے پوچھئے

Marfat.com

کیاان میں کوئی ایک بھی ایسا ہے جس کے منہ سے نظام بدلنے کی بات زیب دیتی ہو؟

تکلف بر طرف کیا میاں نواز شریف صاحب نظام بدلیں گی جس نظام نے ان کا کاروبار چمکایا اور پھراس کاروبار نے ان کے لئے اقتدار کا راستہ بنایا؟

کیا بے نظیر نظام بدلیں گے جن کی بد عنوانیاں دنیا بھر کی مرغوب کہانیاں بن چکی ہیں؟ کیا پیر پگاڑا نظام بدلیں گے جن سے اپنے گھر کا نظام نہیں چل رہا؟

کیا مخدوم آف ہالہ نظام بدلیں گے جو آج تک اپنا مزاج نہیں بدل سکے؟

کیا غلام مصطفےٰ جتوئی نظام بدلیں گے جو ایک دن لندن ہوتے ہیں تو اگلے روز ہنوئی پائے جاتے ہیں؟

کیا فاروق لغاری نظام بدلیں گے جن سے ان کے اہل اور ہاری بھی خوش نہیں؟

کیا ممتاز بھٹو نظام بدلیں گے جو کسی میلے لباس والے سے ہاتھ ملا کر راضی نہیں؟

کیا فرقہ وارانہ جماعتوں کے سربراہ نظام بدلیں گے جو آج تک فروعی مسائل سے اوپر نہیں اُٹھ سکے؟ کن کن کا نام لیا جائے اور کیا کیا الزام دیا جائے؟ اب یہ باتیں تکرار کے زمرے میں آچکی ہیں' نظام بدلنے کا مطلب وزیر' جج' آئی جی' کمشنر' ڈی سی بدلنا نہیں بلکہ وہ رویہ بدلنا ہے جو حکمران کو اپنے آپے اور ماتحتوں کو اپنے جامے میں نہیں رہنے دیتا۔

جناب وزیراعظم! کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ اگر آپ نظام بدلنا چاہتے ہیں تو بقدرِ کفاف وسائل اپنے پاس رکھ لیں اور باقی بحق سرکار منتقل کر دیں اور یہ سب کچھ آپ کو گوارا ہو؟ اگر آپ کے لئے یہ ممکن نہیں تو پھر کسی سیکرٹری' ڈی سی اور اے سی کے لئے بھی ممکن نہیں کہ وہ کئی کنال کی کوٹھیاں چھوڑ کر شاد باغ اور مصری شاہ چلے جائیں' کیا آپ میں یہ حوصلہ ہے کہ آپ حضرت علیؓ کی طرح عدالت میں اس طرح پیش ہوں کہ نہ کوئی چوبدار آپ کے ساتھ ہو' نہ وہاں آپ کے لئے ریٹائرنگ روم کھولا جائے' نہ آپ کی حاضری کوٹی وی کوریج ملے' آپ کا بیٹا آپ کا گواہ ہو اور عدالت اس کی گواہی مسترد کردے' اور فیصلہ آپ کے خلاف صادر کردے اور اس کے باوجود آپ کے ماتھے پر شکن اور دل میں ملال نہ آئے' اگر یہ آپ نہیں کر سکتے۔ تو پھر عدالتی نظام کی اصلاح بھی نہیں کر سکتے' جنابِ والا! کیا آپ اپنے اندر اتنی ہمت پاتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرح اپنی اہلیہ سے کہیں کہ اپنا زیور' اپنے ہار اور اپنے کڑے سرکاری خزانے میں جمع کرا دو اس لئے کہ میں آغاز اپنی ذات کی طرف سے کرنا چاہتا ہوں اور آپ کی اہلیہ ذرا توقف کرے تو آپ

صاف کہہ دیں کہ دیکھو بیگم' یا زیور رکھنا ہو گا یا شوہر کے ساتھ رہنا ہو گا دونوں چیزیں ممکن نہیں' اگر آپ سے یہ ہونا ممکن نہیں تو آپ اقربانوازی کا کلچر تبدیل نہیں کرسکتے۔

حضورِ والا! اگر آپ اور آپ کے رفقاء حضرت عمر فاروقؓ کی طرح یہ نہیں کر سکتے' کہ وصیت کر دیں کہ میرے بعد ساری دنیا امیرالمومنین بن سکتی ہے میرا بیٹا عبداللہ نہیں ہو سکتا' تو پھر آپ سیاست میں خاندانی اجارہ داری کا نظام نہیں توڑ سکتے۔

"نظام بدلو" کا راگ الاپنا آسان ہے اس آگ میں کودنا پھولوں کی آغوش میں پلنے والوں کے بس میں نہیں' مکمل اور جامع انقلاب نہ سہی دوسرے درجے میں بھی جہاں انقلاب آیا ہے' تو اس کے بانیوں نے بڑے عزم اور کردار کا مظاہرہ کیا ہے؟

لینن دورانِ حکومت نرم و نازک گدوں پر نہیں دفتر کی ٹیبل پر برسوں تک سوتا رہا' کام سے فارغ ہوا اور وہیں سو گیا۔

ماؤزے تنگ نے بتیس برس تک ایک ہی کوٹ زیرِ استعمال رکھا جو آج بھی میوزیم میں موجود ہے' خمینی کا قم میں کچا گھر آج بھی اسی حالت میں ہے' اس کے علاوہ ان کی کوئی جائیداد دستیاب نہیں ہو سکی۔

آپ کہتے ہیں نظام بدلنا چاہئے' ہم بھی کہتے ہیں نظام بدلنا چاہئے' تو پھر رکاوٹ کیا ہے؟ آپ کے نزدیک فنی اور قانونی رکاوٹیں ہوں گی' ہمارے نزدیک شخصی اور ذاتی رکاوٹیں ہیں' آپ کہتے ہیں آئین بدلنا چاہئے' قانون بدلنا چاہئے' افسر بدل دینا چاہئے' رُولز آف بزنس بدلنے چاہئیں' ہم کہتے ہیں یہ سب بدل جائیں گے' بس آپ خود بدل جائیے' پھر سب کچھ نہ بدلا تو جو سزا کالے چور کی' وہی سزا ہماری' آپ دل کی آرزو نہیں بدل رہے تو افسر اور عوام اپنی خو کیسے بدلیں گے؟

بدلنا ہے تو مے بدلو' نظامِ میکشی بدلو
وگرنہ جام و پیمانہ بدل جانے سے کیا ہو گا؟

(9 اپریل 1999ء)

"ضروریات اور فضولیات"

پندرہ کھرب روپے کے قرض میں ڈوبے ہوئے ملک کے حکمرانوں کی ضروریات اور فضولیات کا فرق سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہئے اور نہ یہ طے کرنے میں مزید غفلت کرنی چاہئے کہ ایک مقروض ملک کی ترجیحات کیا ہوتی ہیں؟

یہ مبالغہ نہیں واقعہ ہے کہ بیرونی سرمایہ کاری نابود' زرِ مبادلہ مفقود اور مقامی کاروبار پر جمود ہے' اگر ہمت کی پستی اور طبیعت کی خرمستی آڑے نہ آئے' نیز نیت بھی درست ہو تو قرض ادا ہو سکتا اور مرض شفا پا سکتا ہے' اس مسئلے کے حل کے لئے باہر سے مہنگے ایکسپرٹ منگوانے اور سقراطی و بقراطی فارمولے بنانے کی نہیں' سادہ سا اصول اپنانے کی ضرورت ہے اور وہ ہے۔

------ آمد و خرچ میں توازن ---- "ضروریات و فضولیات میں فرق" اب بھی اللہ کا بہت بڑا کرم ہے کہ پاکستان ۱۹۴۵ء کے جاپان جیسا نہیں جو کھنڈر بن چکا تھا' وہ سوڈان کی حالت کو بھی نہیں پہنچا جو چند سال پہلے فلاکت کا شکار تھا' پاکستان کوئی الگ تھلگ ملک بھی نہیں جو کسی راہداری کا محتاج ہو بحمد اللہ پاکستان کو بری بحری اور ہوائی تمام راستے دستیاب ہیں۔ رہ گئیں قدرت کی کرم نوازیاں' وہ بھی بے حد و حساب ہیں' تمام غذائی اجناس' جملہ موسمی پھول' اور پھل اور ہر طرح کی سبزیاں' یہاں وافر مقدار میں اُگتی ہیں' ریت' پتھر' سیمنٹ کی یہاں قلت نہیں' کپاس' لکڑی' اور چمڑے کا کوئی مسئلہ نہیں' چینی' دودھ اور گوشت کا پرابلم نہیں' ان سب نعمتوں کے باوجود ہم معاشی مشکلوں میں گھرے ہوئے ہیں' اور اس کا سبب حوصلے کا فقدان اور عزم کا بحران ہے' اگر حکومت چاہے تو صرف ایک جرأت مند فیصلے سے میرے اندازے کے مطابق سال بھر میں ڈھائی تین کھرب روپیہ بچایا جا سکتا ہے' اور وہ ہے غیر ضروری اشیاء کی امپورٹ کی بندش کا فیصلہ' اور یہ بڑا جوہری اور بنیادی فیصلہ ہے' دوائیں ضرور منگوائی جائیں' ضرورت ہو تو گندم کی درآمد ہو سکتی ہے' اور دفاع کے لئے اسلحہ بھی ہماری مجبوری ہے' لیکن فضولیات کی درآمد کس لئے ضروری ہے؟ اگر ہم پانچ سال کے لئے یہ طے کر لیں اور ہمارا سرکاری لذت گزیدہ اور عیش زدہ طبقہ کڑوا

Marfat.com

گھونٹ بھر لے تو قوم قرضوں کی لعنت سے نجات پا سکتی ہے' اگر چند سالوں کے لئے ماربل' ٹائلز' اور ساگوان کی لکڑی باہر سے نہ منگوائیں اور بدمست اور آرام پرست لوگوں کے بنگلے اور محل نہ بنیں تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی؟

اگر پان' پرفیوم' گھڑیاں' ٹائیاں' جرابیں' بریف کیس' پرس' کٹلری' چشموں اور تصویروں کے فریم درآمد نہ کئے جائیں' تو کون سی موت واقع ہو جائے گی؟

اگر ڈنر سیٹ' گاڑیاں' قلم' نوادرات' اور آرائشی پھول باہر سے آنے بند ہو جائیں' تو کون سی آفت کھڑی ہو جائے گی؟ اگر دس ارب روپے کے انناس جیم' جیلی' اور ٹن پیک جوس کچھ عرصے کے لئے نہ ملیں تو کون سی ہنگامی حالت پیدا ہو جائے گی؟ ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جو ناگزیر ہو۔

جس ملک کی آدھی آبادی بھی بجلی جیسی ضرورت سے محروم ہو' صاف پانی جیسی خدائی نعمت سے محروم ہو' اور تعلیم اور صحت جیسی رحمت سے محروم ہو' وہاں ان فضولیات کی درآمد عوام کے لئے اذیت سے کم نہیں' جس ملک کی سڑکیں سفر کے قابل نہ ہوں' جس کے شہر گندگی اور دھوئیں کا ڈپو ہوں' جس کا ریلوے ٹریک پچاس برسوں میں ڈبل نہ ہو سکا ہو' اور جس کے پاس نئے ہسپتال اور سکول بنانے کے وسائل نہ ہوں' وہاں ان خرافات پر زرِ مبادلہ لٹانا عوام کو لوٹنے کے برابر ہے' جس ملک کے کروڑوں عوام اب بھی کچے مکانوں اور گھاس پھونس کے چھپروں میں رہتے ہوں' لاکھوں بچے ورکشاپوں' ہوٹلوں اور فیکٹریوں میں اپنا معصوم بچپن قربان کرتے اپنے ناآسودہ ارمان گروی رکھتے ہوں وہاں اربوں روپے تعیشات پر اڑانا مجرمانہ حرکت کے مترادف ہے۔

ایک طرف کروڑوں لوگوں کے لئے مکان کا کرایہ' بجلی کا بل' بچوں کا دودھ' بیٹیوں کا جہیز' روٹی ہانڈی کا خرچہ' اور تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اور دوسری طرف سابق اور موجودہ حکمرانوں کے لئے زرِ مبادلہ کا بے دریغ صرفہ ایک مشغلہ بنا ہوا ہے' جب تک یہ مشاغل رہیں گے معاشی مسائل بھی رہیں گے' ان خرافات اور موجودہ معاشی حالات کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں۔

(12 اکتوبر 1999ء)

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ--------

جب سے امریکہ نے اسامہ بن لادن کو ختم کرنے کے لئے خوست اور خرطوم پر حملہ کیا ہے وہ لمحہ اور آج کی ساعت ایک دنیا زلزلہ براندم ہے' ارتعاش کی لہریں وسیع ہوتی اور اضطراب کی لکیریں پھیلتی جا رہی ہیں' اور ہر طلوع ہونے والا دن امریکہ کے لئے نفرت اور ہر غروب ہونے والی شام اس کے لئے حقارت کا پیغام لئے ہوئے ہے' امریکہ جسے اپنے علم' اپنی دانش' اپنے تجزیے اور اپنی معلومات پر ناز ہے' یہ کیوں بھول رہا ہے' کہ تاریخ کے کسی بھی دور میں جس نے بھی کسی کی گردن جھکانے پر زور دیا' دل اسی قدر بغاوت پر آمادہ ہوتے چلے گئے' زر' زور اور مکر سے نہ کبھی کوئی "فاتح عالم" بنا ہے اور نہ کوئی اس طریقے سے فتح ہوا ہے' کسی کو مغلوب کرنے کی خواہش دراصل خود کو مغضوب بنانے کی روش ہوتی ہے' اگر ایسا ہوتا تو آج فرعون اپنے اقتدار کے سبب نیک نام ہوتا' قارون اپنی بے تحاشا دولت کے باعث عزیز جہاں ہوتا' یزید اپنی حیلہ جوئی کی وجہ سے ہیرو ہوتا' لیکن ایسا نہیں ہوا' اس لئے کہ یہ لوگ عمر بھر دوسروں کی گردنیں ناپتے پھرے اور آج تک ان کی روحیں جہنم میں ہانپتی پھر رہی ہیں۔

وہ بندے مٹ گئے' نازک بہت اندام تھے جن کے
گلاب و مشک میں گوندھے ہوئے اجسام تھے جن کے
بہت بے آبرو ہو کر اٹھے دنیا کی محفل سے
زمانے میں بہت اعزاز اور اکرام تھے جن کے
کہیں بھولے سے کوئی نام اب لیتا نہیں ان کا
زبان خلق پر اذکار صبح و شام تھے جن کے

امریکہ اس سے پہلے ویت نام میں ایک تلخ تجربے سے دوچار ہو چکا ہے' روس اسی طرح کا ایک کڑوا پھل افغانستان میں چکھ چکا ہے' امریکہ نے کچھ عرصہ پہلے قذافی پر حملہ کیا' عراق کو بھی نشانۂ ستم بنا چکا ہے' کیا ان حملوں سے ان کی عزت میں اضافہ ہوا ہے؟ دو اور پہلو بھی ضمیر انسان

کے لئے لائق توجہ ہیں' پہلا یہ کہ اس طرح کے اقدامات قبائل کے دورِ وحشت اور قرون وسطیٰ کے عہد ظلمت میں ہوتے تو چنداں تعجب خیز نہیں تھے' کہ ان زمانوں میں نہ تو بنیادی حقوق کا کوئی واضح تصور تھا' نہ بین الاقوامی ادارے تھے' نہ باضابطہ آئینی دستاویز تھیں' نہ اقتدارِ اعلیٰ کے بارے میں ذہن واضح تھے' نہ سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے سوسائٹی میں بالغ نظری موجود تھی' اور طاقت ہی کو حق کا درجہ حاصل تھا' مگر آج تو دنیا صدیوں کا سفر کر کے اس موڑ پر آگئی ہے' جہاں انسان اس شعور سے بہرہ ور ہو چکا ہے کہ آزادی انسان کا بنیادی حق ہے جس کا احترام ہونا چاہئے' بنیادی حقوق کا چارٹر مرتب ہو چکا ہے' اقوام متحدہ جیسے عالمی ادارے قائم ہو چکے ہیں' جنگ کے میدان کی جگہ مذاکرات کا کمرہ لے چکا ہے' ڈپلومیسی دنیا بھر میں معروف اور مقبول ہو چکی ہے' عقل و خرد کے غلبے کی فضا ہے' امن عالمی نعرہ بن چکا ہے' ہر مسئلہ کا حل لفظ و حرف کے ذریعے ممکن ہے' اور ہر ملک کی سرحدیں متعین ہو چکی ہیں' مگر اس کے باوجود امریکہ ایک سے زائد بار عہد بربریت کو تازہ کر چکا ہے' آخر اس ذہنی فکری' سماجی' سیاسی' تہذیبی' علمی' فنی' اور تکنیکی ترقی کا حاصل کیا نکلا؟ اگر آج بھی جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول کار فرما ہو تو دستورِ شاہی کو نظام جمہور میں بدلنے کی افادیت کیا ہوئی؟ اگر آج بھی "ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات" کا کلیہ بر سر عمل ہے تو عالمی و اجتماعی ادارے اپنے وجود کا احساس کب دلائیں گے؟ اگر ہر طاقتور جب چاہے کسی ملک کی سرحدیں عبور کر لے تو اقوام متحدہ میں ہر ملک کے لئے الگ الگ نشستیں کیوں مختص کی گئی ہیں؟ اگر ہر سپر پاور اپنے فیصلے اپنی مرضی سے کرنے لگے تو دوسروں سے قرار دادوں پر انگوٹھا لگوانے کا بے کار عمل کیوں جاری ہے؟ اگر مدعی ہی وکیل اور منصف بن بیٹھے تو عالمی عدالت سجانے کا کیا مقصد ہے؟ یہ حرکتیں دیکھ کر انسان اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ناحق خون دے کر جمہوری فضا پروان چڑھائی' بلاوجہ دماغ جلا کر دستور مرتب کئے' بے فائدہ اعصاب پر زور دے کر حقوق انسانی کی تحریکیں چلائیں اور بے حاصل کسی ملک کے اقتدارِ اعلیٰ کو برتر اور مقدس بنانے پر محنت صرف کی' جب صدیوں کی کاوش پر ایک ہی یورش نے غالب آنا تھا تو اتنا کٹھن سفر کرنے اور اس قدر لمبا موڑ کاٹنے کی کیا ضرورت تھی؟ طاقت کا اصول تو پہلے بھی کار فرما تھا اب بھی یہی کچھ ہو رہا ہے تو صدیوں کی مشق کا کیا حاصل؟

دوسرا پہلو عالمی ضمیر سے تعلق رکھتا ہے کہ اگر دنیا نے ہر طاقتور کا ساتھ دینا ہے' ہر ظلم کے آگے زاری کرنی ہے اور قتل کے ہر محضر نامے پر دستخط کرنے ہیں' تو پھر کاہے کے ملک کہاں کی

Marfat.com

آزادی اور کیسا اقتدارِ اعلیٰ؟ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ایسے مواقع پر بیچارے عوام تو چیخ اٹھتے ہیں مگر حکمران بھیڑ بن کر ڈھیر ہو جاتے ہیں' بے مغز لفظوں کا ملغوبہ ایک بیان کی شکل میں آجاتا ہے اور بس! کیا ایک سو اسی ممالک پر امریکہ بھاری ہے؟ کیا امریکہ کی پچیس کروڑ آبادی دنیا کی باقی پانچ ارب آبادی سے زیادہ طاقتور ہے؟ کیا امریکی خزانہ دنیا بھر کے خزانوں سے زیادہ وسیع ہے؟ کیا ایک جنس زدہ امریکی صدر پونے دو سو ممالک کے سربراہوں سے زیادہ روشن دماغ' اور ہوش مند ہے؟ بجا کہ ہمارے حکمرانوں کو اپنی زندگی بہت پیاری ہے۔ اپنی حکومت بہت عزیز ہے' اپنے مفادات بہت اہم ہیں مگر آبرو کی بھی میزان حیات میں کوئی قیمت ہے کہ نہیں؟

زندگی اتنی غنیمت تو نہیں جس کے لئے
عہد کم ظرف کی ہر بات گوارا کر لیں

بہرحال اُسامہ ایک عہد کی علامت بن چکا ہے' امریکہ خواہ مخواہ ایک سائے کے تعاقب میں ہے' اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا' دنیا کی عزت اسی طرح کی ایک علامت ہوتی ہے' وہ طارق بن زیادؒ ہو' محمد بن قاسم ہو صلاح الدین ایوبیؒ ہو' نور الدین زنگیؒ ہو سراج الدولہؒ ہو' سلطان ٹیپوؒ' یا اُسامہ بن لادن۔

سبھی نام ہیں ایک ہی شخص کے سبھی پھول ہیں ایک ہی ڈال کے

(31 اگست 1998ء)

"کروڑ پتی"

دنیا کی تاریخ کھنگال ڈالیے' قوموں کے عروج و زوال کی داستان پڑھ لیجئے' ہر پیغمبر اور مصلح کی تعلیمات سامنے لے آیئے اور ہر سچے اور مخلص ماہر معاشیات کی تفصیلی آراء نظر سے گزار جایئے دو باتوں کے بارے میں کامل اتفاق رائے اور اجماع فکر ملے گا کہ جوئے کے باعث فرد------ حرکت----- سے اور سودی معیشت کے سبب قوم--- برکت---- سے محروم ہو جاتی ہے' جوئے سے فرد------ ذہنی اختلال---- اور سود سے قومی معیشت------ اضمحلال------ میں مبتلا رہتی ہے۔

حضرت آدمؑ سے لے کر رسول خاتمؐ تک کسی نبی اور اُن پر اترنے والے کسی صحیفے میں سود اور جوئے کا کوئی جواز نہیں ملتا' خواہ اس کی کوئی بھی شکل ہو' اور اسی طرح مہاتمابدھ' کنفیوشس' مانی' زرتشت' تاؤ' مہاویر' سقراط' جیسے کسی بھی مصلح نے سود اور جوئے کے حق میں بات نہیں کی' ابن خلدون سے ٹائن بی تک کوئی بھی ماہر عمرانیات سود کو قوم اور جوئے کو فرد کے لئے مفید نہیں بتاتا' بلکہ اقبالؒ نے تو ایک جگہ دونوں عظیم جنگوں کا سبب اور محرک سود کو بتایا ہے۔

یوں تو ایک عرصے سے پاکستان میں سود' جوا' سٹہ چل رہا ہے' لیکن جب سے پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کیا ہے' اور قدرے معاشی بحران کا شکار ہوا ہے' اس دن سے حکومت نے معاشی بحران اور غیر ملکی اقتصادی پابندیوں کا حل اور توڑ یہ ڈھونڈھا ہے کہ تھوک کے حساب سے "کروڑ پتی سکیموں" کا اعلان اور اجراء کر دیا ہے' حکومت کی دیکھا دیکھی بہت سی پرائیویٹ کمپنیوں حتیٰ کہ بعض ڈیلی اخبارات نے بھی ان سکیموں کو شروع کر دیا' اس طرح ملک کا باقی کاروبار تو مندا ہے البتہ کروڑ پتی سکیمیں پھل پھول اور ہر گلی محلے میں پھیل رہی ہیں' ان سکیموں سے حکومت کو کیا بچت ہو گی؟ ملک کو معاشی دباؤ اور بحران سے نکلنے میں کتنی مدد ملے گی؟ بیرونی قرضے اتارنے میں کتنی سہولت حاصل ہو گی؟ اور یہی سکیمیں مستقبل میں کس طرح حکومت کے گلے پڑیں گی؟ یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا' ہم صرف یہ جانتے ہی کہ قومیں "بے زری" سے نہیں "بے صبری" سے

Marfat.com

مرتی ہیں' فرمودۂ اقبالؒ بھی یہی ہے۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

کروڑ پتی سکیمیں بھوک مٹانے کا نہیں الٹا معاشی بھوک بڑھانے اور ہوس بھڑکانے کا ذریعہ بنیں گی' جس طرح اقبالؒ نے کہا ہے کہ بندۂ مومن کے زوال کا سبب بے زری نہیں بلکہ اس کا اصل باعث کچھ اور ہے جس کو مومن خود سمجھتا ہے' اسی طرح قرض چڑھنے کا سبب ملکی وسائل کی کمی یا بے تحاشا مسائل نہیں بلکہ ان کا باعث کچھ اور ہے جسے حکمران خوب سمجھتے ہیں' اور نہ ہی قرض اتارنے اور معاشی بوجھ کم کرنے کا ذریعہ ایسی ہوس آمیز اور ہیجان انگیز سکیمیں ہیں بلکہ خوشحالی لانے اور بچت بڑھانے کے اور طریقے ہیں جنہیں حکمران جانتے ہیں مگر وہ اختیار نہیں کرنا چاہتے' جوئے کے لئے قرآن مجید میں "میسرہ" عام تھا' جو تیروں کے ذریعے کھیلا جاتا تھا' بہ آسانی مال ہاتھ آجانے کے بظاہر کچھ فوائد بھی ہوتے ہیں' لیکن قرآن حکیم اس جوئے کے نفع کے مقابلے میں اس کے گناہ کو زیادہ شدید قرار دیتا ہے۔ واثمھما اکبر من نفعھما "اور ان دونوں شراب اور جوئے گناہ ان کے نفع سے زیادہ ہے۔" (البقرہ:۲۱۹)

بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے' دولت اگر مل جائے تو اپنے اندر بہت کشش رکھتی ہے لیکن اس سے جو انسانی نفسیات پر منفی اور مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ فوائد سے برعکس زیادہ نقصان دہ ہیں' اس سے انسان پر کسل مندی' سستی اور اضمحلال کا غلبہ ہو جاتا ہے' انسان سے قوتِ عمل سلب ہو جاتی ہے' حرص کی ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور مفت خوری کی عادت پڑ جاتی ہے' یہ عادت فرد میں ہو تو گھر اور قوم میں ہو تو ملک بری طرح متاثر ہوتا ہے۔

عہد رواں میں قومیں جن مشکلات کا شکار ہیں اور معاشی مسائل میں گرفتار ہیں' ان کا ایک بڑا سبب عالمی سطح پر ایک ایسے اقتصادی نظام کا غلبہ و تسلط ہے جس کا جزو اعظم --- سود اور جوا---- ہے' قرضوں کی معیشت ہے تو اسی باعث' ناقابل برداشت قسطوں کا نظام ہے تو اسی باعث اجارہ داری کا رجحان ہے تو اسی باعث' چور بازاری ہے تو اسی باعث' سیاسی تعلقات میں کشیدگی ہے تو اسی باعث' بنیادی انسانی ضروریات کی فراہمی مشکل تر ہو رہی ہے' تو اسی باعث سرمایہ دارانہ نظام کی سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ انسانوں میں دو طرح کے طبقات جنم دیتا ہے۔ اور دونوں طبقات کو ایک ایسی حالت میں قائم رکھتا ہے جس سے یہ نظام چلتا رہے اور یہ دو طبقات جان توڑ محنت کر کے

Marfat.com

کمانے والے اور دوسروں کی محنت پر عیش اُڑانے والے لوگوں پر مشتمل ہیں' سود اور جوئے میں محنت شامل نہیں ہوتی اور پیسہ محنت کے ذریعے نہیں پیسے کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔

ہمارا ملک جن دیدہ و نادیدہ معاشی مصائب میں گرفتار ہے ان سے نکلنے کے لئے سود اور جوا نہیں دیگر دو عوامل اور ذرائع درکار ہیں' ایک محنت اور دوسری بچت

کروڑ پتی سکیمیں اصول محنت کے منافی بلکہ محنت کو بے وقعت بنانے کی سازش ہیں اور حکمرانوں کا اندازِ زیست اصول بچت کے خلاف ہے' اگر کوئی قوم اقتصادی گرداب میں پھنس جائے تو عوام پر محنت اور حکمرانوں پر بچت لازم ہو جاتی ہے۔ کیا جاپان ہم سے زیادہ بڑے سانحے سے نہیں گذرا' کیا جرمنی کی اینٹ سے اینٹ نہیں بجی؟ کیا ترکی مردِ بیمار نہیں کہلاتا رہا؟ کیا لیبیا عالمی طاقتوں اور استعماری سازشوں کے حصار میں جکڑا ہوا نہیں؟ کیا سوڈان ابتری کے آخری نقطے تک نہیں پہنچا؟ یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن نکلنے کا راستہ وہ نہیں جو پاکستانیوں کو دکھایا جا رہا ہے' پیسے کی ہوس بڑھانے سے دولت نہیں بڑھتی بلکہ لوگوں کی عادت بگڑتی ہے' ریلوے کو فالتو اور سفارشی ملازمین کے بوجھ سے نکالا جائے' واپڈا کو لاکھوں روپے کے بھتے پر پلنے والے سفید ہاتھوں سے بچایا جائے ملکی خزانے کو بے جا کرم بخشیوں سے محفوظ کیا جائے' ایک ہزار بنک نادہندگان کو کسی چوک میں لٹکایا جائے' جب تک ملکی معیشت نہ سدھر جائے ہر غیر ضروری چیز کی درآمد پر تالا لگایا جائے' چمکتے دمکتے سرکاری ایوانوں کا رنگ و نور کچھ وقت تک کے لئے کجلایا اور بجھایا جائے' پھر کروڑ پتی سکیموں کی ضرورت پیش نہیں آئے گی' حکمران بچت کرلیں عوام خود بخود محنت کریں گے۔

ایسی سکیموں کے معاشی نقصانات تو جو ہیں سو ہیں معاشرتی و سماجی مضرات کا شائد حکمرانوں کو اندازہ نہیں جس قوم کا "پیر" پیسہ بن جائے' اس کے خون میں "سفیدی" آنکھوں میں "ندیدہ پن" رگوں میں "بے غیرتی" دل میں "ویرانی" روح میں "یخ بستگی" اور جذبات میں "اوس" کی مقدار بہت بڑھ جاتی ہے' کیا یہ نقصانات سطحی معاشی فوائد سے زیادہ نہیں؟

(13 جنوری 1999ء)

"رائے عامہ"

اگرچہ یہ حقیقت ہے اور ثابت شدہ حقیقت ہے کہ "الناس علٰی دین ملوکھم" یعنی عوام حکمرانوں کے پیروکار ہوتے ہیں، حکمران جو رنگ اختیار کریں عوام خود کو اسی میں رنگتے چلے جاتے ہیں، حکمران جو ڈھنگ اپنائیں عوام بھی اسے اپنا لیتے ہیں، حکمرانوں کا جو مزاج ہو عوام کا بھی وہی مزاج بن جاتا ہے، اور حکمران جس فیشن کے ہوں عوام کا بھی وہی فیشن ہوتا ہے، حکمران اگر نڈر اور جرأت مند ہوں تو عوام بھی بے باک اور بے خوف ہوتے ہیں، حکمران اگر بزدل اور کم ہمت ہوں تو عوام بھی مصلحت کیش اور عافیت کوش بن جاتے ہیں حکمران اگر اصول پسند اور ضابطہ پرست ہوں تو عوام بھی قانون اور قاعدے کا احترام کرتے ہیں، حکمران اگر سادگی کو شعار بنالیں تو عوام بھی اپنا طرزِ عمل سادہ بنالیتے ہیں، حکمران اگر شاہ خرچ ہوں تو عوام بھی اسراف پر آجاتے ہیں، حکمران اگر سنجیدہ ہوں تو عوام میں بھی ٹھہراؤ آجاتا ہے اور اگر حکمران نمائش کے دلدادہ ہوں تو عوام ان سے پہلے آرائش و آسائش پر فریفتہ دکھائی دیتے ہیں، یہ حقیقت اپنی جگہ درست مگر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ حکمران عوام ہی سے اٹھتے اور ان پر مسلط ہوتے ہیں، آج جو سیاسی لیڈر ہیں اور کل جو حکمران بنتے ہیں، عوام کے ووٹوں سے بنتے ہیں اور عوام کی پسند کے نتیجے میں آتے ہیں، کوئی شخص عوام کی خواہش کے بغیر تو لیڈر نہیں بن جاتا، عوام کندھا پیش کرتے ہیں تبھی تو کوئی ان پر سوار ہوتا ہے، عوام اپنی پیٹھ جھکاتے ہیں تبھی تو کوئی ان پر کاٹھی ڈالتا ہے، عوام کان دیتے ہیں تبھی تو کوئی ان میں سے کچی پکی باتیں ڈالتا ہے، عوام آنکھیں بچھاتے ہیں تبھی تو کوئی منظورِ نظر بنتا ہے، عوام سٹیج بناتے ہیں تبھی تو کوئی ڈرامہ کرتا ہے، عوام نعرے لگاتے ہیں، تبھی تو کوئی غبارے کی طرح پھولتا ہے، عوام گلا پھاڑتے ہیں تبھی تو کوئی "زندہ باد" ہوتا ہے اور عوام مہر لگاتے ہیں تبھی تو کسی کی صندوقچی بھرتی ہے، آج اگر پاکستان مقروض ہے، غریب ہے، بدحال ہے اور اس کا ہر شعبہ آمادۂ زوال ہے اور اگر کہا جائے کہ اس صورتحال کے ذمہ دار حکمران ہیں تو یہ پورا نہیں آدھا سچ ہوگا۔ اگر تو امریکہ اپنی فوجیں لے کر پاکستان میں گھس آئے اور اپنی مرضی کی حکومت زور آور

قوت کی بنیاد پر قائم کردے پھر تو یہ پورا سچ ہو گا کہ بگاڑ کے ذمہ دار حکمران ہیں جیسا کہ ایک عرصہ یہاں برطانوی اقتدار رہا لیکن اگر ہر دو چار سال بعد لوگوں کو حکمرانوں کے انتخاب کا حق اور موقع ملتا رہے اور وہ ہر بار ایسے حکمران منتخب کریں جو جابر بھی ہوں اور مکار بھی' جو غاصب بھی ہوں اور عیار بھی' تو اس عمل میں عوام خود کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے' گویا یہ وہ طوق ہے جو چوم کر گلے میں ڈالا گیا' اور یہ وہ زنجیر ہے جسے خود مانجھ کر اپنے پاؤں کی زینت بنایا گیا' آواز دے کر مسلط کی گئی بیماری کا علاج جالینوس نہ ڈھونڈھ سکا تو اب کون دریافت کر سکے گا؟

آج عوام خود کو رشوت' سفارش' اقربا پروری' کرپشن' مہنگائی' ناانصافی' ظلم اور بے روز گاری کی دلدل میں دھنسا ہوا محسوس کرتے ہیں' اور کوئی طبقہ ایسا نہیں جو تنگ اور مایوس نہ ہو لیکن سوال یہ ہے کہ کل کے حکمران ہوں یا آج کے' کیا یہ سلیمانی ٹوپی پہن کر عوام سے ووٹ اور حمائیت لینے آئے تھے؟ جس کے باعث لوگ انہیں پہچان نہ سکے' کیا ایم کیو ایم نیا دھڑا ہے؟ جو پہلی بار سامنے آیا' کیا پیپلز پارٹی کوئی نئی جماعت ہے جس سے عوام پہلے آشنا نہ ہوں؟ کیا مسلم لیگ الیکشن سے چند روز پہلے تشکیل ہوئی تھی جس کا تجربہ عوام کو قبل ازیں نہیں تھا؟ کیا ولی خاں اور بگٹی نئے چہرے ہیں؟ کیا مینگل اور مگسی عوام نے پہلی بار دیکھے ہیں؟ کیا چٹھے اور چیمے راتوں رات اُگے اور برگ و بار لائے ہیں؟ کیا جتوئی اور مزاری ہر الیکشن سے چند روز پہلے کہیں سے ہجرت کر کے پاکستان میں منتقل ہوتے ہیں کہ عوام کو ان کے پہچاننے میں دقت ہوتی ہے؟ کیا سرمایہ دار اور جاگیردار اچانک کہیں سے رونما ہوتے' دفعتہ الیکشن لڑتے' آناً فاناً جیتتے اور یکدم اقتدار میں پہنچ جاتے ہیں جس سے عوام کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملتا؟ ان میں سے کوئی نیا نہیں ہوتا نہ پارٹی نہ لیڈر' دیکھے بھالے چہرے ہیں' آزمائے ہوئے کردار ہیں' کھنگالے ہوئے لوگ ہیں' اور جانچے پرکھے گروپ ہیں' اس کے باوجود ہر بار نیا لطیفہ اور شعبدہ ظہور پذیر ہو جائے تو اس کی ذمہ داری لیڈروں اور حکمرانوں پر کم اور عوام پر زیادہ عائد ہوتی ہے' ہم عوام بھولے بنتے تو ہیں لیکن بننے کے فن میں ایک نہ ایک آنچ کی کسر رہ جاتی ہے' ہر حلقے کے عوام کا یہ مشترکہ دُکھ اور گلہ ہے کہ ہمارے نمائندے پلٹ کر ہماری بات نہیں پوچھتے' سارے فنڈ ہڑپ کر جاتے ہیں' اپنے عزیزوں اور چمچوں کو نوازتے ہیں اور اپنا گھر بھرتے ہیں' لیکن ہر بار وہی چہرے یا ان کے خلیرے ممیرے ہم سے ووٹ بھی لے جاتے ہیں' آخر کیوں؟ اگر ہم کبھی کسی لیڈر یا ممبر سے ناراض بھی ہوتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ وہ نااہل ہے' بد دیانت ہے' جاہل ہے' یا بے بس ہے بلکہ اس لئے کہ اس نے ہمارا کوئی عزیز کسی محکمے میں بھرتی

نہیں کرایا ہوتا ہمیں کوئی ٹھیکہ لے کر نہیں دیا ہوتا اور ہمارے لئے کوئی پرمٹ منظور نہیں کررہا ہوتا' اگر ہم یعنی عوام کسی سے اس بنیاد پر نفرت کرنا شروع کردیں کہ اس نے خیانت کی ہے' بد عہدی کی ہے' حلقے سے بے وفائی کی ہے' ملکی وسائل سے اپنا دامن بھرا ہے' اور اپنے علاقے میں اپنے رشتے داروں کو کھل کھیلنے کا موقع دیا ہے تو پھر ایک چہرہ دوسری بار کسی محفل میں کبھی نظر نہ آتا کجا کہ وہ اسمبلی یا بلدیہ میں دکھائی دیتا۔

اگر عوام برادریوں کا خول بھی نہ توڑیں' اپنے حقیر مفادات سے دستکش بھی نہ ہوں' دھڑے پالنے کی سیاست سے گریزاں بھی نہ ہوں' نیک اور بد میں فرق کرنے کا تکلف بھی نہ کریں' دیانتدار اور خائن کو ایک باٹ تولنے کا مشغلہ بھی جاری رکھیں' اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اور ملک کے حالات میں خوشگوار اور پائیدار تبدیلی کی آرزو بھی اپنے سینے میں پالتے رہیں تو یہ ایسے ہی ہے جس طرح بادلوں کے بغیر بارش ہو جائے' امتحان دیئے بغیر فرسٹ ڈویژن آجائے' بیج بوئے بغیر فصل تیار ہو جائے' بنیاد اٹھائے بغیر محل تعمیر ہو جائے' روٹی کھائے بغیر بھوک مٹ جائے اور پانی پیئے بغیر پیاس بجھ جائے' اگر تو کسی دھرتی پر اور کسی بستی میں ایسا ہوتا ہے تو پھر پاکستان میں بھی یہ معجزہ ہو سکتا ہے ورنہ یہ خیال ہے جو محض ذہن تک رہے گا اور ایک خواب ہے جو فقط نیند میں نظر آئے گا' حکمران بناؤ اور بگاڑ کا بہت اہم ذریعہ سہی مگر رائے عامہ اس کا حقیقی سرچشمہ ہے' حکمران بجا طور پر آئینہ سہی مگر اس میں تصویر کس کی نظر آتی ہے؟ اسے ذرا دھیان سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

(19 اکتوبر 1998ء)

حاصل مطالعہ

یہ جُملہ آپ نے ضرور سنا یا پڑھا ہو گا "تنہائی سا بے ضرر اور کتاب سا مخلص دوست کوئی نہیں۔" اسے جتنی بار دہرائیں اس کی افادیت اور معنویت واضح سے واضح تر ہوتی چلی جاتی ہے' تنہائی انسان کو دروں بینی اور کتاب جہاں بینی کا موقع فراہم کرتی ہے' دوسروں لفظوں میں خلوت النفس کے مطالعہ اور کتاب' آفاق کے مشاہدے کا نام ہے' ذات کے مطالعے سے آدمی اپنے آپ کو دریافت کرتا اور کائنات کے مشاہدے سے وہ خدا کو پاتا ہے' تبھی تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی تخلیق پر غور اور لیل و نہار اور ارض و سماء پر فکر و تدبر کرنے کی بار بار تاکید کی ہے' معلوم نہیں انسانوں کی وہ کون سی قسم ہے جو دونوں خوبیوں سے محروم ہے پھر بھی وہ نوع انسانی میں شمار ہوتے ہیں' مراقبہ آدابِ خود آگاہی سکھاتا اور مشاہدہ اسرارِ شہنشاہی کھولتا ہے۔

کتاب علم میں اضافہ کرتی' غور و فکر کے دریچے کھولتی' زبان کو حسن بخشتی' اسلوب کو نکھارتی' لہجے کو سنوارتی' اظہار کو قرینہ سکھاتی' الفاظ میں جادو بھرتی اور ابلاغ کو تاثیر دیتی ہے' کتاب کے مطالعے کے بغیر گفتگو میں تنوع اور پیغام میں تیقن پیدا نہیں ہوتا' مطالعہ زبان کو خطیب اور قلم کو ادیب بنا دیتا ہے' مطالعے کی وسعت تکلم کو قدرت اور تلفظ کو ندرت عطا کرتی ہے' صاحب مطالعہ آدمی کی تقریر آبشار کا لطف دیتی اور اس کی تحریر تیغ آبدار کے جوہر دکھاتی ہے۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے گوشۂ فراغت میسر آیا ہو یا نہ 'کتاب سے رفاقت کبھی نہیں ٹوٹی' یہ الگ بات ہے کہ اب تک عالم نہیں بن پایا لیکن بحمد اللہ طالب علم ہمیشہ رہا ہوں' اسی طرح تقریر کا ڈھنگ تو میں نہیں سیکھ سکا تاہم لفظوں کی تاثیر کا ہمیشہ قائل رہا ہوں' اور تحریر کا ملکہ تو حاصل نہیں ہو سکا البتہ پڑھنے کا لپکا برسوں سے ہے۔

افسانے اور ڈرامے کو چھوڑ کر باقی تقریباً سبھی موضوعات سے ایک گونہ شغف ہے' شعرو ادب اور دینیات' فلسفہ اور نفسیات' تصوف اور سیاسیات' سوانح اور شخصیات ان سب سے رغبت ہے' مقصد مطالعہ برائے مطالعہ نہیں بلکہ کسب فیض رہا ہے اور سچ عرض کروں کہ میں کتاب کے

فیض سے کبھی محروم نہیں رہا، جب کچھ پڑھا تو کبھی خیالات کو رفعت ملی اور کبھی سوچ کو وسعت نصیب ہوئی، کبھی ذہن کو پختگی اور کبھی دماغ کو بلندی حاصل ہوئی، کبھی زاویہ نظر درست اور کبھی قبلہ فکر راست ہوا، الفاظ و حروف سے دل میں ہلچل بھی ہوئی اور آنکھوں میں جل تھل بھی، غنچہ تخیل چٹک اٹھا اور کبھی شعلہ عمل بھڑک اٹھا، کبھی احساسات کے آنگن میں چاند اُتر آیا اور کبھی جذبات کے افق پر سورج اُبھر آیا، کبھی اپنے ارد گرد رنگ و نور کے ہالے بھی دیکھے ہیں اور کبھی کیف و سرور کے چشمے بھی، البتہ ایک آرزو اب تک تشنہ چلی آرہی ہے کہ کاش کتاب کے ساتھ ساتھ کوئی "صاحب کتاب" سامنے آئے تاکہ جو کام الفاظ و حروف نہیں کرپاتے۔ "انسان کامل" وہ کردار ادا کرے کہ یہی عصر حاضر کی سب سے بڑی ضرورت اور عہد فردا کی مانگ ہے، مطالعہ کتاب سے کیا کچھ ملتا ہے، آیئے آپ بھی "باہر کے میخانے" کے مقابلے میں "دل کے پیمانے" میں ڈوب کر سراغ زندگی ڈھونڈیئے۔

ایک الہامی کتاب میں اللہ تعالیٰ سے منسوب ایک وجدان انگیز جملہ ملاحظہ فرمایئے

"میرے بندے نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا وہ مجھے پکارتا ہے تو مجھے اس کو رد کرتے ہوئے شرم آتی ہے مگر وہ میری نافرمانی کرتے ہوئے مجھ سے حیا محسوس نہیں کرتا۔"

امام ابو القاسم قشیریؒ نے اپنے رسالہ قشیریہ میں لکھا ہے "ایک شخص شیخ شبلیؒ کے پاس آیا اور کثیر العیال ہونے کی شکایت کی، آپ نے فرمایا ان افراد کو گھر سے نکال دو جن کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہیں۔"

شیخ ضیاء الدین سہروردیؒ نے اپنی کتاب "آداب المریدین" میں لوگوں کی اقسام بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔

"لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں ایک مانند غذا جن کے بغیر گذارا نہیں، دوسرے مثل دوا جو بوقت ضرورت کار آمد ہوتے ہیں اور تیسرے بیماری کی طرح جن سے بچنا لازم ہے۔"

شیخ ابوبکر ترمذیؒ مختلف طبقات کے بناؤ اور بگاڑ کا یوں جائزہ لیتے ہیں۔

"جب امراء بگڑ جاتے ہیں تو رعیت کی معاش بگڑ جاتی ہے، جب علماء بگڑیں تو شریعت کا طریق بگڑ جاتا ہے اور جب فقراء بگڑ جائیں تو لوگوں کے اطوار و اخلاق خراب ہو جاتے

Marfat.com

ہیں۔ امراء کا بگاڑ ظلم، علماء کا بگاڑ طمع اور فقراء کا بگاڑ ریاکاری سے ہے۔"

شیخ ابوبکر کلاباذیؒ نے "التعرف" میں اخلاص عمل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"خالص عمل وہ ہے جس کا فرشتے تک کو علم نہ ہو کہ لکھ سکے، شیطان کو بھی خبر نہ ہو کہ خراب کر سکے اور نہ ہی نفس کو پتہ چلے کہ اس پر فخر کر سکے۔"

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فتوح الغیب میں خلق حسن کی یوں تعریف بیان کی ہے۔

"جب تو خدا سے معاملہ کرے تو مخلوق آڑے نہ آئے اور جب تیرا واسطہ مخلوق سے پڑے تو درمیان میں نفس کو حائل نہ ہونے دے۔"

اہل زر کی نفسیات کا لینن نے کس خوبصورتی سے جائزہ لیا اور تجزیہ کیا ہے۔

"جب انقلاب کے بعد سرمایہ داروں کو پھانسی پر لٹکانے کا وقت آئے گا تو سرمایہ دار پھانسی کے رسوں کی تجارت پر منافع کمانے کے لئے ایک دوسرے سے مقابلہ شروع کر دیں گے۔"

احیاء العلوم میں امام غزالیؒ نے ایک حکمت آموز اور ایمان افروز بات لکھی ہے۔

"اگر ایک یہودی طبیب تجھے کہہ دے کہ فلاں غذا مضر ہے تو تُو فوراً اسے چھوڑ دیتا ہے اگر ایک بچہ تجھے بتائے کہ تیرے کپڑوں میں بچھو ہے تو تُو ہزار دلیل مانگتا ہے۔"

مطالعے کے دوران بعض حکیمانہ اقوال بھی نظر سے گزرتے ہیں جو ضخیم کتابوں پر بھاری اور طویل لیکچروں پر حاوی ہوتے ہیں، مثلاً "جمہوریت میں قابلیت کے مقابلے میں مقبولیت کو دیکھا جاتا ہے۔" اسی طرح جمہوریت کے حوالے سے ایک اور فکر انگیز قول۔

"جمہوریت وہ خوش فہمی ہے جس میں عوام مسلسل مبتلا رہے ہیں۔"

تاریخ اور سیاست کی بابت یہ جملہ بھی انتہائی قابل توجہ اور فکر آفریں ہے۔

"تاریخ ماضی کی سیاست اور سیاست حال کی تاریخ کا نام ہے۔"

یونانی مقنن سولن مثالی معاشرے کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"مثالی معاشرہ وہ ہے جہاں عوام حکام کے تابع اور حاکم قانون کے تابع ہوں۔"

مشہور مغربی فلاسفر ڈاکٹر راجرز بیکن کا یہ تاثر بھی پڑھ لیجئے، حقیقت کے کس قدر قریب ہے،

"فلسفہ کا تھوڑا علم انسان کو دہریہ بنا دیتا ہے جبکہ اس کی گہرائیوں میں اتر کر انسان مذہب پرست بن کر نکلتا ہے۔"

Marfat.com

آخر میں ابو الکلام آزادؔ کا ایک نثر پارہ پیش ہے جتنی بار پڑھیے اتنی بار لطف لیجئے۔

"بڑے بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور اسبابِ کار فراہم نہیں لیکن وقت کا عازم وفاتح اُٹھتا ہے اور کہتا ہے اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا' اگر سروسامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے تیار کر لوں گا' اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیئے' اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیئے' اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیئے' اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ' درختوں کو دوڑنا چاہیئے' وہ زمانے کا مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے چاکری کرائے وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے' وہ زمانے کے حکموں پر نہیں چلتا بلکہ زمانہ آتا ہے تاکہ اس کی جنبش لب کا انتظار کرے' وہ دنیا پر اس لئے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے جس سے دامن بھرلوں؟ بلکہ وہ یہ دیکھنے کے لئے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں ہے جس کو پورا کردوں۔ (تذکرہ ص ۲۴۸)

اور چلتے چلتے استاد نُوح ناروی کا ایک خوبصورت شعر آپ کی نذر ہے۔

ع
نسبت جو مجھے ہے تیرے کوچے کی زمیں سے
میں دفن کہیں ہوں مگر اٹھوں گا وہیں سے

(8 نومبر 1998ء)

Marfat.com

چشم بد دُور ---- یہ ہیں رہنمایانِ قوم؟

تحسین کے حقدار ہمارے سیاسی لیڈر بھی ہیں مگر دل کھول کر داد پاکستانی قوم کو دینی چاہیئے جس نے ایسے لیڈر بنائے اور نمائندگی کے لئے چنے ہیں، بجلی چور سیاستدانوں کی جو فہرست سینٹ میں پیش کی گئی ہے اور اخبارات کی زینت بنی ہے اُسے پڑھ کر لیڈروں کے مزاج اور قوم کے انتخاب پر انسان عش عش کر اُٹھتا ہے، کہ "رہنمایانِ قوم" میں ایک سے ایک بڑھ کر نادہندہ، بجلی چور، ڈیفالٹر، بدعنوان اور خائن ہے، مدت ہوئی مرحوم شورش کاشمیری نے ایک نظم موزوں کی تھی، اس کے کچھ اشعار پڑھ لیجئے، ممکن ہے اس میں وہ سب کچھ آجائے جو میں لکھنا چاہتا ہوں، نام تو کسی کا نہیں القاب سے سارا تعارف حاصل ہو جاتا ہے۔

کچھ ایرے ہیں کچھ غیرے ہیں
کچھ نتھو ہیں کچھ خیرے ہیں
کچھ جھوٹے ہیں، کچھ سچے ہیں
کچھ بڈھے ہیں کچھ بچے ہیں
کچھ گونگے ہیں کچھ بہرے ہیں
کچھ ہلکے ہیں کچھ گہرے ہیں
کچھ ململ ہیں کچھ لٹھے ہیں
کچھ چمچے ہیں کچھ چٹھے ہیں
کچھ تلیر اور بٹیرے ہیں
کچھ ڈاکو اور لٹیرے ہیں
کچھ دارا کچھ اسکندر ہیں
کچھ روٹی توڑ قلندر ہیں
کچھ ملی ہیں کچھ گھمن ہیں

Marfat.com

کچھ پھندنے ہیں کچھ پھمن ہیں
کچھ اپنی بات کے پکے ہیں
کچھ جیب تراش اچکے ہیں
کچھ ان میں ہر فن مولا ہیں
کچھ "رَولا" ہیں کچھ "غولا" ہیں
کچھ ان میں رنگ رنگیلے ہیں
کچھ خاصے چھیل چھبیلے ہیں
کچھ "تیری میری مرضی" ہیں
کچھ مصنوعی، کچھ فرضی ہیں
کچھ تاک دھنا دھن تاکے ہیں
کچھ اُلٹے سیدھے خاکے ہیں
کچھ بادہ خوار پرانے ہیں
کچھ کھڑ اور ٹوانے ہیں
کچھ چورا چوری کرتے ہیں
کچھ سینہ زوری کرتے ہیں
ہر چند بڑے ہشیار ہیں یہ
شہ زور ہیں یہ سردار ہیں یہ
اب قوم کی خاطر مرتے ہیں
اسلام کا بھی دم بھرتے ہیں

یہ نظم سیاسی ہے اور سیاستدانوں کے بارے میں ہے، یہ نظم کچھ شعلہ نواحواریوں اور ہمنوا درباریوں کو بہت توہین آمیز لگے گی لیکن جنہوں نے پوری قوم کی غیرت کا سودا کیا وہ کہاں کی تعظیم کے حقدار ٹھہرتے ہیں؟ سینٹ میں پیش کی جانے والی فہرست دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت نے خواجگی کی کلاہ ان کے سر پر رکھی ہے جو کچلے جانے کے قابل تھے، زمام کار ان ہاتھوں میں ہے جن میں ہتھکڑیاں سجتی تھیں، قیادت کے تمغے ان کے سینوں پر ہیں جن پر ہر داغ ملامت ہے، رہنمائی کی مالا ان گردنوں میں ہے جو ناپے جانے کے لائق تھیں، اور پیشوائی کی کرسی ان کے پاس ہے جنہیں

Marfat.com

رسوائی کی ٹکٹکی پر ہونا چاہئے تھا' ان حضرات کے ایک طرف نام و نسب ہیں اور دوسری جانب ان کے کرتب ہیں' دل سے ایک آہ اُٹھتی ہے کہ کاش یا تو ماؤں نے ہمیں جنم نہ دیا ہوتا یا یہ لوگ کسی اور خطے اور عہد میں "رہنمائی" فرماتے۔

جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

ایک بار پھر شورش مرحوم کا حاصل تجربہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں اس لئے کہ موضوع جس قدر پر شور ہے میرے قلم میں اتنا زور نہیں' شورش نے بھی اپنا حاصل تجربہ خوب نچوڑا مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ مخلوق کوئی اور مخلوق ہے جس کے لئے قلم کافی نہیں کچھ اور درکار ہے۔

یہ ہے مرے تجربے کا حاصل یہاں کوئی باوفا نہیں ہے
شریک بزم سخن کئی ہیں' مگر کوئی ہم نوا نہیں ہے
ہماری محنت نظام زر کے بتوں میں تقسیم ہو گئی ہے
ہم اس طرح جی رہے ہیں گویا کوئی ہمارا خدا نہیں ہے۔
اُٹھاؤ پرچم' بڑھاؤ گھوڑے' لگاؤ نعرے' چلاؤ خنجر
کہ ہم فقیروں کی آہ و زاری کو راہزنوں نے سنا نہیں ہے
ہماری اولاد کے مصائب تمہاری اولاد تک بھی پہنچیں
ہمارے ذیشان رہنماؤ' یہ آرزو ہے' دعا نہیں ہے
مقابلہ کی جو بات ٹھہری تو آؤ پھر فیصلہ ہی کر لیں
غریب لوگوں پہ ہنسنے والو' ہمارے دامن میں کیا نہیں ہے؟
غریب ماں باپ کے گھرانوں میں ہم نے بے شک جنم لیا ہے
یہی خطا ہے؟ مرے خداؤ؟ مگر یہ کوئی خطا نہیں ہے
تمہارے سینے میں دل تو ہو گا جو ہو سکے تو اسی سے پوچھو
کہ تم نے جو قوم سے کیا ہے تمہیں کہو ناروا نہیں ہے؟

جس ملک کے وفاقی وزیر' قومی اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر' صوبائی وزراء' پارلیمانی سیکرٹری' سٹینڈنگ کمیٹیوں کے چیئرمین' ایم این ایز اور ایم پی ایز بجلی چور ہوں' ان کا علاج "آسمانی بجلی" ہے زمینی قانون اور زمینی عدالت انہیں کیا سزا دے گی؟

(6 مئی 1999ء)

؎ جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

جو شخص چار حرف انگریزی کے بول یا لکھ سکتا ہے' جسے ٹائی کی گرہ درست باندھنا آجاتی ہے' جو آکسفورڈ اور کیمبرج میں ایک بار داخلہ لینے میں کامیاب ہو گیا ہو' جو لندن اور پیرس کو ایک نظر دیکھ آیا ہو' جو سر پر ہیٹ رکھنے کے فن سے آگاہ ہو اور جو ڈبل روٹی سے ناشتہ کرنے کو جدیدیت کی معراج سمجھتا ہو' وہ اسلام سے گریز اپنا حق اور اہل اسلام پر طعن توڑنا اپنے لئے واجب گردانتا ہے' اگرچہ یہ رویہ بے خبری اور بے بصری کی چغلی کھاتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان آج جس طرح علم و ادب سے بے نیاز' عقل و خرد سے بیگانہ' فن و ہنر سے گریزاں' سیاسی استحکام سے محروم' معاشی گرداب میں گرفتار' تحقیق و جستجو سے لاتعلق اور اجتہاد و ایجاد سے الرجک ہیں' یہ وجوہ گلہ گزاروں کو جواز اور طعنہ زنوں کو دلیل مہیا کرتی ہیں' ظاہر ہے جب زُلف ایاز میں خم نہیں ہو گا تو غزنوی میں تڑپ کیسے پیدا ہو گی؟ اور جب حسن شوخی کھو بیٹھے تو عشق میں گرمی کہاں سے آئے گی؟

جب حال ماضی سے ہم آہنگ نہ ہو' جب دعویٰ دلیل سے محروم ہو' اور جب عمل قول کی نفی کر رہا ہو تو اعتبار کون کرے گا اور ایمان کیسے لائے گا؟

اسی طرح یورپ بھی اسلام اور اہل اسلام پر مسلسل چڑھائی کئے ہوئے ہے' وہ سائنس کو اپنی خانہ زاد' علم کو اپنا لے پالک' فن کو زر خرید غلام دانش کو اپنی کنیز' طب کو اپنا دربان اور ادب کو حاشیہ بردار سمجھتا ہے' اور اسی طرح اسلام کو عہد ظلمہ کی یادگار' اور اہل اسلام کو بدو' وحشی' تاریک خیال' توہم پرست' جہل مرکب' تاریک راہوں کے مسافر اور غاروں کی مخلوق قرار دیتا ہے' اس کا یہ احساس فخر اس بناء پر ہے کہ فی الواقع مسلمان اس وقت سکتے کے عالم میں ہیں' ورنہ ہم ایسے نہیں تھے۔

؎ جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

یہ دن تو گردش دوراں کی غلط بخشیوں اور اہل اسلام کی تن آسانیوں نے دکھائے ہیں' ورنہ سورج ہم سے روشنی کی بھیک مانگتا تھا' ہمارے دم سے گلشن حیات میں بہار تھی' سمندر ہمارے

لئے پاتال تھے' دریا ہم سے پوچھ کر اپنا رخ متعین کرتے تھے' صحرا ہماری ایک جست کی لپیٹ میں تھے' ساحل ہمارے قدموں کی دھمک سے کانپتے تھے' کہکشاں ہماری گرد راہ سے ستارے چنتی تھی' ہمارے گھوڑوں کے سموں سے اٹھنے والے شرارے قوس قزح میں رنگ بھرتے تھے' ہماری تلواروں کی چمک کے سامنے بجلیوں کے کوندے ماند رہتے تھے' ہمارے قلم کی نوک تقدیر عالم رقم کرتی تھی' ہماری شوخی چشم پہاڑوں میں دراڑیں ڈال دیتی تھی' ہمارا اشارۂ ابرو تاج و تخت کے فیصلے کرتا تھا' ہماری جنبش لب کا تاریخ انتظار کرتی تھی' ہماری رِکاب کو آسمان جھک کر تھامتا تھا' زمین ہمارے قدموں میں لپٹتی جاتی تھی' مشرق و مغرب ہمارے محیط میں حباب تھے' قیصر و کسریٰ ہمارے باجگزار تھے' اور ہماری درازی قد سے فتنۂ محشر پناہ مانگتا تھا۔

ے
میں ماضی دا مہاراجہ ہم کہیں غیرتوں جیتی جنگ ہانمیں
ہر اک دی اکھ دا تارا ہم جڈاں کہیں دی خاص اُمنگ ہانمیں
جیں کوں مانگ اِچہ یار بجیندا ہا اولال سندوری رنگ ہانمیں
میکوں شاکر تروڑ نصیب گھتے نہ تے یار دے ہتھ دین ونگ ہانمیں

"جس وقت ہارون اور مامون یونان و ایران کے علوم و فنون کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر عربی میں منتقل کر رہے تھے اور یونانی فلسفہ پر ریسرچ ہو رہی تھی' اس وقت فرانس کا بادشاہ شارلیمان اور اُس کے لارڈز اپنے نام لکھنے کی مشق کر رہے تھے۔"

اوپر کے یہ الفاظ کسی مسجد کے خطیب' کسی دار العلوم کے مفتی' کسی مجلس کے واعظ' اور کسی مذہبی تنظیم کے کارکن کے نہیں یورپ کے نامور دانشور اور مصنف Flip.k.Hitte کے ہیں جو اُس نے اپنی مشہورِ عالم کتاب The History Of The Arabs میں کہے ہیں۔

آج یورپ کو اپنی دانش پر ناز ہے مگر تاریخ اس کی گواہ ہے کہ جب مسلمان فلسفے کو نیا رُخ' ادب کو نیا اسلوب' سائنس کو نئی جہت' زبان کو نیا لہجہ' طب کو نیا تجربہ' فن کو نیا قالب اور علم کو نیا افق دے رہے تھے' اس وقت یورپ ابھی اس مباحثے میں مصروف تھا کہ حضرت عیسیٰؑ پر اترنے والی روٹی خمیری تھی یا فطیری؟

ہمیں بدو کہنے والے بھول جاتے ہیں کہ تہذیب اور علم و فن کے وہ درجنوں مراکز ہمارے ہی تھے جو ملتان سے غرناطہ تک پھیلے ہوئے تھے' ایران میں نیشاپور' شیراز' ہمدان' اصفہان' طوس اور تبریز شعر و ادب کی آبیاری کر رہے تھے' بخارا' سمرقند' اور تاشقند' تفسیر و حدیث کے مراکز تھے'

Marfat.com

عراق میں بصرہ، کوفہ اور بغداد سے قرأت، فقہ اور تصوف کے سرچشمے پھوٹ رہے تھے، مصر میں قاہرہ اور اسکندریہ یونیورسٹیوں کی تعمیر میں مصروف تھے، قرطبہ، غرناطہ، طلیطلہ، طرابلس اور مراغہ کی لائبریریاں دنیا میں فلسفہ، طب، ہیئت اور الجبرا، بانٹ رہی تھیں۔

یہ سچ ہے کہ مسلمان اسلاف کی میراث سنبھال نہ سکے، جواہر علمی غیروں کے ہاتھ لگ گئے، روشن روایات بے عملی کے سبب خرافات میں بدل گئیں، زندگی بخش رویے لطیفے بن کر رہ گئے، وگرنہ آج بھی کھنڈر کھودے جائیں تو خزینے نکلیں گے، ملبہ ہٹایا جائے تو دفینہ برآمد ہوگا، مسلمان آج بھی عہد رفتہ کو آواز دے تو عظمت کے جلترنگ بج اٹھیں گے، دفتر ماضی کا ورق پلٹا جائے تو کہانی کے رنگ شوخ ہی ملیں گے، کیا کریں آسمان تو نامہربان ہو رہا ہے زمین کی گردش بھی ناموافق بن گئی ہے، غیروں کو ہمارے حال سے کیا غرض ہو سکتی ہے جب اپنے ہی اپنا ماضی کھدیڑنے اور اپنے نقوش حرمت کھرچنے پہ آجائیں تو رنگ مفصل بگڑنے میں کیا کسر رہ جاتی ہے؟

مصریوں کو ابال آیا اور "فرعون" کو اُچھال دیا کہ ہمارا "مورث اعلیٰ" یہ ہے، ترکوں کا ایک طبقہ "تہذیب چنگیز" کے احیاء کا نعرہ لے کر اٹھ کھڑا ہوا، لبنان کے نوجوانوں نے "ابوجہل اکیڈمی" بنا ڈالی، اور سندھ میں "راجہ داہر" کو ہیرو بنانے کی مہم شروع کردی گئی، ظاہر ہے جب مورث اعلیٰ فرعون ٹھہرے گا تو عدل رخصت ہوگا، جب چنگیز ماڈل بنے گا تو تہذیب منہ موڑ لے گی، جب ابوجہل کے نام پر اکیڈمی کھلے گی تو علم ہجرت کر جائے گا اور جب راجہ داہر ہیرو کے منصب پر فائز ہو گا تو راجاؤں جیسی عیاشی فروغ پا کر قناعت کی جگہ سنبھالے گی، جو قوم عدل، تہذیب، علم اور قناعت سے جان چھڑانے پہ آجائے اسے دنیا قہقہوں میں اڑانے، لطیفوں کا موضوع بنانے، اور مضحکہ خیز القاب دینے سے کیوں نہ گریز کرے گی؟

؎ ترا اے قیس کیوں کر ہو گیا سوزِ دروں ٹھنڈا

(13 اکتوبر 1998ء)

اکیسویں صدی کا چیلنج ------ دہشت گردی

چند دن اُدھر کی بات ہے کہ دنیا کے صنعتی طور پر سات انتہائی ترقی یافتہ ممالک (سیون گروپ) کا ایک اجلاس ہوا' جس میں امریکہ' برطانیہ' فرانس' جرمنی' سپین وغیرہ نے ایک مشترکہ اعلامیہ کے طور پر دہشت گردی کو اکیسویں صدی کا چیلنج قرار دیا' اور اس دہشت گردی سے نمٹنے کے طریقوں پر غور کیا' اور اس کے لئے سائنسی لائحہ عمل تیار کرنے کا عندیہ ظاہر کیا۔

ایک عرصے سے پوری دنیا اکیسویں صدی کی آمد کا چرچا سن رہی ہے' اور نئی صدی کے پیش منظر میں نئی نئی اصطلاحات کو متعارف کرایا جا رہا ہے' آمدہ صدی کو سائنسی' علمی تحقیقی اور سیاسی اعتبار سے بے شمار امکانات کی حامل صدی قرار دیا جا رہا ہے' رواں صدی میں جس برق رفتاری کے ساتھ انسانی معاشرے نے سائنسی و فنی' اور علمی و فکری ترقی کی ہے' اور کرۂ ارض پر بسنے والے انسانوں نے جو ہوش ربا اور حیرت افروز مناظر دیکھے ہیں اسے ذہن میں رکھا جائے تو بلاشبہ اکیسویں صدی اس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ معجزے دکھائے گی' بیسویں صدی میں اگر ہمہ نوعی ترقی نے تیز تیز قدم اٹھائے ہیں' تو اکیسویں صدی میں یقیناً یہ چھلانگیں لگاتی نظر آئے گی' قدرت حق نے معلوم نہیں ابھی تک کائنات اور فطرت کے بطن میں کیا کچھ چھپا رکھا ہے جس کا ظہور آنے والی صدی میں ہو گا' خلاء کی تسخیر تک نوبت تو بیسویں صدی نے پہنچا دی ہے اکیسویں صدی یقیناً اس سے بہت آگے کی منزلیں طے کرے گی' لگتا ہے کارکنان قضاء و قدر بھی انسان کو اس کے ایجنڈے کی تکمیل میں پوری طرح مدد فراہم کر رہے ہیں' کیوں کہ ذرۂ خاکی بڑی سرعت سے ہمدوش ثریا اور ٹوٹا ہوا تارا مہہ کامل بنتا جا رہا ہے' فضائے نیلگوں کی وسعتیں انسان کے قدموں میں سمٹی چلی جا رہی ہیں' اور خوابوں کے منظر واقعات کے قالب میں ڈھلتے جا رہے ہیں' اس حساب سے دیکھا جائے تو اکیسویں صدی اپنی آغوش میں ایسے انکشافات لے کر طلوع ہو گی کہ بیسویں صدی کا انسان جو بزعم خویش علم و فن کے نشے میں مخمور نظر آتا ہے' نئے امکانات دیکھتے ہی اس کا سارا نشہ ہرن ہو جائے گا' زمان و مکان میں بندھی ہوئی یہ کائنات شائد اگلی صدی میں اِن تمام حدود و قیود سے باہر نکل جائے' اور وقت اور سمت کے سارے پیمانے بدل جائیں' واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ہر شخص حیرت اور مسرت کی دہلیز پر کھڑا اکیسویں صدی کی راہ دیکھ رہا ہے' حیرت یوں کہ اس نے اب تک خیالات و افکار کے جو کوہ ہمالیہ کھڑے کر رکھے ہیں شائد وہ اسے کل چھوٹے چھوٹے ریت کے ٹیلے نظر آنے لگیں' اور مسرت یوں کہ سہانے خواب اگرچہ چکنا چور ہوں گے لیکن بدلے میں خوش

Marfat.com

منظر حقائق سے سامنا ہو گا۔ جس کا مطلب ترقی کی طرف ایک بڑا قدم ہے!

یہ توقعات تو ایک عامی آدمی کی ہیں مگر گروپ سیون اکیسویں صدی کی آمد کو ایک منفی رنگ دے رہا ہے اور اس نے اپنی ترجیحات میں دہشت گردی کے فروغ اور اس کے سدباب کو سرفہرست رکھا ہے' اور اس طرح پوری انسانی دنیا کو خوفزدگی کی نفسیات میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے' اس کا نتیجہ ظاہر ہے مثبت نہیں ہو گا' دوسرے لفظوں میں اس کے تجزیے کے مطابق سائنسی ارتقاء ہو نہ ہو' فنی پیش رفت ہو نہ ہو' علمی فتوحات ہوں نہ ہوں' البتہ دہشت گردی کو ضرور فروغ حاصل ہو گا' اور اس سے نمٹنے کا سامان ابھی سے کر لینا چاہیے۔

گروپ سیون کے ذہن پر یہ بھوت کیوں سوار ہے؟ اور اس کے شجر خیال پر یہ آکاس بیل کیوں لپٹی ہوئی ہے؟ ہمارے نزدیک اس کا سبب گروپ سیون کا وہ احساس جرم ہے جو اسے سہانی رات میں بھی بھیانک خواب اور روشن دن میں بھی تاریک پہلو دکھاتا ہے' ورنہ اس انداز میں آئندہ صدی کا استقبال اپنے اندر آخر کیا مفہوم رکھتا ہے؟

گروپ سیون کا جرم کیا ہے؟ اس جرم پر بیسویں صدی کا ہر روز و شب گواہ ہے' یہی وہ ممالک ہیں جنہوں نے ایک عرصے تک پوری دنیا کو اپنے زیر دام رکھا' مختلف ملکوں کو ٹکڑیوں میں بانٹ کر اپنے زیر تسلط رکھا' اور ان کے ساتھ اصطلاحاً نہیں بلکہ لفظاً اور عملاً غلاموں جیسا برتاؤ کیا' رفتہ رفتہ' مختلف خطوں کے عوام انگڑائی لیتے گئے اور رسے تڑاتے چلے گئے' بالآخر حالیہ صدی کے پون حصے تک آزاد ہو گئے' لیکن ان بڑے ممالک نے ان علاقوں کے عوام کے جسم تو بادل نخواستہ آزاد کر دیئے مگر ان کی روحیں' ان کے اذہان اور ان کے سیاسی و معاشی مفادات بدستور ان کے شکنجے میں جکڑے رہے' اور کراہنے کی آوازیں اب تک چار دانگ عالم میں سنائی دے رہی ہیں' امریکہ ہو یا برطانیہ' اسی طرح فرانس ہو یا ہالینڈ ان سب نے اصول اور انصاف کا ہر جگہ خون کیا' اب کچھ عرصے سے سیاسی و معاشی طور پر جکڑے اور پھنسے ہوئے چھوٹے ممالک میں یہ رجحان پیدا ہو چلا ہے کہ آزادی کی کھیر ٹیڑھی انگلیوں سے نکالنی پڑے گی' سو ہر ملک میں لوگوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آگیا ہے جن کے مقاصد ان کے حکمرانوں کی مصلحتوں سے نہ صرف جدا بلکہ متضاد ہیں' بزعم خود بڑے ممالک نے اپنے علاوہ ہر ملک پر ایسے حکمران مسلط کر رکھے ہیں جن کا پہلا اور اہم کام عوام کے مفادات کو نظر انداز کرنا اور ان کے جذبات کو دبانا ہے۔

جہاں عوام کو گلی میں پہنچا اور دیوار کے ساتھ لگا دیا جائے وہاں ایسے واقعات ظہور پذیر ہو کر رہتے ہیں جسے یہ ممالک جنگجوئی' دہشت گردی اور بغاوت کا نام دیتے ہیں' شیخ سعدی کا شعر ہے۔

Marfat.com

ے اذا ئیس الانسان طال لسانہ
کسنور مغلوب یصول علی الکلب

"جب انسان مایوس ہو جاتا ہے تو اس کی زبان دراز ہو جاتی ہے جس طرح قابو میں آئی ہوئی بلی بالآخر کتے پر جھپٹ پڑتی ہے۔"

جب تیسری دنیا کے عوام پر جذبات کے اظہار اور احساسات کے نکاس کا راستہ بند کر دیا گیا تو ظاہر ہے ان کی زبانوں کے قفل ٹوٹ گئے جو زبان میں آتا کہہ ڈالتے ہیں اور جب مایوسی کی حد کو پہنچتے ہیں تو یہ سوچ کر کہ مرنا تو ہے ہی کیوں نہ کسی کو مار کر مریں' مایوسی کی اس حد تک تیسری دنیا کے عوام کو کس نے پہنچایا؟ یہی وہ "گھنڈی" ہے جب تک نہیں کھلے گی مسئلہ سمجھ میں نہیں آئے گا۔

کیا تیسری دنیا کے عوام کو مرگی کا مرض لاحق ہے کہ گاہے گاہے انہیں دورے پڑتے ہیں؟ کیا دوسرے ملکوں کے عوام مجموعی طور پر مخبوط الحواس اور پاگل ہیں کہ وہ آرام سے نہیں رہ سکتے؟ کیا یہ کروڑوں لوگ پیٹ کے عارضے میں مبتلا ہیں کہ رہ رہ کر انہیں مروڑ اٹھتا ہے؟

ہرگز نہیں' تیسری دنیا کے عوام اسی طرح خوبصورت اور نارمل ہیں جس طرح ترقی یافتہ ممالک کے لوگ ہیں' یہ بھی اسی طرح ذہنی طور پر صحت مند اور فکری طور پر توانا ہیں جس طرح یورپ اور امریکہ کے لوگ ہیں' انہیں کوئی مرگی' دماغ اور معدے کا خلل نہیں یہ تندرست لوگ ہیں' لیکن ان پر جو وقفے وقفے سے ہسٹیریائی کیفیت طاری ہوتی ہے اس کا بنیادی سبب ترقی یافتہ ممالک اور ایٹمی اسلحے اور معاشی طاقت سے لیس ملکوں کا ڈبل سٹینڈرڈ ہے جو ان عوام کو روگی بنائے ہوئے ہیں۔

رواں صدی میں اس دھرتی پر دو عظیم جنگیں لڑیں گئیں' براہ راست اور بالواسطہ طور پر تیس کروڑ انسان اس سے بڑی طرح متاثر ہوئے کوئی پوچھے ان جنگوں کا مقصد کیا تھا؟

دوسری جنگ عظیم قریب الاختتام تھی' جرمنی صلح کے معاہدے پر دستخط کرنے والا تھا' پھر ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے کا کیا جواز تھا؟ صرف یہ شوق کہ ایٹم بم کی صلاحیت اور قوت کا ٹیسٹ ہو جائے اور اس شوق کی نذر بستیوں کی بستیاں اور لاکھوں انسان ہو گئے' جنوبی افریقہ میں نصف صدی سے بھی زائد عرصے تک ایک حقیر گوری اقلیت کو مسلسل اکثریت پر مسلط کئے رکھنا اور فریڈم فائٹر کو جنگجو اور دہشت گرد قرار دے دینا اور تیس تیس سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے رکھنا وہاں کے لوگوں کو باؤلا نہیں بنائے گا تو اور کیا ہو گا؟ ٹاؤٹ حکمرانوں کے ذریعے احیائی تحریکوں کے ساتھ قصابوں جیسا سلوک کرنا ان تحریکوں کے کارکنوں کو چڑچڑے پن کا مریض نہیں بنائے گا تو اس سے مختلف کیا نتیجہ برآمد ہو گا؟

Marfat.com

گروزنی' بوسینا' کشمیر' فلسطین' ایسے علاقوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جس کے منشا سے ہو رہا ہے لوگ اندھے تو نہیں کہ انہیں کوئی نظر نہ آئے اور ایسا کرنے والوں نے کوئی سلیمانی ٹوپی تو نہیں پہن رکھی کہ کسی کو دکھائی نہ دیں' لوگ سب کچھ دیکھتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں اور جب ردعمل ظاہر کرتے ہیں تو فوراً ان پر "دہشت گرد" کا ٹھپہ لگا دیا جاتا ہے۔

انہی مثالوں پر دنیا کی دیگر معاملات کو قیاس کر لیا جائے' یہ ایک فطری عمل ہے کہ جب بھوک حد سے بڑھ جائے تو پھر بھوکا اپنا پیٹ بھرنے کی نہیں دوسرے کا پیٹ پھاڑنے کی فکر کرتا ہے' ننگا خود کو نہیں ڈھانپتا دوسرے کے کپڑے اتارنے پر آجاتا ہے' زخمی شیر اپنے زخم پر پھاہا نہیں رکھتا دوسروں کو پھاڑنے کے لئے دوڑتا ہے' نام نہاد ترقی یافتہ ممالک اور طاقتور گروپس کے دوہرے معیار نے یہ دن دکھائے ہیں' جس چیز کو امریکہ اور اس کے حلیف و ہمنوا "دہشت گردی" کا نام دیتے ہیں یہ سب ان کے ذہن کا فتور ہے خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں' نام نہاد طاقتور ممالک کے جرائم کا بھیانک تصور ہی دوسرے لفظوں میں دہشت گردی ہے ان ممالک سے سرزد ہونے والے انسانی دھرتی پر جرائم جب احساس کی لہریں بن کر ایک ہیولے میں ڈھلتے ہیں' تو یہ ممالک اس کا نام "دہشت گری" رکھ دیتے ہیں' اکیسویں صدی کا سب سے بڑا چیلنج "دہشت گردی" نہیں بلکہ گروپ سیون کا "دوہرا معیار" ہے' جب مرض کی علت ختم ہو جاتی ہے تو بیماری اپنے آپ ٹھیک ہو جاتی ہے' اسی طرح اکیسویں صدی میں اگر دوہرے معیار کا خاتمہ کر دیا گیا تو دنیا کے کسی گوشے میں دہشت گردی کا کوئی وجود نہیں رہے گا' دہشت گردی اب بھی نہیں ہو رہی' محض ردعمل ہے' لیکن بڑی طاقتیں "عمل" کو نظرانداز کر دیتی ہیں اور "ردعمل" کو آسمان پر اٹھا لیتی ہیں' جس کے نتیجے میں غصہ اور انتقام اور تیز ہو جاتا ہے۔

ان ترقی یافتہ ممالک نے اپنے زیر اثر علاقوں میں سیاسی نظام اس طرح کا وضع کر رکھا ہے کہ وہاں کے لوگوں کے لئے سانس لینا مشکل ہو رہا ہے اور معاشی پالیسیاں ایسی بنائی ہوتی ہیں' کہ لوگ خودکشی پر اترے نظر آتے ہیں' ایسے میں مایوسی کا پیدا ہونا فطری امر ہے' اور مایوس انسانوں کے ہجوم سے کوئی بھی حرکت کسی بھی وقت سرزد ہو سکتی ہے' لیکن اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ دہشت گردی کا جواز فراہم کیا جائے' بات صرف اتنی ہے اور وہ بھی اصولی کہ دوسروں سے اپنی وضع بدلنے کا مطالبہ کرنے سے پہلے انسان کو اپنی خُو تبدیل کرنی چاہئے۔

ورنہ پھر یہی ہو گا کہ

سبک سر ہو کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟ ؎

(16 اگست 1996ء)

Marfat.com

ڈالر فوبیا

امریکی ڈالر ------- ایک ایسا محبوب ہے جس کے "وصل و فصل" پر ہماری حکومتوں' بیوروکریسی اور ایک خاص کلاس کی نبضِ ہستی کا دارومدار ہے' ڈالر کے اُتار چڑھاؤ سے ان کی نبض ڈوبتی اور اُبھرتی ہے' ڈالر کے حصول میں ہماری حکومت ہلکان' بیوروکریسی سرگردان' اور پریولجڈ کلاس حیران و پریشان پھرتی ہے' خاص طور پر جب سے پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کیا ہے اُس دن سے آج کے لمحے تک حکومت کے تابع الیکٹرانک میڈیا اور آزاد پرنٹ میڈیا سب سے زیادہ اُس خبر کو اہمیت دیتا ہے جس کا تعلق ڈالر سے ہو' ڈالر کا ریٹ پچاس پیسے گر جائے' تو حکومت مٹک اُٹھتی ہے' اگر اوپر چلا جائے تو اس کا منہ لٹک جاتا ہے' اس وقت ہمارا سارا "علم الاصطلاح" ڈالر سے منسلک ہو کر رہ گیا ہے۔

سوال یہ کہ یہ ڈالر ہے کیا؟ اور ہم اس کے پیچھے "گالڑ" بن کر کیوں بھاگ رہے ہیں؟ بلاشبہ ملکی معیشت میں ڈالر کی بہت اہمیت ہے' میں چونکہ کوئی ماہر معیشت نہیں اس لئے فنی بحث کرنا میرے بس سے باہر اور فہم سے اُوپر کی بات ہے' تاہم اتنی بات واضح ہے' کہ ڈالر کا حصول اتنا بھی اہم نہیں کہ جس کے لئے کسی کے تلوے چاٹے جائیں' ہوش اُڑائے جائیں اور اعصاب توڑے جائیں۔

دنیا کی کوئی بھی کرنسی ہو بہرحال اس کا مقصد لین دین کی ضمانت فراہم کرنا ہے' کرنسی بذاتِ خود کوئی قیمت نہیں رکھتی' کاغذی کرنسی ہو یا دھاتی' اس کی حیثیت علامتی ہوتی ہے' اصل میں تو اشیائے صرف ہیں جن پر انسان زندگی کا دارومدار ہے' گندم' کپاس' چاول' گنا' چمڑا' گوشت' پھل' سبزی' دودھ' دال' پانی' ریت' پتھر' مٹی' کوئلہ' لوہا' تانبا' مرچ' نمک' مکئی' جوار' باجرا' اُون' وغیرہ۔

یہ اور اس طرح کی بہت سی دوسری خداداد چیزیں ہیں جو انسانی زندگی کے لئے ضرورت کا درجہ رکھتی اور کفائیت کا اہتمام کرتی ہیں' کھانے پینے' رہنے سہنے اور اوڑھنے پہننے کے لئے ان اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے' اور یہ وہ نعمتیں ہیں جو خدا داد ہیں' اور پاکستان میں بے مقدار اور لاتعداد ہیں' ڈالر کو جو آج آکسیجن اور خون کا درجہ ہمارے ملک میں حاصل ہو چکا ہے کہ اس کے بغیر سانس اور رگِ حیات کی حرکت ناممکن ہے آخر کیسے ناممکن ہے؟ کیا ڈالر گندم اور

Marfat.com

چاول کی جگہ کھایا جاتا ہے؟ پانی اور دودھ کی طرح پیا جاتا ہے؟ کپڑے کی طرح پہنا جاتا ہے؟ اینٹ، گارے کی مانند اس سے گھر بنایا جاتا ہے؟ یہ گیس بن کر چولہے میں جلتا ہے؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہے' تو پھر الجھن کیا ہے؟ اندر کی بات یہ ہے کہ ڈالر عام آبادی کا مسئلہ نہیں ایک خاص طبقے کا معاملہ ہے' جن کی ہر چیز "امپورٹڈ" ہوتی ہے' اور کوئی چیز ڈالر کے بغیر امپورٹ نہیں ہو سکتی۔

حالات نارمل ہوں تو ہر عیش کا جواز ہوتا ہے ورنہ پھر قوم میں طیش پیدا ہوتا ہے' کہ ڈالر کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر تو پاکستان کوئی ہوا میں لٹکا ہوا ملک ہے کہ جہاں نہ کچھ اُگتا ہے' نہ پیدا ہوتا ہے تو پھر ہر چیز درآمد کرنی چاہیئے' یا پاکستان چاروں طرف پانی میں گھرا ہوا ہے کہ سوائے بیرونی امداد کے اس کے زندگی محال ہے' تو پھر امپورٹ کے بغیر گزارا نہیں' لیکن پاکستان تو ماشاء اللہ ایک ایسی سرزمین پر واقع اور آباد ہے جس میں قدرت کے چاروں موسم اپنی بہار دکھاتے ہیں' سرما' گرما' بہار اور خزاں' ربیع اور خریف دونوں فصلیں بھرپور ہوتی ہیں' پانی کے بے بہا قدرتی ذرائع ہیں' دریا' نہریں' چشمے' اور زیر زمین ذخیرے' ہر وہ چیز جو انسان کھاتا ہے وہ یہاں اُگتی ہے' ہر طرح کا اناج' ہر نوع کا پھل' ہر قسم کی سبزی اور ہر جنس کی دال' لوہا بھی یہاں دستیاب ہے' کوئلہ' تانبا' پیتل' گیس' نمک اور مرچ بھی' اس ملک میں کروڑوں گائیں' بھینسیں' بکریاں' بھیڑیں' اونٹنیاں' مرغیاں موجود ہیں' جن سے گوشت چمڑا' دودھ اُون اور انڈہ حاصل ہوتا ہے' مکانات و تعمیرات کے لئے یہاں ہر طرح کا مواد میسر ہے' ریت' مٹی' چونا' پھر' لکڑی' سٹیل' شیشہ' کس چیز کی کمی ہے؟ لباس جس چیز سے تیار ہوتا ہے اس کی بھی قلت نہیں' یعنی کپاس اور اُون وافر ہے چاروں بنیادی ضروریات کے لئے بحمد اللہ ملک خود کفیل ہے یعنی کھانے' پینے' پہننے اور رہنے کے لئے' اس کے باوجود ہم ڈالر اور درآمد کے محتاج ہیں۔

البتہ چار چیزیں ایسی ہیں جن کی درآمد ہماری مجبوری ہے' پٹرول' لازمی ادویات' اسلحہ' اور ضروری ٹیکنالوجی اور مشینری' ان چیزوں کا تخمینہ لگالینا چاہیئے' اللہ کے فضل سے اتنے ڈالر تو ہمیں برآمدات' اور امریکہ اور یورپ میں مقیم پاکستانیوں کی ترسیلات سے حاصل ہو ہی جاتے ہیں' پٹرول ضرور منگوایا جائے مگر پانی کی طرح نہ بہایا جائے' اسلحہ ضرور خریدا جائے لیکن ساتھ ساتھ قوم میں جہاد کا جذبہ بھی ابھارا جائے' ادویات صرف وہ ہوں جن کے بغیر زندگی بچنا محال ہو' اور مشینری کی درآمد ہماری ضرورت ہے لیکن مرسڈیز' ہیوک' ایم بی ڈبلیو' پجیرو' لینڈ کروزر' اور ہونڈا گاڑیاں ہماری قطعاً ضرورت نہیں' اربوں ڈالر پٹرول' ادویات' اسلحہ اور مشینری کے لئے نہیں ہمارے حکمرانوں اور ان کے خاص "دربانوں" کے لئے درکار ہوتے ہیں'

Marfat.com

جس ملک کا حکمران اور ایک خاص طبقہ خود "امپورٹڈ" ہو اس کی ہر چیز "امپورٹڈ" استعمال کرنے کی عادت نہیں ہو گی تو کیا ہو گی؟ جو ملک دس ارب روپے کا اناس درآمد کرے' جس ملک کے خاص قسم کے شہری دستی رومال' ٹائیاں' پہننے کے کپڑے' موزے جوتے' پرفیوم' گھڑیاں' ریڈیو' ٹی وی' فرتج' فریم' عینک' وال گلاس' لاکٹ' چین' قلم' پرس' بریف کیس' ایش ٹرے' قالین' بچوں کے کھلونے' چاکلیٹ 'غرضیکہ ہر دوسری چیز "فارن میڈ" استعمال کرتے ہوں' اربوں ڈالر کی ضرورت تو پڑے گی' اگر ہر چیز ویسی ہو تو اربوں ڈالر باآسانی بچ سکتے ہیں' وہ کون سی چیز ہے جو یہاں تیار اور دستیاب نہیں ہوتی' ایوانوں' بنگلوں' اور کوٹھیوں کے لئے باہر سے ماربل منگوانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا یہاں ماربل دستیاب نہیں' کوٹ پتلون کا کپڑا درآمد کرنا کون سی جائز ضرورت ہے؟ پیک جوس یورپ سے لانے کا کیا جواز ہے؟ فرانس سے پرفیوم منگوانے کی کیا تک ہے؟ اٹلی کے جوتے پہننے کا آخر کیا شوق ہے؟ سوئزر لینڈ کی گھڑیاں کلائی میں باندھنے کا خبط کیوں ہے؟ اصل میں ڈالر تو یہاں کھپتا ہے اور بنا دیا جاتا ہے اسے ملکی ضرورت۔

کچھ اور اسباب بھی ہیں' ڈالر کے ناگزیر بننے کے' ایک تو یہ ہے کہ ہمارے ہر سابق موجود اور متوقع حکمران کے لخت جگر ماشاء اللہ اکثر و بیشتر باہر پڑھتے ہیں زرِ مبادلہ ان کے لئے بھی ضروری ہے' دوسرے یہ کہ اپنا اور بیگمات کا باہر کے ہسپتالوں میں سالانہ میڈیکل چیک اپ اور علاج بھی لازمی ہے' تیسرے یہ کہ گرمیوں کی چھٹیاں باہر کے کسی پر فضا مقام پر گزارنا بھی صحت کے لئے از بس واجب ہے' ان تمام "قومی و ملی ضروریات" کے لئے ڈالر ناگزیر چیز ہے جس سے مفر ممکن ہی نہیں' کیا کیا بات کی جائے اور کس کس مد کا ذکر چھوڑا جائے یہ تو ہیر رانجھے کی کہانی ہے عمر بھر ختم نہیں ہو گی' حاصل کلام یہ ہے کہ اگر تو صرف زندہ رہنا اور باوقار شکل میں جینا ہے تو اس کے لئے پاکستان خود کفیل ہے' ساری دنیا الگ ہو جائے پاکستان اور اس کے عوام نہیں مر سکتے' اور اگر زندہ رہنا ہے اور "غیر کا بندہ" بن کر رہتا ہے تو پھر ڈالر "قاضی الحاجات" ہے کیوں کہ اس کے بغیر ہماری ایک خاص نسل کی زندگی گزر تو جائے گی۔

ع

لیکن بہت اُداس بہت بے قرار گزرے گی

(26 دسمبر 1998ء)

ملکی اثاثے نہیں سرکاری بنگلے بیچیں

کسی سفید پوش کی مجبوری اور کسی قلاش کی غربت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ گھر کے برتن بیچنے پر آجائے' آج کل کچھ ایسی ہی کیفیت میرے وطن عزیز کی ہے' جب سے سیاہ باطن لوگوں کا میرے ملک پر غلبہ ہوا تھا اس دن سے سفید پوش پاکستان مجبوری کے عالم میں سانس لے رہا ہے' اور جس گھڑی عیاش طبقے نے پیارے وطن پر قبضہ جما لیا تھا ملک قلاش ہونا شروع ہوا' یہ قصہ چند ساعتوں کا نہیں چالیس برسوں کا ہے' آج حکومت کو ملکی اثاثے بیچنے پڑ رہے ہیں' پی آئی اے' ریلوے' پی آر ٹی سی' واپڈا' پی ٹی سی' وغیرہ کچھ ادارے خسارے میں ہیں' کچھ محض سفید ہاتھی ہیں' کچھ برائے نام منافع دے رہے ہیں' کچھ ایسے ہیں اگر بک گئے تو بہت سی رقم دے جائیں گے جس سے غیر ملکی قرضے بخوبی ادا ہو پائیں گے۔

یہ سچ ہے کہ کھانے کو روٹی نہ ہو تو خوبصورت کٹلری' دیدہ زیب کراکری اور چمکدار ڈائننگ ٹیبل کس کام کی؟ پینے کو پانی نہ ہو تو بلوریں فنجان اور فرانسیسی گلاس کس لئے؟ پہننے کو کپڑا نہ ہو تو سقف بوس الماریاں اور ولائتی ہینگر چہ معنی دارد؟ کچھ ایسا ہی اپنا عالم ہے۔

قرض سے تو رسول اکرم ﷺ نے پناہ مانگی ہے ہم کیوں نہ نجات حاصل کریں' حدیث نبوی کے مطابق قرض میں برکت نہیں ہوتی' اور ہاتھ کی کمائی خواہ تھوڑی ہو اللہ تعالیٰ اسے کافی وکفیل بنا دیتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اتنے قرضے چڑھنے کی نوبت کیوں آئی؟ اگر تو قرض زراعت کی ترقی کے لئے اٹھائے گئے تھے' تو پھر پچاس لاکھ ٹن گندم درآمد کیوں ہوتی ہے' اور آٹے کا بحران کیوں ہے؟ اگر قرض گھر' گلیاں' سڑکیں اور صنعتی چمنیاں روشن کرنے کے لئے اٹھایا گیا تو پھر لوڈ شیڈنگ کیوں ہوتی ہے؟ اگر قرض ملک سے بیروزگاری ختم کرنے کے لئے نئی سکیموں کے ضمن میں لیا گیا تو آج بیروزگاری سب سے بڑا مسئلہ کیوں ہے؟ اگر قرض تعلیم عام کرنے کے لئے مانگا گیا تھا تو آج جہالت زوروں پر کس لئے ہے؟

احوال وطن سے تو یوں لگتا ہے کہ قرضے کسی ملکی ضرورت کے لئے نہیں لئے گئے بلکہ کچھ اور ضرورتیں تھیں جن کا ملک اور قوم سے کوئی تعلق نہ تھا' لے دے کے خود حکومتی نخرے اور افسرانہ چونچلے رہ جاتے ہیں جن کے لئے قرضوں کا اس قدر بوجھ ملک پر لادا گیا' کہ نوبت گھر کے برتن بیچنے تک آگئی ہے۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ جن اداروں کو بیچا جا رہا ہے انہیں کسی ڈسپلن میں لایا جائے' جل

Marfat.com

ان کا بیچنا نہیں ہے' مریض کے مرض پر قابو پانا چاہئے خود مریض کو ہسپتال یا گھر سے نکال دینے اور اسے جان سے مار دینے کا کیا مطلب؟ ان محکموں میں اگر ناجائز بھرتیاں ہیں تو وہ منسوخ کی جائیں افسروں کے لئے ناروا مراعات ہیں تو ختم کی جائیں' غبن ہو رہا ہے تو اس کی روک تھام کی جائے' بدعنوان لوگ ان پر چھا گئے ہیں تو انہیں فارغ کیا جائے اور ان کی گوشمالی کی جائے' ان طریقوں سے یہ ادارے صحت یاب ہو جائیں گے۔

آخر جو افراد یا کمپنیاں یہ ادارے خریدیں گی وہ انہیں نفع بخش کیسے بنائیں گی؟ کیا وہی طریقے حکومت پاکستان اختیار نہیں کر سکتی؟

گورنمنٹ ٹرانسپورٹ فیل ہو گئی' پرائیویٹ سیکٹر کی پانچوں گھی میں ہیں آخر کیسے اور کیوں؟ اس طرح تو ہر ادارہ "چوڑ" ہوتا جائے گا۔ اور آپ اسے بیچتے چلے جائیں گے' یہ اثاثے بچا کر رکھنے کی ضرورت ہے خدانخواستہ فی الواقع ایمرجنسی پیدا ہو تو کچھ تو گھر میں ہونا چاہئے' اور پھر ڈر یہ ہے کہ ان اثاثوں کی فروخت میں بھی کہیں بیوروکریسی اور افسر شاہی کے کمیشن کا چکر نہ ہو؟ ترقیاتی کام چونکہ بند ہیں اس لئے کمیشن بھی بند' کوئی خرید و فروخت ہو گی تو کمیشن بھی بن پائے گا' ہاں قرض خواہ اگر بہت تنگ کر رہے ہیں اور جیب بالکل خالی ہے تو بسم اللہ کیجئے اور لاہور' کراچی' پشاور اور کوئٹہ کے گورنر ہاؤس بیچنے کا اہتمام کیجئے' جیسی حالت میں ہیں اسی میں فروخت کر دیں یہ چاروں عمارتیں حالیہ قسط یعنی اسی ارب روپیہ آرام سے دے جائیں گی' یہ ہاؤس جن اہم ترین مقامات اور جس وسیع ترین رقبے پر ہیں اربوں میں جائیں گے' اگر کچھ رقم لگا کر انہیں تجارتی پلازوں میں بدل دیں اور کرائے پر چڑھا دیں تو اپنے اپنے شہر کا بلدیاتی بجٹ بڑی خوشی سے دے جائیں گے۔

اسی طرح ہر پر فضا مقام پر سرکاری ریسٹ ہاؤس آخر غریب ملک کے کس کام کے ہیں؟ کمشنر ہاؤس کس مرض کی دوا ہیں؟ یہ کمشنر ریٹائر ہونے کے بعد بھی تو کہیں گزارا کر لیتے ہیں ابھی سے گزارے کی ٹریننگ شروع ہو جانی چاہئے' یہ بنگلے صحیح معنوں میں سفید ہاتھی ہیں جو پاکستان کے ہر صوبے کے دروازے پر بندھے ہوئے ہیں اور صوبے بھر کا چارہ کھا رہے ہیں' مانا کہ زندہ یہ ہاتھی لاکھ کے ہیں لیکن مرنے یعنی بکنے کے بعد اگر سوا لاکھ کے بنتے ہیں تو کیا حرج ہے؟

سابقہ نگران حکومت نے صرف تین مہینوں میں غیر ضروری اخراجات کم کر کے ملکی خزانے کو ساڑھے چار ارب روپے کا فائدہ پہنچایا گویا سال بھر میں اٹھارہ ارب روپے صرف "نخروں" کی مد میں بچ سکتے ہیں' مستقل سیاسی حکومت کو ضرور' اس نہج پر غور کرنا چاہئے۔

(24 جون 1997ء)

Marfat.com

۵ نہ تم بدلے، نہ دل بدلا، نہ دل کی آرزو بدلی

چلیں مان لیتے ہیں کہ ۳ فروری ۹۷ء کو ہونے والے الیکشن آئینی تقاضا ہیں، انتخابات کا تسلسل قومی زندگی کا لازمہ ہے، موجودہ ملکی اور اردگرد کی صورتحال میں الیکشن ناگزیر ہیں، اور الیکشن ہی مسائل کا حل ہے، اگر احتساب مؤخر ہوتا ہے تو ہو جائے انتخاب میں تاخیر ملک کو بڑے بحران سے دوچار کر سکتی ہے، انتخاب ہی احتساب کا مؤثر ذریعہ ہے، اگر ملکی سیاست میں استحکام آنا ہوا، یا قومی معیشت کا بھلا ہونا ہوا تو اسی انتخابی عمل سے ممکن ہے ورنہ سیاست و معیشت دونوں میں استحکام کا تصور کرنا ایک خواب سے زیادہ کچھ بھی نہیں، اور خواب بھی ایسا جو صرف جاگتے میں دیکھا جا سکتا ہے، یہ سارے دلائل ہم سنتے بھی ہیں، پڑھتے بھی ہیں، انہیں وزن بھی دیتے ہیں، اور ان پر غور بھی کرتے ہیں، لیکن دل ہے کہ مطمئن نہیں ہوتا۔

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ الیکشن سرے سے ہونے ہی نہیں چاہئیں تو اس سوچ کے ہم اتنے ہی مخالف ہیں جتنا کوئی بھی "جمہوریت پسند" ہو سکتا ہے، اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ الیکشن ملتوی کر کے موجودہ نگران سیٹ اپ کی وہ آرزو پوری کر دی جائے جو پہلے نگران کار پردازوں کے دل میں مچل رہی تھی اور اب لبوں پر تھرک رہی ہے کہ کاش ہمیں دو تین سال مل جاتے! تو اس خواہش اور کوشش کو ہم "کریمنل ایکٹویٹی" سمجھتے ہیں۔

اگر کوئی انتخاب کو احتساب کا واحد اور مؤثر ذریعہ قرار دیتا ہے تو ہم ایسے شخص کو "بھولا بادشاہ" قرار دینے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتے۔

ہم اپنے شعور کی پوری قوت مجتمع کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کی رائے لینے کے عمل کو اب کسی صورت باطل اور رائے دہی کے حق کو کسی صورت منسوخ نہیں کیا جا سکتا، الیکشن ضرور ہوں اختلاف، صرف "ٹائم فریم" میں ہے، کیا ہر وقت اور ہر حال میں الیکشن مفید ہیں؟ جب کہ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ الیکشن صرف چند خاندانوں کی تفریح طبع کا ذریعہ ہو کر رہ گئے ہیں۔

چند لوگوں نے ملک کے اتنے وسائل اپنے قبضے میں لے رکھے ہیں ان کے علاوہ کوئی شخص اس میدان میں اترنے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور اگر اترے تو دوچار دن میں اس کا پیارا "نشۂ اصلاح" اور "خمارِ انقلاب" اتر جاتا ہے، کیوں کہ ان کے ذہن میں "ووٹ" کی اہمیت اور اس کے فیصلہ کن حیثیت کا خیال بیٹھا ہوتا ہے جبکہ میدان انتخاب میں "نوٹ" کی وقعت ہوتی ہے۔

Marfat.com

اور الیکشن پارٹی منشور، ملکی ایشوز، اور بالاتر نصب العین کی بنیاد پر نہیں بلکہ برادری اور غنڈہ گردی کے زور پر لڑے جاتے ہیں، صرف وہی لوگ پارٹی ٹکٹ لینے میں کامیاب ہوتے ہیں جن کی جیت یقینی ہو، باقی نعرے، منشور اور وعدے خانہ پری کا کام دیتے ہیں، ایک معاصر اخبار نے ۷۵ء سے لے کر ۹۳ء تک کا وہ تمام زائچہ چھاپ دیا ہے کہ کون کون لوگ کس الیکشن میں کس پارٹی کی طرف سے کھڑے ہوئے؟ کون ہارا اور کون جیتا؟ اور اب کون کس کیمپ میں ہے؟

یہ ساری تفصیل دیکھ کر بے اختیار منہ سے نکلتا ہے۔

ے نہ تم بدلے، نہ دل بدلا، نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیسے اعتبارِ انقلاب آسماں کر لوں

قوم روتی ہے کہ مزاج سیاست بدلا جائے، نظام بدلا جائے، اور اندازِ حکمرانی بدلا جائے مگر یہاں چہرے تک بدلنے کی زحمت کوئی پارٹی اٹھانے کو تیار نہیں۔

پشاور سے لے کر اٹک، راولپنڈی سے لے کر، گوجرانوالہ، لاہور سے لے کر ملتان اور رحیم یار خان، سکھر سے لے کر کراچی اور لسبیلہ سے گوادر تک ساری فہرست ہم نے بغور دیکھی، وہی نام اور وہی چہرے نظر آئے، بس دو چار لوگ "نظروٹو" کے طور پر نئے ڈال دیئے جاتے ہیں، تاکہ لوگوں کا پیمانۂ صبر بالکل ہی نہ چھلک پڑے، بعض جماعتوں نے بڑے دعوؤں کے ساتھ کہا کہ ہم نے اس مرتبہ بہت ہی صاف ستھرے اور صاحب کردار لوگوں کو میدان میں اتارا ہے، مگر فہرست پڑھ کر جب دعوے کی صداقت کا جائزہ لیا تو مرزا غالب یاد آگئے۔

ے کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

اگر تو ہم اس مکتب فکر کے آدمی ہوتے جو دنیا اور سوسائٹی کو صرف اس نظر سے دیکھتے ہیں "جیسے کہ وہ ہے۔" (As it is) تو پھر ہمیں شائد نئے اور پرانے چہروں اور اچھے اور برے کرداروں کی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہ تھی، لیکن ہم اُن آشفتہ مزاجوں میں ہیں جو دنیا اور سوسائٹی کو "ایسا ہونا چاہئے" (As it ought to be) کے زاویے سے دیکھنے کے آرزو مند ہیں، اگرچہ ہمیں خیال آتا ہے کہ کانچ کا پیکر رکھنے والوں کو سنگ سے دُشمنی اچھی نہیں لگتی، لیکن کیا کریں کہ ہم سب کے محسن اعظم ﷺ کا ایک ارشاد اس "دیوانگی" پر آمادہ کر دیتا ہے، کہ "جس شخص کا آئندہ کل گذرے کل سے بہتر نہ ہوا وہ خسارے میں رہا۔"

سال پہ سال گزرتے جا رہے ہیں، ۴۷ء میں پاکستان بنا، کل یکم جنوری ۹۷ء ہے، کیا ان پچاس برسوں میں ماؤں نے صرف کھگے اور ٹوانے جنم دیئے ہیں؟ گجر اور جاٹ پیدا کئے ہیں؟ کھوسے اور دریشک ہی گود میں لئے ہیں؟ کیا پچاس برسوں کا حاصل صرف عباسی اور خاکوانی

Marfat.com

ہیں؟ کیا نصف صدی کا سیاسی اثاثہ صرف مینگل اور بگٹی ہیں؟ کیا آئندہ پچاس سال بھی قوم کو انہی پر صبر شکر کرنا ہو گا؟

حافظ شیرازی نے کہا تھا۔

ے میرا ز روزِ قیامت غمے کہ ہست' ایں است
کہ روئے مردم عالم دوبارہ باید دید

(میں قیامت کے دن سے صرف اس لئے خوفزدہ ہوں کہ دوبارہ انہی لوگوں کو دیکھنا پڑے گا۔ جن سے دنیا میں واسطہ رہا۔)

ہم بھی اگر الیکشن کو ایک فضول کارروائی قرار دیتے ہیں تو صرف اس لئے کہ انہی چہروں کو دوبارہ طاقچہء ایوان سیاست کی زینت بنتے ہوئے دیکھنا پڑے گا' اور اس سے زیادہ دلخراش' اور مکروہ منظر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

یہی لوگ الٹا اُن لوگوں پر طعن توڑتے ہیں کہ وہ اگر عوام میں مقبول نہیں تو ہمارا کیا قصور؟ لوگ اگر انہیں ووٹ نہیں دیتے تو ہم کیا کریں؟ مخلوق انہیں اپنا لیڈر نہیں مانتی تو اس کا کیا علاج؟ اور انہیں سیاست کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا تو وہ کسی سے سیکھ لیں ہمارے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں یہ طنزیئے' طربیے بجا' یہ لوگ بھی "قائداعظم" بن سکتے ہیں؟ "محافظ جمہوریت" کہلا سکتے تھے اور برادریوں کے "سرپنچ" اور عظیم الشان "لیڈر" ہو سکتے تھے' لیکن اس کے لئے کچھ "تقاضوں کی تکمیل" ضروری تھی' جو بدقسمتی سے یہ لوگ نہ کر سکے' بقول حبیب جالب۔

ے فرنگی کا جو میں دربان ہوتا
تو جینا کس قدر آسان ہوتا
مرے بچے بھی امریکہ میں پڑھتے
میں ہر گرمی میں انگلستان ہوتا
مری انگلش بلا کی چست ہوتی
بلا سے جو نہ اردو دان ہوتا
جھکا کے سر کو ہو جاتا جو "سر" میں
تو لیڈر بھی عظیم الشان ہوتا
زمینیں میری ہر صوبے میں ہوتیں
میں واللہ صدرِ پاکستان ہوتا

(3اکتوبر 1998ء)

کرپشن------عوام اور حکمرانوں کا مختلف نقطۂ نظر

لیڈر چاہے پیپلز پارٹی کا ہو یا مسلم لیگ کا' جو رکن اسمبلی رہا ہے' وزیر یا مشیر بنا ہے' اور کسی کمیٹی کا چیئرمین سیکرٹری' جس سے بھی بات کی جائے اپنی پاکدامنی کا یوں تذکرہ کرے گا کہ سننے والا جنیدؒ و بایزیدؒ کے فقرو تصوف کو بھول جاتا ہے' آج جن معنوں میں اور جن حوالوں سے حکمران احتساب کی بات کر رہے ہیں' اس کا نتیجہ ہمیں بہرحال معلوم ہے کیوں کہ پانی میں مدھانی گھمانے سے آج تک مکھن نہیں نکلا' ہر دفتر کے در و دیوار چیخ رہے ہیں کہ ہمیں لوٹا گیا ہے اور بے حساب لوٹا گیا ہے' ہر محکمے کی فائل کا ایک ایک پرزہ فریاد کناں ہے کہ ہمیں غور سے پڑھو ہم پر کرپشن کی داستان درج ہے' اور' سرکاری ادارے کا ایک ایک شعبہ اپنے اندر ہونے والے گھپلوں کا کھلا اشتہار بنا ہوا ہے' واپڈا ہو' پی آئی اے ہو' ریلوے ہو' متروکہ وقف املاک بورڈ ہو یا ضلع کونسل اور میونسپل کمیٹی ہو' حکومت بیچاری "ثبوتوں" کو ترس رہی ہے' یہ مخمصہ کیوں ہے؟ ہمارے نزدیک اس کی بنیادی وجہ کرپشن کے بارے میں حکومت اور عوام کے نقطۂ نظر کا اختلاف ہے' حکومت جس "کرپشن" کی ٹوہ میں لگی ہوئی ہے' وہ کرپشن اتنی فول پروف اور اتنی بالا مرتبت ہے کہ ڈیڑھ دو ماہ کے حکمران نہ اس کو جانچ پائیں گے' اور نہ اس تک پہنچ پائیں گے' لیکن جس کرپشن کے زخم خوردہ عوام ہیں بدقسمتی سے ہماری حکومتیں اسے کرپشن ماننے کو تیار نہیں' بلکہ ایسے کام تو حکومت کے نزدیک قانونی تقاضوں کے عین مطابق ہیں' اب اس خلیج کو کون پاٹے؟

اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ حکمران اور ان کے ماتحت افسران خود کو عوام کی سطح پر لے آئیں اور عوامی سوچ سے ہم آہنگ ہو کر غور کریں یا پھر جملہ عوام ایک ایک کرکے وزیر' مشیر' سفیر' گورنر' وزیراعلیٰ' سینیٹر' ممبران قومی و صوبائی اسمبلی اور پارلیمانی سیکرٹری بن جائیں تب عوام کا کرپشن کا مفہوم بھی بدل جائے گا' بصورتِ دیگر عوامی و حکومتی مفہوم میں فاصلہ برقرار رہے گا' عوام میں سے کوئی شخص جب برسرعام کسی کرپشن کی نشاندہی کرتا ہے' کوئی کالم نگار لوٹ مار پر لکھتا ہے' اور کوئی مقرر کسی مجلس میں لیڈروں اور عوامی نمائندوں کی مار دھاڑ کا ذکر سناتا ہے تو حکومتی برزجمہر فوراً بول اٹھتے ہیں کہ یہ کوئی ٹھوس بات نہیں محض زیب داستان اور زینت قلم ہے۔

Marfat.com

عوام کے نزدیک کرپشن کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص جو اپنی انتخابی مہم پر لاکھوں کروڑوں خرچ کرتا ہے' گاڑیوں کے قافلے رواں دواں رکھتا ہے' حاتم طائی کا لنگر چلاتا ہے اور ضرورت پڑے تو کسی خاندان کو فی کس ہزار ہزار روپے دے کر ان کے ووٹ خریدتا ہے' آخر کس جذبے کے تحت؟ اگر وہ جاگیر دار ہے تو اس کے مزارع گرمیوں میں چھاؤں کے لئے چھپر کو اور سردیوں میں تن ڈھانپنے کے لئے سویٹر کو ترستے ہیں اس شخص کو کبھی انکی حالت پر ترس نہیں آتا صرف الیکشن میں اس پر "قومی خدمت" کا جذبہ بھوت بن کر کیسے سوار ہو جاتا ہے؟ ہو نہ ہو رقم دوگنی کرنے کے چکر میں ہے۔

اسی طرح اگر امیدوار سرمایہ دار ہے تو اس کے ملازم کئی کئی ماہ تنخواہ کو روتے رہتے ہیں مگر اس کو ملازموں پر رحم نہیں آتا' آخر اس کے دل میں پوری قوم کا درد کیوں سما جاتا ہے؟ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ شخص ایک فیکٹری کے بعد دوسری لگانے کی امید میں لاکھوں خرچ کر رہا ہے' اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں' عوام ان حرکتوں کو کرپشن کہتے ہیں' مگر ہمارے حکمران اس رُخ پر کان نہیں دھرتے کیوں کہ جو لوگ حکمرانی فرما رہے ہیں وہ بھی تو یہی ٹوٹکے چلا کر یہاں تک پہنچے ہیں' انہیں اس طریق کار میں کرپشن کیسے نظر آئے"؟

عوام اس کو بھی صریحاً کرپشن سمجھتے ہیں کہ ارکان اسمبلی یا افسران بالا کے لئے پی آئی اے رعایتی نرخ پر ٹکٹ جاری کرے' ان کی سیٹوں کا کوٹہ مختص کرنے اور ان کے لئے وی آئی پی لاونجز کا اہتمام کرے' انہیں ٹیلی فون کی مفت سہولت بھی عوام کے نزدیک کرپشن ہے' ملازمتوں کا کوٹہ بھی کرپشن ہے' ارکان اسمبلی قانون ساز اداروں کے ممبر ہوتے ہیں' ان کا کام قانون سازی ہے' یہ اور دیگر ساری مراعات ان لوگوں سے واپس لے لی جائیں پھر ساری قوم دیکھ لے گی کہ کتنے اربابِ زر و جاگیر کے پیٹ میں قانون سازی اور قومی و عوامی خدمت کا مروڑ اٹھتا ہے؟ عوام کے نزدیک یہ بھی کرپشن ہے کہ ارکان و افسران کے لئے مختلف شہروں میں ریسٹ ہاؤس کی سہولت ہو یہ بے دردی سے وہاں کے فون استعمال کریں' اے سی چلائیں' اور اپنے اہالی و موالی سمیت ڈیرے ڈال کر فرنیچر تباہ اور ماحول خراب کریں' عوام کے نزدیک یہ بھی کرپشن ہے کہ صدر سے لے کر وزراء اور ارکان پارلیمنٹ سے لے کر اونچے افسران اور ان کی بیگمات اور اولاد کے علاج کے لئے فنڈز مختص کئے جائیں' اور تو اور بیگم بے نظیر بھٹو جیسی "پشتی جاگیردار" اپنی بچی آصفہ کی پیدائش کے موقع پر برطانیہ میں زچگی کے اخراجات کے ضمن میں دس ہزار پاونڈ وصول کرے آخر اس کا کیا جواز ہے؟ یہ کرپشن نہیں تو اور کیا ہے؟

عوام کے نزدیک یہ بھی کرپشن ہے کہ حکمران اور ارکان اور افسران جس "بازیافت" اور "فتوحات" کو تحائف کے نام پر بٹورتے ہیں ایسے تحائف "اظہار محبت" کے لئے نہیں

Marfat.com

صریحاً "رشوت" کے طور پر دیئے جاتے ہیں' کیوں کہ آج تک کسی سابق صدر' سابق وزیراعظم' سابق گورنر' سابق وزیراعلیٰ اور سابق وزراء (بشرطیکہ ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہوں اور ان کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کا امکان نہ ہو۔) کے گھر تحائف تو کجا قربانی کا گوشت لے جاتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا گیا' ادھر کوئی وزیر سابق ہوا نہیں اور اُدھر ویرانی نے اُس کے گھر ڈیرہ لگایا نہیں 'کوئی افسر او ایس ڈی' لگا دیا جائے تو اس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اب کتنے احباب سلام کرنے حاضر ہوتے اور کتنے جگری دوست احوال پوچھنے آتے ہیں؟ تحائف کا سارا فلسفہ سامنے آجائے گا۔

انہی مثالوں پر دوسرے معاملات کو قیاس کر لیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے مکروہ سیاسی و انتظامی سسٹم نے پچاس فیصد سے زائد مکروہات کو تو پہلے ہی قانون کا چولا پہنایا ہوا ہے' اوپر ہم نے جتنی بھی مثالیں دی ہیں ان سب مکروہات کو قانونی تحفظ حاصل ہے ایسے میں احتساب کن باتوں کارہ جائے گا؟ یہ سب کچھ اگر حکمرانوں' ممبروں' اور افسروں کو قانون خود فراہم کرتا ہے اس کے بعد بھی کوئی بڑا گھپلا ہوتا ہے اور اس کی گرفت کی جاتی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ یہ جرم کی سزا نہیں مجرم کو اس کی حماقت کی سزا ہے کہ تمہارے لئے قانون کے دائرے میں اتنا کچھ کھانے کمانے کے امکانات تھے مگر تم بڑے کودن اور بے صبرے نکلے کہ خواہ مخواہ دوسرا راستہ اختیار کرکے اپنے لئے رسوائی سمیٹی

اگر کوئی معاشرہ زندہ ہو' قانون توانا ہو' اور اخلاقی حسن بیدار ہو تو یہ کبھی اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ ایوان صدر اور ایوان وزیراعظم کی دیکھ بھال' مہمانوں کی تواضع' اور دیگر ضروریات کی فراہمی کے لئے قانونی طور پر ایک ارب ستر کروڑ روپے کا بجٹ منظور کیا جائے' کسی گورنر اور وزیراعلیٰ کے لئے ساٹھ ساٹھ لاکھ روپے کی گاڑیوں کی گنجائش قانون میں نکالی جائے' وزیراعلیٰ کے تین تین دفاتر آراستہ کئے جائیں' صدر اور وزیراعظم کے ہر گھر کو خواہ وہ دیہات میں ہو یا شہر میں ایوان صدر اور پرائم منسٹر ہاؤس کا درجہ دے کر ان پر لاکھوں روپے خرچ کئے جائیں' صدر' وزیراعظم وزیراعلیٰ اور گورنر وغیرہ کا کھانا چیک کرنے کے لئے ڈاکٹروں کا بوجھ ملکی خزانہ اٹھائے' اور "بلیو بک" میں پروٹوکول کے لئے گاڑیوں کی تعداد مقرر کی جائے جن کا کوئی استعمال نہ ہو صدر باہر نکلیں تو ان کے جلوس کی کتنی گاڑیوں کو سڑک پر ہونا چاہیے۔ یہ بلیو بک نہیں' عوام کے نزدیک بلیک بک ہے لیکن الجھن پھر وہی کی یہ ساری مشق تو قانونی طور پر روا بلکہ ناگزیر ہے' پھر نگوڑی کرپشن کو کہاں تلاش کیا جائے؟

(17 دسمبر 1996ء)

Marfat.com

مرگ آرزو

ہمارے ہاں جو اس وقت نظام بر سر عمل ہے' اور جس کلچر میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں' اس کے نتیجے میں عدم برداشت' چڑچڑا پن' باہمی نزاع روز بروز بڑھ رہا ہے' محرومیاں پیمانۂ صبر کو ریزہ ریزہ اور مایوسیاں دامن فقر کو بخیہ بخیہ کئے دے رہی ہیں' ہمارا سیاسی و ثقافتی میزانیہ برابر خسارے میں جا رہا ہے' سیاست اعلیٰ نصب العین اور مسلمہ اصولوں سے خالی ہو کر لہو و لعب اور سلب و نسب کے قبیل میں داخل ہو چکی ہے اور ثقافت پاکیزہ اقدار اور حیات بخش روایات سے محروم ہو کر کثافت کے ذیل میں آچکی ہے' کوئی سوچے تو یہ بہت بڑا نقصان ہے' اگر احساس زیاں ہی مٹ گیا ہے تو پھر ہر حادثے کو لطیفہ اور ہر سانحے کو شگوفہ سمجھنے میں کیا چیز حائل ہے؟

حضرت بایزید بسطامیؒ کا کوزہ ٹوٹ گیا تو کئی دن تک افسردہ و ملول رہے لوگوں نے کہا یا حضرت مٹی کا ایک آبخورہ ہی تو ٹوٹا ہے کوئی جام جمشید تو نہیں ٹوٹ گیا؟ ابھی بازار سے لے آتے ہیں' آپ نے فرمایا مسئلہ یہ نہیں کہ وہ کچھ مٹی کا تھا یا شیشے اور قیمتی دھات کا! بات اس کے کئی برسوں کے ساتھ کی ہے' وہ ایک مدت میرے پاس رہا تھا اور ہونٹ اس سے مانوس ہو گئے تھے جاتے جاتے اس کی یاد ذہن سے جائے گی۔

یہ رویہ اور طرزِ عمل اصحابِ معرفت اور اربابِ بصیرت کا تھا وہ کسی کی رفاقت کو ایک شوخی میں نہیں گنوا دیتے اور کسی اچھی روایت کو محض شیخی میں نہیں اڑا دیتے تھے۔

اور ایک ہم ہیں' کہ ماضی کی وراثت اور اسلاف کی محنت کو ایک قہقہے کی نذر کر کے خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے وراثت ضائع کر دی ہے تو کیا ہوا؟ دولت تو خوب کمائی ہے اور حاصل محنت تلف ہو گیا ہے تو پھر کیا؟ چودھراہٹ تو قائم ہو گئی ہے۔

دولت کے انبار ہونے چاہئیں سچی اور صالح اقدار کو چوم چاٹ کر کیا کرنا ہے؟ افسری ملنی چاہئے خواہ پورے محکمے میں ابتری پھیل جائے ہمیں اس سے کیا واسطہ؟ ہر حال میں وزیر بننا ہے سیاسی اصولوں کا اسیر بننے کا کیا فائدہ؟ قربِ شاہی مل جائے خواہ قلب و ضمیر پر سیاہی ملنی پڑے!

بس ناک اونچی رہے بھلے خاک آلود ہونا پڑے' گردن فرازی کے اس چکر میں ہمارا معاشرہ

زندگی کی بازی برابر ہار رہا ہے۔ کوئی حساس اور زندہ ضمیر شخص یہ حساب لگانے بیٹھے تو اس کا کاسۂ دماغ اور آبگینہ دل دونوں چٹخنے لگیں گے۔

اس غیر منصفانہ نظام سے جہاں یہ نقصان ہو رہا ہے کہ سیاست بازیچۂ اطفال اور معاشرت روح و قلب کے لئے وبال بن گئی ہے وہاں سب سے بڑا فکری و روحانی اور ذہنی و نفسیاتی نقصان یہ ہو رہا ہے کہ آدمی کے اندر سے امنگ اور آرزو مرتی جا رہی ہے۔

زندگی ہے کیا؟ جینے کی آرزو! اور آہنگ زندگی کیا ہے؟ ایک ولولہ اور امنگ!

اور ہمارا نظام بدقسمتی سے اسی آرزو کا لہو کر رہا اور امنگ پر زنگ چڑھا رہا ہے' قدرت نے کارخانۂ کائنات میں ایک خاص کشش رکھی ہوئی ہے' اور اس کشش کے باعث انسان کی دنیا میں دلچسپی ہزار حادثوں کے باوجود کم نہیں ہوئی' اور اسی سے دنیا کا نظام رواں دواں ہے' خوب سے خوب تر کی تلاش آرزو کو زندہ اور امنگ کو توانا رکھتی ہے لیکن ہم اجتماعی طور پر ایسے موڑ پر آگئے ہیں۔ کہ اب آرزو آگے بڑھنے کے لئے مہمیز کا کام دینے سے انکاری نظر آ رہی ہے۔

کوئی بھی شخص خواہ کسی شعبے میں ہو آرزو ہی کے سہارے جیتا اور آگے بڑھنے کی سبیل کرتا ہے لیکن جب اسے ہر مرحلے میں اور ہر قدم پر یہ احساس ہو کہ میری محنت بے قیمت جا رہی ہے' میری صلاحیت پر رشوت غالب آ رہی ہے' میری دماغی کاوش کے مقابلے میں سفارش زیادہ بار آور ہو رہی ہے' میری ذہانت کو کسی کی قرابت پیچھے دھکیل دیتی ہے' میرے فن کے آگے کسی کا دھن دیوار چین بن کر کھڑا ہوا ہے' میرا ہنر بے ثمر جا رہا ہے' میری بلند نظری کسی کی بے بصری کی بھینٹ چڑھ رہی ہے' میری بلند پروازی پر کسی کی زمانہ سازی کو فوقیت حاصل ہے' میری سحر خیزی اور شب بیداری کسی کی رشتہ داری کے ہاتھوں مات کھا جاتی ہے' میری اہلیت اور لیاقت پر دولت ہمیشہ بازی لے جاتی ہے۔ اور میرا سرمایۂ فکر و خیال کسی کے مال و منال کے آگے پامال ہو کر رہ جاتا ہے تو ایسے عالم میں آدمی کی آرزو مرنے لگتی ہے' اور اس کی امنگوں کے رنگ بکھرنے لگتے ہیں۔

کچھ ایسی ہی صورتحال سے اس وقت ہمارا معاشرہ دوچار ہے؛ ہر نوجوان کا ایک آئیڈیل ہوتا ہے اس کا ایک آدرش ہوتا ہے۔ اس کے حصول کے لئے وہ رتجگے کرتا ہے' اپنا دماغ چلاتا ہے' اپنے ذہن کا رس نچوڑتا ہے' کچھ حوصلے پرورش کرتا ہے' وقتی خوشیاں نثار کرتا ہے' شخصی آسودگیاں اور راحتیں نچھاور کرتا ہے' اپنی خواہشوں کو سینے میں تھامتا ہے اس لئے کہ عارضی مشقتیں اور عبوری کلفتیں سہہ کر مستقبل میں اسے اپنا آئیڈیل ملنے کی توقع ہوتی ہے' کوئی چاہتا ہے

Marfat.com

کہ وہ پڑھ لکھ کر اہل علم کی صفوں میں شامل ہو' کوئی کارکن بن کر سیاست میں بلند مقام حاصل کرنا چاہتا ہے' کوئی تحقیق کے میدان میں اُترتا ہے تاکہ زمانہ اُس سے استفادہ کرے' کوئی زہد و تقویٰ کے ذریعے نیک ناموں میں اپنا شمار چاہتا ہے' کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اصولوں کی ہر حال میں پاسداری کرکے سیاسی تاریخ میں روشن مثالوں کا اضافہ کرے گا' کوئی دیانت و امانت کے ذریعے اپنی ذات کو قابل تقلید نمونہ بنانا چاہتا ہے' کسی کے دل میں ہوتا ہے کہ وہ محنت کے ذریعے یہ ثابت کرے گا کہ ایک ذرۂ خاک بھی سیر افلاک کرسکتا ہے۔ غرضیکہ مختلف پہلوؤں سے آدمی اپنی ذات کی شناخت اور اپنا مقام اور تشخص چاہتا ہے' لیکن اس وقت ایسے شخص کا سینہ آرزوؤں اور امنگوں کا دفینہ بن جاتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ اس معاشرے کی واحد شناخت ----- پیسہ اور سفارش ------ ہے۔

کوئی خواہ کتنا ہی پرہیز گار اور صاحب کردار ہو مگر وقار کا پیمانہ صرف بنگلہ اور کار ہے' کار کوٹھی والے کسی محفل میں ہوں' کسی دفتر میں جائیں اور کسی مقام پر ہوں جہالت ان کے بشرے سے جھلکتی اور کراہت ان کے چہرے سے ٹپکتی ہے پھر بھی بات ان کی سنی جاتی ہے اور عزت ان کو دی جاتی ہے ایسے میں آرزو کو خون ہونے سے کون اور کیسے روک سکتا ہے؟

جس معاشرے میں سب سے زیادہ بڑے قانون شکن اور قانون ساز اداروں کے رکن ہوں' مال و جان اور آبرو کے لٹیرے رکھوالے کے منصب پر ہوں' سب سے زیادہ بدعنوان اور خائن ملکی خزانے کے مالک اور متصرف ہوں' ایسی آب و ہوا میں آرزو زندگی کا سانس لے تو کیسے؟ جہاں شاہ کا مصاحب صرف وہی ہو جس کا سرمایۂ حیات فقط خوشامد ہو' اونچا منصب اسے ملے جس کا سیاسی شجرۂ نسب مشکوک ہو' وزارت کا حقدار وہی ہو جو ہر دور میں اپنی پارٹی کا غدار رہا ہو' مشیر صرف وہی بنیں جن کے ضمیر خریدنی و فروختنی ہوتے ہیں' اور حکومت ہمیشہ ان کی رہے جنہیں امریکہ سند ملازمت دے تو اس ماحول میں آرزو کا دم گھٹنا لازم ہے۔

یہی حال دیگر شعبوں کا ہے کہ بڑا ادیب وہی ہے (فی الواقع نہیں بلکہ سمجھا جاتا ہے) جسے منفعت بخش عہدہ نصیب ہو' بڑا شاعر وہی ہے جو لابنگ کا ماہر ہو' بڑا فنکار وہی ہے جو بس سولا سنگھار ہو۔ بڑا اہل صحافت وہی ہے جس پر سرکار کی نگاہ عنایت ہو' اور بڑا اہل دانش وہی ہے جو حکومت کو کسی آزمائش میں نہ ڈالتا ہو' آخر ان کی حوصلہ افزائی کیوں ضروری ہے؟ ہم سیاست میں قائد اعظمؒ اور نثرؒ ادب میں خواجہ حسن نظامیؒ اور عبد الماجد دریا بادیؒ شاعری میں غالب اور حسرت صحافت

Marfat.com

میں ابو الکلام آزادؒ اور جوہرؒ اور فکر و دانش میں اقبالؒ کو اپنا پیشوا کیوں نہیں بناتے؟ یہ لوگ کسی لابی، کسی سفارش، کسی دوست، اور کسی بیساکھی کے زور پر بڑے نہیں بنے اور نہ کہلائے بڑا آدمی بننا ہر ایک کی آرزو ہوتی ہے اور اس کے لئے کسی زمانے میں محنت اور اہلیت درکار ہوتی تھی، اب بھی محنت کرنے اور اہلیت منوانے والے لوگ موجود ہیں، لیکن بڑا آدمی بننے کے لئے اس وقت محنت اور اہلیت نہیں منافقت اور دولت کو ضرورت بنا دیا گیا ہے، منافقت سیکھی جا سکتی ہے مگر کوئی اس کے لئے جوہر انسانیت بیچنے پر آمادہ ہو اور دولت بھی مل سکتی ہے بشرطیکہ وہ احساس مروت کا جنازہ اپنے کندھے پر اٹھانے کو تیار ہو! یہ سب کچھ کرنے کے بعد کوئی شک نہیں کہ آدمی بڑا تو بن جاتا ہے لیکن آدمیت سے محروم ہو جاتا ہے، یہ ہر ایک کا اپنا انتخاب ہے کہ وہ عہدہ و منصب پر مرتا ہے یا زندگی کے حسن اور چھب پر نثار ہوتا ہے، ایسے میں ضروری ہے کہ ہم اپنا معاشرہ اور اجتماعی رویہ اس طرح تشکیل دیں، کہ ہر اہل اور لائق شخص بڑا آدمی بھی بنے، جو ہر آدمیت سے محروم بھی نہ رہے اور اس کی آرزو بھی نہ مرے۔

ہم خود تراشتے ہیں منازل کے سنگ میل ؎

(18 جون 1996ء)

Marfat.com

فردِ امروز نہیں مردِ فردا ۵

حکمرانوں کی کبھی کمی نہیں رہی، قبائل کی سربراہی سے لے کر عالم کی فرمانروائی تک حکم چلانے اور رعب جمانے والوں کی ایک لمبی قطار نظر آتی ہے، لیکن فطرت کے راز دانوں اور حقیقت کے ترجمانوں کا قحط پہلے بھی رہا اور یہ مسئلہ آج بھی درپیش ہے۔

ے جہاں بانی سے ہے دشوارتر کارِ جہاں بینی

"جہاں بانی" کے لئے ایک انتظامی مشینری، ایک چاق و چوبند فوج، کچھ مشیروں کی جماعت، پشت پر قبائلی و سیاسی عصبیت، مناسب افرادی قوت، جتھہ بند حمایت اور جائز و ناجائز دولت درکار ہوتی ہے، جب کہ "جہاں بینی" کے لئے ان ڈھیر سارے اسباب کے مقابلے میں صرف دو چیزیں مطلوب ہیں، لیکن یہ جنس بازارِ سیاست و حکومت میں اکثر کم یاب رہی ہے، اور وہ ہیں جرأت اندیشہ اور کمال جنون، یہ بازار کا سودا نہیں جو نقد یا اُدھار ہاتھ آجائے۔ بلکہ

ے یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

"امروز" فرد کا مسئلہ ہے جب کہ قوم کے لئے "فکر فردا" اہمیت رکھتی ہے۔ اور "جہاں بینی" اسی فکر فردا کا نام ہے، آج پورا انسانی تمدن اور خاص طور پر ہماری سوسائٹی کسی "فردِ امروز" کی نہیں "مردِ فردا" جس کا اندیشہ افلاکی، جس کی سوچ آفاقی اور جس کی پرواز لولاکی ہو، جس کا دیدۂ بینا قطرے میں دجلہ اور ذرے میں صحرا دریافت کر سکے، جس کی جرأتِ اندیشہ کے محیط میں کم از کم ایک صدی حباب کی طرح ہو اور جس کے کمال جنوں کے آگے کم از کم ایک براعظم رائی کا دانہ ہو، یعنی زمان و مکان اُس کے ایوان فکر و عمل کے ادنیٰ دربان ہوں۔

دین اور سیاست دنیا کے دو بازو ہیں اور انہی کے زور سے تمدن قائم رہتا ہے، اگر یہ شل ہو جائیں تو "آج" اور "کل" دونوں خراب ہو جاتے ہیں، امروز معدوم اور فردا موہوم، اگر عقابوں کے نشیمن پر زاغوں کا تصرف ہو جائے تو نتیجہ سب کو معلوم ہوتا ہے اسی طرح جب دین اور سیاست میں ناٹے قد کے لوگ آجائیں تو انجام ہر ایک پر واضح ہونا چاہیے۔

دین کے لئے فکر عمیق اور سیاست کے لئے نگاہ بلند کی ضرورت ہوتی ہے، بدقسمتی سے دینی اور سیاسی حلقوں میں یہ دونوں خوبیاں رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی ہیں، دینی شعبے میں واعظانہ، مقررانہ اور اب بڑی حد تک جارحانہ انداز کے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جب کہ ضرورت مجتہدانہ اسلوب کے حامل لوگوں کی ہے، ایسے لوگ جو دین اور روح عصر میں وہی ربط پیدا کر

Marfat.com

سکیں جو پھول اور خوشبو اور سورج اور روشنی میں ہے' یہی حال سیاسی میدان کا ہے' اس باب میں تدبر و تفکر اور غور و تدبر کرنے والے نایاب اور ہنگامہ اٹھانے اور شور مچانے والے ارزاں و فراواں ہیں' پاکستان میں مذہبی جتھہ بندیاں اور سیاسی سرگرمیاں جس رخ پر جا رہی ہیں' وہ قطعاً خوش کن اور حوصلہ افزا نہیں' دونوں جگہ نعروں سے کام چلایا جا رہا ہے' حوصلہ مندی کے ساتھ وقتی نفع و ضرر سے اُوپر اٹھ کر مستقبل کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ٹھوس منصوبے کے تحت نہ وہاں کام ہو رہا ہے اور نہ یہاں۔

ے یہاں ساقی نہیں پیدا' وہاں بے ذوق ہے صہبا

فرزندان دین کے لئے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی علمی استدلال کو اس قدر معیاری اور مضبوط بنائیں کہ شرق و غرب میں کوئی بھی علمی' تہذیبی' سائنسی اور سیاسی چیلنج انہیں پریشان اور لاجواب نہ کر سکے' جھڑک کر بات دبا دینے کے بجائے ہر ابھرے ہوئے سوال کا اطمینان اور اعتماد کے ساتھ جواب مہیا کرنے کی عادت اپنائیں۔

مغرب سے بہت ہی اعلیٰ سطح پر مکالمہ کرنے کی تیاری کریں تاکہ وہ اسلام کو کائنات کا واحد' سچا اور آخری نجات دہندہ ضابطۂ حیات ثابت کر سکیں۔

بنیادی حقوق' سلطانی جمہور' رواداری' بقائے باہمی اور مساوات انسانی وغیرہ یہ سب دورِ حاضر کے مسلمات ہیں' دینی لٹریچر کی تیاری میں انہیں پیش نظر رکھیں' سطحی بحثوں' بات بے بات فتووں' اور خوفناک جھڑکیوں کا زمانہ لد چکا ہے' گردِ سفر سے تو نکار کسی کو آگے نکل جانے والے قافلے سے ہمکنار نہیں کر سکتی' یہ باتیں کل کے لئے زادِ راہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

رجال سیاست پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنی سیاست کی بنیاد محض اپنے ووٹ بنانے' جلسوں کی رونق بڑھانے' لوگوں سے تالیاں پٹوانے' وزیراعظم ہاؤس میں جلد جانے اور اپنے نورتنوں کو فائدہ پہنچانے پر نہ رکھیں' بلکہ پاکستان کے نظریاتی تشخص کے احیاء اور تہذیبی ورثے کی بقاء کو اپنے سیاسی پروگرام میں ترجیح دیں' معیشت کے لئے ایڈہاک ازم نہیں بلکہ ٹھوس اور دُور رس میکانزم تجویز کریں' پروٹوکول کی رنگا رنگیوں اور بھول بھلیوں سے نکل کر اور پریوں اور شہزادوں کے خواب چھوڑ کر انسانی سطح پر اپنا اسلوب حیات ترتیب دیں' "امروز" کی تنگی ترشی لمحاتی ہوتی ہے جبکہ "فردا" کی شکست و شرمندگی کائناتی بن جاتی ہے نہ اسے دماغوں سے نکالا اور نہ کتابوں سے کھرچا جا سکتا ہے۔ سلطنت روما کیوں زوال پذیر ہوئی؟ مغل امپائر رنگیلا شاہی کے نتیجے میں رنگون جا کر کیوں سرنگوں ہوئی؟ صرف اس لئے کہ لوگوں کا "امروز" پر انحصار بڑھ گیا تھا۔ اور "فردا" فراموشی کی صلیب چڑھ گیا۔

(16 اکتوبر 1999ء)

Marfat.com

نہ شیخ شہر، نہ شاعر، نہ خرقہ پوش اقبال

ہمارے دیس میں تو ہر دوسرا شخص شیخ شہر بننے اور کہلانے کو بیتاب ہے لیکن اقبالؒ حکیم الامت ہونے کے باوجود اس دعوے سے گریزاں ہیں کہ وہ شیخ شہر ہیں شائد اس لئے کہ یہاں جو بھی شیخ شہر دیکھا ہے اس کے لہجے میں شیخی اور باتوں میں شوخی کے علاوہ کچھ نہیں ملتا' اس کی مسند کو غور سے دیکھا جائے تو آدھی سے زیادہ غریب کے پیرہن سے بنی ہوتی ہے' اس کے عبا پر پیوند کم اور داغ ندامت زیادہ نظر آتے ہیں' اس کی ساری کرامات کا' دارومدار سرکارِ دولت مدار کی عنایات پر ہوتا ہے' شیخ شہر کو جب بھی دیکھو امیر شہر کی محفل میں نظر آئے گا؟ "عبدہ" کہلانے کی بجائے "نقدہٗ" کمانے کی فکر میں زیادہ سرگرداں رہتا ہے' اس کی وضع قطع سے خلوص کم اور فلوس زیادہ ظاہر ہوتا ہے' ایسے میں دانائے راز (اقبالؒ) کو کیا پڑی ہے کہ وہ شیخ شہر کہلوائے' اسی طرح شاعری کی تمام اصناف پر کامل عبور رکھنے کے باوجود اقبالؒ کو شاعر کہلانے سے وحشت ہوتی ہے' اس قدر وحشت کہ وہ حضور ﷺ سے فریاد کرتے نظر آتے ہیں۔

ے من اے میر اُمم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزلخوانے شمردند

وہ صف شعراء میں بیٹھنے سے کیوں نفور اور نالاں ہیں' شائد اسی لئے کہ شاعری تو ایک "نعمت خداداد" ہے لیکن یہاں "صدارتی ایوارڈ" سے منسلک ہو کر رہ گئی ہے' شاعری تو جزو پیغمبری ہے جبکہ یہاں دریوزہ گری کی ہم قافیہ ہو گئی ہے' شاعری تو صورِ اسرافیل کا آہنگ رکھتی ہے' یہاں کاکل شب رنگ میں الجھ کر رہ گئی ہے' شاعری سے تو قومیں تیغ آبدار کا کام لیتی ہیں لیکن یہاں اس کا کل سرمایہ چشم سرمگیں اور لب و رُخسار ہے' فیلسوف مشرق آخر کیوں شاعر ہونے کی تہمت اپنے ذمے دھریں؟ اقبالؒ کو خرقہ پوش ہونے کا شوق بھی نہیں' جس خرقے کا اندرش اطلس و کمخواب ہو وہ جبۂ مکر تو ہو سکتا ہے خرقۂ فقر ہرگز نہیں؟

اس لئے اقبالؒ ایسی خرقہ پوشی سے انکاری ہے۔

ہاں اگر شیخ وہ ہو جس کا عصا ہر سامریٔ وقت کے لئے عصائے موسوی ثابت ہو تو پھر اقبالؒ سے بڑا شیخ وقت "کوئی نہیں"" اگر شیخ تسبیح بدست نہ ہو پھر بھی رازِ الست فاش کردے

تو اقبالؒ کو شیخ ماننا پڑے گا' گو کہ شیخ مسند نشین ہو مگر سدرہ نشین کا ہمراز ہو تو اقبالؒ کو شیخ کا قلب دینا پڑے گا' خواہ شیخ اونچی کلاہ نہ پہنتا ہو' لیکن خود آگاہ' خدا آشنا اور بلند نگاہ ہو تو اقبالؒ واقعی شیخ نظر آئے گا' چاہے شیخ باقاعدہ حلقۂ ارادت نہ سجاتا ہو لیکن اس کے حلقۂ سخن میں وہ گدا مستقل زیرِ تربیت ہوں جو شاہوں سے زیادہ رسم کجکلاہی جانتے ہوں تو اقبالؒ شیخ ہی نہیں شیخ اکبر کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔

اقبالؒ کو تو وہ شیخ شہر بننا پسند نہیں جو زندگی گزارنا جانتا ہے زندگی سنوارنے کا گر نہیں بتاتا' جس کے پہلو میں دل تو ہے لیکن نمناک نہیں' آنکھیں تو ہیں لیکن غمناک نہیں' حق ہو کی ضرب تو مارتا ہے' لیکن کسی کا لہو نہیں گرنے پاتا' جو نان جویں تو کھاتا ہے لیکن بازوئے حیدری نہیں رکھتا' مراقبے کا ماہر ہے لیکن مشاہدے سے محروم ہے' باتیں بنانے کا ہنر تو رکھتا ہے' لیکن ممولے کو شہباز سے لڑانے کا فن نہیں جانتا۔

اقبالؒ تو عمر بھر ایسے شیخ کا قائل اور مرید رہا ہے' جو کہتا ہے۔

؎ من آں علم و فراست باپرِ کاہے نمی گیرم
که از تیغ و سپر بیگانه سازد مردِ غازی را
اگر یک قطرهٔ خوں داری' اگر مشت پرے داری
بیامن با تو آموزم طریق شاہبازی را

اقبالؒ مسلم الثبوت شاعر ہے' اقبالؒ کی اس حیثیت سے کون انکاری ہو سکتا ہے؟ اقبالؒ لاکھ کہیں

؎ که برمن تہمت شعر و سخن بست

اس کے باوجود کون اس پر یقین کرے گا' لیکن مسئلہ پھر وہی ہے کہ شاعری صرف بت تراشی کے لئے وقف نہ ہو بلکہ خار اشگافی پر ابھارنے والی ہو۔

ایک شاعری تو وہ ہے کہ محبوب کی رُخسار کے تل پر سمرقند و بخارا بخشیں کیا جا رہا ہے اور

؎ من قبلہ راست کردم برطرف کجکلاہے

جیسے مصرعے موزوں کئے جا رہے ہیں اور کہیں جنس دو عالم کو قربان یک تبسم جانانہ کیا جا رہا ہے' اور کبھی مشق ناز کے نتیجے میں خون دو عالم کا بوجھ اپنی گردن پر بخوشی لادا جا رہا ہے' اور کسی جگہ آسوان صحرا ہتھیلیوں پر اپنے سر سجائے شکاری کی تلاش میں ہیں' لیکن اقبالؒ جب آغازِ سخن کرتا ہے تو جہان دیگر کی خبر لاتا ہے۔

؎ مرا بافقر سامان کلیم است

Marfat.com

فر شاہنشہی زیر گلیم است
اگر خاکم بصحرائے نہ گنجم
دل سنگ از زجاج من بلرزد
یم افکار من ساحل نہ ورزد
نہاں تقدیر ہا در پردۂ من
قیامت ہا بغل پروردۂ من
دمے در خو نشتین خلوت گزیدم
جہانے لازوالے آفریدم
"مرا زیں شاعری خود عار ناید"
کہ در صد قرن یک عطار ناید

شاعری اگر بیداری ملت کے لئے ہو' استحکام خودی کے لئے ہو' عرفان نفس اور خود آگہی کے لئے ہو' تو وہ باعث عار اور موجب ننگ کیوں ہو؟

اس اعتبار سے اقبالؒ سے بڑا شاعر خاک ہند سے نہیں اُٹھا' اقبالؒ نے شاعری سے بانگ درا کا کام لیا ہے' انہوں نے شاعری کو بال جبریل دے کر زمین و آسمان کے فاصلوں کو لمحوں کا سفر بنا دیا ہے۔

جس شاعری کو جزوِ پیغمبری اور جس کلام کو الہام کہا گیا ہے' اُس کے بیشتر اور خوبصورت نمونے کلام اقبال میں جا بجا ملتے ہیں' مثلاً

نہاں اندر دو حرفے سر کار است
مقام عشق منبر نیست' دار است
براہیماں زنمروداں نترسند
کہ عودِ خام را آتش عیار است

ایک اور مقام ملاحظہ ہو۔

ہ مسلمانے کہ داند رمز دیں را
نساید پیش غیر اللہ جبیں را
اگر گردوں بہ کام او نہ گردد
بکام خود بہ گرداند زمیں را

یہ رنگ بھی دیکھنے کے لائق ہے

ہ قلندر میل تقریرے نہ دارد
بجز ایں نکتہ اکسیرے ندارد

Marfat.com

ازاں کشت خرابے حاصلے نیست
کہ آب از خون شبیرے نہ دارد

اس شاعری پہ الہام کا گمان نہ گزرے تو اور کیا ہو؟

می شود پردۂ چشم پر کاہے گاہے
دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے
وادی عشق بسے دُور و راز است ولے

غزل اس اعتبار سے بہت بدنام ہے کہ اس کا سارا لف و نشر گل و بلبل اور عارض و کاکل سے مرتب ہوتا ہے اقبال نے بھی رنگ تغزل باندھا ہے۔

لیکن اس میں وہ متانت' اور بلندی ہے کہ اس کے سامنے غزل کی اباحیت شرما شرما جاتی ہے۔

موج را از سینۂ دریا گسستن می تواں
بحر بے پایاں بجوئے خویش بستن می تواں
می تواں جبریل را کنجشک دست آموز کرد
شہپرش باموئے آتش دیدہ بستن می تواں
اے سکندر! سلطنت نازک تر از جام جم است
یک جہاں آئینہ از سنگے شکستن می تواں

اقبالؒ کو پڑھ کر یہ اندازہ بلکہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ شیخ وقت ہے اگرچہ تسبیح بدست نہیں اور شاعر ہفت زباں ہے گو کہ اسیر زلف بتاں اور مرید پیر مغاں نہیں۔

رہی یہ بات کہ "نہ خرقہ پوش اقبال" تو اس سے مراد خرقہ پوشی سے عداوت نہیں بلکہ خرقہ پوشی کی آڑ میں کم کوشی سے نفرت ہے' جس طرح بادشاہ تاج کے بغیر نامکمل ہوتا ہے اسی طرح فقیر بھی خرقہ کے بغیر ادھورا ہوتا ہے' ہر خرقہ پوش فقیر نہیں ہوتا' لیکن ہر صاحب فقر خرقہ پوش ہوتا ہے' اس کی گدڑی میں وہ وہ لعل و گہر ہوتے ہیں جو تاج شہی میں بھی نہیں ملتے' فقیر کو جو پوستین میں لذتِ یقین ملتی ہے وہ شاہوں کو کبھی خلوتِ رنگیں میں بھی نصیب نہیں ہوتی' اقبالؒ کو اصرار صرف اس بات پر ہے کہ

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

یعنی جو اچھی چائے بنانا اور پینا سیکھ لے ضروری نہیں کہ وہ ابو الکلام آزادؒ بھی بن جائے' خرقہ دلیل فقر ہے اور اقبالؒ کا وجود فقر کے لئے حوالۂ معتبر ہے' فقر کا تانا بانا بے نیازی' خود اعتمادی' اور غیرت و معرفت سے تیار ہوتا ہے' اس لحاظ سے ہمارے ممدوح کی شخصیت ان

Marfat.com

چار عناصر ترکیبی سے بنی ہے' فقر غربت کا نام نہیں غیرت کا نام ہے' فقر حیلہ سازی نہیں بے نیازی ہے' فقر فریاد نہیں کرتا خود اعتماد بناتا ہے' اور فقر رہبانیت نہیں معرفت کا گر سکھاتا ہے' اقبالؒ کو جس فقر سے آگاہی ہے اور وہ جس منزل فقر کا راہی ہے۔ تو پھر خرقہء فقر پہننے کا سب سے زیادہ حقدار اقبالؒ نظر آتا ہے۔ فقر کیا ہے؟ اقبالؒ سے پوچھئے

چیست فقر اے بندگان آب و گل
یک نگاہ راہ بیں' یک زندہ دل
فقر خیبرگیر بانان شعیر
بستہء فتراک او سلطان و میر
گرچہ اندر بزم کم گو بہ سخن
یک دم اُو گرمی صد انجمن
بے پراں را ذوق پروازے دہد
پشہ را تمکین شہبازے دہد
با سلاطیں در فتد مردِ فقیر
از شکوہ بوریا لرزد سریر
حکمت دیں دل نوازی ہائے فقر
قوتِ دیں بے نیازی ہائے فقر

ہمارا عنوان سخن تھا' نہ شیخ شہر' نہ شاعر نہ خرقہ پوش اقبالؒ لیکن حقائق کی رو سے اقبالؒ شیخ وقت بھی نظر آتے ہیں' صدر نشین ہیں اور خرقہ بھی قامت اقبالؒ پہ راست آتا اور زیب دیتا ہے اس لئے کہ اقبالؒ

فقیر راہ نشین است و دل غنی دارد

اقبالؒ فقر کو غلام قبا اور درویشی کو محتاج دلق و کلاہ نہیں سمجھتا' اس کے نزدیک ان کے بغیر آدابِ فقر سے آگہی نصیب ہو سکتی ہے

اقبال قبا پوشد دو کارِ جہاں کوشد
دریاب کہ درویشی با دلق و کلا ہے نیست

خرقہ پوشی کارِ دگر اور خرقہ فروشی چیزے دیگر! اقبالؒ اس فرق کو خوب سمجھتا ہے۔

بیا کہ دامن اقبال را بدست آریم
کہ او از خرقہ فروشان خانقاہے نیست

(23 اپریل 1996ء)

Marfat.com

کیامذہبی جماعتیں ناکام ہیں؟ واقعات و حقائق کی روشنی میں

مندرجہ بالا سوال اور عنوان کا واضح مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہبی جماعتیں جو اس وقت سیاسی عمل کا حصہ ہیں اور High Profile میں ہیں وہ اپنے اہداف کے حصول میں کامیاب رہی ہیں یا نہیں؟ غالبًا یہ نہیں پوچھا جارہا کہ مذہبی جماعتیں اپنے فقہی پیروکار بڑھانے میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہیں؟ یامدارس کے قیام میں کامیاب یا ناکام ہوئیں ہیں؟

ہمارے تجزیے کے مطابق دینی سیاسی جماعتیں نہ تو ہر اعتبار سے ناکام ہوئی ہیں اور نہ ہی انہیں کوئی قابل ذکر کامیابی نصیب ہوئی ہے' ان کی ناکامی کے چند اسباب خارجی ہیں اور کچھ داخلی! سارا قصور دینی جماعتوں کا بھی نہیں اور سارا الزام عوام پر بھی نہیں دھرا جاسکتا' تالی بجی ضرور ہے لیکن دونوں ہاتھوں سے! ایک ہاتھ سے تالی بجتے ویسے بھی کسی نے نہیں دیکھی۔

اگر ایک لمحے کے لئے سیاسی کامیابی اور ناکامی سے ہٹ کر دیکھا جائے تو دینی جماعتیں اس لحاظ سے کامیاب رہی ہیں کہ آج جتنا کچھ اسلام کا چرچا' دین اور شعائر دین سے رغبت' خوف خدا کے مظاہر' صوم و صلوٰۃ کا چرچا' مساجد و مدارس کی رونقیں' دینی علوم کی اشاعت' بنیادی اسلامی عقائد' واخلاق کی تبلیغ و ترویج اور کفرو شر کے خلاف مزاحمتی رویہ پاکستان میں نظر آتا ہے وہ انہی جماعتوں کی موجودگی' ان کی بساط بھر جدوجہد اور ناسازگاری ماحول کے باوجود مسجد و محراب سے وابستگی کے سبب ہے' اگر ان کی کوشش سے خیر اس قدر فروغ نہیں پاسکا تو شر کے ابلاغ و فروغ کی جس بڑے پیمانے اور جن بے تحاشا وسائل کے ساتھ منصوبہ بندی ہوئی ہے اور اس مقصد کے لئے جتنی بین الاقوامی اور مقامی کوششیں ہوئی ہیں اور ہر طرح کے ذرائع بروئے کار لائے گئے بحمد اللہ اتنا پھیلا نہیں' یہ دین کا معجزہ بھی ہے اور دینی جماعتوں کا مجاہدہ بھی! اگر یہ جماعتیں بھی نہ ہوتیں' تو بہت کچھ متوقع تھا' کیونکہ حکمرانوں' افسروں' نو دولتیوں اور ذہنی و ثقافتی غلاموں نے اس قوم کا مزاج بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی' پہلے ان اسباب کا ذکر کیا جائے گا جو مذہبی جماعتوں کی سیاسی ناکامی پر داخلی اعتبار سے اثر انداز ہوئے ہیں اس کے بعد خارجی عوامل کو بیان کیا جائے گا۔

Marfat.com

پہلا داخلی سبب یہ ہے کہ ہماری دینی سیاسی جماعتیں سیاسی بنیادوں پر تشکیل پذیر نہیں ہوئیں، ان کا ڈھانچہ فرقہ واریت اور فقہی مسلک پر استوار ہے ان میں صرف---- جماعت اسلامی---- کا استثناء ہے، لیکن باقی جماعتیں پہلے فقہی اور مشربی جماعتیں ہیں بعد میں سیاسی!

اس وقت سیاسی میدان میں سرگرم عمل دینی جماعتیں پانچ ہیں۔

جماعت اسلامی، جمعیت علماء پاکستان، جمعیت اہل حدیث، جمعیت علماء اسلام اور تحریک جعفریہ، جماعت اسلامی ایک وسیع المشرب دینی سیاسی جماعت ہے جس کے دستور، منشور، اور لٹریچر میں کہیں کسی مشرب، فقہ اور فرقے کا ذکر نہیں، جبکہ باقی جماعتوں کے دستور میں مسلک و مشرب کی تخصیص اور وضاحت نہیں لیکن عملی طور پر جمعیت علماء پاکستان بریلوی مکتب فکر کی نمائندہ سیاسی جماعت ہے، جمعیت اہل حدیث جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اہل حدیث مسلک کی نمائندگی کرتی ہے، جمعیت علماء اسلام صرف اور صرف دیوبندی حنفی، افراد کا پلیٹ فارم ہے اور تحریک جعفریہ اپنے نام کی مناسب سے ملت جعفریہ یعنی شیعہ فقہ کی سیاسی تعبیر و تصویر ہے۔

اس وقت ہم ہر دھڑے اور گروہ کا تفصیلی تجزیہ پیش نہیں کریں گے، کیونکہ ہر جماعت دو یا اس سے زائد دھڑوں میں منقسم ہے، لیکن ساخت پر داخت وہی مسلکی ہے، جب ان جماعتوں کی تشکیل ہی فقہی اور مسلکی ہے تو وہ ملک میں ایک بڑے سیاسی انقلاب یا بہت بڑی سیاسی فتح اور کامیابی کی توقع کیسے کر سکتی ہیں؟

بالغرض عملی مذہبی رجحان رکھنے والے بریلوی حضرات اپنے سارے ووٹ اپنی جماعت کے لئے وقف کر دیں تو بھی ممکن نہیں کہ وہ اپنی جماعت ---- جمعیت علماء پاکستان------ کو واضح اکثریت دلا سکیں، کیوں کہ لاکھوں بریلوی مشائخ عظام سے وابستہ ہیں اور مشائخ کی ایک بڑی تعداد یا تو سیاست سے الگ تھلگ ہے، یا وڈیرہ سیاست کی قائل ہے یا پھر مختلف سیاسی پارٹیوں سے وابستہ ہے، مخدوم آف ہالہ، پیر رانی پور، پیر پگاڑو، وغیرہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے وابستگان کی تعداد لاکھوں میں ہے اور سارے بریلوی ہیں یہ لوگ میلاد، گیارہویں اور دوسری رسوم میں تو بریلوی ہیں لیکن سیاسی اعتبار سے ان کی حمایت کبھی بھی ---- جمعیت علماء پاکستان----- کو حاصل نہیں رہی، بلکہ یہ اور دوسرے مشائخ یا تو پیپلز پارٹی کے ساتھ ہیں یا مسلم لیگ کے حامی یا پھر مقامی سیاست میں مقامی تقاضوں اور مفادات کے تحت اپنی رائے ظاہر اور استعمال کرتے ہیں اسی پر پنجاب کی معروف گدیوں پاک پتن، گولڑہ، مہار شریف، مٹھن کوٹ چورہ، وغیرہ کو قیاس کیا جا سکتا ہے، جہاں بریلوی

Marfat.com

نقطۂ نظر رکھنے والوں کا یہ حال ہو تو جمعیت علماء پاکستان کو کوئی دیوبندی' کوئی اہل حدیث اور کوئی شیعہ کیوں کر ووٹ دے گا؟

جمعیت علماء اسلام کا احوال بھی اس سے مختلف نہیں' چونکہ اس جماعت کا نام ہی ----- جمعیت علماء اسلام----- ہے یعنی علماء کی جمعیت' اب عوام تو ویسے ہی اس سے الگ نظر آتے ہیں زیادہ سے زیادہ وہی لوگ اسے ووٹ دیں گے جو علماء کے حلقۂ اثر میں ہوں گے' عام دیوبندی عام سیاسی جماعتوں سے وابستگی اختیار کرے گا' اور اس نے کی ہوئی ہے' یہاں بھی وہی مشکل ہے کہ سارا دیوبند بھی اس کی پشت پر آجائے تو پاکستان میں دیوبندی مسلک کی اوسط اور شرح کیا ہے؟ بنا بریں جمعیت علماء اسلام کی موجودہ ساخت خود اس کی محدودیت کی دلیل ہے۔

جمعیت اہل حدیث اور تحریک جعفریہ نے تو اپنے ناموں ہی سے اپنا مدعا اور اپنا عندیہ پیش کر دیا ہے' جمعیت اہل حدیثوں کی ہے اور تحریک شیعوں کی!

نمازی اور غیر نمازی' باریش اور بے داڑھی سبھی اہل حدیث ایک جگہ جمع ہو جائیں اور اسی طرح جعفری' زیدی' اثنا عشری' سبھی شیعہ متحد ہو جائیں اور دونوں گروہ اپنے اپنے مسلک کی نمائندہ جماعت کی پشت پناہی کریں تو بھی ان جماعتوں کی پارلیمنٹ کی نمائندگی بڑھ تو سکتی ہے مگر جسے کامیابی کہا جاتا ہے اس سے ہمکنار ہونا مشکل بلکہ ناممکن ہے جس طرح کی کھلی کامیابی پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کو حاصل ہوتی ہے۔

دراصل یہ مذہبی جماعتیں نہیں بلکہ پریشر گروپس ہیں' اور جو کردار کسی پریشر گروپ کا ہوتا ہے اب تک اس سے بھی محروم ہیں' ہاں اگر ساری دینی جماعتیں ایک نکتے پر اور ایک پلیٹ فارم پر آجائیں تو پھر یہ "پریشر گروپ" کا رول بخوبی ادا کر سکتی ہیں' دوسرا سبب یہ ہے کہ یہ جماعتیں بظاہر تو سیاسی ہیں اور ان کے صف اول کے رہنما بھی سیاسی ایشوز پر بات کرتے ہیں' لیکن سیکنڈ اور تھرڈ لائن قیادت اپنا سارا زور خطابت' زور قلم اور زور بیان اختلافی مسائل پر خرچ کرتی ہے ان کے جلسے جلوس اور مظاہرے زیادہ تر مسلکی نوعیت کے ہوتے ہیں' اہل حدیث علماء مقلدین پر برستے نظر آتے ہیں' دیوبندی مقرر بریلویوں کی خبر لے رہے ہوتے ہیں' بریلوی مساجد کے لاؤڈ سپیکر دیوبندیوں کے خلاف شب و روز کھلے رہتے ہیں' اور اسی طرح سنی شیعہ مناظرے بھی آئے روز کا معمول ہیں۔ جب صورتحال یہ ہو گی تو عوام الناس اور بالخصوص اپنے وابستگان کے اندر سیاسی بیداری اور سیاسی شعور کا کام کیوں کر ہو پائے گا؟

Marfat.com

تیسرا سبب یہ ہے کہ ان تمام دینی جماعتوں کو زیادہ تر کام مواد (Raw Material) مدارس سے ملتا ہے' اور مدارس میں رائج نصاب اور طریق تدریس اور تربیت ذہنی اور استعداد فکری یہ سب چیزیں مل کر مدرس' مناظر' مفتی' خطیب' قاری تو تیار کرتی ہیں لیکن سیاسی شعور رکھنے والی کھیپ سامنے نہیں آتی' اگرچہ مدارس میں تفسیر' حدیث' فقہ' علم الکلام' منطق' فلسفہ' ادب' سب کچھ پڑھایا جاتا ہے لیکن دراصل یہ تعلیم اور تیاری اپنے فریق مخالف کو شکست دینے کے لئے اور اپنے مسلک پر راسخ کرنے کے لئے ہوتی ہے صرف اور صرف دین اسلام کے دماغ اور فروغ کے لئے نہیں' یہی وجہ ہے کہ ہمارے مذہبی لٹریچر میں دوسرے فرقوں کے رد اور ابطال پر زیادہ زور ہوتا ہے بنیادی اسلامی مسائل اور عالم کفر کی سیاسی و ثقافتی یلغار کے خلاف بہت کم مواد شائع ہوتا ہے' ان مدارس سے جب ایسے ذہن اور لوگ تیار ہو کر اپنی سیاسی جماعت کو سپورٹ فراہم کرتے ہیں تو اس سے ان کی جماعت کو نیا فرقہ وارانہ خون تو مل جاتا ہے مگر سیاسی ورکر اور سیاسی مزاج نصیب نہیں ہوتا' جن دنوں میں یہ مضمون لکھا جا رہا ہے محرم کے ایام ہیں ان ایام کی سرگرمیاں دیکھ لی جائیں تو ہماری بات کی تصدیق ہو جائے گی' ان دنوں فلسطین اور اسرائیل کی آویزش ہے' مذاکرات تعطل کا شکار ہیں' اسرائیلی بستی کی تعمیر یو این او تک میں زیر بحث ہے اس کے خلاف عالمی سطح پر قرار دادیں آچکی ہیں جنہیں امریکہ ویٹو کر چکا ہے' کشمیر پر بھاری دباؤ بدستور ہے' امریکہ دہشت گردی کی آڑ میں پاکستان کا قافیہ تنگ کر رہا ہے' پاک بھارت معاملات کو پوری دنیا حیرت و استعجاب کے ساتھ ساتھ دلچسپی سے دیکھ رہی ہے روس اور چین امریکہ کی بالادستی سے کھلے عام انکار کر رہے ہیں اور عالمی طاقت کا نیا توازن ترتیب دے رہے ہیں' افغانستان کے حالات نئی کروٹ لے چکے ہیں' وغیرہ لیکن ان دنوں سنی شیعہ جلسوں اور مجلسوں کی رپورٹ منگوالی جائے مجال ہے جو کسی نے ان موضوعات پر عوام کو شعور دینے کی کوشش کی ہو' وہی پرانے موضوعات اور وہی اگلے مناظرے زینت سخن بنے رہے' جب منظر یہ ہو تو مذہب سے دلچسپی رکھنے والے سامعین اور کارکنان کیوں کر سیاسی میدان میں اگلے مورچوں پر لڑ سکیں گے؟

چوتھا سبب یہ ہے کہ دینی جماعتوں کی تمام تر تگ و تاز کا مقصد شریعت کا نفاذ' اسلام کا غلبہ اور قرآن و سنت کی بالادستی ہے جو بظاہر ان کی زبان سے سنائی دیتی اور ان کے منشور میں لکھی ہوئی دکھائی دیتی ہے' لیکن یہ عظیم مقصد عظیم الشان شخصی و اجتماعی' اور فقہی و مسلکی قربانی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا جہاں کیفیت یہ ہو کہ دینی جماعتوں کی حریف کوئی سیکولر سیاسی جماعت نہ ہو بلکہ ایک نہ

Marfat.com

ایک مذہبی جماعت ہو تو اس سے ملی یکجہتی اور ایثار و قربانی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور یہی کچھ ہمارے ملک میں ہو رہا ہے ایک سے زائد بار ہماری دینی جماعتوں نے سیاسی اتحاد کیا مگر آپس میں نہیں بلکہ کسی نے پی پی پی کے ساتھ' کسی نے مسلم لیگ کے ساتھ' کسی نے تحریک استقلال کے ساتھ' اور کسی نے نیپ (اب اے این پی) کے ساتھ' اور ایک بار اگر ملی یکجہتی کونسل کے دور میں دینی سیاسی اتحاد کی بات چلی تو اتحاد کی تشکیل تو نہ ہو سکی البتہ اختلاف فکر و نظر کے باعث ملی یکجہتی کونسل تحلیل ہو کر رہ گئی۔

مندرجہ بالا داخلی اسباب ہمارے نزدیک سیاسی کامیابی کی راہ میں حائل رہے ہیں اور رہیں گے جب تک کہ ارباب مذہب ان پر ہمدردانہ غور کر کے انہیں دور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

اب آتے ہیں خارجی اسباب کی طرف' جن پر دینی جماعتوں اور مذہبی راہنماؤں کا کوئی زور نہیں چلتا اور وہ ایسے ناموافق ماحول میں گھر کر رہ گئے ہیں کہ جب تک عوام اپنے معیار قیادت' پیمانہ خیر و شر اور انداز فکر و نظر پر نظر ثانی نہیں کرتے اس وقت تک میزان سیاست میں موجودہ باٹوں سے تلنے والی مذہبی جماعتیں کبھی بھی کامیاب نہیں کہلا سکتیں'

خارجی عوامل میں پہلی توجہ طلب بات یہ ہے کہ جب سے انگریز نے برصغیر میں قدم جمائے اس نے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا کہ وہ ہر زاویے سے دین اور رجال دین کو بے وقعت بنا دے' اور بالخصوص سیاسی قیادت کے لئے علماء کو نااہل ثابت کرے' چنانچہ وہ دن اور آج کی گھڑی سیاسی حوالے سے لوگوں میں یہ بات راسخ ہو چکی ہے کہ سیاسی قیادت کو بہرحال سیکولر ہونا چاہئے' (سیکولر سے ہماری مراد خدانخواستہ بے دین اور ملحد نہیں بلکہ عام دنیا دارانہ قیادت ہے) یعنی سیاسی قیادت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ دین سے آگاہ ہو' نماز روزے کی پابند ہو' سچ جھوٹ میں تمیز کرتی ہو' ہر حال میں لوگوں کی خوشنودی حاصل کر سکے' ووٹ بیچنے اور خریدنے میں اسے عار نہ ہو' پولیس اور سرکاری محکموں کی ملی بھگت اور ان کی خوشامد سے اسے عار نہ ہو وغیرہ اب ظاہر ہے دینی جماعتیں لاکھ پتلی ہو جائیں وہ کسی صورت دینی اقدار و روایات سے منحرف نہیں ہو سکتیں' دینی رہنما وہ خرید و فرخت نہیں کر سکتے جن کی چھوٹ دوسروں کو حاصل ہوتی ہے' مذہبی جماعتوں کے ہاں بہرحال سچ اور جھوٹ' غلط اور صحیح' جائز اور ناجائز کی بہرحال تمیز ہوتی ہے' اور اگر یہ لوگ اسے نظر انداز کریں تو پبلک ان کا محاسبہ کرتی ہے جب کہ دوسرے لوگ بالعموم ان چیزوں سے مستثنیٰ

Marfat.com

سمجھے جاتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ سیاست برادری اور پیسے کا کھیل بن کر رہ گئی ہے' اور ''مولوی بیچارہ'' ان دونوں خوبیوں سے محروم تھا' محروم ہے اور غالباً محروم رہے گا' دینی رہنما منبرو محراب پر قبائلی تعصب کے خلاف بات کرتے ہیں 'کیونکہ اسلام خود ایسی عصبیت کو ''نخوت جاہلیہ'' قرار دیتا ہے' تو انہیں برادری کی بنیاد پر کون سپورٹ کرے گا؟ یہی حال پیسے کا ہے' پیسہ نہیں ہے تو ووٹ کوئی نہیں دیتا' اگر حلال و حرام دونوں ذرائع سے یہ جماعتیں پیسہ جمع کرلیں تو پھر نفرت کی سانگ پر چڑھادی جاتی ہیں کہ ان کا ''قال'' دیکھو اور ''حال'' دیکھو' جان مجنون کو ہمیشہ دوگونہ عذاب لاحق رہتا ہے دوسرے سیاسی زعماء کے لئے تقریباً تمام راستے کھلے رہتے ہیں' کواپریٹو سوسائٹیوں کو لوٹنا' بیرونی سودوں میں کمیشن کھانا' بنک ہڑپ کرنا' منشیاب کے ذریعے پیسہ کمانا' رسہ گیری سے مال بنانا' انگریز کی عطا کردہ جاگیروں کا ماحاصل اور دیگر بے شمار ذرائع سے ''یافت'' پیدا کرنا' جہاں مقابلہ ایک اور لاکھ کے تناسب سے ہو وہاں بیچارے ''ملا'' پر وہی مثال صادق نہیں آئے گی تو کیا آئے گی کہ ''گنجی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا؟''

تیسری بات یہ ہے کہ حکومتیں صدیوں سے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں اور حکومتی وسائل و ذرائع بھی' جو طبقہ پہلے دن محروم تھا آج بھی تہی دست ہے اور جس کی پہلی سے ہی پانچویں انگلیاں گھی میں تھیں' اب اس کا سر بھی کڑاہی میں ہے' جہاں بڑے بڑے سیاسی انقلاب آئے ہیں وہاں قیادت کا معیار بدلا ہے جیسے روس' چین اور اب ایران وغیرہ ورنہ ہر دور میں ایک ہی طبقہ سیاسی طور پر بالادست رہا ہے' یعنی صاحب جاگیردار' اگر سیاست زرو مال کے ساتھ بندی رہے گی تو مذہبی لوگوں کو کیا پذیرائی ملے گی؟ ہاں معیار قیادت بدل جائے سیاست کو شعور' علم' اور کردار سے منسلک کردیا جائے تو پھر امکان ہے کہ نئی قیادت ابھرے وہ مذہبی بھی ہوسکتی ہے اور دانشور قیادت بھی! جب کہ ابھی تک علم و دانش کو سیاسی ترازو میں رتی ماشے کا وزن بھی حاصل نہیں' رونا صرف یہ نہیں مذہبی جماعتیں کامیاب نہیں ہوتیں بلکہ اصل المیہ تو یہ ہے کہ علم و دانش ہمیشہ ہارتے ہیں' اور پیسہ اور سرکاری اثر و رسوخ جیت جاتا ہے' اربابِ زر حکومت میں ہوں یا اپوزیشن میں ان کے اثر و رسوخ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور اصحابِ علم و دانش اگر کبھی ایوان حکومت میں داخل ہوئے ہیں تو بھی علم و دانش کے زور پر نہیں' بلکہ خدایان زر و مال کی سفارش اور فرمائش پر داخل ہوئے ہیں۔

Marfat.com

چوتھی بات یہ ہے کہ ہمارے عوام کا معیار قیادت ابھی تک واضح نہیں ہو سکا کہ وہ کس قسم کی قیادت چاہتے ہیں' جاگیردار قیادت' صنعتکار قیادت' علمی و فکری قیادت' نظریاتی قیادت' یا کچھ اور' کیونکہ کہ یہاں قیادت کی جتنی قسمیں بھی سامنے آئیں' اور عوام نے جنہیں اپنی آنکھوں پر بٹھایا' معلوم نہیں ہو سکا کہ معیار قیادت کیا ہے؟ بلدیاتی ممبرشب سے کر ایوان بالا کی رکنیت تک' عجیب مخمصہ ہے۔

اگر عوام چاہتے ہیں کہ ہمارا نمائندہ ایسا ہو جو

- تھانے کچہری کے کام آئے۔
- جو جائز و ناجائز دونوں ذرائع سے ہمیں نوازے
- ہمارے لئے روزگار اور اولاد و اقرباء کے لئے ملازمت کا بندوبست کرے۔
- ہمیں کسی بات سے نہ روکے اور نہ کسی حرکت پر ٹوکے۔
- جو صرف جھوٹے وعدوں اور پُر فریب نعروں سے پُر جوش رکھ سکے۔
- جو فرفر انگریزی بولتا اور تھری پیس سوٹ زیب تن کرتا ہو علی ہذا القیاس تو اس تناظر میں دینی جماعتیں ظاہر ہے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں اور اگر معیار اصول و نظریات' کردار وعمل' دین سے وابستگی' قومی غیرت' شخصی خودداری اور امریکہ و یورپ کی غلامی سے نجات ہے تو پھر دینی رہنماؤں کو ضرور زیر غور لایا جائے بشرطیکہ وہ اپنی ناکامیوں کے داخلی اسباب کو دور کریں اور اپنی صفوں میں وہ تبدیلیاں لائیں جو ایک بالغ نظر قیادت کیل ئے ضروری ہیں۔

(3 اکتوبر 1998ء)

Marfat.com

قائداعظمؒ کیسا پاکستان چاہتے تھے؟

اس نقطۂ نظر کی ایک سے زائد تعداد جو تقریباً اجماع کے درجے میں شامل ہے' کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ بانی پاکستان کے سامنے پاکستان کے قیام کا مقصد ایک ---- عظیم اسلامی ریاست---- کا قیام تھا' اور اس کی سب سے بڑی دلیل دو قومی نظریے کا پرچار اور چرچا ہے' اور دو قومی نظریے کی اساس و بنیاد بجز اسلام کے اور کچھ نہیں تھی' اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ ہندو ایک الگ قوم ہے اور مسلمان ایک جداگانہ قوم! چنانچہ جب بعض اہل اسلام نے وطن کو قومیت کی بنیاد ثابت کرنا چاہا تو مصورِ پاکستان علامہ اقبالؒ نے بلاتوقف وطن کے پیرہن کو مذہب کے کفن سے تعبیر کیا' اور بانی پاکستان نے بڑے مضبوط استدلال کے ساتھ ثابت کیا کہ قومیت کی جو بھی تعریف متعین کی جائے مسلمان بہرحال ایک الگ قوم کے معیار پر پورے اترتے ہیں' خواہ ایک خطے میں کثرتِ آبادی کو معیار بنایا جائے' تہذیب و تمدن کو پیمانہ قرار دیا جائے' زبان اور رسم رواج کو بنائے قومیت سمجھا جائے یا کوئی دوسرا بیرومیٹر ایجاد کیا جائے مسلمان ایک الگ قوم نظر آئیں گے۔

پاکستان کے قیام کی ایک تعبیر بعض مخصوص حلقوں کی طرف سے یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ قائداعظم کے ذہن میں ایک اسلامی پاکستان کا نہیں بلکہ سیکولر پاکستان کا خاکہ تھا' یہ علمی بحث بھی اپنی تمام ترکج فکری اور کوتاہ نظری کے باوجود بہرکیف ایک عرصے سے چل رہی ہے' ایک خیال یہ بھی ہے کہ پاکستان کا وجود کسی نظریاتی پس منظر میں نہیں بلکہ خالصتاً معاشی حوالے سے' مسلمانان ہند کی ایک ضرورت کا درجہ اختیار کرگیا' اس لئے کہ ہندو نے ایک طرح سے معاشی اجارہ داری قائم کررکھی تھی جس سے اسلامیان ہند زبردست محرومی اور استحصال کا شکار بنے ہوئے تھے' اس حلقے کا ایک اپنا طرزِ استدلال ہے' لیکن غالب اور درست نقطۂ نظر اول الذکر موقف ہے کیونکہ جتنی صراحت اور وضاحت قائداعظم کی تقریروں' پریس کانفرنسوں' اخباری بیانات' نجی گفتگوؤں اور انٹرویو میں اول الذکر موقف کی تائید و تصوب میں نظر آتی ہے وہ دوسروں میں ہرگز نہیں' اور اس کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے دور دراز گوشوں میں بسنے والے مسلمانوں کا تحریک

پاکستان کے لئے جوش اور ولولہ اور قیام پاکستان کا والہانہ خیر مقدم اور قائداعظم کی پُرشکوہ قیادت پر متفقہ اعتماد و اتفاق صرف اور صرف اسلامی تشخص کے حوالے سے تھا ورنہ کروڑوں مسلمانوں کو اس وقت تو "سیکولر" کا معنی ہی نہیں آتا تھا کجا کہ وہ سارے پس منظر اور محرکات سے آگاہ ہوتے' پشاور سے راس کماری تک کے مسلمانوں کا ردِ عمل اور وہ بھی خوشگوار ردعمل اسلامی جذبے اور دینی عقیدے کی بنیاد پر تھا نہ کہ کسی شخصی مفادات اور معاشی مراعات کے باعث! خلافت کا ادارہ جب تک موجود رہا جو اگرچہ اہل اسلام کے لئے کسی سیاسی' روحانی' معاشی اور نظریاتی تقویت کا موجب نہیں تھا پھر بھی نفسیاتی اعتبار سے ان کے لئے ایک بڑا سہارا تھا' جب خلافت تحلیل کر دی گئی' تو اہل اسلام میں پھر سے Nostalgia کا جذبہ توانا ہو گیا' اور ایک ایسے الگ خطے اور تشخص کی ضرورت دو چند ہو گئی جس کا سارا تانا بانا اسلام سے ترتیب دیا گیا ہو' جو نظریاتی مرکز ہو' اور جسے دنیا بھر میں----- اسلامی ریاست--- کا عمدہ نمونہ اور اسلامیان عالم کی آرزوؤں کا مظہر کہا جا سکے۔

اگر مسئلہ محض ایک "سیکولر پاکستان" کا ہوتا جو اسلامی احکام و تعلیمات کا تجربہ گاہ نہ ہوتا تو پھر ایک بڑے "سیکولر ہندوستان" کے ہوتے ہوئے ایک نسبتاً چھوٹے سیکولر ملک کی کیا ضرورت تھی؟ اگر سر پھوڑنا ہی مقدر ٹھہرا۔

؎ تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو؟

اور اگر معاشی خوشحالی اور اقتصادی ترقی پیش نظر تھی تو بھی جیسے امکانات ایک بڑے ملک میں اس ترقی کے ہو سکتے تھے وہ نسبتاً ایک چھوٹے اور نوزائیدہ ملک میں کیسے ہو سکتے تھے؟ عام مسلمانوں نے تو اپنے معاشی مفادات داؤ پر لگا کر اور بہت سارا خسارا برداشت کر کے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا تھا۔

ہاں اگر مسلمانوں کو متحکم مرچنٹ کلاس اور جاگیرداروں کے مفادات کا تحفظ مقصود تھا۔ تو یہ کوئی ایسا اعلیٰ نصب العین نہیں ہو سکتا جس کے لئے جان' مال اور آبرو کی قربانی دی جاتی' لیکن اس سب کچھ کے باوجود یہ بحث ہنوز جاری ہے کہ پاکستان کا جذبۂ محرکہ ایک اسلامی فلاحی مملکت کا قیام تھا یا ایک ویسٹرن لبرل سٹیٹ؟

اس بحث کو علمی دائرے میں اور پھیلایا جا سکتا ہے' حلقۂ علم و دانش میں اس پر موافق و مخالف آراء پیش کی جا سکتی ہے اور مختلف سیاسی مکاتب فکر اس پر اپنے اپنے تحفظات پیش کر سکتے ہیں' مگر اس وقت جو پاکستان کی دینی' سیاسی' اور اقتصادی حیثیت ہے یہ کم از کم اقبالؒ کے خواب کی

تعبیر اور قائدؒ کے افکار کی تصویر ہرگز نہیں پہلی بحث میں تو اختلاف کی ہزار گنجائشیں نکل سکتی ہیں بشرطیکہ شائستہ عنوان اور مہذب اور معقول استدلال کے ساتھ بات ہو لیکن کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا۔

پاکستان کو تو اسلامیان ہند کے لئے ٹھوس تشخص فراہم کرنا تھا کجا کہ آج پاکستان خود اپنے تشخص سے محروم نظر آتا ہے۔

کہنے کو تو اسلامی جمہوری پاکستان ہے لیکن ہمارے حکمرانوں کے لئے اسلام ایک الزام کے درجے پر رہ گیا ہے' رہ گئی جمہوریت تو اس کا حال نہ اپنوں سے پوشیدہ ہے اور نہ عزیزوں سے مخفی!

پاکستان کا جذبۂ محرکہ "سیکولر سٹیٹ" کا قیام ہی مان لیا جائے جس کا مفہوم آزادی فکر اور رواداری بیان کیا جاتا ہے تو یہ آزادی فکر اور رواداری کس شعبے میں ہے؟ نہ سیاسی سطح پر رواداری نظر آتی ہے اور نہ مذہبی حلقوں میں اس کا عکس ملتا ہے۔ رہ گئی آزادی فکر اس کا تو نام و نشان نہیں البتہ آوارگیٔ فکر کے مظاہر و مناظر ہر قدم پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اسی طرح پاکستان کے قیام کا جواز معاشی خوشحالی اور غیروں کے استحصال سے نجات ہی کو تسلیم کر لیا جائے تو بھی بات بنتی نظر نہیں آتی' عام آدمی کے لئے معاشی و اقتصادی حالات آج بھی وہی ہیں جو متحدہ ہندوستان کے وقت تھے۔ صرف استحصال کرنے والوں کے نام اور ان کے کاروبار کی نوعیت بدلی ہے' استحصال بدستور جاری ہے' یہ کہنا اور تسلی دینا کافی نہیں کہ پہلے ہندو بنیا استحصال کرتا تھا مگر اب ایک مسلمان صنعتکار اور جاگیردار استحصال کر رہا ہے محض اس لئے اس استحصال کو "مشرف بہ اسلام" سمجھ لیا جائے' اور ایک گونہ دل کو بہلا لیا جائے۔

کسی سیاسی دانشور اور مفکر سے نہیں ایک عام آدمی سے پوچھ لیا جائے کہ قائداعظمؒ کیسا پاکستان چاہتے تھے؟ اور ٹی وی پر ان کی تصویروں کے ساتھ دکھائے جانے والے اقتباسات سے کیسے پاکستان کی تصویر سامنے آتی ہے؟ تو وہ بلا توقف یہ جواب دے گا کہ علامہ اقبالؒ نے ایک ایسے پاکستان کا خواب دیکھا تھا' قائداعظمؒ نے ایک ایسے پاکستان کی تحریک برپا کی تھی اور اسلامیان ہند نے ایک ایسے پاکستان کے لئے اپنا سب کچھ نذر کر دیا تھا' جس پاکستان میں کسی بادشاہ' وائسرائے' چودھری' اور رئیس کا قانون نہیں بلکہ اللہ و رسولؐ کا قانون نافذ ہو گا جو ہر ایک کو عزتِ نفس' مساوات' اور انصاف کی ضمانت فراہم کرے گا۔

جس پاکستان میں چند خاندانوں کی سیاسی و معاشی اجارہ داری نہیں ہو گی بلکہ ہر شخص کو اس

کی ذہنی و علمی اور فکری و فنی صلاحیت کے مطابق ترقی کے مواقع میسر آئیں گے' جس پاکستان کا اقتدارِ اعلیٰ اس کے عوام کے پاس ہو گا نہ کہ باہر کی طاقتیں اس پر اپنا حق حاکمیت جتائیں گی۔

جس پاکستان میں ایسی تفریق اور ایسے امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں ہو گی کہ حکمرانوں کی اولاد ہمیشہ حاکم رہے گی اور ہاری کا بیٹا ہاری رہے گا۔

جس پاکستان میں افراد نہیں بلکہ ادارے مضبوط ہوں گے تاکہ جس کا جو بھی حق بنتا ہے اسے بلا تردد مل جائے' اس کا حق بہت بڑا احسان سمجھ کر اسے نہ لوٹایا جائے' تمام بحثوں سے قطع نظر یہی وہ پاکستان تھا جسے قائداعظمؒ نے حاصل کرنا چاہا اور حاصل کیا لیکن پچاس برس قبل دیکھا جانے والا خواب ابھی تشنۂ تعبیر اور پردۂ ذہن پر ابھرنے والا خاکہ محتاج تکمیل ہے' گویا تشکیل پاکستان کا ایک معرکہ سر ہوا ہے' تکمیل پاکستان کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔

(19 اگست 1996ء)

اسلام اور بنیادی انسانی حقوق

اسے ذہنی مرعوبیت کہئے' احساس کمتری سمجھئے یا فیشن کا نام دے لیجئے' بہرحال ہمارے ہاں یہ روش ایک عرصے سے چل نکلی ہے کہ کوئی مسئلہ ہو' اصطلاح ہو' یا کوئی حوالہ اور جملہ' جو مغرب سے ہمارے ہاں پہنچے ہم اُسے فوراً حرزِ جاں اور وردِ زباں بنالیتے ہیں' اور یوں محسوس کرتے ہیں کہ گویا یہ ایک الہام ہے جسے نقل کرنا' جس کی پیروی کرنا اور جسے عام کرنا ہمارے بنیادی فرائض میں شامل ہے' اس کے باوجود ہم سینہ پھلا کر کہتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں' ۱۹۴۷ء کے بعد صرف ہمارے حکمران بدلے ہیں اذہان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی' ہمارے بالائی طبقوں اور لٹریری حلقوں کے مزاج و نفسیات پر آج بھی پوری طرح مغرب چھایا ہوا ہے' ہماری رولنگ کلاس بین الاقوامی مارکیٹ میں مغربی مفادات کی دلالی' بالائی طبقات یورپی فیشن کی نقالی اور لٹریری سرکل مغربی خیالات کی جگالی کرتا ہے' آخری حلقے یعنی دانشوروں میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو فکری طور پر اقبالؒ کی طرح اپنے دینی ورثے' تاریخی اثاثے اور تہذیبی سرمائے پر فخر کرتے ہوں' ہمارا یہ رویہ بہرحال قابل رشک اور اعتماد افزا نہیں۔

مغرب نے ریاست اور کلیسا کو الگ کیا تو ہم نے فوراً دین اور سیاست کی جدائی کا راگ الاپنا شروع کر دیا' مغرب نے آزادی نسواں کی بات کی تو ہم نے بلا توقف اپنے تہذیبی و خاندانی ڈھانچے پر تیشہ چلانا شروع کر دیا' مغرب نے سودی معیشت کو فروغ دیا تو ہم نے قرآن و حدیث سے ایسی معیشت کے حق میں دلائل فراہم کرنے شروع کر دیئے' مغرب نے اخلاق و اقدار کے نئے پیمانے گھڑے تو ہم فی الفور اپنی اخلاقیات کے سانچے توڑنے پر آ گئے' حد یہ کہ الفاظ و محاورات اور اصطلاحات تک میں ہم مغرب کے ذہنی گداگر بن گئے' مثال کے طور پر مشہور فرانسیسی مفکر نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "سوشل کنٹریکٹ" یعنی معاہدہ عمرانی میں ایک جملہ لکھا۔

"انسان آزاد پیدا ہوا تھا مگر وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔"

بس یہ فقرہ ہمارے اربابِ دانش اور روشن خیال لوگوں کے لئے ایک الہامی کلام بن گیا' نہ

Marfat.com

جانے یہ جملہ کتنی بار کہاں کہاں نقل کیا گیا' اسے مجموعۂ اقوال زریں میں سرفہرست رکھا گیا' اس ایک فقرے سے کتنی تحریروں کا آغاز کیا گیا' اور کتنی تنظیموں نے اسے اپنا "ماٹو" قرار دیا یہ جملہ ۱۷۵۰ء میں روسو کی زبان اور قلم سے نکلا' لیکن جدید مفکرین کو یہ خیال نہ آیا' کہ اس سے کہیں زیادہ بلیغ' فصیح اور پر اثر جملہ روسو سے تقریباً گیارہ سو سال قبل یعنی ۶۴۱ کے لگ بھگ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے اس وقت ادا کیا تھا جب مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاصؓ کے بیٹے نے ایک بار ایک قبطی کو بلاوجہ مارا تھا آپ نے گورنر کے بیٹے کو سرعام کوڑے لگوائے اور ساتھ ہی گورنر کو غضب آلود نگاہوں میں دیکھتے ہوئے فرمایا۔

مَتٰی اسۡتَعۡبَدۡتُمُ النَّاسَ وَقَدۡ وَلَدَتۡهُمۡ اُمَّهَاتُهُمۡ اَحۡرَارًا

ترجمہ: "تم نے کب سے لوگوں کو اپنا غلام بنانا شروع کیا ہے جبکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا۔"

مجال ہے ہمارے (بظاہر) روشن خیال دانشوروں نے کسی بھی جگہ یہ جملہ نقل کیا ہو' ہر جگہ رُوسو کے جملے کی دھوم مچی ہوئی نظر آتی ہے' ہمیں رُوسو سے کوئی کد نہیں لیکن اس کا یہ جملہ بذاتِ خود حضرت عمرؓ کے ارشاد کا چربہ بلکہ سو فیصد ترجمہ ہے۔ کوئی انوکھا اور تخلیقی فقرہ نہیں' یہ مثال محض یہ واضح کرنے کے لئے دی گئی' کہ ہم ہر واقع کو مغرب کی آنکھ سے دیکھتے' ہر خیال کو مغرب کے دماغ سے سوچتے' ہر جملے کو مغرب کے کان سے سنتے اور ہر حرف و لفظ کو مغرب کی زبان سے بولتے اور قلم سے نقل کرتے ہیں۔

چنانچہ آج جو پوری دنیا میں بنیادی انسانی حقوق کا چرچا ہے' ہم ان حقوق کا پہلی بار شعور حاصل کرنے' پھر اس شعور کو عام کرنے اور ان کی بنیادی دستاویز لکھنے اور ان کی حفاظت اور نگہبانی کا سارا خراج مغرب کو دیتے ہیں' گویا مغربی تہذیب کے فروغ اور غلبے سے پہلے اس روئے زمین پر نہ کوئی انسان رہتا تھا اور نہ اس کے کوئی حقوق تھے' ان حقوق کا علم و ادراک اور ترتیب و شعور تو بعد کی بات ہے۔

اگر ہم روسو' ہیگل' کانٹ' نٹشے' رسکن' سپنگلر' فرائڈ' وغیرہ کے بھاری بھرکم نام لے کر لوگوں پر رعب جمانے کے بجائے سنجیدگی اور متانت سے قرآن حکیم اور سیرتِ نبویؐ کا مطالعہ کرتے تو وہ سب کچھ آج ہمارے کاسۂ دماغ اور دامن فکر میں ہوتا جو ہم بھیک کے طور پر مغرب سے مانگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

Marfat.com

اصولاً اور عملاً اسلام اور اہل اسلام بنیادی انسانی حقوق کے شروع دن سے نہ صرف علمبردار بلکہ محافظ رہے ہیں لیکن آج ان حقوق کی جملہ اجارہ داری مغرب کے نام لکھی جا چکی ہے' اور مغرب اس مسئلے کو ہر اس قوم اور ملک کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہے جہاں اس کے سیاسی اور معاشی مفادات خطرے میں ہوں' اگر کسی جگہ ایسا نہ ہو تو اس کے نزدیک کہاں کے انسان اور کہاں کے حقوق۔ راوی ہر طرف چین ہی چین لکھتا ہے' خطۂ فلسطین ہو یا وادی کشمیر' شیشستان کے پہاڑ ہوں یا بوسنیا کا برف پوش علاقہ' وہاں مغرب کا نیا چہرہ سامنے آتا ہے۔

مغرب کے اسی فکری و عملی تضاد کے باعث بنیادی انسانی حقوق کا شور اور چرچا جس قدر بڑھ رہا ہے ان حقوق کی پامالی بھی اسی رفتار سے روز افزوں ہے' اس کا جوہری سبب اس قوتِ نافذہ کی کمی اور شعور کے نہج کا فقدان ہے جو انسان کے بنیادی حقوق کی حفاظت کو یقینی بنا سکتا ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جس زمانے میں یورپ انسان اور حیوان کے فرق سے ناآشنا تھا' یورپ میں باقاعدہ اکھاڑے لگتے تھے اور زندہ انسانوں پر بھوکے درندے چھوڑے جاتے تھے' بات بات پر زبان تالو سے کھینچی جاتی تھی' ہتھوڑوں سے انسانی جبڑے توڑے جاتے تھے' انسانی جسم پر تارکول مل کر اسے آگ دکھائی جاتی تھی' اور انسان کو سزا کے طور پر برف زاروں میں منجمد کر دیا جاتا تھا' اسی زمانے میں اسلام نے بنیادی انسانی حقوق کا نہ صرف تصور دیا' بلکہ اسے ایک الٰہی اور الہامی ضابطے کے طور پر پیش کیا اور پہلی بار رعایا اور حاکم کے بنیادی حقوق کے درمیان فرق کو عملاً منسوخ کر دیا' اور ولقد کرمنا بنی آدم "اور بلاشبہ ہم نے انسان کو تکریم بخشی" نیز لقد خلقنا الانسان فی احسنِ تقویم "بے شک ہم نے انسان کو بہترین قالب میں ڈھالا۔" جیسے انقلابی اور انسانیت نواز افکار سے روشناس کر دیا۔

مغرب کے ہاں بنیادی انسانی حقوق کا سارے کا سارا سرمایہ اور ماخذ و سرچشمہ کنگ جان (King John) کا وہ "میگنا کارٹا" ہے جسے والٹیر نے حالات کے خاص پس منظر میں "منشور آزادی" قرار دیا' اور واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ عہد تاریک میں برطانیہ' فرانس' جرمنی' وغیرہ مغربی ممالک میں انسانوں کے ساتھ سیاسی و سماجی اور معاشی سلوک ہوتا رہا اس اعتبار سے اس "میگنا کارٹا" کے مندرجات میں عوام کے حقوق کا واضح شعور اور تحفظ موجود نہیں بلکہ یہ دستاویز دراصل یورپی امراء (Barons) اور بادشاہ کے درمیان ایک بقائے باہمی کے معاہدے کی ہے' پھر بھی جس کے ماحول میں اسے بادِ بہاری کا جھونکا نہ سہی لُو کا تھپیڑا قرار دیا جا سکتا ہے جس سے گھٹن میں

Marfat.com

خاصی کمی آئی، یہ میگنا کارٹا ۱۲۱۵ء کو جاری ہوا، اس کے بعد اہل مغرب نے بڑے وقفے کے بعد ایک سماجی زقند لگائی ٹام پین (Tom Paine) نے ایک پمفلٹ "حقوق انسانی" کے نام سے شائع کیا اس پمفلٹ نے بہرحال مغربی دنیا کے جمود زدہ ماحول میں زبردست ارتعاش پیدا کیا، یہ ۱۷۳۷ء سے ۱۸۰۹ء کے درمیانے عرصے کی بات ہے۔

اگلے مرحلے میں انقلاب فرانس کے بطن سے انسانی حقوق کا شعور جنم لیتا ہے۔ "منشورِ حقوق انسانی" نامی دستاویز ۱۷۸۹ء میں اشاعت پذیر ہوتی ہے، اس دستاویز کی ترتیب کا محرک رُوسو کا "معاہدۂ عمرانی" بنا، اس کے ذریعے انسانی حقوق کا شعور نسبتاً زیادہ واضح شکل میں سامنے آیا، سماجی تاریخ نے اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے بالآخر ۱۹۴۸ء میں وہ چارٹر دنیا کو دیا جسے آج حقوق انسانی کی مستند، مفصل، جامع اور واضح دستاویز کا درجہ حاصل ہے، یہ دستاویز اقوام متحدہ کے ذریعے سامنے آئی، بلاشبہ یہ دستاویز بہت اہم اور دور رس ہے، اور عصر حاضر میں بنیادی انسانی حقوق اجاگر کرنے میں اس کا مثبت کردار ہے۔

یہ دستاویز تیس دفعات پر مشتمل ہے، یہاں مقصود ہر دفعہ کی تنقیح اور تائید و تردید نہیں تاہم قابل ذکر نکات یہ ہیں۔

1۔ ہر انسان کا وقار و حقوق میں مساوی حیثیت کا حامل ہونا۔
2۔ نسل، رنگ، زبان، وطن، جنس اور مذہب کے حوالے سے ہر نوع کے امتیاز کی نفی۔
3۔ غلامی کا خاتمہ۔
4۔ زندہ اور آزاد رہنے کا حق۔
5۔ قانون کی نظر میں مساوات۔
6۔ نجی اور گھریلو زندگی کی ضمانت۔
7۔ حصول شہریت کا حق۔
8۔ عائلی زندگی کی آزادی۔
9۔ جائیداد کا تحفظ۔
10۔ اظہارِ رائے اور عقیدے کی آزادی۔
11۔ اجتماع اور تنظیم کا حق۔
12۔ ثبوتِ جرم کے بغیر سزا کی نفی۔

13۔ نقل مکانی کی اجازت۔

14۔ ٹریڈ یونین ازم (وغیرہ)

اس قدر جامع اور مفصل دستاویز اور اس پر درجنوں ممالک کے دستخط ہونے کے باوجود ان برسوں کا مشاہدہ یہ بتاتا ہے' کہ اقوام متحدہ کا چارٹر وہ مقاصد حاصل نہیں کر سکا جو اسے مطلوب تھے' اس کے کیا اسباب ہیں؟ یہ ہم آگے چل کر بتائیں گے اس موقع پر ایک نظر اسلام کے عطا کردہ بنیادی انسانی حقوق پر ڈال لی جائے' آج جس اسلام کو سب سے زیادہ "رجعت پسند" اور "جنگ جو" ثابت کیا جا رہا ہے' اس اسلام اور پیغمبر اسلامؐ اور صحیفۂ اسلام (قرآن مجید) نے سب سے پہلے بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ ان حقوق کا ذکر کیا' جامع تصور دیا' اور انہیں نافذ کر کے دکھایا۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ حقوق اس وقت دنیا کو عطا ہوئے جب یورپ تو ملکی اندھیرے میں تھا ہی' ایران و روم جیسی روشن خیال ریاستیں بھی ان حقوق سے ناآشنائے محض تھیں' بلکہ ان کے ہاں انسان مستقل طور پر تین خانوں میں بٹے ہوئے تھے' اعلیٰ اوسط اور ادنیٰ اعلیٰ درجے کے لوگ شاہی خاندان کے افراد تھے' متوسط طبقہ امراء کا تھا اور ادنیٰ مخلوق کا نام رعایا تھا' شاہی خاندان خدائی تحفظات رکھتا تھا' امراء کے لئے بے پناہ مراعات تھیں اور رعایا کے مقدر میں کوڑے' رسوائی' توہین' ذلت' غلامی اور تعزیر! اسلام کے دیئے ہوئے بنیادی انسانی حقوق کا تصور اور خاکہ قرآن و سنت دونوں میں موجود ہے' اور ان دونوں سرچشموں میں اتنی صراحت اور تفصیل ہے کہ جب ہم اقوام متحدہ کا چارٹر پڑھتے ہیں تو وہ قرآن و حدیث کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے یا اگر کوئی اسے زیادہ ہی "مذہبی عقیدت" اور "دینی جوش" کا نام دے تو کم از کم ادبی زبان میں اسے "توارد" ضرور کہا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک ہی خیال دو مختلف مصادر سے ابھرے۔

ویسے بھی یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اسلام ایک منظم ریاست تشکیل دے' عدل و تقویٰ پر اسے استوار کرے' اور اجتماعی فلاح کے حوالے سے اپنا نظام چلائے اور پھر انسان کے بنیادی حقوق سے صرف نظر کرے'؟ چنانچہ اسلام نے ایسا نہیں کیا' بہت سی تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے ہم ان بنیادی حقوق کا تذکرہ کرتے ہیں جو قرآن مجید میں درج ہیں' اور نص قطعی کا درجہ رکھتے ہیں' جن آیات میں ان حقوق کا ذکر ہے کسی مفسر کے استنباط کا نتیجہ نہیں بلکہ صریحاً وہ حقوق موجود ہیں جن کا تحفظ مطلوب ہے' رازی و زمخشری کو درمیان میں لائے بغیر ہر وہ شخص جو محض قرآن مجید کو ناظرہ پڑھ اور اس کا ترجمہ دیکھ سکتا ہے خود ہی اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ آیات محض وعظ و تلقین اور حصول ثواب کے لئے نہیں اتریں بلکہ ان کا ماحصل اور مدعا

Marfat.com

انسان کو اس کے بنیادی حقوق سے آگاہ کرنا اور ریاست کو ان حقوق کی ادائیگی کا پابند بنانا ہے۔

○ **تحفظ جان**

"جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے (یعنی قصاص) یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کی زندگی بچالی۔" (المائدہ: ۳۲)

علاوہ ازیں قرآن مجید میں اور متعدد آیات موجود ہیں جن میں قتل و ہلاکت کی ہر شکل کو ناجائز قرار دیا گیا۔

○ **تحفظ ملکیت**

"اور تم باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ۔" (البقرہ: ۱۸۸)

○ **تحفظ ناموس**

"اے نبیؐ، مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، اور مومن عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔" (النور: ۳۰۔۳۱)

○ **تحفظ چہار دیواری**

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو۔" (النور: ۲۷)

○ **شخصی آزادی**

"کسی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے غلام بن جاؤ۔" (آل عمران۔ ۷۹)

○ **تحفظ عقیدہ و ضمیر**

"دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں صحیح اور غلط کی چھانٹی کر دی گئی ہے۔" (البقرہ: ۲۵۶)

○ **حق مساوات**

"اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو اللہ کے نزدیک معزز صرف پرہیز گار ہے۔ (الحجرات: ۱۳)

Marfat.com

○ **حصول انصاف**

"اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل قائم کروں۔ (الشوریٰ: ۱۵)

○ **بے لاگ عدل**

"کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ عدل کرو۔"
(المائدہ: ۸)

○ **تحفظ حاصل محنت**

"انسان کے لئے کچھ نہیں مگر وہ جس کی اس نے سعی کی۔" (النجم: ۳۹)

○ **سیاسی زندگی میں شرکت کا حق**

"اور مسلمانوں کا کام آپس میں مشورے سے چلتا ہے۔" (الشوریٰ: ۳۸)

○ **تنظیم و اجتماع کا حق**

"تم میں ایک گروہ ضرور ایسا ہونا چاہئے' جو نیکی کی طرف بلائے' بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔" (آل عمران: ۱۰۴)

○ **کفالت کا حق**

"اور ان کے مال میں سائل اور محروم کا ایک حق مقرر ہے۔" (الذاریات: ۱۹)

○ **آزادی تقریر و تحریر**

" اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان لو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کی اس کو خبر ہے۔" (النساء: ۱۳۵)

○ **ثبوت کے بغیر مؤاخذہ سے تحفظ کا حق**

" بہت گمان کرنے سے بچو بعض گمان بجائے خود گناہ ہے اور خواہ مخواہ تجسّس نہ کرو۔" (الحجرات: ۴۹)

○ **مذہبی دلآزاری سے تحفظ کا حق**

"ان کو برا بھلا نہ کہو جنہیں یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں پس وہ جہالت کے باعث اللہ کو برا بھلا کہیں گے۔"

ان تصریحات کے بعد یہ کہنے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ الہامی مذاہب پوجاپاٹ' رسوم و شعائر اور عبادت و ریاضت کے طریقے بتاتے ہیں جبکہ امورِ دنیا کی ادائیگی کے لئے انسان خود

Marfat.com

ہی ضابطہء کار طے کریں نیز مذہب خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہے اس کا معاشرتی زندگی' امورِ ریاست اور سیاست سے کیا واسطہ؟

مغرب نے انسانی حقوق کے حوالے سے جتنا بھی سفر کیا ہے وہ اس لئے رائیگاں جا رہا ہے کہ اس نے انسان کے حقوق واضح تو کر دیئے مگر انہیں دوسروں پر عائد اور نافذ کون کرے؟

یہاں ایک بہت بڑا خلاء ہے جسے کم از کم موجودہ سیکولر اور خود سر مغرب پورا نہیں کر سکتا وہ یہ کہ انسان کبھی اپنے جیسے انسان کے حقوق کی نگہبانی نہیں کر سکتا' اس لئے کہ قدم قدم پر انسانی مفادات ٹکراتے ہیں' غلاموں کے جو مفادات اور حقوق ہیں وہ آقاؤں کے خلاف جاتے ہیں' آقا کیوں کر ان کا لحاظ کرے گا؟ نسلی تفاخر میں مبتلا قومیں کیسے دوسری قوموں کے بنیادی حقوق کی پاسداری کر سکتی ہیں؟ مغرب والے جنہوں نے صدہا سال تک اہل مشرق کو غلام بنائے رکھا وہ انہیں بنیادی حقوق کس خوشی میں دیں گے؟ سرمایہ دار اپنے مزدور اور جاگیردار اور اپنے مزارع کے بنیادی حقوق کس طرح تسلیم کر سکتا ہے؟

ان بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت صرف وہ دین' مذہب' یا ضابطہء حیات دے سکتا ہے۔ جو اپنے پیروکاروں کی جماعت ان خطوط پر استوار کرتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے آنے والی زندگی میں موجودہ زندگی کے ہر عمل کا حساب لیا جائے گا' انسان اپنی حیات اور موت کا مالک و مختار نہیں بلکہ اس کی زندگی اور موت ایک برتر ہستی یعنی اللہ کے قبضہء قدرت میں ہے' اللہ نے انسان کو ایک ہی قالب میں ڈھالا' نسل' وطن' رنگ' زبان جیسے اعتبارات بے معنی ہیں' کوئی انسان دوسرے انسان کا حاکم' مولا' کارساز' رازق' خالق' مالک نہیں سبھی انسان خدا کے بندے ہیں' اسلام نے یہی تصورِ حیات اپنے ماننے والوں کو عطا کیا' چنانچہ جب اس نے بنیادی انسانی حقوق کا چارٹر مرتب کیا تو یہ چارٹر فرد کا فرد کے درمیان یا ریاست کے امراء کے درمیان' یا حکومت کا رعایا کے درمیان اور یا مختلف حکومتوں' ملکوں اور قوموں کا دوسری حکومتوں اور قوموں کے درمیان معاہدہ نہیں بلکہ یہ الٰہی حقوق ہیں' جن پر عمل کرنا ہر انسان پر واجب ہے' اس میں کسی شاہ و گدا کی اور پیغمبر و امتی کی تخصیص نہیں' اس تصورِ حقوق کے پس منظر میں صاف نظر آتا ہے' کہ انسان اپنے جیسے انسان کے بنیادی حق کو تسلیم اور اسے ادا نہیں کر رہا ہوتا بلکہ وہ خدا کے حقوق پورے کر رہا ہوتا ہے' جو اللہ کی طرف سے اپنے ہر بندے پر عائد کئے گئے ہیں۔

لیکن وہ معاشرہ جو اپنے امور زندگی میں خود مختاری کے شوق میں مبتلا ہو جیسا کہ مغرب ہے وہاں اور اس کی سفارشات کی بناء پر دوسرے معاشرے میں انسان کے بنیادی حقوق کاغذوں میں تو محفوظ رہ سکتے ہیں کارگاہ عمل میں ہرگز نہیں' اسی کا نتیجہ آج ہم دیکھ رہے ہیں' اہل

Marfat.com

مغرب اور مغرب کے "فکری مرید" یہ کہتے کہ جب کوئی بات یورپ سے اٹھتی ہے اس وقت اسلامی دانشوروں اور علماء کو یاد آتا ہے کہ قرآن میں تو یہ بات پہلے آچکی ہے' اسلام تو اس بارے میں یہ ہدایت پہلے دے چکا ہے اور سنت میں تو اس کا ذکر پہلے سے موجود ہے' یہ اعتراض کسی حد تک درست ہے' لیکن اتنا بھی نہیں کہ شرم کے مارے سر جھکا لیا جائے۔

بات یہ ہے کہ اہل اسلام مغرب کو پڑھا لکھا سمجھتے ہیں اور اس کی دیانت و امانت کے چرچے سے متاثر ہوتے ہیں وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ مغرب اسلامی تعلیمات' قرآنی احکام' اور دینی لٹریچر سے اتنا نابلد نہیں ہو گا' وہ یہ نہیں کرے گا کہ ایک بات واضح اور ظاہر ہے پھر بھی ڈنڈی مارنے سے کام لے لیکن جب مغرب اور اس کے ذہنی غلاموں کی تان اس پر آکر ٹوٹتی ہے کہ مذہب چلا ہوا کارتوس ہے' دین از کار رفتہ چیز ہے' اسلام کو عصر حاضر کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے' زندگی کے تمام شعبوں میں مغرب سے رہنمائی حاصل کرنی چاہئے' وغیرہ تو پھر ضرورت پیش آجاتی ہے کہ ہر قدم پر انہیں بتلایا جائے کہ یہ بات جو تم کر رہے ہو کوئی نئی اور انوکھی نہیں بلکہ جگالی کر رہے ہو' یہ سب کچھ صدیوں پہلے ہو چکا ہے' یا تو تمہیں پتہ اب چلا ہے یا پھر کتمان حق کا مظاہرہ کرتے ہو۔

اوپر جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے ظاہر ہے وہ سبھی قرآن مجید میں موجود ہیں کسی اسلامی مفکر اور دینی عالم نے آج یا اس سے کچھ عرصے پہلے قرآن مجید میں داخل نہیں کیں' لیکن آج جو اقوام متحدہ کے چارٹر کو آسمانی صحیفہ اور الہامی دستاویز قرار دے کر پوری دنیا کو سر پر اٹھایا گیا ہے ایسے موقع پر صورتِ واقع کو واضح کرنا ضروری ہو جاتا ہے ان آیات کے علاوہ حضور ﷺ کا خطبۂ حجتہ الوداع بنیادی انسانی حقوق کے حوالے سے حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے' اب قیامت تک کوئی فلاسفہ اور مفکر اس کی تشریح تو کر سکتا ہے اضافہ ہرگز نہیں کر سکے گا۔

آج مغرب کو جس دانش پر بڑا ناز ہے اور دانش کی اس ترنگ میں وہ ادارہ و شعور بخشنے والے خدا کو بھی بھول بیٹھا ہے اسے معلوم ہونا چاہئے' کہ اس کا صدیوں کا اجتماعی شعور اب بھی اس کا محتاج ہے کہ وہ نبوت کے نور سے اخذ فیض کرے' تبھی جوہر آدمیت کو آب اور شعورِ انسانیت کو تاب نصیب ہو گی۔

(20 جولائی 1996ء)

نہ ہر کہ چائے بنو شد ابو الکلام شود

سپریم کورٹ کی طرف سے قومی اسمبلی کی تحلیل کے خلاف دائر کی گئی بے نظیر بھٹو کی رٹ مسترد ہونے اور صدارتی فیصلہ برقرار رکھنے کے اگلے روز معاصر اخبار میں ایک جواں سال کالم نگار نے اپنے کالم کا عنوان باندھا ہے "جیت کر بھی ہارنے والی عدالت"

مذکورہ کالم میں یونان کی عدالت کے فیصلے اور تاریخ کے لافانی کردار سقراط کی سزا کو زیر بحث لایا گیا ہے' جس میں ثابت کیا گیا عدالت اور اُس کے کسی جج کا نام تاریخ میں احترام نہ پا سکا مگر سقراط آج بھی زندہ ہے' اس کالم میں کہیں بھی پاکستان کی عدالت عظمیٰ اور بے نظیر بھٹو کا ذکر نہیں لیکن کالم کی اشاعت کی "ٹائمنگ" صاف پتہ دے رہی ہے کہ بین السطور میں سپریم کورٹ یونان کی عدالت ہے اور بے نظیر بھٹو اپنے وقت کی "سقراط" جن کا جرم صرف "بے گناہی" ہے' بلاشبہ تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات رونما ہوئے جس کے نتیجے میں۔

مقتول تا ابد رہا قاتل نہیں رہا

کی کیفیت سامنے آئی' لیکن "بھٹوز" کو اُس صف میں کھڑا کرنا جہاں سقراط ابو حنیفہ" احمد بن حنبل' ابن تیمیہ" مجدد الف ثانی" احمد اللہ شاہ مدراسی" فضل حق خیر آبادی" شیخ الہند" سید قطب" عبد القادر عودہ" محمد علی جوہر" اور مولانا مودودی" جیسے لوگ نظر آتے ہوں' اس سے بڑھ کر اصول نظریے' حمیت' استقامت' حریت اور شہادت کی توہین کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا' کوے کی دم میں آفتاب کی کرن ٹانکنے کا محاورہ ایسے ہی موقع پر استعمال ہوتا ہے' جہاں سقراط اور بھٹو کو تاریخ کے ایک ہی چبوترے پر کھڑا کرنے کی سعی مشکور کی جائے' کوئی دانشور اور تاریخ کا طالب تو کجا عقل عام رکھنے والا شخص بھی اس فرق سے آگاہ ہوتا ہے' کہ ہر بھوکا پیاسا روزہ دار نہیں ہوتا' ہر سر تراشیدہ قلندر نہیں بن جاتا' ہر عطائی ڈاکٹر نہیں مانا جاتا' ہر چائے پینے والے کو ابو الکلام آزاد" نہیں کہا جاتا اور ہر پھانسی پانے والے کو شہید کا رتبہ نہیں مل جاتا تو پھر ہر زہر پینے والے کو سقراط کے پہلو میں کیسے بٹھایا جا سکتا ہے؟ زہر خورانی کے مرتکب بیسیوں لوگ خودکشی کے مجرم قرار پاتے ہیں۔

Marfat.com

امام ابو حنیفہؒ برسوں جیل میں رہے تو کیا ہر قیدی کو "امام اعظمؒ" کے لقب سے یاد کیا جائے؟ امام احمد بن حنبلؒ نے بھرے بازار میں کوڑے کھائے تو اس کا یہ معنی لیا جائے کہ قذف اور تہمت کی بناء پر کوڑوں کی سزا پانے والا ہر مجرم احمد بن حنبلؒ کہلانے کا مستحق ہے؟

آئمہ اہل بیت میں سے اکثر جلاوطن ہوئے تو پھر ہر بھگوڑے کو تاریخ میں وہی مقام ملنا چاہئے؟ مجدد الف ثانیؒ قلعۂ گوالیار میں نظر بند رہے' تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہی قلعے کا ہر قیدی باہر نکلتے ہی "مجدد الف ثانی" بن جائے گا۔

محمد علی جوہرؒ خالقدنیا ہال میں لگنے والی عدالت کے کٹہرے میں ایک سے زیادہ بار بطور ملزم کھڑے دکھائی دیئے گویا عدالتی کٹہرے میں کھڑے ہونے والے ہر ملزم کو جوہرؒ کے برابر قرار دے دیا جائے؟ غازی علم الدینؒ نے راج پال کو قتل کر کے پھانسی پائی اور شہید کا اعزار پایا' کیا اس کے بعد تمام سزائے موت پانے والوں کو "غازی علم الدین شہیدؒ" کے نام سے پکارا جائے؟ ہرگز نہیں' ہر واقعے کا پس منظر مختلف ہوتا ہے' بنائے استدلال جدا ہوتی ہے' سزا کی نوعیت اور ہوتی ہے' اور کردار منفرد ہوتا ہے' حامد کی پگڑی زبردستی محمود کے سر پر نہیں باندھی جاسکتی' یونان کی عدالت اور اسمبلی نے سقراط کے ساتھ جو ناانصافی کی وہ اپنی جگہ مگر اس ظلم کا کیا جواز ہے کہ سقراط کے ساتھ ان لوگوں کو کھڑا کیا جائے کہ یہ لوگ اگر اس وقت قائد ایوان ہوتے تو سقراط کو صفائی کا موقع دیئے بغیر ہی زہر کا پیالہ پلا دیتے اور اس کی وہ کردار کشی کرتے کہ ایک زمانہ شرم کے مارے آنکھیں نیچی کر لیتا۔

تاریخ کے کچھ حوالے بڑے معتبر ہوتے ہیں اور کچھ خواب بڑے مقدس ہوتے ہیں' ان حوالوں کو جنس بازار بنانے اور ان خوابوں کو دماغوں سے نکالنے سے بڑا نقصان ہوتا ہے' قومیں ان حوالوں سے مدد لے کر آگے بڑھتی اور ان خوابوں کے سحر میں ڈوب کر منزلیں طے کرتی ہیں' اگر یہ حوالے اتنے ارزاں اور یہ خواب ہر جگہ دستیاب ہونے لگے تو پھر خیر و شر کی تمیز مٹ جائے گی' مفاہمت اور مقاومت کا فاصلہ ختم ہو جائے گا' حمیت اور مداہنت کا فرق اٹھ جائے گا' اور عزیمت و ہزیمت کا مفہوم گم ہو جائے گا۔

تاریخ نے سقراط کو اس لئے زندہ رکھا کہ سقراط ایک خدا کی بات کرتا تھا جب کہ پورا یونان صنم کدہ بنا ہوا تھا' سقراط شعور کی بنیاد پر عقیدے کو استوار کرنے کی تلقین کرتا تھا' جبکہ اہل یونان توہمات کو حرف آخر سمجھتے تھے' سقراط شخصی حکومت کے خلاف تھا۔ جب کہ یونان کا بادشاہ خود کو

"دیوتا" قرار دیتا تھا' سقراط جمہور کی زبان بولتا تھا جبکہ یونان کی رولنگ جنٹا اشرافیہ کی ترجمان تھی' سقراط ذہنی بیداری کا علمبردار تھا جبکہ حکومت یونان عوام کو افیون زدہ رکھنا چاہتی تھی' یہ باتیں تھیں جن کے سبب تاریخ سقراط کو نظرانداز نہیں کر سکی اور یہ آدرش تھا جس نے سقراط کو امر کر دیا' لیکن جو شواہد سامنے لائے اور دلائل پیش کئے جا رہے ہیں اس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سقراط کی حکومت کرپشن کے باعث برطرف کر دی گئی تھی اور اس کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا' عدالت نے رٹ خارج کر دی اور تاریخ نے سقراط کو زندہ جاوید بنا دیا' یا سقراط کے والد نے اپنے اقتدار کی خاطر یونان کو دولخت کیا تھا اور پھر پانچ سال تک ایمرجنسی کے زور پر حکومت کی اور عوام کے بپھرے سیلاب نے اس کے اقتدار کو تنکے کی طرح بہا دیا' اور اس کی اولاد میں سے ایک نام سقراط تھا اور وہ تاریخ کا معتبر حوالہ بن گیا' یا پھر سقراط اس لئے عالمی مشاہیر میں جگہ پانے کا اہل بنا کہ اس نے عدالت سے کہا کہ چونکہ میرے حریف نے بھی وہی جرم کیا ہے جو مجھ سے سرزد ہوا ہے۔ لہٰذا اگر اسے سزا نہیں دی گئی تو مجھے بھی معاف کر دیا جائے اگر اس کا عہدہ بحال ہوا ہے تو مجھے بھی بحال کیا جائے' ورنہ میں پھر "پنجاب" اور "سندھ" کی بات کروں گا اور اس انوکھے استدلال پر تاریخ نے سقراط کو "لافانی ہیرو" بنا دیا' ظاہر ہے کوئی عقل مند آدمی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔

سقراط کی سوانح حیات بازار سے مل سکتی ہے اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے' اردو اور انگریزی انسائیکلوپیڈیا میں سقراط کے حالات درج ہیں' فلسفے منطق اور سیاسی لٹریچر میں سقراط پر سیر حاصل بحثیں ملتی ہیں' اور مصلحین عالم پر لکھی جانے والی کتابوں میں سقراط کا تذکرہ بڑی تفصیل سے موجود ہے' یہ سب کچھ اگر پڑھا جائے' تو اس کے ذہنی پس منظر' فکر نقطۂ نظری کردار اور سرگرمیوں کا ایک فیصد بھی "بھٹوز" سے مماثلت نہیں رکھتا' سقراط نے جائیداد کی خاطر کبھی "دوہری شخصیت" کی دستاویزات عدالت میں پیش نہیں کی تھیں' سقراط نے کبھی "سندھ کلب" کی رکنیت اختیار نہیں کی تھی' سقراط نے کبھی شکار کے بہانے حکمرانوں کا قرب حاصل نہیں کیا تھا' سقراط نے ایک "غیر منتخب فوجی آمر" کی کابینہ میں شمولیت نہیں کی تھی' سقراط نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا وزیر بننا کبھی گوارا نہیں کیا تھا' سقراط نے دس برس تک ایک "آمر" کو سیاسی سپورٹ فراہم نہیں کی تھی' سقراط نے "اِدھر ہم اُدھر تم" کا کبھی نعرہ نہیں لگایا تھا' سقراط نے ارکان اسمبلی کی ٹانگیں اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے جرم میں توڑنے کی بات نہیں کی تھی' سقراط نے سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ نہیں سنبھالا تھا' سقراط نے کسی بھی وقت اپنے مخالف "فکس اپ"

کرنے کی پالیسی نہیں اپنائی تھی۔

سقراط نے "ضیاء باقیات" کو اپنی کابینہ اور پارٹی میں اہم عہدے نہیں دیئے تھے' سقراط نے آرمی چیف کو "تمغۂ جمہوریت" سے نہیں نوازا تھا' سقراط نے منتخب حکومت کے خلاف سازش کرکے اسمبلی نہیں تڑوائی تھی' سقراط نے کسی جج کے خلاف بغاوت کا مقدمہ درج کرنے کی ہدایت نہیں دی تھی' سقراط نے اپنے پارٹی ورکر کو کبھی "چیف جسٹس" بنانے کی تجویز نہیں دی تھی' سقراط نے صدر' فوجی سربراہوں' چیف جسٹس اور قائد حزبِ اختلاف اور دیگر اپوزیشن رہنماؤں کے ٹیلی فون ٹیپ کرنے کا حکم جاری نہیں کیا تھا' سقراط نے ایک ہی سانس میں عدالت عظمیٰ کے فیصلے کو "چمک کا نتیجہ" اور "تاریخی فیصلہ" قرار نہیں دیا تھا' اور سقراط نے کبھی مختلف صوبوں میں الگ لیبل لگانے' الگ ماسک چڑھانے' الگ بولی بولنے اور الگ نعرہ دینے کا شیوہ اختیار نہیں کیا تھا' جب سقراط اور "بھٹوز" کی ہر ادا مختلف اور ہر شعار جدا ہے' تو عدالت کی طرف سے اسمبلی اور حکومت کی بحالی کی رٹ مسترد ہونے کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو آناً فاناً کیسے سقراط بن جاتی ہیں اور عدالت عظمیٰ کس طرح یونان کی ہارنے والی عدالت کے مقام پر آجاتی ہے؟

فلک کو برسوں گردش میں رہنا پڑتا ہے تب جا کر خاک کے پردے سے کوئی سقراط نکلتا ہے' ایسے لوگوں کو آسمان خلاک چھان کر ڈھونڈھتا ہے' سقراط جیسے لوگ زمین کا نمک ہوتے ہیں' یہ موتی ساحل کی ریت سے نہیں ملتے انہیں سمندر کی تہہ میں اتر کر پایا جاتا ہے' ایسی روحوں کے لئے قدرت خاص پیکر تیار کرتی ہے' یہ لوگ پیکر تو خاکی رکھتے ہیں لیکن اندیشہ ان کا افلاکی ہوتا ہے' ہر بو الہوس کو "مجنوں" کے ساتھ نہ بٹھایا جائے' یہ صحرائے نجد' آبلہ پائی' آواز جرس اور محمل لیلیٰ کی توہین ہے۔

(2 فروری 1997ء)

Marfat.com

قحط الرجال ------ واقعہ یا واہمہ؟

کل رجسٹرڈ ووٹرز کی تعداد تقریباً پانچ کروڑ سے زائد ہے' یہ اعداد و شمار ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہیں' اگر آئین کے تقاضے کے مطابق دس سال بعد یعنی ۱۹۹۱ء میں دوبارہ مردم شماری ہوتی تو یقیناً ایک ڈیڑھ کروڑ ووٹرز کا اضافہ ہو جاتا' ۶ کروڑ ووٹرز نے قومی اسمبلی کے لئے ۲۱۷ ارکان یعنی ارباب حل و عقد کو منتخب کرنا ہوتا ہے' مگر پوری قوم کے لئے یہ مسئلہ بنا ہوا ہے کہ چھ کروڑ افراد میں سے ایسے ۲۱۷ لوگ تلاش کرنے محال ہو رہے ہیں جن کے علم' کردار' شعور اور ادائیگیٔ فرض کے احساس پر عوام کو اعتماد ہو۔

اتنی بڑی عاقل اور بالغ آبادی میں سے محض ۲۱۷ افراد کا انتخاب جوئے شیر لانے کے مترادف ہو رہا ہے' اب کوئی فرہاد جیسا کوہکن کہاں سے آئے جو پہاڑ کا سینہ چیر کر دودھ کی نہر جاری کر سکے' قحط الرجال کے ضمن میں یہ الجھن کیا امر واقعہ ہے یا محض واہمہ؟

اگر تو پاکستان فی الواقع قحط الرجال کا شکار ہے اور یہ امر واقعہ ہے تو اس سے بڑھ کر مقام افسوس کوئی نہیں دل نہیں مانتا کہ کوئی ملک اتنا بنجر اور کوئی قوم اتنی بانجھ ہو سکتی ہے؟ اور اگر یہ محض واہمہ اور پراپیگنڈہ ہے تو پھر ہر بار وہ لوگ مقننہ میں کیوں پہنچتے ہیں (الا ماشاء اللہ) جو قانون سازی میں مہارت اور دلچسپی تو کجا قانون کے "ق" سے بھی بے بہرہ ہوتے ہیں' اور ہر دفعہ ہر سیاسی جماعت کو الیکشن کے موقع پر انہی لوگوں سے معاملہ اور انہی افراد پر گزارا کرنا پڑتا ہے؟

ہمارے نزدیک اس بات کی کوئی اصل نہیں کہ پاکستان بھر سے محض سوا دو سو ایسے افراد ڈھونڈھنا بہت مشکل ہے جو تعلیم یافتہ ہوں' اعلیٰ سیاسی شعور رکھتے ہوں' مہذب رویے کے حامل ہوں' جن کا کردار عمدہ اور مثالی ہو' جن کی دیانت ضرب المثل ہو' جو اپنے فرض منصبی کے ادراک اور ذمہ داری کے احساس سے بہرہ ور ہوں' اور جنہیں خوف اور لوٹ سے کوئی غرض اور واسطہ نہ ہو' ہمارے ہاں الحمد اللہ ایسے لوگوں کی تعداد سینکڑوں نہیں ہزاروں میں ہے' مگر ہمارا سماجی ڈھانچہ اور سیاسی نظام جن خطوط پر استوار ہے' بدقسمتی سے یہ دونوں چیزیں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔

Marfat.com

ہمارے سماجی ڈھانچے کی بنیاد ------- جاگیرداری ------ ہے' اور ہمارا سیاسی نظام عہد فرنگی اور دورِ غلامی کا بقیہ اور چربہ ہے' ۱۴ اگست ۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جو کچھ ہمارے سپرد کیا ہم نے اسے آیاتِ الٰہی سمجھ کر قبول کر لیا' اور سامری کا بچھڑا جان کر اس کی پوجا شروع کر دی' جب پہلا الیکشن لڑا گیا تو قومی اسمبلی کی رکنیت کو قانون سازی کا فریضہ انجام دینے کی نیت سے نہیں بلکہ حکومتی اداروں میں اثر و رسوخ پیدا کرنے اور علاقے میں اپنی چودھراہٹ قائم رکھنے کی غرض سے لڑا' ہم نے کبھی پلٹ کر دیکھا اور سر جھکا کر سوچا بھی نہیں کہ مقننہ کی رکنیت کے لئے علم اور اہلیت درکار ہے یا لمبی چوڑی جاگیر اور برادری؟ جب یہ حد فاصل اور تمیز خیر و شر پہلے دن ہی ختم ہو گئی تو اس باب میں قحط الرجال جیسا المیہ رونما نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ وہ سارے کام جو حکومتی ادارے اور محکمے کرتے ہیں وہ ارکان اسمبلی نے سنبھال لئے اور جو کام ارکان اسمبلی نے کرنا تھا وہ کون کرے؟ یعنی قانون سازی اور ملکی پالیسوں کی تشکیل! جو لوگ یہ کام کر سکتے تھے وہ کبھی ایوان میں داخل ہونے کے حقدار نہ بن سکے' کیونکہ ہمارا سماجی ڈھانچہ اور سیاسی نظام اس طرح کے "پیدل" اور "لاوارث" لوگوں کو ایوان کی رکنیت دینے کا قائل نہیں' ایک شخص ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتا ہے یا وہ علم کو حاصل اور دیانت کا اہتمام کرے یا پھر پیسہ کمائے اور حرام و حلال کی ہر حد کو پھلانگ جائے' ملک کے سب سے بڑے پالیسی ساز ادارے کے لئے علم اور دیانت درکار ہیں جب کہ اس ادارے کا رکن بننے کے لئے دولت اور برادری ضروری ہے' یہ دونوں چیزیں بیک وقت ایک شخص اپنے لئے کیسے مجتمع کرے؟ اسی الجھن نے قحط الرجال کا تاثر اور واہمہ پیدا کر رکھا ہے۔

ملازمین کی بھرتی تنزلی' ٹرانسفر' ترقی وغیرہ یہ سارے کام حکومتی اداروں کے ہوتے ہیں' لیکن یہ سارے کھکھیڑ ارکان اسمبلی نے سنبھال رکھے ہیں' سڑکوں کی تعمیر و مرمت ہائی وے اتھارٹی کا فرض ہے یہ بھی ارکان اسمبلی نے اپنے ذمے لے رکھا ہے' بجلی کے کھمبوں کی تنصیب اور کنکشن یہ واپڈا کی ذمہ داری ہے یہ بھی ارکان نے اپنے سر لے رکھی ہے' تھانیداروں کی تعیناتی اور تبادلہ یہ محکمہ پولیس کا مسئلہ ہے مگر یہ بھی ارکان اسمبلی کا دردِ سر ہوتا ہے۔ اسی طرح کے باقی معاملات ہیں' یہ سارا ورثہ انگریز کے عہد حکومت کا ہے اُسے ہر علاقے میں اپنے مفادات کے نگہبان درکار تھے' اور اس نگہبانی کے عوض وہ اپنے "خدائی فوجداروں" کو خصوصی مراعات سے نوازتا تھا' تاکہ حکومت بعض مسائل سے محفوظ اور بعض الجھنوں سے بے نیاز رہے' لیکن اس ترکے اور رویے کو ہم نے ایک لمحے کے لئے ترک کرنا گوارا نہیں کیا۔

Marfat.com

چنانچہ ہربار جب بھی انتخابات کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے اور پارلیمنٹ کو وجود میں آنا ہوتا ہے۔ وہی لوگ ہرپارٹی کی ----- فرسٹ چوائس ------- ہوتے ہیں جو موجودہ سماجی ڈھانچے اور رائج الوقت سیاسی نظام کی بدولت ووٹ لے سکتے اور جیت سکتے ہوں' خواہ ان میں سے کوئی سمگلر ہو' کوئی قانون شکن ہو' کوئی نادہندہ ہو' کوئی اخلاق باختہ ہو اور کوئی بندۂ حرص و ہوا ہو' تعلیم' اہلیت' شعور' دیانت' اخلاص اور اپنے شعبے میں مہارت یہ ساری باتیں غیر ضروری قرار پا جاتی ہیں۔

یہ ہر جماعت کا المیہ ہے کہ اس کے وہ مرکزی رہنما جو جماعت کا شہ دماغ سمجھے جاتے ہیں' جو دانشور ہوتے ہیں' جو اعلیٰ سیاسی شعور رکھتے ہیں' جو امورِ مملکت چلانے کے اہل ہوتے ہیں' جنہیں عالمی رجحانات کی خبر ہوتی ہے' اور جو علاقائی' لسانی' اور گروہی' آلائشوں سے تقریباً دور اور نفور ہوتے ہیں' وہ کبھی بھی پارلیمنٹ میں نہیں پہنچ پاتے زیادہ سے زیادہ خیرات کے طور پر انہیں بصد مشکل سینٹ کی ممبری عطا کر دی جاتی ہے۔

ہمارے وہ مخلص سیاسی کارکن اور روشن خیال دانشور جو اس مقدمے کے سب سے مضبوط وکیل بنتے ہیں کہ ایک تو پڑھے لکھے اور باکردار اور شریف لوگوں کو موجودہ سیاسی سسٹم میں حصہ لینا اور اپنی جگہ بنانی چاہئے اور دوسرے یہ کہ پاپولر لوگوں کا ساتھ دینا چاہئے۔

مثلاً ہمیں اس معیار سے آگاہ کیا جائے جس کے باعث علی حسن منگی تو دستور ساز اسمبلی کا رکن بن جائے اور اے کے بروہی مطلوبہ حمائت حاصل نہ کر سکیں؟ خواجہ ریاض محمود تو جماعتی ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے اور ایس ایم ظفر جیسے نامور قانون دان اس اعزاز سے محروم رہیں؟ چودہری ذوالفقار جیسے لوگ تو قومی اسمبلی میں پہنچ جائیں جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال سیاست میں پوری دلچسپی کے باوجود رکنیت کو ترستے رہیں؟ خالد گھرکی تو پارلیمنٹ کے ممبر بن جائیں اور قاضی حسین احمد باہر رہ جائیں؟ عبدالقیوم جتوئی ٹائپ لوگ کامیاب ہوں اور مولانا شاہ احمد نورانی ناکام؟ اختر علی وریو ہربار اسمبلی میں جلوہ گر ہوں اور پروفیسر ساجد میر باہر؟

آخر وہ مسئلہ کیا ہے کہ حکیم محمد سعید' مجید نظامی' محمد صلاح الدین' ڈاکٹر اسرار احمد' مولانا محمد اکرم اعوان' پروفیسر طاہر القادری' جسٹس کے ایم صمدانی' پیر محمد کرم شاہ' جسٹس تقی عثمانی' علامہ ساجد علی نقوی' جنرل حمید گل' ڈاکٹر فاروق خاں' پروفیسر غفور احمد' ائرمارشل اصغر خاں' احمد ندیم قاسمی' اشفاق احمد' اور پروفیسر مرزا منور جیسے لوگ اگر چاہیں بھی' اور اس کے اہل بھی ہوں تب بھی وہ کبھی اسمبلیوں میں نہیں پہنچ سکتے' ان لوگوں کے پاس علم ہے' اہلیت ہے' زور بیان ہے' قوتِ

Marfat.com

استدلال ہے، تقویٰ ہے، راست فکری ہے، نصب العین ہے، جوش و جذبہ ہے، اور کچھ کر گزرنے کا عزم ہے لیکن اس کے باوجود یہ ناکام ترین لوگ ہیں، ہمارے نزدیک یہ ناکام نہیں ہمارا سماجی ڈھانچہ اور سیاسی نظام ناکام ہو چکا ہے، جس کے ہاں اہلیت، شرافت اور شخصیت بے معنی چیزیں ہیں اور دولت و قوت بنیادی عناصر! ایسے میں وہ کون اہل اور شریف آدمی ہو گا جو آگے بڑھے گا اور کون ہو گا جو ان کے لئے جگہ خالی کرے گا؟

جب صورت یہ ہو کہ

ہم الٹے، بات الٹی، یار اُلٹا

تو پھر نتیجہ بھی یہی نکلے گا کہ

بنے کیوں کر کہ ہے ہر کار اُلٹا

اس لئے ہم کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں قحط الرجال ہرگز نہیں، لیکن ہمارا نظام ہماری جان کا وبال ہوا ہے، جس نے اس تاثر کو قوی بنا رکھا ہے، کہ جو کچھ ----- ماحضر----- ہے اسی پر قناعت کی جائے فرشتے کہاں سے آئیں گے؟ ان کے علاوہ ہے کون جسے آگے لایا جائے؟ فرشتے بھی اس ملک میں ہیں، ''حضر و موجود زعماء'' کے علاوہ بھی یہ ملک مردم خیز ہے، لیکن جب تک بنیادی تبدیلیاں----- نفسیاتی اور عملی----- نہیں لائی جائیں گی، قحط الرجال کا رونا تو رویا جاتا رہے گا، ہم اس مسئلہ کے قواعد و ضوابط کو ذرا بھی چھیڑنے کو تیار نہیں۔ آخر کیا حرج ہے کہ کچھ لوگوں کو مستقل طور پر نااہل قرار دیا جائے، کچھ پابندیاں ایسی لگائی جائیں کہ کوئی مسخرہ اور غنڈہ ایوان میں نہ پہنچ سکے، رہ گئے عوام وہ آج کچھ باتوں کے عادی ہیں، انقلابی تبدیلیوں سے وہ نئے رویوں کے بھی عادی ہو جائیں گے۔

(14 جنوری 1997ء)

Marfat.com

غیر معمولی حالات--- غیر معمولی اقدامات

عقل عام (Common Sense) کی بات ہے کہ حالات اگر غیر معمولی ہوں تو اقدامات ہمیشہ غیر معمولی درکار ہوتے ہیں' مگر ہمارے ہاں چیتے کی لپک کا مقابلہ کچھوے کی چال سے کیا جاتا ہے' جس کے نتیجے میں بگاڑ اور اصلاح کے درمیان ہمیشہ قیامت کا فاصلہ رہتا ہے۔

جس طرح خلاء کی تسخیر کے لئے گدھا گاڑی کام نہیں دیتی اسی طرح آسمان سے باتیں کرنے والے بگاڑ کی اصلاح معمول کے قوانین اور نیم دلانہ اقدامات سے ممکن نہیں' اس کے لئے عقاب کی نظر' چیتے کا دل اور بجلی کی سی تیزی کار آمد ثابت ہوتی ہے' وزیر اعظم آئے روز اپنے بیانات کے ذریعے ملکی حالات کی ابتری کا بھاشن دیتے ہیں' ہر محکمے کی زبوں حالی کا رونا روتے ہیں' خالی خزانے کی فریاد کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ میرا دل تو چاہتا ہے کہ مقتول کا خون خشک ہونے سے پہلے قاتل تختہ دار پر لٹکا ہوا نظر آئے' کسی مظلوم کی طرف بڑھنے والے ہاتھ اٹھنے سے پہلے شل ہوتا ہوا دکھائی دے' اور کسی کی غربت کی جانب اٹھنے والی میلی نگاہ پتلیوں کی حرکت سے پھوٹ جانی چاہئے مگر کیا کروں کہ ملک کا قانونی ڈھانچہ اس کی راہ میں رکاوٹ ہے اور میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جو قانونی ڈھانچہ پہلے ہی "ڈھانچہ" ہے تو اس میں حس و حرکت اور توانائی کہاں سے آئے گی؟ اور اگر شریف وزیر اعظم کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں تو یقیناً اس وقت تک بدمعاش کے ہاتھ کھلے رہیں گے۔

شیخ سعدیؒ کو بھی ایک زمانے میں اسی واردات سے پالا پڑا تھا جب وہ اجنبی شہر میں داخل ہونے لگے تو کتوں نے انہیں گھیر لیا' سردی کا موسم تھا جونہی شیخؒ نے پتھر اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو پتھر یخ بستہ ہو کر زمین سے جڑے ہوئے تھے' کوئی پتھر ان کے ہاتھ نہ آیا' شیخؒ نے ہاتھ مل کر کہا' "اس شہر کے لوگ بھی عجیب ہیں جنہوں نے کتوں کو کھول اور پتھروں کو باندھ رکھا ہے۔" کچھ ایسی ہی واردات وزیر اعظم اور پوری رعایا کے ساتھ ہو رہی ہے کہ قانون پابند اور لاقانونیت آزاد ہے۔

Marfat.com

اگر وزیراعظم کے ہاتھ فی الواقع بندھے ہوئے ہیں تو پھر انہیں اپنی آنکھیں بھی بند کر لینی چاہئیں تاکہ وہ خرابیاں دیکھ بھی نہ پائیں جنہیں دُور کرنے کی اپنی اندر سکت نہیں پاتے اور حالات اجازت نہیں دیتے' غالب نے شائد ایسے موقع پر کہا تھا۔

؎ نادیدنی کی دید سے ہوتا ہے خون دل
بے دست و پا کو دیدۂ بنیا نہ چاہیئے

ہماری رائے میں بیمار اور لاغر قانونی ڈھانچہ اس شخص کی راہ میں حائل ہوتا ہے جو خود قدم نہ اٹھانا چاہتا ہو اور روڑے کا بہانہ بنائے' جب کہ میاں نواز شریف حیلے گھڑنے والے نہیں بلکہ تیزی سے آگے بڑھنے والے آدمی ہیں' اور اسی طرح ہاتھ اس وزیراعظم کے بندھے ہوئے ہوتے ہیں جو کسی جوڑ توڑ' طے شدہ خفیہ شرائط' بیوروکریسی کے "الہامی" تعاون اور کسی لولے لنگڑے مینڈیٹ کے ساتھ برسراقتدار آیا ہو جس وزیراعظم کو تاریخ کا سب سے بڑا مینڈیٹ ملا ہو' جو ساری رکاوٹیں عبور کرکے ایوان حکومت تک پہنچا ہو' جسے شہرہ آفاق آٹھویں ترمیم کے بعض انتہائی نازک اور حساس حصے ختم کرنے کے لئے چند گھنٹے درکار ہوں اور نئی قانون سازی تو کیا' آئین تک میں بنیادی ترامیم کرنے کی اکثریت حاصل ہو اگر وہ بھی خود کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ تو اس کی مشکل سمجھنے کے لئے اقبالؒ کے الفاظ ہی مستعار لئے جاسکتے ہیں اور تو کوئی صورت نہیں۔

؎ خضر کیوں کر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے؟

ہمارے نزدیک ان سارے مسائل کا "سنگل پوائنٹ" حل یہ ہے کہ حالات اگر بقول وزیراعظم ----- غیر معمولی ----- ہیں تو پھر انہیں ----- غیر معمولی اقدامات ----- سے گریز نہیں کرنا چاہئے' ورنہ ان کا یہ گریز ----- انہیں خدا' تاریخ اور قوم کی نظر میں ----- ڈی گریڈ ----- بھی کردے گا اور ---- ڈی گریس ----- بھی۔

یک نکاتی فارمولا یہ ہے کہ وزیراعظم اس بار اپنے تمام اقدامات محض خدا کی خوشنودی اور عوام کی بہبودی کے لئے صرف اس ارادے اور حوصلے کے ساتھ کریں کہ وہ گویا آخری بار وزیراعظم بنے ہیں اور آئندہ وہ حکومت میں نہیں آئیں گے' اگر ایک بار یہ کڑا حوصلہ کرلیں اور کڑوا گھونٹ بھرلیں تو کوئی مصلحت ان کے پاؤں کی زنجیر نہیں بنے گی' اور کوئی سفارش دامن گیر نہیں ہوگی' میاں صاحب دوسری بار وزیراعظم بنے ہیں آخر وہ کتنی بار اس عہدے پر پہنچنا چاہتے

Marfat.com

ہیں؟ اگر کوئی کارنامہ سرانجام دیئے بغیر وہ دس بار بھی اس عہدۂ جلیلہ پر پہنچے تو انہیں کوئی حیلہ تاریخ کا حوالہ نہیں بنا سکے گا تو مسئلہ وقت اور حقدار کا نہیں ہوتا نیت اور معیار کا ہوتا ہے تاریخ کے جھروکوں میں جھانک کر دیکھا جائے' تو حکمرانوں کی ایک لمبی قطار دکھائی دیتی ہے مگر اعتبار و وقار صرف ان حکمرانوں کو حاصل ہوا ہے جو مر تو گئے مگر امر ہو گئے' تخت شاہی پر سدا کون متمکن رہا ہے؟ اور ہر بار حکمرانی نے کس سے وفا کی ہے؟ کہ وزیراعظم یہ آس لگا کر اپنا ایجنڈا ادھورا چھوڑتے چلے جائیں' اور بعض طبقوں کی مصلحتوں کو مدنظر رکھتے جائیں۔

اسی متحدہ ہندوستان میں ایک سے ایک بڑھ کر حکمران آیا' پچاس پچاس سال تک حکومت کی' مگر شیر شاہ سوری آج تک ہر ایک کو یاد ہے محض اپنی سماجی خدمات اور رفاہی اقدامات کے باعث' ورنہ اسے بمشکل پانچ سال حکومت نصیب رہی' جی ٹی روڈ جو کل تھی' آج کہاں سے کہاں پہنچ گئی مگر ہمیشہ شیر شاہ سوری کی یاد دلاتی رہے گی' محمود غزنوی کو دنیا فقط "فاتح سومنات" کے طور پر یاد کرتی ہے ورنہ وہ افغانستان کا بادشاہ رہا ہے' یادگار بات صرف "فتح سومنات" ہے' جہانگیر کی شوخیاں خاک میں رُل گئیں مگر اس کی "زنجیر عدل" آج بھی لوح تاریخ پر مرتسم ہے' سلطان ٹیپو ۱۷ برس تک حکمران رہا مگر اس کے آخری لمحے جاوداں ہو گئے' اور اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک جملہ اس کے پورے دورِ حکومت پر بھاری ہے اس لئے کہ اس نے اپنے جملے کی لاج نبھائی اور وہ جملہ ہے "گیڈر" کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔"

محمد بن قاسمؒ شائد سندھ میں دو سال بھی نہیں رہے' ۱۷ سال کی عمر میں دیبل پہنچے اور اکیس برس کے تھے کہ اپنوں کے ہاتھوں شہید کر دیئے گئے اور "پاور پالیٹکس" کا شکار ہو گئے' یہ المیہ اپنی جگہ کہ ایک جوہر تابدار اپنی پوری درخشانی دکھائے بغیر کجلا گیا مگر ایک عرصے تک سندھ میں ایک نوجوان کی پوجا ہوتی رہی اور آج بھی دس رمضان المبارک کو "یوم باب الاسلام" کے طور پر پورے فخر کے ساتھ یاد رکھا جاتا ہے' وجہ کیا ہے؟ محمد بن قاسمؒ کا طول اقتدار؟ نہیں' غیر معمولی مینڈیٹ؟ ہرگز نہیں' بلکہ ایک عورت کی فریاد میں کارروائی اور داہر شاہی سے نجات!

اسی لاہور میں کتنے گردن فراز خاک اوڑھے پڑے ہیں چونکہ کام نہیں کیا تو نام بھی نہیں رہا' گو کہ زندگی میں ان کی نوبت کی صدا سے آسمان گونجتے تھے مگر اب ہوں نہ ہاں! ایک طویل خاموشی اور ابدی فراموشی!

عشق کی منزل ہی ایسی ہے کہ ہاتھ نہ آئے تو عمر بھر کی اوجھڑ مارنے سے بھی نہیں آتی اور

عزم صادق ہو تو۔

؎ طے شود جادۂ صد سالہ باہے گاہے

اگر ہدہد پلک جھپکنے سے پہلے تخت بلقیس لاکر پیش کر سکتا ہے تو کوئی سلیمان ہو تو وہ اس سے بھی پہلے مورِ بے مایہ کو ہمدوش ثریا کر سکتا ہے' شرط یہ ہے کہ کسی میں کوچۂ جاناں کے عوض اپنی سلطنت فروخت کرنے کا حوصلہ ہو' اگر نگاہ اگلی ٹرم پر ٹکی رہے تو کام ٹکے کا بھی نہیں ہو پاتا' اموی دور حکومت میں سب سے کم عرصہ غالباً حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ہے۔ صرف ڈھائی سال! مگر اس عرصے میں عہد فاروقیؓ کی یاد تازہ کردی' اور امت آج تک انہیں پانچواں خلیفہ راشد مانتی ہے۔

فرانس میں ایک نظریہ آج کل بہت قابل احترام سمجھا جاتا ہے اور وہ ہے "ڈیگالزم" یہ نظریۂ سیاست فرانس کے مرد آہن ڈیگال سے منسوب ہے' اس کا مطلب ہے "حکومت اور قیادت کی قیمت پر ملکی منفعت کو ترجیح دینا۔"

اس کا پس منظر یہ ہے کہ ڈیگال جسے جدید فرانس کا بانی سمجھا جاتا ہے' اور ایک زمانے میں لوگ ڈیگال اور فرانس کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم اور دونوں ناموں کو مترادف سمجھتے تھے انہوں نے اپنی حکومت اور قیادت کی پروانہ کرتے ہوئے الجزائر کا حق خود اختیاری تسلیم کیا' اور انہوں نے برملا کہا کہ ہم کب تک' الجزائریوں کا خون بہاتے رہیں گے اور کب تک ان کی آزادی دباتے رہیں گے؟ سو ڈیگال نے الجزائر کو آزاد کر دیا جس کے نتیجے میں ڈیگال غیر مقبول ہو گئے انہیں اقتدار چھوڑنا پڑا مگر ڈیگال نے اس کی پروانہ کی اور مطمئن ضمیر کے ساتھ ایوان حکومت سے رخصت ہوئے حتیٰ کہ گمنامی کے عالم میں وفات پائی اور بجز چند رشتہ داروں کے کوئی اور آخری رسوم میں شریک نہ ہوا' لیکن آج ڈیگال تو زندہ ہے اس کے نام سے ایک نظریہ پنپ چکا ہے مگر اس کے بعد آنے والے حکمرانوں کے نام شائد خود میاں صاحب کو بھی نہ آتے ہوں دوسروں کا تو ذکر ہی کیا؟

ڈیگال اگر ملکی منفعت پر اپنی قیادت اور حکومت کو ترجیح دیتے اور اپنے جنازے کو سلامیاں دلوانے کا شوق پالتے تو تاریخ ان کا جنازہ کب کا نکال چکی ہوتی۔

وزیراعظم آج اگر طے کرلیں کہ انہوں نے احتساب کر کے رہنا ہے اور کرپشن کو مٹا کر دم لینا ہے تو سب سے پہلے اپنی حکومت اور قیادت کو ہتھیلی پر رکھ لیں اور اسے ابن تیمیہؒ کی طرح ؒ۔ ٹا سکہ سمجھ کر ہوا میں اچھال دیں اور برملا کہیں کہ ملک اور قوم کے مفاد کے سامنے اس کی حیثیت پر

Marfat.com

کاہ کی بھی نہیں اس فیصلے سے یہ نہیں ہو گا کہ ان کی حکومت ٹوٹ جائے گی اور قیادت سلب ہو جائے گی بلکہ وہ لوگ جو کوہ ہمالیہ بن کر احتساب کی راہ میں آڑے آرہے ہیں وہ دھنکی ہوئی روئی اور ہاتھ سے گری ہوئی سوئی کی طرح بے وقعت اور بے نام ہو جائیں گے۔

انسان جوں جوں قدم پھونکتا ہے گرد توں توں چھٹتی ہے اگر قدم بڑھتے چلے جائیں تو غبار پیچھے ہٹتا جاتا ہے' کسی بااثر کو گرد راہ سمجھا جائے نہ کہ سد راہ بنالیا جائے۔

وزیراعظم آج طے کرلیں کہ مجھے خواہ مخواہ کی پاپولیریٹی درکار نہیں' اور آئندہ مدت سے سروکار نہیں تو اگلے ہی دن ان کے لہجے کا طنطنہ مختلف ہو گا اور بدقماشوں کا رویہ مختلف ہو گا۔

ہم یہ سب کچھ سمجھ کر ایسا لکھ رہے ہیں ورنہ ہمیں حکومت اور مصلحت کے درمیان فرق پوری طرح معلوم ہے کسی بھی فیصلے پر حکمت غالب ہو تو اس میں برکت ہوتی ہے۔ اگر مصلحت کا رنگ چڑھ جائے تو انجام کار ندامت تو رہ جاتی ہے فیصلے کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے' پاسبان عقل بہت خوب سہی مگر دل کی آزادی خوب تر ہے' کوئی اس آزادی کا مزہ چکھ کر تو دیکھے۔

(5 جولائی 1997ء)

Marfat.com

جامعیت کبریٰ

حسن یوسفؑ دم عیسیٰؑ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند' تو تنہا داری

نعت کا یہ شعر سینکڑوں بار تقاریر و مضامین کا عنوان بنا ہے' جس کا مقصد سید عالم ﷺ کی جامعیت کو واضح کرنا ہے' یہ دنیا کمالات سے معمور ہے اور ہر دور اور ہر قبیلے میں اصحاب کمال کی ایک بڑی تعداد موجود رہی ہے' بارہا دیکھنے میں آیا کہ کسی فرد کو ایک یا ایک سے زائد کمالات میں وہ درجۂ اختصاص حاصل ہوا کہ وہ کمال اس کے نام کا جزو' اور اس شخصیت کا مترادف بن گیا' کمال کا ذکر ہوا تو بے ساختہ پردۂ ذہن پر صاحب کمال کی تصویر ابھر آتی ہے اور صاحب کمال کی بات چلی تو لفظ کمال مجسم اور پیکر محسوس بن کر سامنے آگیا' مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن' درجۂ کمال پر پہنچ کر ایک مثال کی حیثیت اختیار کر گیا ہے' کرۂ ارض پر موجود کوئی بھی شخص خواہ چندے آفتاب ماہتاب ہو' یوسف نہیں بن پائے گا "بلکہ یوسف ثانی" کہلائے گا' لفظ حسن "کے لئے دنیا بھر کے لٹریچر میں جب اور جہاں بھی مبالغے کے لئے کوئی نام مستعار لیا جائے گا' وہ حضرتِ یوسفؑ کا نام ہو گا۔

اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے لئے "مسیحا" کا لفظ روز مرہ محاورے کا درجہ اختیار کر چکا ہے' نثری و شعری سرمائے میں جب بھی کسی کے جاں بلب ہونے کا ذکر آئے گا' کسی کے طول مرض کا تذکرہ چلے گا' چارہ سازی و چارہ گری کی بات ہو گی' یا کسی طبیب اور حکیم کے حاذق و ماہر ہونے کا تاثر دیا جائے گا تو اس کے لئے ایسے موقع پر "مسیحا" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے' ایسے ہی سیاق و سباق میں سخاوت کے لئے "حاتم طائی" عدل کے لئے "نوشیرواں" قوت و طاقت کے لئے "رستم و سہراب" حکمت و فلسفہ کے حوالے سے سقراط اور بقراط زہد و تقویٰ کے پس منظر میں "جنیدؒ و بایزیدؒ" حاکمانہ جاہ و جلال کے لئے "قیصر و کسریٰ" اور فقر کی نسبت سے "ابوذرؓ" کا نام لیا جاتا ہے اسی ضمن میں اور بے شمار کمالات و اربابِ کمال کا نام لیا جا سکتا ہے' لیکن یہ سب اوصاف و خصائص وہ ہیں جو

اپنے لئے اور اپنے موصوف و ممدوح کے لئے انفرادیت کا رنگ لئے ہوئے ہیں' اسے "جامعیت" کا عنوان نہیں دیا جا سکتا' نوشیرواں کا عدل تو شہرہ آفاق بن گیا مگر کوئی فاتحانہ کارنامہ' اس کی سوانح میں نہیں ملتا' حاتم طائی کو سخاوت سے تعلق تو پھول اور خوشبو جیسا حاصل ہے مگر علم و حکمت سے اس کا دور کا بھی علاقہ نہیں بنتا۔

افلاطون کو دانائی و حکمت کا سمبل تو کہا جاتا ہے' زہد و تقویٰ کے لئے اس کا ذکر کسی مفصل میں نہیں آئے گا' رستم و سہراب کی پیل تنی اور پہلوانی تو بلاشبہ ضرب المثل ہے' علاوہ ازیں وہ کیا تھے؟ ان کے بارے میں کوئی نہیں جانتا اور نہ جاننے کی خواہش رکھتا ہے۔

حتیٰ کہ انبیاء کرام کی مقدس اور برگزیدہ جماعت جسے خلاصۂ انسانیت کا مقام و مرتبہ حاصل ہے اس قابل قدر جماعت کے لائق صد ہزار تعظیم افراد بھی اپنے اپنے فضل و کمال میں نقطۂ عروج پر نظر آتے ہیں' لیکن انبیاء کی پوری صف اور انسانیت کی پوری بزم میں "جامعیت کبریٰ" کے مقام پر صرف ایک ہستی جلوہ افروز نظر آتی ہے اور وہ ہیں سید عالم ﷺ ہر خوبی کا شجرۂ نسب حضورؐ سے جا کر ملتا ہے اور ہر کمال کا چشمہ آپ کی ذات سے پھوٹتا ہے' اسی باعث قرآن حکیم نے آپ کی سیرت کے لئے بڑی جامع اصطلاح استعمال کی ہے۔ یعنی "اسوۂ حسنہ" (Perfect Model)

اور آپ کا اسوۂ حسنہ ہر زمان و مکان کو محیط اور ہر شعبۂ زندگی کے لئے ہادی اور رہبر ہے' آپ کا عرصۂ نبوت تیئس سال ہے' لیکن یہ عرصہ در حقیقت پورا' "دورانیۂ حیات" یعنی (Life Circle) ہے' اور انسانی زندگی کے دائرے میں جو سرگرمیاں رہیں گی اور تا قیامت زندگی کے ہر شعبے میں جو امور سرانجام پائیں گے' ان کے لئے حضور ﷺ کی سیرت طیبہ یعنی اسوۂ حسنہ' پوری شان جامعیت کے ساتھ رہنمائی کا فریضہ ادا کرتا رہے گا' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت ختم نبوت کے پس منظر میں حضورؐ کو ہر اس تجربے سے گزارا جس سے کسی بھی عہد میں کوئی بھی شخص کسی بھی اعتبار سے گزرے گا' تاکہ اس کے لئے آپؐ کے اسوۂ حسنہ میں رہنمائی کا سامان موجود رہے' اور کوئی شخص دنیا میں یا آخرت میں یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ میرے فلاں کام اور فلاں اقدام کے لئے کوئی نمونۂ ہدایت موجود نہ تھا تاکہ میں اس کی اطاعت کر پاتا' انبیاء کرام کی ایک پوری جماعت مختلف وقتوں اور مختلف علاقوں میں اللہ تعالیٰ نے مبعوث کی تاکہ کسی بھی عہد کا انسان ہدایت ربانی اور ہدایت کے انہی نمونوں سے محروم نہ رہے' مگر کوئی بھی نبی اپنے عہد کے سارے انسانوں اور آنے والے تمام زمانوں کے لئے مبعوث نہیں ہوا یہ اعزاز و افتخار صرف تاجدارِ

Marfat.com

ختم نبوت ﷺ کو حاصل ہوا' اس لئے سابق انبیاء کرام کو زندگی کے ہر مرحلے اور تجربے سے نہیں گزارا گیا' بعض انبیاء وہ گزرے ہیں جنہیں خلعت نبوت تو ملی مسند حکومت نہ مل سکی' کچھ ایسے بھی تھے' جو میدان جنگ میں نہیں اترے' متعدد وہ ہیں' جنہیں مختلف اقوام و قبائل سے معاہدات نہیں کرنے پڑے' بے شمار انبیاء ہجرت کا سفر نہیں کرپائے' ایسے ہی انبیاء گزرے جنہیں امت میسر نہ آسکی' چند ایک نے متاہل زندگی نہیں گزاری' کچھ بالکل محدود علاقوں میں چھوٹی موٹی قوموں کے درمیان رہے انہیں صنادید و عمائد سے سابقہ پیش نہیں آیا اور کئی انبیاء ایسے بھی ہو گزرے جو عمر بھر فقر و مسکنت کے عالم میں رہے خوشحالی و آسودگی کا ذائقہ نہیں چکھا' علی ہذا القیاس یہ سب تجربے جزوی نوعیت کے تھے' اور ان سے ہدایت پانے کا دائرہ بھی جزوی رہا' یہ کوئی عیب یا نقص نہیں' یہ تمام انبیاء کرام اپنے اپنے احوال و ظرفت کے مطابق مکمل اور کامل نبی اور کامل سرچشمۂ ہدایت تھے' دائرہ کار محدود ہونے کے باعث تجربات محدود رہے' چونکہ حضور ﷺ کو رہتی دنیا تک ہر قوم' ہر علاقے' ہر نسل' اور ہر فرد و جماعت کا ہادی و پیغمبر بنا کر مبعوث کیا گیا' اس لئے آپ کا دائرہ اطاعت و امت لامحدود بن گیا' آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد نہ معلوم انسانیت نے کتنی صدیوں کا سفر کرنا ہے' اور کروڑوں اربوں انسانوں نے کس کس شعبۂ زندگی میں اوج و کمال پانا ہے' اور سفر حیات کے دوران کس کس کوچے کی خاک چھاننی ہے' اس چیز کو ملحوظ رکھتے ہوئے حکمت الٰہی نے آپ کی حیاتِ طیبہ کو جامعیت کبریٰ سے آراستہ کیا' تاکہ کوئی شخص اور قبیلہ حصول ہدایت میں کسی نوع کی تشنگی اور کوتاہی محسوس نہ کرے' چنانچہ سید عالم ﷺ نے نبوت کے تیئس سالہ دور میں مختلف حیثیتوں سے اپنے آپ کو پیش کیا اور آپ مختلف دائروں میں محو گردش رہے تاکہ تکمیل ہدایت ہو سکے۔

آپ نے آغاز نبوت میں سخت مزاحمتوں کا سامنا بھی کیا اور پھر فتح و نصرت اور غلبہ و عروج کا دور بھی گزارا' مالی تنگی کا شکار بھی ہوئے اور اپنی آنکھوں کے سامنے مال غنیمت کا ڈھیر بھی دیکھا' ہجرت بھی فرمائی اور اس کے بعد ایک ہی مرکز میں اقامت بھی فرمائی' تنہائی کا مرحلہ بھی بھگتایا اور لاکھوں خدا کاروں کے جھرمٹ کا نظارہ بھی فرمایا۔

متعدد جنگوں میں فتح و کامرانی کا اعزاز بھی پایا اور جنگ غزوۂ احد میں وقتی شکست کا صدمہ بھی سہا' شعب ابی طالب میں محصوری کے دن بھی گزارے اور میدان عرفات میں ڈیڑھ لاکھ کے سامنے شہادت حق کا فریضہ بھی سرانجام دیا' وہ زمانہ بھی دیکھا کہ لوگ گلی کوچوں میں طعنے مارتے

Marfat.com

تھے اور وہ سماں بھی ملاحظہ فرمایا کہ راستے میں لوگ پلکیں بچھاتے تھے' مزدور بن کر اینٹ گارا بھی اٹھایا اور امام بن کر مقام ابراہیم کو زینت بھی بخشی' مرشد و معلم بن کر اصحابِ صفہ کی تربیت بھی فرمائی' اور ہزار ہا لشکریوں کی بطور سپہ سالار کمان بھی سنبھالی' متاہل زندگی بھی گزاری' اور مال و اولاد کی آزمائشوں سے بھی گزرے' گھر میں جھاڑو پھیرنے' آٹا گوندھنے' بازار سے بیواؤں کا سودا سلف لانے' نعلین دوزی کرنے' بوسیدہ کپڑوں کو پیوند لگانے اور مدینے کا پہرہ دینے جیسے چھوٹے کام بھی کئے اور حدیبیہ کے معاہدے اور قیصر و کسریٰ کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھوانے جیسے عظیم الشان کارنامے بھی سرانجام دیئے' دارِ ارقم جیسے چند گز کے گھر میں محدود لوگوں کو تبلیغ بھی فرمائی اور بارہ لاکھ مربع میل پر محیط حکومت کرکے دنیا بھر کے حکمرانوں کو اندازِ حکمرانی بھی سکھایا' خلوت میں گریہ بھی فرمایا اور جلوت میں خطابت کے جوہر بھی دکھائے' زمانہء عسرت میں پیٹ پر پتھر بھی باندھے اور عہد نصرت میں صحابہ کو تکمیل بشارت کی غرض سے سوار پر سونے کے کنگن بھی پہنائے' مرجع عقیدت بھی رہے اور بے تکلف رفیق اور دوست بھی بنے' شاہی میں فقیری اور غریبی میں امیری کا بیک وقت لطف بھی لیا۔

المختصر یہ کہ زندگی کے جتنے بھی شعبے ہو سکتے ہیں' ہر ایک میں قدم رکھا اور دنیا والوں پر منصب نبوت اور اس کی ذمہ داریوں کو واضح فرمایا۔

آپ' بیٹا' بھائی' باپ' شوہر' سسر' داماد' پڑوسی' رفیق سفر' تاجر' مسافر' مقیم' محصور' آزاد' پابند' خود مختار' زخمی' تنگدست' خوشحال' کمانڈر' معلم' خطیب' مرشد' امام' مزدور' غمگین' خوش و خرم' اُمی اور مفسر حکمت الٰہی' ہر حیثیت میں رہ کر اہل دنیا کے لئے روشن نقوش مہیا فرمائے' کہ انسان ان میں سے کسی بھی حال میں ہو تو وہ نورِ نبوت سے کیسے فیض پا سکتا اور رسول کے نقوش قدم پر کیسے چل سکتا ہے؟

کوئی بیٹا ہے تو وہ دیکھے کہ آمنہؓ کا لخت جگر سیدہ حلیمہؓ کے دودھ کی چند دھاریں پی کر اپنی ماں کے لئے کیسے سراپا احترام رہتا ہے' کوئی باپ ہے تو سیدہ فاطمہؓ کی روح سے رجوع کرے کہ باپ اپنی بیٹی کے لئے سرچشمہء محبت کیسے بنتا ہے؟ کوئی سسر ہے' تو حضرت علیؓ کے سسر کا احوال معلوم کرے کہ داماد کن کن شفقتوں اور رعائتوں کا مستحق ہوتا ہے' کوئی پڑوسی ہے تو اسے دیکھنا چاہئے کہ آپ نے پڑوسی بن کر اُس عورت سے کس قدر مہر و مروت فرمائی جو آپ کے راستے میں کانٹے بچھاتی تھی' کوئی کسی کا رفیق سفر بنے تو پھر صدیق اکبرؓ سے پوچھ لے کہ سید عالمؐ نے سفر کی رفاقت کو کیسے

Marfat.com

نبھایا؟ کوئی تاجر ہے تو ام معبد سے جا کر پوچھے کہ تجارت میں دیانت کو کیسے ملحوظ رکھا جاتا ہے؟ کوئی شوہر ہے تو سیدہ خدیجہؓ اور سیدہ عائشہؓ کے شوہر نامدار کی سیرت پڑھے تاکہ اُسے مثالی شوہر بننے کا راز معلوم ہو سکے' عالم جبر میں شعب ابی طالب کے محصور کو نمونہ بنایا جائے' جشن فتح مناتے ہوئے فاتح مکہ کا اسوۂ سامنے رکھنا چاہیے' معلم بننے کے لئے دارِ ارقم کے اُستاد اور رہنما بننے کے لئے اصحابِ صفہ کے مرشد کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیے' حالات اگر شکست سے دوچار کر دیں تو اُحد کے کمانڈر کی حکمت عملی کو نمونہ بنانا چاہیے' کوئی معاشی بدحالی کا شکار ہو جائے تو اُس گھر کے سربراہ کا اسوۂ حسنہ سامنے رکھنا چاہیے جس کے ہاں کئی کئی دن چولہا نہیں جلتا تھا' کوئی حکمران بن جائے تو اس کے لئے کامل نمونۂ حکمرانی اس شخصیت کا نظر آئے گا۔ جو بارہ لاکھ مربع میل کی قلمرو کا مالک و مختار ہے مگر نان جویں پر گزارا کرتا ہے' گویا ہر اعتبار سے حضور ﷺ جامعیت کے اُس مقام پر فائز ہیں جہاں سے ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسب فیض کر سکتا ہے۔

طہارت اور وضو کے مسائل سے لے کر اسلوبِ حکمرانی تک اور نجی و عائلی معاملات سے لے کر عالمی و بین الاقوامی معاہدات تک ان سب کے لئے یا تو قول رسول (حدیث) میں رہنمائی مل جائے گی یا پھر عمل نبوت (سنت) اس کے لئے نشان راہ کا کام دے گا' ادھورے اور ایک رُخے رہنما ڈھونڈھنے کے بجائے اس شخصیت کو کیوں نہ اپنا ہادی و پیمبر بنایا جائے' جس کی ہدایت نے بدوؤں کو حکمت و حکومت کے باوقار منصب تک پہنچا دیا' اور جس کی رہبری نے گدایان راہ کو شان سکندری سے ہمکنار کر دیا۔

ناز کر اپنی قسمت پہ نوع بشر
مل گئے مصطفیٰؐ اور کیا چاہیے

(29 جولائی 1996ء)

ہم ابروباد کا موسم تھے گردباد ہوئے

"خلافت راشدہ کا نظام تو دُور کی بات ہے ہم تو اوسط درجے کی مہذب قوم کی خصوصیات بھی کھو رہے ہیں۔"

یہ الفاظ صدر مملکت فاروق احمد خاں لغاری نے نو تشکیل شدہ اسلامی نظریاتی کونسل کے معزز ارکان سے خطاب کے دوران ادا کئے۔

اپنے اپنے مزاج کی بات ہوتی ہے لوگ چیختی چنگھاڑتی سرخیوں پر نظریں جمائے اور انہیں نئے نئے مفہوم کے جامے پہناتے ہیں' مگر مجھ ایسا شخص ان لفظوں اور خبروں کی تاڑ میں رہتا ہے جو خواہ بہت ہی غیر اہم جگہ پر درج ہوں' یا کسی بڑی خبر کا بہت چھوٹا حصہ ہوں' یا کسی تجزیے کا بہت ہی ضمنی قسم کا حصہ ہو' بشرطیکہ وہ الفاظ دل کے تار چھیڑ دیں یا روح کے تالاب میں تلاطم پیدا کر دیں' اس جملے نے وہی کیفیت پیدا کر دی جو بیک وقت حیرت' ندامت اور حسرت کا مرقع ہوتی ہے' حیرت یوں کہ ایک دور ہم پر ایسا گزرا ہے' اور فلک ہم پر اس قدر مہربان تھا کہ ہم بہت تھوڑے تھے مگر دنیا کی اکثریت ہم سے دبتی تھی' ہم سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ نہ تھا' دشمن ہماری جان کے درپے تھا' لیکن اُسے ہمارے ایقان کا اعتراف تھا' وہ ہماری تلوار سے نہیں ہمارے کردار سے خم کھاتا تھا' ہمارا مخالف اپنے لاؤ لشکر سمیت ہمارے ساتھ لڑنے آتا تھا مگر ہم پر کبھی دغا' مکر' فریب' جھوٹ اور درندگی کا الزام نہیں لگایا تھا۔

ندامت اس طرح ہوتی ہے کہ آج ہم عددی اعتبار سے بہت زیادہ ہیں لیکن ہمارا وقار نہ ہونے کے برابر ہے' ہم نظر آنے میں خوشحال اور شاد آباد ہیں مگر اخلاق کے ترازو میں کنگال اور خانماں برباد ہیں' اور حسرت یہ ہے کہ کاش ہماری کثرت ایک بار پھر قلت میں بدل جائے لیکن کسی طور ہماری ذلت ختم اور عزت بحال ہو جائے۔

یہ کوئی قصہ کہانی نہیں اور نہ ہی کسی مولوی صاحب کے وعظ کا اقتباس ہے بلکہ تاریخ کا ناقابل تردید مشاہدہ ہے کہ ہم جس پیغمبرؐ کے دامن سے وابستہ ہیں ان کے سراپا کا عالم یہ تھا۔ کہ ایک یہودی عالم مناظرے کا شوق اور شکست دینے کا زعم لے کر آیا مگر آپ کا چہرۂ اقدس دیکھ کر پکار اٹھا۔

Marfat.com

لیس بو جہ کذاب (یہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔)

ہمارے پہلے خلیفہٴ راشد کا قبل از اسلام نام "عبد الکعبہ" تھا۔ قبول اسلام کے بعد وہ "عبداللہ" قرار پائے، اُن کی کنیت "ابوبکر" تھی مگر تاریخ انہیں "صدیق اکبرؓ" کے نام سے یاد کرتی ہے------سب سے بڑا سچا اور راستباز۔-----

ہم جب خلافت راشدہ کے قیام کا مطالبہ اور اس کے نفاذ کا دعویٰ کرتے ہیں تو یہ منصب اور اس پر سب سے پہلے فائز ہونے والی شخصیت-------- سچائی اور راستبازی----- کا تقاضا کرتی ہے، اتنی سچائی اور اس قدر راستبازی کہ وہ تاریخی حقیقت بن جائے۔

دوسرے خلیفہٴ راشد عمر بن الخطابؓ تھے دنیا انہیں------ فاروق اعظمؓ------ کے طور پر یاد کرتی ہے یعنی------ سچ اور جھوٹ میں فرق کرنے والا------ حق اور باطل میں امتیاز برتنے والا------ عدل اور ظلم میں لکیر کھینچے والا۔---------

گویا جس نظام حکومت میں سچ اور جھوٹ خلط ملط ہوں، حق اور باطل ہم آغوش ہوں اور عدل و ظلم کے درمیان کوئی حد فاصل نہ ہو وہ حکومت خلافت راشدہ کی پرچھائیں سے بھی محروم ہوتی ہے کجا کہ وہ خود کو اس کا متبادل سمجھ بیٹھے۔

تیسرے خلیفہٴ راشد عثمان بن عفانؓ تھے بعد از اسلام وہ "عثمان غنی" کہلائے غنی------ کیا مطلب؟ یعنی وہ خلیفہ جس نے اسلام اور اسلامی حکومت کو بہت کچھ دیا ہو اس کے نام پر کمایا نہ ہو، اہل مدینہ کو پانی کی دقت ہوئی تو بیس ہزار درہم دے کر یہودی سے کنواں خریدا اور اہل اسلام کے لئے وقف کر دیا، مسجد نبوی میں توسیع کی ضرورت پیش آئی تو ملحقہ مکان منہ مانگی قیمت دے کر لیا اور مسجد میں شامل کر دیا۔

جب بھی خلافت راشدہ کی بات آئے گی وہاں عزیزوں کے سامنے دامن پھیلانے والے اور ملکی خزانے پر ہاتھ صاف کرنے والے حکمرانوں کا نہیں بلکہ اسلام اور اہل اسلام کے لئے گھر کی جمع پونجی لٹا کر اور دامن جھاڑ کر کھڑے ہونے والے لوگوں کا چہرہ نظروں میں گھوم جاتا ہے۔

چوتھے خلیفہٴ راشد علی المرتضیٰؓ تھے، جنہیں دنیا "شیر خدا" کہتی ہے، آج تو ہر دوسرا حکمران "شیر" کہلاتا ہے خواہ بلی کے کھنکھارنے سے سہم جائے، مگر شیر خدا ایک ہے جس نے غیر اللہ کے سامنے کبھی پیشانی جھکائی نہ میدان میں پیٹھ دکھائی۔

آج ہماری پیشانیوں پر رگڑ کے نشان کو ایک دنیا دیکھ رہی ہے اور سر میدان پیٹھ دے کر

Marfat.com

بھاگنے کا مشاہدہ ایک زمانہ کر رہا ہے۔

یہ تو وہ ہمارا------ آئیڈیل----- ہے لیکن ہمارا----- طرز عمل------ وہی ہے جس کی نشاندہی صدر مملکت نے ان الفاظ میں کی ہے۔ "ہم اوسط درجے کی مہذب قوم کی خصوصیات بھی کھو رہے ہیں۔"

ایک مہذب قوم کیا ہوتی ہے؟ اور اس کی کم سے کم اچھی خصوصیات کیا ہو سکتی ہیں؟ یہ کوئی چیستان اور معمہ نہیں سادہ سی بات ہے۔

مہذب کہلانے کی حقدار وہ قوم ہوتی ہے جس کے قول اور عمل میں بہت زیادہ فاصلہ نہ ہو' اور ہمارے ہاں یہ فاصلہ اندھے کو بھی نظر آتا ہے کہ بات ہم خلافت راشدہ کی کرتے ہیں لیکن طرزِ سیاست سراسر میکیاولین اور اندازِ حکومت صد فی صد ڈکٹیٹوریل ہے۔

مہذب قوم وہ ہوتی ہے جس کا ہر فرد----- ادنیٰ فرد------ بھی اپنے طرز عمل سے قوم کا وقار بڑھائے نہ کہ مذموم حرکتوں سے رہا سہا اعتبار بھی کھو دے' ہمارے ہاں ادنیٰ فرد تو کیا اعلیٰ افسر بلکہ وزراء تک اس احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھتے۔

بین الاقوامی سودوں میں طے پانے والا کمیشن اور اسے جیب میں رکھنے والا وزیر یا افسر آخر قوم کا کیا تعارف پیش کرتا ہے؟ جس قوم کے ذمہ داران دو ارب روپے روزانہ کا غبن کرتے ہوں وہ قوم سر اٹھا کر چلنے کے قابل کب رہ سکتی ہے؟ جس قوم کے منتخب نمائندوں کی حرکتوں کے اشتہار دیوارِ چین پر چسپاں ہوں اور زمانے بھر کے سیاح ان کا نظارہ کریں وہ قوم تہذیب کے کس دائرے میں سمائے جانے کے قابل ہے؟

مہذب قوم وہ ہوتی ہے جو احساس کمتری کی مریض نہ ہو' جس کا لباس' وضع قطع' بود و باش اور چال چلن اس کے اپنے قومی رجحان کا آئینہ دار ہو جبکہ یہاں کا احوال یہ ہے کہ سر کی چوٹی سے لے کر پاؤں کے تلوے تک ہر نقش ادھار لگتا اور مستعار معلوم ہوتا ہے' کوئی امریکن لگنے کے خبط میں مبتلا ہے' کوئی ہندو کلچر کا دلدادہ ہے۔ کسی کو برطانوی لہجہ اپنانے کا لپکا ہے' اور کوئی فرنچ نظر آنے کے روگ میں پہلو بدل رہا ہے' ایک مہذب قوم تو مانگی ہوئی جنت کو بھی خودی کے منافی سمجھتی ہے کجا کہ وہ کشکول ہاتھوں میں لے کر جہنم کی بھیک مانگتی نظر آئے۔

مہذب قوم وہ ہوتی ہے جس کے ہاں پیسہ ہاتھ کی میل اور علم ماتھے کا جھومر ہوتا ہے پیسے سے وہ زندگی گزارتی ہے اور علم سے اپنی زندگی سنوارتی ہے' مگر ہمارے ہاں پیسہ "قاضی الحاجات"

Marfat.com

ہے اور علم محض "دال بھات" مہذب قوم اسے کہا جاتا ہے جس کے ہاں افراد فانی اور ادارے باقی کا تصور کار فرما ہو' قانون بالادست اور حکمران اور رعایا زیردست' جبکہ ہم نے افراد کو آبِ حیات کا درجہ دے رکھا ہے اور ادارے فقط ٹشو پیپر' کھایا پیا ہاتھ پونچھے اور ایک طرف پھینک دیا۔

مہذب قوم کی بات موضوع سخن ہو' تو اسے مہذب قوم کہا جائے گا جس کے ہاں مثالی ایثار نہ سہی ضروری حد تک لوگ روادار ہوں' اور یہاں کا فرمان امروز یہ ہے' جو مفتی اختلاف کرے اس کا گلا کاٹ دو' جو سیاسی مخالف ہو اسے حوالۂ زنداں کردو' اور جو علمی رائے میں منفرد ہو اُسے فتوے کی سان چڑھادو۔

دور و نزدیک کے دوست اور دشمن سبھی ہمارے احوال کا مشاہدہ کر رہے ہیں ہم کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ ہمارے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کرتے' اور بات لبوں پر نہیں لاتے ہوں گے کشمیر' بوسنیا' فلسطین میں برپا غارتگری اور ہمارے ہاں کی خون ارزانی میں اب کتنا فرق باقی رہ گیا ہے؟

پی آئی اے کی یورپ جانے والی فلائٹ جونہی اپنے پہیے رن وے پر لگاتی ہے۔ تلاشی کے لئے کتے اندر آجاتے ہیں یہ "حسن سلوک" آخر کسی عمل کا معاوضہ تو ہے؟ بھارت اپنے ہاں بسنے والے مسلمانوں کو طعن آمیز انداز میں کہتا ہوگا یہی تھا تمہارا دو قومی نظریہ؟ اب تو تمہارے ہاں درجن بھر قومی نظریے بن چکے ہیں' سندھی مہاجر سے بیزار' پختون پنجابی سے متنفر' بلوچ پٹھان سے دست بگریباں' سنی شیعہ سے تیغ بدست' کل کو خدا معلوم نفرت کی اور کون سی اصطلاح وضع ہوتی ہے اور نئی جنگ کا عنوان کیا بنتا ہے؟

(21 مئی 1997ء)

اَن پڑھ اور غریب ماں کی یاد میں

۲۲ اگست میری والدہ مرحومہ کی تاریخ وفات ہے' یہ چند سطریں ایک بیٹے کی طرف سے اپنی ماں کے حضور عقیدت کے پھول ہیں' اس طرح شائد اُن کی روح کو سکون مل سکے کہ جس بیٹے کی تعلیم کے لئے انہوں نے جدائی برداشت کی تھی آج وہ ایڑھے ترچھے لفظ لکھنے کے قابل ہو گیا ہے' اس اعتراف میں کیا حجاب ہے کہ اماں جان ایک گمنام دیہاتی خاتون تھیں' اور ساتھ ہی ان پڑھ اور غریب بھی' ہرچند کہ ان کا بیٹا یعنی راقم الحروف دس بیس آدمیوں میں جانا پہچانا جاتا ہے' لاہور جیسے شہر میں رہائش رکھتا ہے' دو چار حرف پڑھ لکھ لیتا ہے' دولتمند تو قطعاً نہیں البتہ دھوبی کے دُھلے کپڑے پہننے کی توفیق اسے نصیب ہے' اپنی سواری بھی اس کے پاس ہے' گاہے ماہے کسی تقریب میں اونچی کرسی پر بھی بٹھا دیا جاتا ہے' ایک چھوٹے سے ادارے کا صدر نشین بھی ہے لیکن بایں ہمہ یہ ساری چیزیں اس کمی کو پورا کرنے سے قاصر ہیں' جس کو ماں کا پیار' ماں کی شفقت اور ماں کا سایہ کہتے ہیں۔

کہنے کو تو ملک کی صدارت سب سے بڑا عہدہ ہے' وزارتِ عظمٰی خوش بختی کی انتہاء ہے' فیکٹری اور مربعوں کا مالک ہونا' ترقی و خوشحالی کے افق کا بلند ترین ستارہ ہے مگر خدا لگتی بات یہ ہے کہ ملک کی صدارت ماں کی شفقت وزارتِ عظمٰی ماں کی دُعا' اور فیکٹریاں اور مربعے ماں کی محبت آمیز لہجے کا بدل نہیں بن سکتے۔

ضروری نہیں کہ ماں کا تعلق بڑے خاندان سے ہو' وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو' جدید دنیا کے رجحانات سے آگاہ ہو' آداب و اطوار میں ماڈرن رویے کی حامل ہو' اور سیاسی و معاشرتی اعتبار سے اونچا مقام رکھتی ہو تب ہی اُس پر مضمون لکھا جائے بلکہ ماں فقط ماں ہوتی ہے اور بس' باقی سب اضافتیں بے معنی ہیں' جس طرح گلاب کا کوئی نام رکھ لیا جائے اس کی طراوت اور لطافت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا اسی طرح ماں شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہو یا معمولی محنت کش گھرانے سے' وہ نبئ وقت اور مجتہد عصر کے لئے احترام کا مرکز ہوتی ہے' خدا نگاہ معرفت دے تو ماں اگر لیپا پوتی کر رہی ہو تو اس کے گارے میں لتھڑے ہوئے کپڑے خلعت شاہی سے زیادہ قیمتی نظر آتے ہیں' ماں اوپلے تھاپ رہی ہو تو اس کے وہ ہاتھ تقدیرِ مبرم کو ٹالنے کے لئے کافی ہوتے ہیں' ماں لوری دے رہی ہو تو اس کے لہجے میں جبریلؑ بولتا نظر آتا ہے' ماں روٹیاں لگا

رہی ہو تو وقت کے بادشاہ اس کے آگے ایک ٹکڑے کے سوالی نظر آتے ہیں' ماں دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دے تو کل جہانوں کا مالک عرش سے دو زینے نیچے اتر کر اس سے ہمکلام ہوتا ہے' ماں کا دل کبھی اُداس ہو تو جنت کے شگوفے مرجھانے لگتے ہیں' ماں کی آنکھیں نم آلود ہوں تو کارکنان قضا و قدر کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے' ماں دامن پھیلا دے تو خدا اپنی جنت کی ساری نعمتیں اس میں انڈیل دیتا ہے' ماں بچے پر اپنا میلا آنچل ڈال دے تو رحمت خداوندی گھٹا بن کر چھا جاتی ہے' اور اللہ نہ کرے ماں کی نگاہ غضب آلود ہو تو عرش الٰہی تھر تھر کانپنے لگتا ہے' کرسی صدارت پر بیٹھنے سے وہ عزت کہاں ملتی ہے جو ماں کے قدموں سے لپٹنے میں نصیب ہوتی ہے' وزارت کا حلف اٹھانے میں وہ لطف کہاں جو ماں کے جوتے اٹھانے میں آتا ہے' عالی جناب اور عزت مآب کہلوانے میں سُرور کہاں جو ماں کے "اوئے .بلو" کہنے میں ہے' اعلیٰ سول اور فوجی حکام کو اپنے ہاتھ سے ایوارڈ اور میڈل دینے میں لذت کہاں جو ماں کے ہاتھ سے خرچی کا ایک روپیہ لینے میں ہے' گارڈ آف آنر کا معائنہ کرنے اور چبوترے پر چڑھ کر سلامی لینے میں وہ خُمار کہاں جو جھولے میں لیٹ کر ماں کے ہاتھوں ہلکورے کھانے میں آتا ہے' جنت میں مخملیں مسہریوں پر لیٹ کر نیند کا وہ نشہ کہاں جو ماں کی گود میں حاصل ہوتا ہے' غزالیؒ و رازیؒ کے فلسفے اور رومیؒ و جامیؒ کے شعر و سخن میں وہ حسن کہاں جو ان پڑھ ماں کی سادگی اور سادہ لوحی میں ہے' نثر و نظم کے شہ پاروں میں رس کہاں جو ماں کی لوری میں گھلا ہوتا ہے' قوس و قزح کے حسین رنگ ضرب المثل بن چکے ہیں' مگر ماں کے بے لوث اور بے ساختہ پیار کا رنگ بہت دلآویز اور نظر نواز ہوتا ہے' گلاب کی پنکھڑی لاکھ نازک سہی مگر ممتا کے آبگینے کی لطافت کی اور ہی بات ہے' کنول کا پھول بہت شفاف ہے مگر ماں کا آئینہ دل اس سے کہیں زیادہ شفاف ہوتا ہے' چاند کی چاندنی بڑی خنک ہے مگر ماں کے سائے کی ٹھنڈک کا جواب کہیں بھی نہیں' اور نسیم سحر کا پر لطف جھونکا اپنی جگہ مگر ماں کے دامن کی ہوا کا مقابلہ کون کرے؟ اگرچہ صحرا کے ذروں سمندر کے قطروں اور جنگل کے پتوں کو کوئی نہیں گن سکتا' پھر بھی ایسے کمپیوٹر ایجاد ہو چکے ہیں جن کے ذریعے' ذروں' قطروں اور پتوں کا حساب ممکن ہے لیکن ماں کے پیار کا شمار حد امکان سے باہر ہے۔

خالق کائنات نے ماں کے سینے میں اپنی رحمت اور اس کے رویے میں اپنی ربوبیت بھر دی ہے' یہ تو ممکن ہے کوئی سمندر کے پاتال تک پہنچ جائے مگر کسی میں دم نہیں کہ وہ ماں کے پیار کا پاتال پا سکے۔

کبھی ہم تصور کی دنیا میں کھو کر دیکھیں کہ جب ماں اپنے جگر گوشے کو پیار سے دیکھتی ہے تو یوں لگتا ہے کہ خدا آج ساری نعمتیں اپنی مخلوق میں بانٹ دے گا' انسان بعض اوقات

کسی کی خاطر ساری دنیا کو فراموش کر دیتا ہے لیکن ماں اپنے نورِ نظر کو پا کر اپنا آپ بھی فراموش کر بیٹھتی ہے۔

ماں کا وجود ایسی نعمت تو ہے کہ متحدہ ہندوستان کے فرمانروا اورنگ زیب عالمگیر کو کہنا پڑ گیا' کہ

"ماں کے بغیر گھر قبرستان لگتا ہے۔"

آخر اورنگ زیب کے ہاں کس چیز کی کمی تھی' وراثت میں بادشاہت ملی' پچاس برس حکومت کی' اورنگ زیب لقب پایا عالمگیر کہلایا' تاج مغلیہ زیب سر کر کے بھی ممتا سے بے نیاز نہ ہو سکا۔

نادر شاہ دُرانی جیسا تیر و تفنگ سے کھیلنے اور تیغ و سناں کے سائے میں پلنے والا حکمران اپنی ساری سختی و صلابت کو بھول کر بول اٹھتا ہے "ماں اور پھولوں میں مجھے کوئی فرق نظر نہیں آتا۔"

مولانا محمد علی جوہر نے دنیا سے کیا کچھ نہیں پایا اور زمانے میں کیا کچھ نہیں دیکھا' آکسفورڈ کی ڈگری' ذوق شعر و سخن اقلیم صحافت کی تاجداری اور میدان خطابت کی شہسواری' قیادت کی مسند اور بیت المقدس میں مرقد' پھر بھی وہ کہتے ہیں کہ "دنیا کی سب سے حسین شے ماں اور صرف ماں ہے۔"

علامہ اقبالؒ جو بجا طور پر "حکیم الامت" کہلائے دنیا نے انہیں فیلسوف مشرق مانا اسلامیان ہند کے نزدیک "مصورِ پاکستان" ٹھہرے' غلام قوم کے فرد ہو کر جرمن فلسفی نطشے کو مقام کبریائی سمجھاتے رہے' اور اپنی زندگی ہی میں مرجع خلائق بنے' وہ ماں کی عظمت کو یوں سلام پیش کرتے رہے۔

"سخت سے سخت دل کو ماں کی پر نم آنکھوں سے نرم کیا جا سکتا ہے۔"

دنیا کے مانے ہوئے فرانسیسی جرنیل نپولین نے ماں کے مزاج کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"حسرتوں کے ہجوم اور خوشیوں کے تلاطم میں ماں کی عظمت دیکھو۔"

انسان واقعی جب دکھوں میں گھرا اور غموں سے گھبرایا ہوا ہو یا بہت بڑی خوشی سے ہمکنار ہو تو اس وقت احساس ہوتا ہے کہ کاش آج ماں ہوتی تو سارے دُکھ درد سمیٹ لیتی یا اولاد کی خوشی میں خود بے کنار ہو جاتی۔

یورپ کے نامور شاعر ملٹن نے اپنے سارے ذخیرۂ ادب کو نچوڑ کر یہ فقرہ ادا کیا ہے کہ

"آسمان کا سب سے بہترین اور آخری تحفہ ماں ہے۔"

Marfat.com

لیکن آیئے کائناتِ انسانی کی برتر شخصیت کی بات سنئے' سچ ہے بادشاہوں کی بات' باتوں کی بادشاہ ہوتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے۔ "جنت ماں کے قدموں میں ہے۔"

جنت ابدی خوشی اور دائمی کامرانی کی آخری منزل ہے لیکن یہ آخری منزل ماں کی دہلیز کا زینۂ اول ہے' اس اونچی منزل کو پانے کے لئے سدرۃ المنتہیٰ پر جانے کی نہیں ماں کے قدموں میں بیٹھنے کی ضرورت ہے' ماں کی قدر و منزلت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ کونین کے والی حلیمہ سعدیہؓ کے آنے پر سرو قد کھڑے ہو جاتے تھے اور دنیا بھر کے عیب ڈھانپنے والی کالی کملی زمین پر بچھا دیتے تھے' حلیمہؓ آپ کی حقیقی ماں نہیں دودھ کی چند دھاریں پلانے والی دایہ تھیں' سچ ہے جو ماں کی عاطفت کو نہیں سمجھ پایا وہ اللہ کی شان ربوبیت کا ادراک کب کر پائے گا؟

۲۲ اگست ۱۹۷۴ء کو اماں جان مجھ سے جدا ہوئیں' اور ۲۲ اگست ۱۹۹۰ء کو میرے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی' جسے دیکھ دیکھ کر ماں کی جدائی کی پیاس بجھاتا رہتا ہوں' جب کبھی آلام دُنیا سے جی گھبراتا ہے' غم روزگار سے دل گھٹتا ہے اور کسی طرف سے دُکھ ملتا ہے تو گھر پہنچ کر اپنی بچی سعدیہ کو سینے سے چمٹا لیتا ہوں اور یوں لگتا ہے کہ میں خود اماں مرحومہ کی چھاتی سے لپٹا ہوا ہوں' اور یوں میرے دُکھ درد کا ایک ایک کانٹا نکل جاتا ہے' جب کبھی والدہ کے لئے اداس ہوتا ہوں تو نظر بھر کر بیٹی کو دیکھ لیتا ہوں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے برف کی ڈلی جگر پر رکھ دی ہے' یوں اُداسی کی ساری جلن لمحوں میں کافور ہو جاتی ہے' جب کبھی والدہ کا پیار یاد آتا ہے تو سعدیہ پر بے اختیار پیار آجاتا ہے اور روح کو قرار مل جاتا ہے' یہ سب کچھ اپنی جگہ برحق مگر اب اس دُنیا میں راتوں کو اُٹھ کر میرے لئے دعائیں کرنے والا کوئی نہیں' میری طرف آنے والی بلاؤں کو روکنے والا ہاتھ نہیں رہا' میرے آنسو پونچھنے والا پلو نہیں رہا' میرے لئے بلا مزدو معاوضہ دامن پسارنے اور عرش سے میرے حصے کی رحمت کھینچ لینے والی ذات نہیں رہی' مجھے پر کوئی آپ' جناب' کہہ کر پکارتا ہے تو اور تم کہہ کر بلانے والی ہستی نہیں رہی' ہائے کس کس محرومی کا ذکر کروں؟

میری ان پڑھ ماں میری یونیورسٹی تھی' میری غریب ماں میری جاگیر تھی' میری گمنام ماں میرا نام و نشان تھی' میری چٹائی نشین ماں میرا سرمایہ توقیر تھی' وہ الف با نہیں پڑھ سکتی تھی مگر درس شفقت خوب ازبر تھا' وہ "ایٹی کیٹ" سے آشنا نہ تھیں' مگر حسن خلقی کا مجسمہ تھیں' میں نے اپنے ہوش میں ان کے تن پر ہمیشہ پیوند لگا کپڑا دیکھا لیکن ان کا رشتۂ محبت بے گرہ تھا' ان کی جوتی ہمیشہ گرد آلود رہی لیکن اس کی قدر و قیمت آج معلوم ہوئی ہے جب سے فرمانرواؤں کے تاج دیکھنے کا موقع ملا' ان کا جھریوں بھرا چہرہ آج بے طرح یاد آتا ہے' جب سے زمانے کا

Marfat.com

مکروہ چہرہ دیکھا ہے' ان کی سادگی پر رشک آتا ہے۔ جب سے دنیا کی پرکاری سے آگہی ہوئی ہے۔

سرسید مرحوم سے کسی نے کہا تھا کہ آپ اپنا حاصل حیات بیان کریں تو مرحوم نے جواب میں کہا تھا۔

؎ طفلی و دامان مادر خوش بہشتے بودہ است
چوں بپائے خود رواں گشتیم و سرگرداں شدیم

"بچپن کی عمر اور ماں کی گود ہی حقیقی بہشت تھی ورنہ جب سے اپنے پاؤں سے گھومنا سیکھا ہے تب سے سر چکرا رہا ہے۔"

بہشت کا یہی تو تصور ہے کہ وہاں سب کچھ بن مانگے ملے گا' اور من چاہی نعمت میسر ہو گی' ماں بھی تو اولاد کو بن مانگے دیتی ہے منہ کا نوالہ تک دے دیتی ہے' اور اولاد جو چاہے اسے مہیا کرتی ہے خواہ اسے کسی کے برتن کیوں نہ مانجھنے پڑیں' آج دنیا دولت کی تلاش میں ہے سب سے بڑی دولت تو ماں کا وجود ہے' جسے ماں کا سایہ میسر ہے وہ سب سے بڑا تونگر ہے' آج لوگ روشنیاں ڈھونڈھ رہے ہیں' جب کہ ماں کے قدموں کی دُھول میں کہکشاں آباد ہے' آج کا انسان غم غلط کرنے کے لئے تنہائی کا طالب ہے' جام و پیمانہ میں گم ہونا چاہتا ہے' اور اربابِ اقتدار کی پناہ میں آنا چاہتا ہے حالانکہ ماں کے آنچل سے بڑھ کر کوئی پناہ گاہ نہیں' جب والدہ نے آخری ہچکی لی تھی میں اس وقت ان کے سرہانے پر موجود تھا' میں نے جھٹ سے اپنی ٹوپی اتار کر ان کے قدموں میں ڈال دی تھی اور اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگی تھی' اپنا سر ان کے پاؤں پر رکھ دیا تھا اور یوں انہیں آخری سلامی دی تھی' آج جب کہ میری ٹوپی کی نوک اونچی رہتی ہے تو اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ ماں کے قدموں سے مس ہوئی ہے اور آج اگر مجھے اونچی کرسی پر بٹھایا جاتا ہے تو وہ ماں کے پاؤں پر سر رکھنے کا صدقہ ہے' میں یہ سطریں لکھ رہا تھا کہ غیب سے اماں مرحومہ کی آواز کانوں سے ٹکرائی وہ کہہ رہی تھیں' بیٹا' میں اللہ کی گنہ گار بندی سہی مگر تیرے لئے رابعہ بصریؒ ہوں' میں نے تیرے لئے اپنے رب سے پناہ مانگ لی ہے' تو میرے دامن کی ہوا اور پالنہار کی عطا سے کبھی محروم نہیں رہے گا۔

(20 اگست 1997ء)

Marfat.com

حج ----- وحدت و مرکزیت کا مظہر

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ابھی ٹیلی فون ایجاد ہوا تھا اور نہ ٹیلی وژن' نہ میگافون تھا نہ لاوڈ سپیکر' نہ فیکس تھی نہ ٹیلیکس' نہ موڈیم موجود تھی اور نہ لاسکی سسٹم' نہ اخبارات تھے اور نہ رسائل و جرائد' رسل و رسائل کے ذرائع تقریباً معدوم اور مواصلاتی نظام مفقود! ایک شہر میں بیٹھ کر دوسرے شہر سے رابطہ کرنا گویا دو براعظموں کے فاصلے سمیٹنے کے مترادف تھے' یہ کرشمے اور سائنسی معجزے بہت بعد کی چیزیں ہیں' کہ ریسیور اُٹھایا اور لاہور کا نیویارک سے رابطہ جڑ گیا' ناشتے کی میز پر اخبار پہنچی اور دنیا بھر کی خبریں معلوم ہو گئیں۔ ٹی وی کا بٹن دبایا اور کسی بھی ملک کا پورا منظر آنکھوں کے سامنے گیا' اور بات ہزاروں لوگوں کو سنائی دینے لگی' آج دنیا سمٹ کر اکائی میں ڈھل چکی ہے' لمحوں میں صدیوں کے فاصلے طے ہو رہے ہیں' ناشتہ پاکستان میں ظہرانہ سعودی عرب میں اور عشائیہ لندن میں کسی اللہ دین کے چراغ کا کرشمہ نہیں روز مرہ کا مشاہدہ بن چکا ہے' آج اپنی بات دنیا کے کسی بھی کونے میں پہنچ جانے کے لئے ٹی وی کا وقت خریدنے پر موقوف ہے تھوڑا سا وقت خریدئے اور اپنا پیغام دنیا بھر کو بھیج دیجئے' لیکن آج سے پانچ ہزار سال قبل ان میں سے کوئی بھی سہولت موجود نہ تھی' ایک آدمی زیادہ سے زیادہ چند آدمیوں سے مخاطب ہو سکتا تھا' اس زمانے میں براہ راست سماعت کا رواج تھا' کوئی ٹیلی فونی خطاب کا دستور نہ تھا' اور نہ ہی قومی نشریاتی رابطے کی گنجائش تھی' سٹیلائٹ کے ذریعے کوئی بھی منظر دوسری جگہ نہیں دیکھا جا سکتا تھا' اور نہ ہی برقی رو' آواز کا آہنگ اور حجم بڑھا سکتی تھی۔

جو بات میں کرنے چلا ہوں وہ صدیوں پہلے کی ہے جب اللہ کے دو بندوں اور وقت کے دو پیغمبروں نے دنیا کے بتکدوں میں خدا کا گھر بنایا' وہ دو بندے اور دو پیغمبر باپ بیٹا تھے' باپ معمار بنا اور بیٹا مزدور' ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام دونوں نے مل کر بیت اللہ تعمیر کیا' بیٹا اینٹیں ہاتھ میں تھماتا گیا اور باپ انہیں جوڑ کر دیوار اٹھاتا گیا' جب بیت اللہ تعمیر ہو گیا' تو حکم ہوا کہ میرے گھر کو طواف رکوع اور سجود کرنے والوں کے لئے پاک صاف کرو اور منادی کرو کہ لوگ میرے گھر کے

Marfat.com

طواف ' اور حج کے لئے آئیں حضرت ابراہیم نے کہا کہ آخر میری کمزور سی آواز کہاں تک جائے گی اور کون میری آواز سن کر یہاں پہنچے گا ارشاد ہوا تم بلاؤ تو سہی ! وقت بتائے گا کہ لوگ کس طرح کشاں کشاں تمہاری آواز پر لبیک کہتے ہوئے دنیا کے ہر کونے سے چلے آئیں گے یَأتِیہ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ O

نجانے صدائے ابراہیمی میں کیا زور اور کتنا اخلاص تھا کہ ہر سال اتنے لوگ یہاں حاضر ہوتے ہیں کہ کسی سلطان وقت کے بلاوے پر بھی لوگوں کی اتنی بڑی تعداد جمع ہوئی ہو گی اور نہ ہو سکتی ہے۔

اونٹوں کے دور سے لے کر جہازوں کے زمانے تک زائرین و حجاج کی تعداد ہے کہ برابر بڑھتی چلی جا رہی ہے ' دنیا میں کسی بھی جگہ پر انسانوں کا یہ سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے ' اور یہ محض اجتماع ہی نہیں ہوتا بلکہ بے شمار روحانی اور معاشرتی خوبیوں اور پہلوؤں کا حامل ہوتا ہے۔

1۔ اتنا بڑا اجتماع کسی قومی فخر کے اظہار اور کسی نسلی عصبیت کے حوالے سے نہیں ہوتا اور نہ ہی وقتی سیاسی ہنگاموں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ بلکہ اس عالمگیر اجتماع میں شریک ہونے والا ہر شخص جذبۂ عبودیت کے ساتھ شریک ہوتا ہے ' وہ یہاں زرق برق لباس پہن کر نہیں بلکہ ایک طرح کا کفن اوڑھ کر حاضر ہوتا ہے۔ اس اجتماع میں اپنی شخصی وجاہت کا نہیں ہر لحہ اپنی خطاؤں پر ندامت کا اظہار کیا جاتا ہے ' تحت نشین خاک نشین بن کر رہتے ہیں ' حج کے اجتماع میں جو کچھ نظر آتا ہے اگر یہی کچھ امت کا اجتماعی رویہ بن جائے تو فکری و روحانی اور سیاسی و معاشرتی انقلاب دو قدم کے فاصلے پر رہ جاتا ہے ' ہمارے یہاں جو بھی اجتماع ہوتا ہے کسی اسلامی قدر اور علمی و فکری اہلیت کے لئے نہیں محض گروہی حمیت اور جماعتی عصبیت کے اظہار کا مکروہ نمونہ ہوتا ہے ' اُمت اگر ہر قدم پر اُسی جذبۂ عبودیت سے سرشار ہو جس کا مظاہرہ مکاف کعبہ ' کوہ صفا ' میدان عرفات اور منیٰ و مزدلفہ میں کیا جاتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اُمت کو اپنے دام غلامی میں نہیں پھانس سکتی ' اسی زرق برق لباس کی بے محابا اور منہ زور خواہش نے عالم اسلام کو تن آسانی کا مریض بنا دیا ہے جس کے نتیجے میں ہم اپنا من بڑی آسانی سے گروی رکھنے کو تیار ہو جاتے ہیں ' کفن پر قناعت کر لی جائے تو دریوزہ گری کی ذلت سے آدمی کو نجات مل سکتی ہے ' آج اُمت کا ایک بڑا روگ شخصی وجاہت کا اظہار ہے جس نے وجودِ اُمت کو ریزہ ریزہ اور اسلامی جمعیت کو پارہ پارہ کیا ہوا

Marfat.com

ہے، کسی زمانے میں اسلامی برادروں کا رنگ الگ لیکن آہنگ ایک تھا، جغرافیائی خطے تو تھے، مگر دینی رشتے پر استوار، لفظ مختلف تھے مگر معنی مشترک تھا، بول چال اور لہجے میں ضرور اختلاف تھا لیکن چال ڈھال اور رویے میں زبردست اشتراک تھا، حج کے اجتماع میں مختلف رنگوں، زبانوں، اور علاقوں کی نمائندگی ہوتی ہے لیکن یہ سبھی ایک ہی رشتہ بندگی میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

2۔ حج کے موقع پر آج تک کسی بھی زمانے میں یہ حادثہ نہیں ہوا کہ کوئی عربی طواف کے دوران کسی عجمی سے کندھا جوڑ کر چلنے میں عار محسوس کرے، کوئی گورا کسی کالے کو اپنے ساتھ نہ لگنے دے، کوئی امیر کسی غریب کے ساتھ ایک صف میں نماز پڑھنے کو آمادہ نہ ہو، کوئی عالم عامیوں کے عرفات میں قیام نہ کرے، اور کوئی شب زندہ دار اور زاہد مرتاض کسی عاصی و خاطی کی موجودگی میں مناسک حج ادا کرنے سے گریز کرے، لیکن یہ کیا کہ وہاں سے واپس ہوتے ہی کسی کی عربیت جاگ پڑتی ہے، کوئی اپنے گورے رنگ پر دنگ رہ جاتا ہے۔ کسی کی امارت میں فرعونیت آجاتی ہے، کوئی اپنی علمی برتری کو باقاعدہ صنعت آزادی بنا کر بیٹھ جاتا ہے کہ لوگ آئیں اور پوجا کریں، اور کوئی اپنی شب بیداری کو باضابطہ مردم آزاری میں بدل دیتا ہے اگر حج کے موقع پر کعبہ کسی کی ملکیت نہیں ہوتا تو ہم نے رب کعبہ کو اپنے فرقوں میں کیوں منحصر کیا ہوا ہے؟ اگر صفا مروہ کی دوڑ میں سب برابر کے شریک ہوتے ہیں، تو زندگی کی دوڑ میں ہم سب کو شریک کرنے سے کیوں گھبراتے ہیں؟ اگر نمرہ و مزدلفہ میں قیام و سجود ایک ساتھ ہو سکتا ہے تو عام مسجدوں میں ایک دوسرے کا وجود کیوں ناقابل برداشت ہو جاتا ہے؟

3۔ حج کے موقع پر جو چیز سب سے نمایاں ہوتی ہے وہ وفورِ عشق اور جذبہء جنوں! عقل حیلہ تراش، منطق نکتہ طراز اور فلسفہء گردن فراز کا وہاں کوئی شائبہ نہیں ملتا، یہ وفورِ عشق اور جذبہء جنوں کسی فتورِ ذہنی اور دیوانگی کا نتیجہ نہیں بلکہ حکم خدا کی تعمیل اور سنت رسولؐ کی پیروی کا مظہر ہوتا ہے، ایک سیاہ پوش کوٹھے کے گرد بار بار گھومنا آخر اس میں کیا منطق ہے؟ لیکن مسئلہ منطق کا نہیں بات وحی اور صاحب وحیؐ کے نطق کی ہے، سیاہ پتھر (حجر اسود) سے لپٹنا اور بار بار چومنا، لپٹنے میں بے ساختگی اور چومنے میں وارفتگی، آخر اس بھدے اور سیاہ پتھر میں کون سا حسن اترا ہے؟ اس بے کلی سے تو آدمی اپنی اکلوتی اولاد سے نہیں چمٹتا

اور اس شوق سے اس کی پیشانی نہیں چومتا جس جنون اور خود سپردگی کے ساتھ ایک حاجی اور زائر حجراسود کی طرف لپکتا اور اسے اپنی آنکھوں سے لگاتا ہے' تو یہاں بھی بات حجراسود کے حسن کی نہیں پیغمبر اسود و احمر کے حسن ادا کی پیروی کی ہے کہ آپؐ نے ایسا کیا اور ہمیں ایسا کرنا چاہئے ورنہ۔

کون روتا ہے لپٹ کر در و دیوار کے ساتھ

یہ ساری باتیں اس امر کا پتہ دیتی ہیں کہ ایک مسلمان اپنی زندگی اور محولاتِ زندگی کا خود مالک نہیں ہوتا بلکہ وہ انہیں خدا اور رسول کی مرضی اور خواہش کے تابع سمجھتا ہے۔ زندگی کا ڈھب کیا ہو؟ وہی جو اس کے رب نے سکھایا' جینے کا اصول کا کیا ہو؟ وہی جو اللہ کے رسولؐ نے طے کیا' دنیا میں رہنے کا اسلوب کیا ہو؟ وہی جو اللہ و رسولؐ کا مرغوب ہے۔

یہی وارفتگی اور جذب و جنون اگر امت کے مجموعی مزاج میں آجائے تو دنیا کی کسی چیز میں وہ طاقت اور کشش نہیں رہتی جو ایک مسلمان کو اللہ و رسول سے الگ کر سکے اور اپنی طرف کھینچ سکے' جب ہم مرغوباتِ نفس کی طرف مائل ہوتے' اور دنیوی طاقتوں کے قائل ہوتے ہیں تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ہم عشق خدا بیں کے بجائے عقل خود بیں کو اپنا رہبر اور امام بنا لیتے ہیں۔

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

آج اُمت کے مجموعی حالات عقل عیار کی مصلحت آمیزی کے نہیں جنون یزداں شکار کی بلا خیزی کے منتظر ہیں۔

مصطفٰےؐ نایاب و ارزاں بو لہب

4۔ قرآن مجید میں بارہا "ملت ابراہیمؑ" کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے' ایک ملت ابراہیمیؑ کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے' اور حضور ﷺ نے اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کا فرد قرار دیا ہے اور قرآن مجید میں ایک جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو باقاعدہ "اُمت" کہا گیا ہے' یعنی ایک فرد بذاتِ خود امت ہے' اس کی حکمت انسان پر حج کے موقع پر کھلتی ہے کہ ملت ابراہیمؑ کو کیوں اہمیت دی گئی' ملت ابراہیمی کی پیروی کو کیوں لازم ٹھہرایا گیا اور حضرت ابراہیمؑ کو "امت" کیوں کہا گیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے بیت اللہ تعمیر کر کے اس کو "مثابةً للنّاس" (انسانیت کا مرکز) بنا دیا' اور دوسرے "جائے امن" کا درجہ دیا' کسی بھی ملت کے لئے اس

سے بڑھ کر ضروری چیز اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے "مرکزیت" اور "امن" حاصل ہو جائے اور کعبہ اسی مرکزیت اور امن کا بہت بڑا بلکہ سب سے بڑا مظہر اور محسوس پیکر ہے' پانچ ہزار سال سے نہ کعبے کی مرکزیت ختم ہوئی ہے اور نہ اس کے امن بخش کردار میں کوئی خلل آیا ہے' ہر حاجی کو معلوم ہے کہ انسان تو ایک طرف اگر اس کے ہاتھ سے عمداً کوئی مچھر' مکھی' اور جوں تک مر جائے' تو "دم" قربانی واجب ہو جاتا ہے' اگر کوئی صاحب احرام منطق وجدال کا مظاہرہ کرے تو اس کا حج اور عمرہ مکروہ بلکہ کسی درجے میں باطل ہو جاتا ہے' قتل و غارت کا تو تصور بھی نہیں' اور مرکزیت کا یہ عالم ہے کہ پانچ ہزار سال سے طواف کعبہ نہ رُکا ہے نہ معطل ہوا ہے اور نہ موقوف ہوا ہے' بجز ان چند حادثات کے جو انسانی دنیا میں ناگزیر ہوتے ہیں' ورنہ خچروں اور اونٹوں کے دور سے لے کر ہوائی جہاز کے عہد تک لوگ برابر طواف کعبہ کے لئے جاتے اور ملی مرکزیت کا مشاہدہ کرتے ہیں جو شخصیت لاکھوں کروڑوں انسانوں کو بتان رنگ و بو سے بے نیاز کر کے الٰہی رنگ اور وحدت کی خوشبو سے ہمکنار کر دے اسے بجا طور پر "اُمت" کا خطاب دیا جا سکتا ہے۔ کہ جو کام ایک امت کے ہاتھوں برپا ہو سکتا ہے وہ ایک شخصیت نے کر کے دکھایا' آج بھی ہر حاجی اور زائر "اُمت" کے منصب پر فائز ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہاں سے لوٹے تو اس پر کسی نسل' برادری' گروہ' فرقے' ذات' زبان' علاقے' اور رنگ زیب کی چھاپ ڈھونڈھنے سے بھی دکھائی نہ دے اور وہ کام کرے جو اُمت کے کرنے کا ہے۔

5۔ حضرتِ ابراہیمؑ کے ہاتھوں تعمیر کئے گئے خانۂ کعبہ کی ایک شان یہ بھی ہے کہ وہ محتاج شرف و غرب اور پابند جہت اور سمت نہیں' اس لئے کہ اس کو نسبت مشرق و مغرب سے نہیں بلکہ رب المشارق والمغارب سے ہے اور وہ بے جہت اور سمت سے بے نیاز خدا کا گھر ہے اس کے چاروں طرف نمازی ہوتے ہیں' بیک وقت کسی کا رخ شمال' کسی کا مغرب' کسی کا جنوب اور کسی کا مشرق کی طرف ہوتا ہے' لیکن سب کی توجہات کا مرکز خانۂ کعبہ ہوتا ہے جو انوارِ الٰہی اور تجلیات خداوندی کا زمین پر سب سے بڑا مظہر اور مرکز ہے۔

پاکستان والے مغرب کی طرف' مصر والے مشرق کی طرف' یمن والے جنوب کی طرف اور کئی دوسرے ممالک کے لوگ شمال کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں لیکن رخ سب کا

Marfat.com

بیت اللہ کی طرف ہوتا ہے' اور ایسا کیوں نہ ہو کہ وہ "مثابةً للناس" (مرکز انسانیت) ہے۔ اور ظاہر ہے انسان اس کرۂ ارضی کے ہر کونے پر آباد ہیں' سمت اور جہت کی قید ہوتی تو مرکزیت پر حرف آسکتا تھا' اور اس سے امت اور ملت کا تصور دھندلا جاتا' جبکہ خانۂ کعبہ کا وجود' اس کا طواف' حج اور زیارت ہے ہی اس لئے کہ دنیا کو الوان و اوطان' اور نسل و زبان کے شیطانی چکر سے نکال کر ایک ہی سرکار کا بندہ اور ایک ہی دربار کا منگتا بنا دیا جائے' تاکہ جبین انسانیت ہر سنگ در پر جھکنے سے بار بار خوار نہ ہو اور دامن آدمیت ہر ایک کے سامنے بھیک مانگنے سے شرمسار نہ ہو۔

؎ بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

(26 مارچ 1999ء)

اتحاد بین المسلمین اور عاشورۂ محرم

برسوں سے وطن عزیز میں ایک رجحان چلا آرہا ہے اور ہر بار یہ رجحان پختہ تر ہو رہا ہے کہ جونہی محرم الحرام کی آمد ہوتی ہے تو ایک غیر معمولی اور ہنگامی نوعیت کی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔

جس طرح بجٹ کی آمد سے قبل اشیاء کی قلت' ذخیرہ اندوزی اور مہنگائی کے امراض قوم کو لاحق ہو جاتے ہیں اسی طرح محرم کے آغاز میں مذہبی فضا میں تناؤ اور کھچاؤ سا آجاتا ہے' حکومت کی طرف سے بعض علماء کی زبان بندی' بعض علماء پر دوسرے علاقوں میں جانے کی ممانعت' دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ' اور انتظامیہ کو الرٹ کر دینے کے احکام جاری کر دیئے جاتے ہیں۔

امن کمیٹیاں بنی شروع ہو جاتی ہیں' ان کے اجلاسوں کا سلسلہ چل نکلتا ہے اور سنی شیعہ فرقوں کے درمیان دھمکی آمیز بیانات کی یلغار ہو جاتی ہے' یہ رجحان کم از کم ایک سادہ اور عام مسلمان کے لئے ناقابل فہم اور انتہائی تعجب انگیز ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی سیلاب یا طوفان آرہا ہے جس کی پیش بندی کے سارے سامان ہو رہے ہیں' اگر بند نہ باندھے گئے' پشتے مضبوط نہ کئے گئے' کٹاؤ کے انتظامات نہ کئے گئے' اور بہاؤ کے رُخ متعین نہ کئے گئے تو خدانخواستہ بڑی تباہی مچ سکتی ہے۔

آخر آغازِ محرم میں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کی سادہ سی وجہ فرقہ واریت ہے جس کے زہر نے ذہنوں کو آلودہ اور جس کی نفرت نے دلوں کو کبیدہ کر رکھا ہے اور وہ ایام اور مواقع جو کسی قوم کے لئے ذریعہ اتحاد' سرمایۂ افتخار اور طرۂ امتیاز ہوتے ہیں اُلٹا موجب افتراق' باعث فساد اور وجہ نزاع بن جاتے ہیں۔

حالانکہ کوئی بادنیٰ تعمق دیکھے تو عاشورہ محرم تاریخ اسلام کا ایک دردناک باب ہے' اور غم آگیں ورق! دنیا کا دستور ہے کہ غم اور دُکھ کے موقع پر برادریوں میں اختلاف ہو بھی تو وقتی طور پر ختم ہو جاتا ہے اور ہر فرد دکھ درد میں شریک ہوتا ہے مگر ہمارے یہاں اس لحۂ الم میں پہلے سے بھی زیادہ اختلاف رُونما ہو جاتا ہے' اور دلوں کی دُوریاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ اس ناخوشگوار کیفیت کے یوں تو بہت سے اسباب ہیں جن کا گہرا علمی اور تاریخی تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے تاہم بادی النظر میں کچھ وجوہ اور اس نفرت کو ختم کرنے کے مندرجہ ذیل طریقے ہیں۔

1۔ ہمارے فرقہ وارانہ ذوق نے ہماری ملی اور تاریخی شخصیات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے

Marfat.com

اور ہم ان شخصیات کے آفاقی کردار کو اپنے گروہی دائرے میں بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ہمارے درمیان ان شخصیات کے حوالے سے ایک طرح کی کشمکش ابھر آئی ہے، انہی میں ایک مظلوم ہستی حضرتِ امام حسینؑ کی ہے حالانکہ سانحۂ کربلا محض ایک واقعہ نہیں تاریخ کا مستقل اور مسلسل کردار ہے جب تک نوع انسانی کے درمیان حق اور باطل، خیر اور شر، ظالم اور مظلوم کی آویزش رہے گی سانحۂ کربلا اور حضرتِ امامؑ ایک قومی علامت کے طور پر انسانیت کے حق اور خیر کے لئے ظلم کے خلاف جدوجہد کا درس دیتے رہیں گے، مگر بدقسمتی سے ہم نے اس واقعے کو سنی شیعہ کی بھینٹ چڑھا دیا ہے سب سے پہلے اس سوچ کو بدلنے کی ضرورت ہے، تب مفاہمت کی فضا پیدا ہو گی۔

2. ایک الجھن یہ بھی ہے کہ ہم غم حسینؑ کا اظہار کم کرتے اور اسے اپنے مسلک کا شعار زیادہ بناتے ہیں، چنانچہ اس ذہنیت کے نتیجے میں اس دوران تصادم اور کشمکش کے کئی مرحلے آجاتے ہیں، پھر مسئلہ کربلا کا نہیں رہتا، اپنے دھڑے کی بقا اور انا کا ہو جاتا ہے، ظاہر ہے جہاں انا کا ٹکراؤ ہو گا وہاں سے خیریت اور محبت کیسے برآمد ہو گی؟

3. اس سلسلے میں ایک اور سبب بھی قابل توجہ ہے کہ ہم بظاہر امام حسینؑ کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے جلسہ اور جلوس کا اہتمام کرتے ہیں مگر بلاتے ان لوگوں کو ہیں جن کی اپنی بقاء اور گزران اسوۂ حسینیؑ سے وابستہ نہیں بلکہ امامؑ کے نام پر تفرقے سے منسلک ہوتی ہے پیشہ ور ذاکر اور فرقہ پرست واعظ حضرتِ امامؑ کی شخصیت اور قربانی کو اس طرح پیش کرتے ہیں گویا انہوں نے یہ سب کچھ اسلام کی بالادستی اور وحدتِ ملی کو قائم رکھنے کے لئے نہیں کیا بلکہ کسی ایک گروہ کی سربلندی اور حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے قربانی دی، حالانکہ امامؑ کا یہ جہاد کسی فقہی، فروعی اور جزئی مسئلے کے لئے نہیں تھا بلکہ انہوں نے اپنے خون سے خلافت راشدہ اور ملوکیت کے درمیان حد فاصل کھینچ دی، اگر ایسا نہ ہوتا تو امت کے لئے یہ جاننا مشکل ہو جاتا کہ اسلام کا اصل سرچشمہ مسجد نبویؐ ہے یا شام کے محلات! شہادتِ حسینؑ کا یہ سب سے بڑا احسان ہے کہ اس نے امت کو فکری یکسوئی عطا کر کے ذہنی انتشار سے بچا لیا، چنانچہ آج تک حکمرانوں نے عوام کو بے شمار دھوکے دیئے اور لوگوں نے دھوکے کھائے مگر اسلام کے مثالی نظام پر دو آراء نہیں ہیں، اور کوئی حکمران اپنی ملوکیت، موروثیت، اور آمریت کو خلافت راشدہ کا متبادل نہ تو ثابت کر سکا اور نہ عوام سے منوا سکا گویا عاشورۂ محرم امت کی وحدتِ رائے کو قائم کرنے کا بہت بڑا ذریعہ بنا، مگر ہماری گروہی عصبیت نے اسکی قدر نہ جانی۔

Marfat.com

4. چوتھی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی بداعمالیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے بڑی ناروا جسارت کرتے ہوئے اصحابِ نبیؐ اور اہل بیت رسولؐ کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا ہے' حالانکہ یہ حریف نہیں ایک دوسرے کے جگری حلیف ہیں' آل رسولؐ سے اظہارِ عقیدت کا مطلب اصحابِ نبیؐ سے گریز نہیں اور اصحابِ نبیؐ کا احترام آل نبیؐ کے احترام کے منافی نہیں' لیکن ہر چیز کے اظہار کا ایک موقع ہوتا ہے اور کسی چیز کو اس کے اصل محل اور موقع سے ہٹا دینے کو عربی میں ظلم کہتے ہیں اور ہم برابر اس ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں' جس قوم کے ہاتھ میں میزان عدل نہ رہے قدرت اس قوم کی معاشرت کو بے اعتدال کر دیتی ہے اور اسی محرومی نے ہمیں ایک دوسرے کی بات سننے اور جذبات سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑا۔

5. آخر میں ایک بنیادی سبب کا بھی تذکرہ ہو جائے کہ مختلف مسلک اور مشرب اسلام کی منشاء کو بہتر انداز میں سمجھنے کے لئے وجود میں آئے مگر ہم نے ان مسالک اور مکاتب کو ذریعہ نہیں اصل سمجھ لیا ہے' اور درمیان سے اسلام کا جوہری رشتہ کمزور پڑ گیا ہے' گروہی شناخت نے اسلام کے آفاقی تعارف پر غلبہ پا لیا ہے' اور ہم نے اس غلطی کو ماننے کے بجائے بڑی شخصیات کی آڑ میں اور بھاری بھرکم اصطلاحوں کے پردے میں اور مقدس ناموں کے دامن میں چھپا کر اس کو غلطی نہیں رہنے دیا بلکہ اس کو عین اسلام اور حق سمجھ لیا ہے' جس کے منفی اثرات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گہرے اور زہرناک ہوتے جا رہے ہیں' قومیتی' لسانی' صوبائی' اور علاقائی عصبیتوں کے ساتھ مذہبی منافرت نے ہمارا ملی وجود خطرے میں ڈال دیا ہے' اس کے لئے ہمیں اپنے طرز عمل پر از سر نو غور کرنا پڑے گا۔

عاشورہ محرم ایسے ایام درحقیقت ہمیں غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ اصول اور فروع کے درمیان فرق کیا جائے' دین اور فرقوں کی صحیح نوعیت سمجھی جائے' ملی مفاد اور گروہی مفاد کے تقدم اور تاخر کا ادراک حاصل کیا جائے' اہم اور غیر اہم باتوں کے درمیان حد قائم کی جائے اور ہر مسئلے کو اس کے صحیح تناظر میں رکھ کر فیصلہ کرنے اور رویہ اپنانے کی شعوری کوشش کی جائے۔

یہ وہ مختصر سی باتیں ہیں اگر دل و دماغ انہیں قبول کر لیں تو محرم الحرام نہ صرف امن کے ساتھ گزر سکتا ہے بلکہ امت کے لئے امن کی بنیاد بن سکتا ہے۔

(16 مئی 1997ء)

Marfat.com

کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا بارہ آنے

ایک عرصے سے وزیراعظم کے دورۂ امریکہ کی دھوم مچی ہوئی تھی' پیش گوئیاں اور بد گوئیاں عروج پر تھیں' دفترخارجہ تیاریوں میں لگا ہوا تھا' قائد حزبِ اختلاف مسز بھٹو صدر کلنٹن کو خط پہ خط بھیج رہی تھیں' پاکستان کی طرف سے ایٹمی دھماکوں کے بعد اس دورے کو پبلک بھی خصوصی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی' اور بالآخر دورۂ امریکہ ہو گیا' لیکن واقعہ یہ ہے کہ پہلو میں دل کا شور جس قدر سنتے تھے چیرنے پر خون کا ایک قطرہ بھی نہیں نکلا' حکومتی ذرائع ابلاغ اور ساتھ جانے والے کالم نگار خواہ کتنا رنگ باندھ لیں' مگر واپسی کا آہنگ بتا رہا ہے۔ کہ

؎ جانے میں قدم اور تھے آنے' میں قدم اور

اس دورے میں فائلوں کا پیٹ کس قدر بھرا گیا' اور "لپ سروس" کس قدر ہوئی؟ اس سے قطع نظر ما حصل بس یہی ہے کہ "کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا بارہ آنے" یعنی ایک سو دس رکنی وفد پر غریب پاکستان کے لاکھوں ڈالر برباد ہو گئے۔

وزیراعظم نے واپسی پر بتایا "کہ میں کشکول لے کر نہیں گیا تھا اس لئے خالی واپس آنے کا کیا مطلب؟" سوال یہ ہے کہ وزیراعظم اگر کشکول لے کر نہیں گئے تھے تو کیا محض بڑا وفد لے جانے کا شوق تھا؟ اگر کوئی کام کرنے نہیں گئے تھے تو کیا صرف امریکہ دیکھنے گئے تھے؟ اس سے پہلے امریکہ نہیں دیکھ رکھا؟ وزیراعظم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "وہ کچھ لو اور کچھ دو کے ضمن میں سودا بازی نہیں کرنے گئے تھے۔" پھر وہی سوال ہے کہ وہ فقط کلنٹن کا ظہرانہ کھانے گئے تھے؟ اس قدر مہنگا لنچ کیا کسی غریب ملک کے وزیراعظم کو زیب دیتا تھا؟ آخر امریکہ جانے کا کوئی ایجنڈا تو ہو گا؟

گپ شپ؟ سیر سپاٹا؟ تقریب بہر ملاقات؟ ایف سولہ کے پیسوں کی واپسی؟ ایٹمی دھماکوں پر اپنے موقف کی وضاحت؟ سی ٹی بی ٹی کے حوالے سے مذاکرات؟ اسامہ بن لادن کا معاملہ؟ آخر کوئی مقصد تو ہو گا؟ حزبِ اختلاف کو تو کوڑا دان میں ڈالئے اس کا تو کام ہی مخالفت ہے' مگر قوم یہ سوچنے اور پوچھنے میں حق بجانب ہے کہ اس قدر زر مبادلہ کے خرچ کا نتیجہ کیا نکلا؟

ہاں اگر کلنٹن صاحب اپنا جہاز بھیج دیتے' پین ایم کی پرواز کے دو طرفہ ٹکٹ روانہ کر دیتے'

Marfat.com

سارے مہمانوں کو سرکاری مد سے کھانا کھلاتے' جملہ ارکان وفد کو مفت ٹھہراتے اور ٹرانسپورٹ کا خرچہ اپنے ذمے لیتے' تو بھی کچھ بات ہوتی کہ چلو ہاتھ کچھ نہیں آیا تو ملکی خزانے سے بھی کچھ نہیں گیا' مگر صورتحال اس کے برعکس ہے۔

اگر صدر کلنٹن کی طرف سے کچھ پابندیاں نرم ہوئی ہیں اور آئی ایم ایف اور دیگر عالمی مالیاتی ادارے قرض دینے پر آمادہ ہوئے ہیں تو یہ کون سی کامیابی ہے؟ قرض ہی ملے گا انعام تو نہیں ملے گا؟ پہلے قرض تھوڑا ہے کہ مزید لینے کے لئے اتنی تام جھام کی جائے؟

کہا جا سکتا ہے کہ سفارتی سطح پر یہ کچھ کرنا بہت ضروری ہوتا ہے' ہم بھی مانتے ہیں بشرطیکہ حالات نارمل ہوں اگر ملک گردن تک مقروض ہو' ہر ایک پر ملکی معیشت کا حال واضح ہو اور سب کے سامنے پیٹ ننگا ہو تو اس تکلف کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی' میں نام لکھوں گا تو دوست ناراض ہو جائیں گے' بجز چند ایک کے باقی صاحبان جو وزیراعظم کے ہمرکاب تھے آخر ان کی کیا ضرورت تھی؟

وزراء اکیلے نہیں بیگمات بھی ساتھ تھیں' وزیراعلیٰ پنجاب کی فیملی بھی ہمراہ تھی' ہمارے ایسے صحافی اور کالم نگار بھی ہم سفر تھے جن کا ایک ایک کالم ملک کو تقریباً پانچ پانچ لاکھ روپے میں پڑا' جب مغل اقتدار اپنے آخری نقطۂ زوال پر تھا اس وقت بھی ان کے چونچلے پورے عروج پر تھے' حالت یہ تھی کہ "شہنشاہ عالم" کی سلطنت فقط "از دلی تا پالم" تھی مگر پاؤں میں جوتا ڈالنے کے لئے درجن بھر کنیزیں حاضر رہتی تھیں' جوتا پہننے کی تکلیف بھی شاہ عالم کو گوارا نہ تھی' کچھ ایسا ہی مزاج ہمارے حکمرانوں نے پایا ہے' لیموزین کاروں کے بغیر ان سے سفر نہیں ہوتا' چارٹرڈ طیارے کے علاوہ انہیں اڑان کا لطف نہیں آتا' فائیو سٹار ہوٹلوں کے بغیر انہیں نیند نہیں آتی' اور دائیں بائیں سینکڑوں افراد کے پاؤں کی چاپ سنے بغیر انہیں سکون نہیں آتا۔

کیا دنیا کو معلوم نہیں کہ پاکستان کا گزارا اس وقت قرضے کی رقم پر ہو رہا ہے اگر یہ حقیقت ہے تو اس تصنع کی کیا ضرورت ہے؟

کیا دنیا نہیں جانتی کہ پاکستان دنیا کے غریب ملکوں میں شمار ہوتا ہے اگر یہ سچ ہے تو یہ "فیشن شو" لوگوں کو عجیب نہیں لگتا ہو گا؟

کیا دنیا اس سے آگاہ نہیں کہ پاکستان نے اس وقت مختلف ملکوں اور مالیاتی اداروں کو تقریباً چالیس ارب ڈالر یعنی پچیس کھرب روپے دینے ہیں اگر یہ امرواقعہ ہے تو پھر اس نمائش کا کیا جواز

Marfat.com

ہو سکتا ہے؟

دنیا کے ستاون مسلمان ملکوں کی مجموعی قومی آمدنی گیارہ سو بلین ڈالر ہے جبکہ اکیلے فرانس کی قومی آمدنی بارہ سو بلین ڈالر ہے اور جرمنی کی دو ہزار بلین ڈالر۔

مگر جرمنی کا وزیر خارجہ فشر گذشتہ دنوں امریکہ گیا تو عام پرواز سے روانہ ہوا' وہ آج بھی فرینکفرٹ میں اپنے سنگل کمرے میں رہائش پذیر ہے' جرمن چاہے تو وہ بھی چونچلے کر سکتا ہے اور اسے ہمارے مقابلے میں اس کا حق پہنچتا ہے مگر یورپی قوموں میں ہزار خامیاں ہونے کے باوجود ان کی یہ خوبی طے ہے کہ وہ رہتے انسانی حد اور اپنے دائرے میں ہیں' انہیں بھوکے پیٹ ڈکار مارنے کا فن نہیں آتا اور وہ خالی ہاتھ مونچھوں پر تاؤ دینے کے ہنر سے واقف نہیں' ہمارے سرکاری ذرائع ابلاغ آسمان سر پر اٹھائے ہوئے ہیں کہ پاکستان آئی ایم ایف سے قرضہ لینے میں کامیاب ہو گیا ہے' معلوم نہیں قرضہ مل جانا دنیا کی کس لغت میں کامیابی کا معنی و مفہوم رکھتا ہے؟ مقروض کی تو گلی محلے میں عزت نہیں ہوتی دنیا میں اسے کون وقعت دے گا؟

"بھوک" بندے کو بے عزت نہیں کرتی "بھیک" انسان کو بے وقعت بناتی ہے' جب تک ہاتھ نہ پھیلے کسی کے کپڑے میلے بھی ہوں تو کوئی حرف نہیں لاتا' اور تین دن کے فاقے میں آدمی مر نہیں جاتا لیکن "ٹھوٹھا" ہاتھ میں لے کر کسی در پر جاتے ہی انسان نظروں سے گر جاتا ہے۔

ے خود داریوں میں حد سے گزر جانا چاہئے
عزت سے جی نہ پائیں تو مر جانا چاہئے

(13 دسمبر 1998ء)

Marfat.com

خود کُشی

ادارہ فکر و نظر کے زیرِ اہتمام گذشتہ دنوں قائداعظم لائبریری باغ جناح لاہور میں مجھے ایک سیمینار میں اظہار خیال کا موقع ملا' عنوان تھا "خود کشی" اسباب اور حل۔"

گلستان فاطمہ جناح جیسے پر فضا مقام' قائداعظم لائبریری جیسے پر وقار اور علم پرور ماحول اور اس کے انتہائی خوبصورت اور پر کشش ہال میں "خود کشی" ایسے دل دوز اور ہولناک موضوع پر سیمینار کا انعقاد اور اس میں اظہارِ خیال عجیب بھی لگا اور سنگین بھی محسوس ہوا' اس تقریب کے منتظم بھی نوجوان تھے' تقریبات تو بہر ملاقات اور پیار کی سوغات بانٹنے کیلئے ہوتی ہیں' یہ کیا کہ خود کشی جیسا عنوان چن لیا جائے' لیکن اس سے اندازہ ہوا کہ ہمارے نظام زر اور عہد جبر نے نوجوانوں کو زندگی سے بھرپور قہقہے بانٹنے کے بجائے موت کے مرثیے پڑھنے اور سننے پر مجبور کر دیا ہے۔

خود کشی کے روز افزوں رجحان کے تین زاویئے اور پہلو ہیں' معاشی بھی اور ذہنی و جذباتی بھی یہ طے ہے کہ زندگی بہت لذیذ اور ہر ایک کو بہت عزیز ہے' زندگی کا کوئی نعم البدل نہیں' نہ سونا' نہ چاندی' نہ تاج نہ تخت اور نہ جاگیر و محل' یہی وجہ ہے کہ کوئی مرنا نہیں چاہتا' خواہ نوے سال کا بوڑھا ہو یا چارپائی سے لگا ہوا مریض' موت کا لفظ منہ سے ادا کرنا جس قدر آسان ہے اس کے مرحلے سے گزرنا اسی قدر مشکل ہے' عشق و عاشقی کے چکر میں وقتی اشتعال کے تحت ہونے والی خود کشی کو چھوڑ کر اگر کوئی مریض' کوئی غریب' کوئی مظلوم اور کوئی بے وسیلہ جان سے گزرتا ہے تو یہ بات بہت ہی لائق توجہ ہے یقیناً زندگی اس کے لئے وبال دوش تھی جسے اتار پھینکنا اس نے ضروری سمجھا ورنہ ہر ایک زندگی پر مرتا ہے کوئی مرنے کے لئے نہیں جیتا' کہ وہ خوشی خوشی موت کو گلے لگالے۔

وہ مریض جس کی عمر بھر کی پونجی' گھر کے برتن' تن کے کپڑے' حتیٰ کہ بچوں کا مستقبل تک علاج کی نذر ہو جائے اور اس کے باوجود وہ ڈاکٹروں کی فیس' دوائیوں کی قیمت اور ہسپتال کے چارجز ادا نہ کر پائے اور موت کو اپنی طرف ٹہل ٹہل کر آتا دیکھے' اور آنکھوں کے سامنے گول مٹول اور پھول سے بچے ہوں جن سے کچھ ہی دنوں میں وہ بچھڑ جائے گا' ایسا شخص خود کشی پر مجبور نہیں ہو گا' تو اور کیا کرے گا؟

وہ غریب جو گھر بھر کا اکیلا کفیل ہو' ہڈ حرام اور کام چور بھی نہ ہو' روزانہ کانڈی تیشی بھی لے

Marfat.com

کر گھر سے نکلے، چونے کی کوچی بھی ہاتھ میں رکھے، دن کا آدھا پہر فٹ پاتھ پر بیٹھ کر مزدوری کا انتظار بھی کرے، ہر گزرنے والے کو حسرت بھری نگاہوں سے بھی دیکھے کہ شائد وہ مجھے کام کے لئے لے جائے، اور اس کے باوجود وہ شام ڈھلے خالی ہاتھ لوٹ آئے، گھر میں آٹا بھی نہ ہو، بچے دودھ کے لئے بھی رو رہے ہوں، کسی سے مانگتے ہوئے بھی اسے حیا آئے، نہ اس سے درد سہا جائے اور نہ گھر کا نقشہ دیکھا جائے ایسے میں وہ خودکشی کرنے پر نہیں آئے گا، تو اور کیا کرے گا؟

وہ بے روزگار جو پڑھا لکھا بھی ہو، ہنرمند بھی ہو اور اس پر بوڑھے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائیوں کا بوجھ بھی ہو وہ باوجود تلاش بسیار کے روزگار نہ ڈھونڈھ پائے اسے اتنی تنخواہ کی طلب نہیں کہ خرافات کی نذر کر سکے بلکہ صرف اس قدر کہ رشتۂ حیات برقرار رکھ سکے اسے وہ بھی نہ مل سکے تو یا وہ خاندان چھوڑ جائے گا یا پھر جان سے گزر جائے گا اس کے علاوہ وہ کیا کر سکتا ہے؟ وہ شریف زادی جس کے قدم کبھی دہلیز سے باہر نہ نکلے ہوں، جس کا چہرہ کبھی سورج نے نہ دیکھا ہو، جس کی آنکھیں حیا کے بوجھ سے کبھی اوپر نہ اٹھی ہوں، جس کی آواز شرافت کے حصار سے باہر کبھی نہ سنی گئی ہو، اور اس کے ماں باپ بدقسمتی سے غریب بھی ہوں اور بے وسیلہ بھی، نہ وکلاء کی فیس دے سکیں، نہ اخبار میں خبر دے سکیں، نہ تھانے دار کو اپروچ کر سکیں، نہ گاؤں کے بااثر افراد کو مرعوب اور متاثر کر سکیں اور کچھ کر بھی لیں پھر بھی شنوائی اور انصاف سے محروم رہیں وہ قسمت کی ماری موت کے پھندے میں نہیں جھولے گی تو اور کیا کرے گی؟

بلاشبہ خودکشی بہت مشکل ہے مگر نظام زر اور عہد جبر کسی کا جینا اس سے بھی مشکل بنا دے تو ظاہر ہے آسان راستہ اختیا کیا جائے گا، زندگی کے ہاتھوں بے بس ہونے والا موت کو اپنے بس میں پا کر اسے گلے لگائے گا۔ لاریب خودکشی حرام ہے مگر جس کا سارا لطف زندگی برباد اور اس پر سکون زیست حرام ہو جائے وہ یقیناً انتہائی اقدام کرے گا، خودکشی کے اسباب خواہ انفرادی ہی کیوں نہ ہوں اس کا ذمہ دار بہرحال نظام اجتماعی ہو گا، کس ماں کا دل کرتا ہے کہ وہ بچوں سمیت نہر میں ڈوب جائے؟ کس باپ کا حوصلہ ہے کہ وہ خود کو گولی مار کر بچوں کو یتیم کر دے؟ کس بھائی کی محبت گوارا کرے گی کہ وہ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہو کر انہیں عمر بھر کا روگ دے جائے؟ کس بیٹی کی خواہش ہو گی کہ وہ ماں باپ کی گود چھوڑ کر قبر کا گوشہ جا سنبھالے؟ مگر جب ماں سے بچوں کا بھوک سے بلک بلک کر رونا، باپ سے گھر کا اجاڑ، بھائی سے بہنوں کا برہنہ سر اور بیٹی سے اپنے والدین کا اترا ہوا چہرہ دیکھا نہ جائے تو ان سے "پاک سرزمین شاد باد" کا ترانہ نہیں سنا جا سکے گا، ان کے لئے زمین کی پیٹھ اور

Marfat.com

زمین کا پیٹ برابر ہو جائے گا۔

یہ ٹھیک ہے کہ لوگ حوصلہ رکھیں لیکن حوصلہ بڑھانے سے پہلے غربت و امارت کا زہرناک فاصلہ مٹانے کا اہتمام کیا جائے' یہ درست ہے کہ لوگ دل بڑا کریں لیکن دل بڑا کرنے سے پہلے نظام احتساب کڑا کرنے کی ضرورت ہے' یہ بجا ہے کہ لوگ جذبے توانا بنائیں لیکن جذبے توانا بنانے سے پہلے خونخواروں کے جبڑے توڑنے کا بندوبست ہونا چاہئے۔

میں ذاتی طور پر انتہائی غربت کا زہر چکھ چکا ہوں الگ بات ہے کہ بحمد اللہ میرا کوئی فاقہ توہین ہنر تک نہیں پہنچتا میں سمجھتا ہوں کہ غربت سے بڑی ذلت کوئی نہیں' میں تنہائی کے غار میں بھی رہ چکا ہوں میری کوئی برادری نہیں یہ الگ بات ہے کہ میرے رب نے مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑا پھر بھی تنہائی انسان کو پاگل اور سودائی بنا دیتی ہے' میں موت جیسی بیماری بھی بھگت چکا ہوں یہ الگ بات ہے کہ میرے مولا نے رستگاری کا سامان کر دیا مگر بیماری سے بڑی "لاچاری" کا بندہ تصور بھی نہیں کر سکتا' ضروری نہیں کہ ہر شخص غربت میں غیرت کا بھرم رکھ سکے' تنہائی میں خود آشنائی کی لذت پا سکے' اور بیماری میں اسے کسی کی تیمار داری میسر آسکے' خدا نہ کرے کسی آنگن میں تینوں چیزیں جمع ہو جائیں۔

ہمارا سیاسی اور معاشی نظام' سیاستکاروں اور زرداروں کا رویہ چنگے بھلے انسان کو پاگل' مخبوط الحواس اور باؤلا بنانے کے لئے کافی ہے' میرے خیال میں زمانے کی فضا بدلنے کے لئے گردش دوراں کو آخری سلام کہہ دینا چاہئے' غریب کی سانس اکھڑنے کے بجائے بے حس امیر کے بخئے ادھڑنے چاہئیں' اور دل کے داغ پھوڑنے کے بجائے نظام جبر پر چڑھ دوڑنے کی تدبیر کرنی چاہئے' دل تو یہ چاہتا ہے کہ۔

جتنے غریب گھر ہیں اجالوں سے دور دور
اتنی ہی روشنی میں ستاروں سے چھین لوں
جتنے غریب تن ہیں لباسوں سے بے نیاز
اتنی ہی چادریں میں مزاروں سے چھین لوں
اتنی تو جرأتیں ہوں' مری کم سے کم بلند
شاہوں کے تاج فقط اشاروں سے چھین لوں

(17 نومبر 1998ء)

Marfat.com

آوازِ خلق

اب اس احساس کو "آوازِ خلق" کا درجہ حاصل ہو چکا ہے کہ ملک کو بہت نوچا اور چاٹا جا چکا ہے' اسے بہت لوٹا اور بھنبھوڑا جا چکا ہے' اور اسے بہت چوسا اور نچوڑا جا چکا ہے' اب------ احتساب---- ہونا چاہئے' جس مجلس میں بیٹھو یہی بات ہے' جس محفل میں جاؤ یہی تذکرہ ہے جو اس کی زد میں آسکتے ہیں' یا وہ افراد ہیں جنہیں غاصب اور لٹیرے لیڈروں کا دُم چھلہ اور حواری ہونے کا "اعزاز" حاصل ہے' ورنہ جس کو خدا نے سر دیا ہے اور اس میں تھوڑا سا دماغ ہے اور جسے دل دیا ہے اور اس میں معمولی سا درد ہے' وہ احتساب کا حامی ہے' احتساب کے لفظ کو ۹۷ء کی انتخابی مہم میں کافی قبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی' یہ الگ بات ہے کہ بے لاگ اور بے آمیز احتساب تو کوئی چھاج کرے گا چھلنی سے ممکن نہیں لیکن ہم اس منطق کو مسترد کرتے ہیں کہ جو احتساب کا دفتر کھلا ہے اسے لپیٹ دیا جائے' اور کسی "عمر فاروقؓ" اور "عمر بن عبدالعزیزؒ" کا انتظار کیا جائے۔

"جیسی رُوح ویسے فرشتے" کے مصداق گندم نہ سہی جو پر گزارا کرنا چاہئے اور احتساب جس مد میں' جس رفتار سے اور جس انداز میں ہو رہا ہے اسے جاری رکھنا چاہئے' چلو چور نہ سہی اُس کی لنگوٹی ہی سہی۔

ہائی کورٹ کے احتساب بنچ کا فیصلہ بارانِ رحمت نہ سہی' بارش کا پہلا قطرہ ہونے کے سبب حبس اور خشک سالی سے تو بہتر ہے' بے نظیر بھٹو اور ان کے بعض "وکلائے صفائی" احتسابی عمل اور عدالتی فیصلے کو ناقص اور مشتبہ قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں' جلوس نکل رہے ہیں' مظاہرے ہو رہے ہیں' ہڑتالوں کا پروگرام بن رہا ہے' زبان و قلم بے تاب ہو رہے ہیں' اور ہر ممکن ذریعے سے احتساب کو غلط اور عدالتی فیصلے کو جانبدارانہ ثابت کرنے کی مہم زوروں پر ہے' اگرچہ دولت میں بڑی طاقت ہے' تعلقات میں بڑی قوت ہے' پراپیگنڈے میں بڑی جاذبیت ہے اور سیاسی حیثیت کی بڑی اہمیت ہے اور بھٹو فیملی اپنی ناجائز دولت' اپنے وسیع تعلقات' اپنی پراپیگنڈہ ٹیکنک اور سیاسی حیثیت کو احتساب کے روکنے میں بے دریغ استعمال کر رہی ہے کیونکہ آج تک یہ حربے بڑے کارگر

Marfat.com

اور نتیجہ خیز ثابت ہوئے ہیں لیکن اب کی بار لگتا ہے کہ سارا ترکش بھی خالی ہو جائے کوئی تیر نشانے نہیں لگے گا۔

ہم عدالت عالیہ کی خدمت میں ڈرتے ڈرتے یہ گزارش ضرور کریں گے اور پریس سے بھی بصد معذرت یہ درخواست لازماً کریں گے کہ بے نظیر بھٹو اور ان کی لوٹ مار کے حصہ دار جس انداز سے عدلیہ کو مخاطب کر رہے ہیں اور جن خطابات سے نواز رہے ہیں کیا ہر ایک کو اس کی اجازت ہے؟ اور یہ اندازِ تخاطب اور طرزِ تکلم کسی قانون کی زد میں نہیں آتا؟ اور کیا پریس کے ضابطۂ اخلاق میں یہ کہیں درج نہیں کہ ملزم کے بیانات کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟ اور کیا شہ سرخیاں اور حاشیہ بند بیانات ایسے ہی لوگوں کے نام الاٹ ہو چکے ہیں؟

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جس کے پاس لوٹ کا مال ہو' اور دولت کے بل پر حلقۂ تعلقات ہو' جو چرب زبان ہو اور جس کا ووٹ بنک ہو وہ جو چاہے اسلوبِ سخن ایجاد کرے جس طرح چاہے لفظ و حرف کی بے حرمتی کرے اور جب چاہے مسلمہ اداروں کو لتاڑ دے اس کی حیثیت کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔

دو ٹوک بات ہے کہ جس نے کھایا ہے اسے اگلنا چاہئے اور جس نے کمایا ہے اسے لوٹانا چاہئے' اس کے حلق میں انگلی ڈال کر اگلوایا جائے اس کی کلائی مروڑ کر مال لوٹایا جائے' خواہ اس کا نرخرہ پھٹ جائے یا کندھا الٹ جائے' مگر ایسا ضرور ہونا چاہئے۔

اس راگ کے الاپنے میں اب کوئی مزہ نہیں رہا کہ اس سے پنجاب کا امیج خراب ہو گا' دوسرے صوبے ناراض ہوں گے یا سیاسی عمل میں منافرت کا رجحان بڑھے گا۔

کیا سوئٹزر فرلینڈ کے جج تھے جن کی انکوائری کے نتیجے میں یہ سارا بھانڈہ پھوٹا؟ کیا چھوٹے صوبوں نے اپنے لیڈروں کو ملک لوٹنے کا مینڈیٹ دیا ہوا ہے؟ اور کیا سیاسی عمل میں محبت صرف کھانے پینے سے پیدا ہوتی ہے کھانے پینے کا حساب لیا جائے تو منافرت پیدا ہو جاتی ہے؟

اس چیخ پکار کا بھی کم از کم عوام کی طرف سے جواب یہی ہے کہ اگر موجودہ حکومت نے لوٹ مار کی ہے تو حکومت کے سربراہ پہلی بار اقتدار میں نہیں آئے' ۸۵ء سے ۸۸ء تک وزیر اعلیٰ رہے ہیں پھر ۸۸ء سے ۹۰ء تک دوبارہ وزیر اعلیٰ کا منصب ان کے پاس رہا ہے اور ۸۸ء سے ۹۰ء تک بے نظیر بھٹو وزیر اعظم رہیں' ان کا فرض تھا کہ وہ حساب کتاب کرتیں' اگر کسی سیاسی مصلحت کے تحت ایسا نہیں کیا تو یہ ان کا اپنا مسئلہ ہے عوام کا اس میں کوئی مفاد نہیں تھا' پھر میاں نواز شریف

Marfat.com

۹۰ء سے ۹۳ء تک وزیراعظم رہے اور ۹۳ء سے ۹۶ء تک بے نظیر وزیراعظم رہی ہیں، اگر مسز بھٹو کو پہلی بار احتساب کا خیال نہیں آیا تھا، تو دوسری مدت میں یہ حسرت پوری کر سکتی تھیں انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ جب کہ چاروں صوبوں میں ان کی حکومتیں تھیں، یہ وہ جانیں، تاہم ہمارے اس استدلال کا یہ ہرگز مطلب نہ لیا جائے کہ موجودہ حکومت کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہے بلکہ اس کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ اب بھی میدان کھلا ہے پیپلز پارٹی کو پھر حکومت ملے تو اپنے ارمان نکال لے لیکن موجودہ احتسابی عمل کو کسی بہانے ملتوی، مؤخر یا منسوخ نہیں ہونا چاہئے۔

ہماری آخری گزارش یہ بھی ہے کہ عوام حکومت سے مطالبہ کریں کہ وہ جہاں لاکھوں کروڑوں اور خرچ کرتی ہے دو چار لاکھ اس پر لگا دے کہ وہ محترمہ سمیت ان کی کابینہ کے ارکان اور سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبران کو سرکاری خرچ پر بیت اللہ شریف لے جائے اور ان سے کہے کہ خانۂ کعبہ میں کھڑے ہو کر یہ لوگ حلفاً بتائیں کہ ملکی خزانہ نہیں لوٹا گیا، کمیشن نہیں کھایا گیا، بیرونی ملکوں میں سرمایہ نہیں رکھا گیا اور کک بیکس کے ذریعے پیسہ نہیں جوڑا گیا، تو پھر بے نظیر بھٹو اور ان کے شوہر کو نہ صرف باعزت بری کر دیا جائے بلکہ ان سے کھلے لفظوں میں ٹیلی وژن پر معافی مانگی جائے، اس صورت میں حکومت کی عزت میں بھی اضافہ ہو گا اور عوام کو بھی اطمینان نصیب ہو گا، پھر نئے سرے اور نئے جذبے سے ہر فریق، اپنی سیاست کا آغاز کرے تاکہ لوگوں کا سیاسی لیڈروں اور سیاسی اداروں پر اعتماد بڑھے۔

اگر ہر مسئلے کا حل----- سیاسی شور شرابا------- ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آئندہ کے لئے صرف مچھر چھاننے کا تکلف کیا جائے ہاتھی نگلنے میں کوئی قباحت نہیں، یعنی نام نہاد بڑے لوگ جو چاہیں کرتے پھریں ان کا احتساب نہیں ہونا چاہئے اور اگر ہو تو ان کی مرضی کے مطابق، جس سے سانپ بھی بچ جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، یعنی احتساب کا فنی عمل بھی ہو جائے اور ان ''معززین اور شرفاء'' کے دامن پر کوئی داغ بھی نہ لگے۔

(24 اپریل 1999ء)

غیر سے دوستی کرو لیکن

آج کل ہماری حکومت کا پیمانۂ صبر و شوق چھلکا پڑ رہا ہے کہ بھارت کے ساتھ جلد سے جلد رشتۂ محبت استوار' راہ تجارت ہموار اور فضائے مذاکرات سازگار ہو جائے' جنوبی ایشیا میں امن کا قیام محض حکومتوں کی نہیں عوام کی خواہش بھی ہے اور ضرورت بھی' اور اس میں کسی کو کلام نہیں' بھارت کے ساتھ کشیدگی کم ہو اس میں بھی کوئی دوسری رائے نہیں' اور یہ دونوں چیزیں جنگ کے بجائے مذاکرات کے ذریعے حاصل ہوں' اس پر بھی اتفاق رائے ہے' مسئلہ صرف یہ ہے کہ یہ سب کچھ کس قیمت پر ہو؟

بھارت کی سیاسی و علاقائی برتری تسلیم کر کے؟ اور یہی دراصل بھارت کی خواہش ہے مگر اس سے بہتری کا امکان کم اور ابتری پھیلنے کا اندیشہ زیادہ ہے' اب تو برابری کی پوزیشن ہے تو یہ حال ہے اگر بھارت کی بالادستی باقاعدہ تسلیم کر لی گئی تو اس کی خرمستی کا عالم کیا ہو گا؟

کیا امن کی قیمت یہ چکائی جائے کہ امریکی ایجنڈے کے مطابق چین کو الگ اور محصور کر دیا جائے؟ فرض کیا اس پر دو گام چل کر دیکھ بھی لیا جائے گا' تو سوال یہ ہے کہ کیا چین مٹھی بھر آبادی کا ملک ہے جسے کوئی چاہے تو جیب میں ڈال لے؟ یا چین موم کا بنا ہوا ہے کہ اسے ذرا تپش پہنچے تو وہ فوراً پگھل جائے گا اور اسے جس طرح چاہے موڑ دیا جائے؟

اور اگر قیام امن کے لئے مسئلہ کشمیر کو "کیمپ ڈیوڈ سٹائل" معاہدے کے مطابق حل کر دیا جائے اور سمجھ لیا جائے کہ اب راوی چین کی خبر دے گا تو یہ بھی ایک خواب ہے اور خواب کی بھی وہ قسم جسے قرآن مجید "اضغاث و احلام" کہتا ہے یعنی بیہودہ دماغی اختراعات اور لایعنی خیالات!

اس لئے کہ کشمیر کی تحریک آزادی کوئی "فرمائشی تحریک" نہیں جو کسی "سہارے" پر چلتی اور کسی کے "اشارے" پر تھمتی ہے' اس بارے میں کسی کو خوش فہمی ہو' تو زائل کر دے' نہ اس کی لگام کسی کے ہاتھ میں ہے اور نہ اس کا انجام کسی کی مرضی کے مطابق ہو گا۔

واقعہ یہ ہے کہ بھارت کے ساتھ معاملہ بندی' ماحول کی خوشگواری اور حتیٰ کہ جنوبی ایشیا میں مکمل اور پائیدار امن مشروط اور منسلک ہے مسئلہ کشمیر کے ساتھ' اور مسئلہ کشمیر کا حل وہ نہیں ہو گا جس طرح بھارت چاہے' نہ اس طرح ممکن ہے جیسے پاکستان کی مصلحت ہو اور نہ ہی اس کا حل

Marfat.com

یہ ہے جیسا کہ امریکہ چاہتا ہے بلکہ اس مسئلے کا امکانی ' اور پھر پائیدار حل یہ ہے کہ جس طرح اسلامیان کشمیر چاہیں ' اس لئے کہ کشمیری جدوجہد آزادی کے حوالے سے اپنا یہ استحقاق ہر فورم اور ہر معیار پر ثابت کر چکے ہیں کہ انہیں آزادی ملنی چاہئے اور انہیں آزاد ہونا چاہئے ' اگر آزادی حاصل کرنے کا معیار یہ ہے کہ وہ قوم خون سے حق خود ارادیت کی دستاویز لکھے تو کشمیری یہ رقم کر چکے ہیں ' اگر معیار یہ ہو کہ پوری قوم اس مطالبے کی پشت پر ہو تو اسلامیان کشمیر کی پوری تائید اس مطالبے کو حاصل ہے ورنہ کوئی مصنوعی ' سپانسرڈ اور پلانٹڈ تحریک اتنے عرصے تک نہیں چل سکتی ' اگر معیار یہ ہو کہ وہ خطہ نظریاتی اور جغرافیائی اعتبار سے آزاد ہونے کا استحقاق رکھتا ہے تو اس پر بھی کشمیر پورا اترتا ہے اس لئے کہ جس اصول اور فارمولے کے تحت پاکستان الگ اور قائم ہوا تھا یعنی (Tow Nation Theory) وہی نظریہ یہاں بھی لاگو ہوتا ہے ' کشمیر مسلمانوں کی اکثریتی آبادی کا خطہ ہے اور اس کی جداگانہ حیثیت کی دلیل قاطع ' رہ گیا کشمیر کا جغرافیہ تو ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ کشمیر کے پاکستان کی طرف گیارہ راستے کھلتے ہیں بالکل فطری اور طبعی ' جب کہ بھارت کو ایک راستہ دیا گیا وہ بھی مصنوعی ' یعنی آخری لمحوں میں گورداسپور بھارت کو دے کر کشمیر کے لئے راستہ نکالا گیا ' ورنہ ایک بھی راستہ نہ تھا۔

اسی طرح اگر آزادی کے حق کے لئے عالمی رائے عامہ اور بین الاقوامی اداروں کی قراردادوں کو معیار مانا جائے ' تو اس حوالے سے بھی کشمیری اپنا حق مانگنے اور پانے کے اہل ہیں ' کتنی قراردادیں ہیں جو اس حوالے سے واضح اور قطعی ہیں ' اور سوائے بھارت کے ہر شخص ان کا قائل اور حامی ہے۔

لب لباب یہ سامنے آتا ہے کہ جنوبی ایشیا کے امن اور بھارت کے ساتھ دوستی کی واحد شرط مسئلہ کشمیر کا حل ہے اور حل کا مطلب اہالیان کشمیر کی خواہش اور مرضی کا احترام!

بھارتی وزیر اعظم واجپائی کا حالیہ دورۂ لاہور اب تک موضوع سخن ہے ' اور اسے بعض حلقے خلط مبحث کا رنگ دے رہے ہیں ' یہ اعتراض نہیں کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کم نہ ہو ' یہ اختلاف نہیں کہ بھارت کے ساتھ مذاکرات نہ ہوں ' یہ بھی مسئلہ نہیں کہ بھارتی وزیر اعظم کیوں آئے؟ بات صرف اتنی ہے کہ امن کے عمل کی رفتار فطری ہو اگر پائیدار نتائج مطلوب ہیں ' اس میں غیر ضروری اضطراب شکوک و شبہات کو جنم دیتا ہے ' کیا حکومت سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتی ہے کہ پاکستانی عوام فی الواقع بھارتی وزیر اعظم کو "پرجوش خوش آمدید" کہنے کے لئے تیار تھے یا

Marfat.com

ہیں؟ اگر نہیں تو پھر ان کے اعزاز میں دیئے گئے استقبالیہ کو عوام کی طرف منسوب کرنے کا کیا مطلب؟

کیا کوئی بھارتی وزیراعظم مقبوضہ کشمیر میں اسی طرح جا سکتا ہے جس طرح کوئی بھی پاکستانی وزیراعظم آزاد کشمیر میں جاتا اور پھول پہن کر واپس آتا ہے؟ پوری وادی میں کرفیو لگائے بغیر بھارتی وزیراعظم وہاں کی سرزمین پر قدم رکھنے کا مجاز بھی نہیں اور حوصلہ بھی نہیں رکھتا' اور پھر یہ کہ یہاں ہڑتال کی کال دینے والوں کو مطعون کیا جا رہا ہے' کیا بیس فروری کو حریت کانفرنس نے مقبوضہ کشمیر میں ہڑتال کا اعلان نہیں کیا؟ اور یہ ہڑتال بھارتی وزیراعظم کے دورۂ لاہور پر احتجاج کے لئے تھی' اس کا واضح مفہوم یہی ہے کہ یہاں کے لوگوں اور کشمیریوں کی Frequency ایک ہے۔ اور یہ علامت باعث مسرت ہے نہ کہ لائق مذمت' ہمیں بھارت کے وجود سے کوئی نفرت نہیں' اس کی حیثیت سے بھی انکار نہیں' اس کے تشخص اور مقام کے بھی ہم قائل ہیں' لیکن اس کا مزاج اور رویہ ایسا ہے جب تک اس میں کوئی جوہری تبدیلی واقع نہیں ہوتی' یہاں امن قائم ہوتا نظر نہیں آتا' ہمارے دماغ کو تو چلو ہوا لگ گئی ہے بنگلہ دیش اس سے کیوں شاکی ہے؟ جب کہ اس کے قیام میں خود بھارت کا ہاتھ ہے' نیپال کیوں ""نکو نک"" ہے؟ سری لنکا اس سے کیوں ملول و گریزاں ہے؟ مالدیپ کس لئے ""اس سے نفور"" ہے؟ یہ اشارے اولوالالباب کے لئے واضح بھی ہیں اور کافی بھی!""

؎ غیر سے دوستی کرو لیکن --- پہلے کچھ روز آزما لینا

(2 مارچ 1999ء)

Marfat.com

ظلم رہے اور امن بھی ہو

امن------ پوری دنیا کی آرزو اور مانگ تو ہے ہی' پاکستان کے لئے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ نمبرون بنا ہوا ہے' ظاہر ہے امن کے بغیر معاش ہے نہ سماج۔

وزیراعظم نواز شریف دہشت گردی' بدامنی' قتل و غارت گری اور سماجی انارکی کے خلاف کئی بار آہنی عزم کا اظہار کر چکے ہیں' اپنی دلدوز تقریروں کے ذریعے خود رو اور ناظرین و سامعین کو کئی بار رُلا چکے ہیں' ہولناک مظالم کی داستانیں سنا کر دل پگھلا چکے ہیں' لرزہ خیز مناظر دکھا کر جذبات بھڑکا چکے ہیں' اور اپنا کلیجہ ہاتھ میں لے کر حشر اُلٹا چکے ہیں' اُن کے آنسو ان کی نیت کے کس قدر ترجمان ہیں؟ ان کی بھرائی آواز انکے درد کی کتنی آئینہ دار ہے؟ اور ان کے لرزتے ہونٹوں سے ادا ہونے والے کپکپاتے الفاظ ان کے قلبی دُکھ کا کس درجے سچا اظہار ہیں؟ ہمیں اس سے غرض ہے نہ بحث' ان کی نیت خدا جانے' بھرایا لہجہ ان کا اپنا مسئلہ ہے' اور الفاظ کی لرزش ممکن ہے ضمیر کی خلش ہو' لیکن یہ مسئلہ ان کے پیش رو حل کر پائے ہیں' اور نہ ڈور کا سرا ان کے ہاتھ آرہا ہے' مختلف ذہن اس کی مختلف توجیہات پیش کریں گے' وسائل کی کمی' خفیہ ایجنسیوں کی کاہلی' قانون کی پیچیدگی' عدلیہ کی سست روی' پولیس کی نااہلی' عوام کی بے حسی' تفتیش کی کمزوری' وغیرہ۔

یہ عوامل اپنی جگہ اہم ہیں' مگر سب سے بڑی وجہ جسے مسلسل نظرانداز کیا جارہا ہے اور جو فساد کی اصل جڑ ہے وہ ہے------ بڑے اور چھوٹے کی تمیز------

کائنات کے سب سے بڑے' سب سے اچھے اور سب سے سچے انسان نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد اس باب میں------ "قول فیصل" کا درجہ' اور اپنے اندر ازل سے ابد تک کی صداقت کا جوہر رکھتا ہے کہ

"تم سے اگلی قومیں اس لئے تباہ ہو گئیں کہ وہ امیر اور غریب کے لئے الگ قانون اور معیار رکھتی تھیں۔"

ایماندار حکمران اللہ کا عطیہ ہوتا ہے لیکن اسے ایماندار ہونے سے کہیں بڑھ کر "بے دید" ہونا چاہئے' یہ لفظ ہے تو بہت سخت مگر ہے انتہائی موزوں! بے دید کا مطلب آنکھوں کی چمک

Marfat.com

محروم ہونا نہیں طبیعت کی لچک سے عاری ہونا ہے' ایسا بے لچک حکمران جسے کسی کی نوٹوں کی کڑک' بوٹوں کی دھمک' ہیرے کی ڈلک' حسن کی جھلک' طاقت کی بڑھک اور محبت کی لپک اپنی رائے اور فیصلے سے نہ ہٹا سکے۔

جو حکمران خود قانون کے سامنے جھکنے والا ہو گا' اس ملک میں کوئی مائی کالال عدل کی میزان نہیں جھکا سکے گا' جو حکمران خود رعائت کا طالب نہ ہو کوئی اس کی مروت آزمانے کی جرأت نہیں کرے گا' جو حکمران عمرؓ بن خطاب کی طرح اپنے بیٹے کو کوڑے کھاتے دیکھنے کی تاب رکھتا ہو' اس کے کوڑے سے کوئی "نواب" نہیں بچ سکتا' جو حکمران علیؓ کی طرح سر عام عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہونے کا حوصلہ دکھاتا ہو اسے کسی پہرے کی ضرورت نہیں رہتی' جو حکمران عمر بن عبد العزیزؒ کی طرح اپنی بیوی کا ہار بیت المال میں جمع کرانے پر تل جائے اس کے سامنے بڑے سے بڑا "سردار" بتاشے کی طرح پانی میں گھل جاتا ہے' جو حکمران ملک شاہ سلجوقی کی طرح نہر کے پل پر بیوہ کے ہاتھ میں اپنا گریبان دے دیتا ہے' اس کے سامنے کوئی شخص "پھنے خان" نہیں رہتا' جو حکمران محمود غزنوی کی طرح جرم کی پاداش میں بیٹے کی گردن اتارنے پر آجائے اس کے سامنے کسی غنڈے کے سر ابھارنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

ہمارے ہاں ہو یہ رہا ہے کہ قانون کے راستے میں کبھی دولت حائل ہو جاتی ہے' کبھی قرابت آڑے آجاتی ہے' کبھی مروت جلوہ دکھا جاتی ہے' کبھی مصلحت فتنہ اٹھا جاتی ہے' کبھی سیاست مراد پا جاتی ہے' اور کبھی رفاقت رنگ جما جاتی ہے۔

ملک میں قیام امن کے لئے فوج آچکی ہے' کوڑے لگ چکے ہیں' اور آپریشن کلین اپ ہو چکے ہیں' فوج آئی مگر قاتلوں کی "موج" نہ گئی' ڈنڈے لگے مگر غنڈے باز نہ آئے' پھندے سجے مگر "دھندے" جاری رہے' آپریشن ہوا مگر کرپشن نہ مٹی' اس کا واحد سبب قانون کے نفاذ میں امتیاز ہے' پولیس مقابلوں میں تنخواہ دار قاتل تو پھڑکائے جاتے ہیں پتھاریدار اور ڈیرے دار بچا لئے جاتے ہیں' کارکن سزا پاتے ہیں' کار پرداز "چھوٹ" جاتے ہیں' جیب کاٹنے والے پکڑے جاتے ہیں' بینک ڈکارنے والے قابو نہیں کئے جاتے' سیاسی غصے اور انتقام کی بات الگ ہے کیا پچاس سال میں کسی "بڑے" کو کوئی سزا ہوئی ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کا بڑا محض "طرہ طراز" ہی نہیں ماشاء اللہ "پاکباز" بھی ہے' صرف عہدیداری نہیں چشم بدور بہت "پرہیزگار" بھی ہے' فقط افسر بالا ہی نہیں "پارسا" بھی ہے' نرا جاگیردار ہی نہیں قربان جایئے "تہجد گزار" بھی ہے' اس لئے کہ

Marfat.com

یہاں جیلوں میں ہر دوسرا قیدی "رحم دین" اور "کرم دین" دکھائی دیتا ہے کوئی "کرسی نشین" اور "مہ جبین" نظر نہیں آتا، ہم خواہ مخواہ ماضی کے دریچوں سے صوفیاء ڈھونڈتے ہیں جب کہ ہمارے ارد گرد سیاستدان، وزیر، جرنیل، بیوروکریٹ، وڈیرے، صنعتکار، حکمرانوں کے رشتے دار ماشاء اللہ سب کے سب "اولیاء" پڑے ہیں، جن سے نہ کبھی معصیت سرزد ہوئی ہے، نہ عدالت نے انہیں کوئی زحمت دی ہے، اور نہ جیل سے ان کی واقفیت ہوئی ہے۔

مثل ہے تو بڑی پامال لیکن ہے کمال کی، کہ کتا کنویں میں رہے اور پانی پاک ہو جائے، آخر یہ کیسے ممکن ہے؟ ظلم رہے اور امن بھی قائم ہو بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

قتل بڑا ظلم ہے مگر قاتل کے چہرے کو دیکھ کر قانون حرکت میں لانا اس سے بڑا ظلم ہے، ڈکیتی سنگین جرم ہے مگر ڈاکو کے سماجی رُتبے کو ملحوظ رکھنا اس سے بڑا جرم ہے، چوری مکروہ فعل ہے مگر چور کے حلیے کو خاطر میں لانا اس سے زیادہ مکروہ عمل ہے، یہ ظلم، یہ جرم، اور یہ عمل بار بار کیا جا رہا ہے، تیرہ کروڑ آبادی کے لئے صرف تیرہ سو آدمی مسئلہ بنے ہوئے ہیں، خائن، قاتل، غاصب، اور ظالم اس تعداد سے زیادہ نہیں باقی جو بھی ہیں ان "بھوتوں" کے "سائے" ہیں، سائے کو ڈھلنے اور مٹنے میں دیر نہیں لگتی، جو حکمران ان تیرہ سو کے لئے "بے دید" بن جائے گا وہی باقی تیرہ کروڑ کے لئے امن کی نوید لائے گا۔

(28 فروری 1999ء)

عرض نیازِ عشق

دوستان عزیز مرزا اسد اللہ خاں غالب جیسے شخص کے ساتھ بھی یہ حادثہ ہو جاتا ہے کہ وہ عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہتا کیونکہ اس کے لئے جس دل کی ضرورت ہوتی ہے اور جس دل پہ ناز بھی ہو بعض اوقات وہ نہیں رہتا جب دل نہ ہو تو حال دل کیسا؟ قارئین کرام' کچھ یہی احوال میرا ہے' ایک بار پھر بستر علالت پر ہوں' ایک سال بعد آنت کے ایک اور میجر آپریشن سے گزر چکا ہوں' لگ بھگ ایک ماہ بستر کا ساتھ رہے گا' باقی علاج معالجہ بعد میں! ظاہر ہے بیماری کے باعث نہ ذہن میں وہ ترو تازگی نہ سوچ میں وہ شگفتگی' نہ خیالات میں وہ لرزش اور نہ قلم میں وہ جنبش' اس لئے کچھ عرصہ عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہوں گا۔

نقاہت اور علالت کے باوجود یہ چار سطریں لکھنی اس لئے ضروری معلوم ہوئیں کہ آپ کو اپنی وارداتِ قلبی سے آگاہ کر دوں' میرا جسم اگرچہ اس وقت بہت لاغر ہے مگر بحمد اللہ دماغ صابر اور دل شاکر ہے' یہ ٹھیک ہے کہ میری زندگی خوشیوں کا چھلکتا پیمانہ نہیں رہی لیکن پھر بھی خدا کے فضل و کرم سے رنج کے تلاطم میں بھی نہیں رہی' اس لئے تکلیف کے باوجود میں اپنے مالک کے فیصلے پر راضی ہوں' شائد یہی سوچ تکلیف کی تلخی کم کر دے' اپنے بارے میں بلندی درجات کا تو کیا سوچنا' تلافی مافات کی فکر دامن گیر رہی' کہ خطاؤں کی بہتات میں رب کریم کی عنایات برابر حاوی رہیں کہیں یہ اس کی گرفت کا انداز نہ ہو' لیکن یہ چیز بندے کو غافل بھی بنا دیتی ہے' اور وہ اللہ کی رحمت بے پایاں پہ کچھ زیادہ ہی تکیہ کر بیٹھتا ہے اور لوح عمل بے نقش ہوتی چلی جاتی ہے' مجھے بھی اس کی فکر رہی مگر تلافی کیسے ہو؟ پیسہ کبھی جیب میں نہیں رہا کہ ہر سال عمرے کر کے اپنے گناہ دھو سکتا' کاہلی نے شب زندہ دار نہ بننے دیا' ملامتی طبیعت نے جبہ و دستار اور تسبیح و زنار سے دور رکھا عام گنہ گار مسلمانوں جیسی وضع قطع رکھی' ورنہ جبہ و دستار میں کئی گناہ چھپ جاتے ہیں' فرض روزوں کے علاوہ بھوک کی مشقت کبھی برداشت نہیں ہوتی' مراقبوں اور وظیفوں سے طبیعت کو مناسبت نہیں رہی' زندگی بھر مراقبہ کیا ہے تو کتابوں میں اور وظیفہ پڑھا ہے' تو علم اور شعور کا' کہ

Marfat.com

یہی شرف انسانی ہے' لیکن لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری بیماری کو میرے گناہوں کی تلافی اور معافی کا سبب بنا دیا ہے' کیونکہ حضور ﷺ کے ارشاد مبارک میں اس کا اشارہ ملتا ہے' اگر میرا حساب اس پر بے باق ہو جائے تو اس سے بڑھ کر میرے لئے کیا تحفہ ہو سکتا ہے؟

اس علالت کو میں اپنے لئے ایک اور پہلو سے بھی نعمت سمجھ رہا ہوں کہ ان دنوں میں دور و نزدیک کے احباب کی جس قدر شفقتیں' محبتیں اور عنائتیں میسر آئیں وہ شائد صحت کے عالم میں نہ آتیں' بعض دوست اس طرح پیش آئے کہ خونی رشتے ثانوی نظر آنے لگے' بعض نے اس انداز میں پرسش احوال کی کہ دل و دماغ کے جذباتِ تشکر آنسو بن کر چھلک پڑے' بعض اتنے دور سے چل کر آئے کہ صحن دل میں خیمہ زن ہو گئے' بعض نے وہ حرف دعا دیا کہ ان پر دل فدا ہو گیا' میں جان بوجھ کر کسی کا نام نہیں لکھ رہا مبادا ان کے اخلاص پر آلودگی کا عکس پڑ جائے' اللہ تعالیٰ سب احباب کو بہترین جزا سے نوازے' آمین' ایسے لوگ بھی ہیں جو مجھ سے کبھی نہیں ملے' ان سے شخصی شناسائی نہیں' بس کسی باعث میرے رب نے ان کے دل میں میرے لئے توجہ پیدا کر دی وہ بھی میری تکلیف پہ سراپا دعا ہو گئے۔

یہ سوچ کر خوشی سے دوہرا ہو جاتا ہوں کہ میں آخر ہوں کیا؟ اور اس بندۂ عاصی کی اتنی مدارتیں؟ میں ایک بہت ہی دور افتادہ گاؤں کا باسی' غریب ترین ماں باپ کا بیٹا' رسمی تعلیم سے کورا شخص' کسی عہدے پر نہیں ہوں' کوئی عنوان تعارف نہیں' افسر بھی نہیں ہوں کہ لوگوں کو ڈر یا طمع لے کر آئے' کسی ایسی کرسی پر بھی نہیں ہوں جو خواہ مخواہ لوگوں کے لئے مقناطیس بنی رہتی ہے' کوئی مجھے جھٹک دے تو میں اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا' کوئی میری خدمت کرے تو میں سوائے دعا کے کچھ سنوار نہیں سکتا' اتنی ساری تنہائیوں کے باوجود میں ہجوم میں رہتا ہوں' دعاؤں کے ہجوم میں' چاہتوں کے ہجوم میں' پہلے بھی بہت غور کیا' علالت میں غور کی شرح بڑھ جاتی ہے اب پھر سوچا' اس ایک سبب کے اور کوئی وجہ نظر نہیں آئی' کہ میرے مہربان رب نے میرے ساتھ ہمیشہ چشم پوشی اور رعائت کا معاملہ فرمایا ہے' جس کے میں لائق ہوں اس نے میرے ساتھ وہ نہیں بلکہ جو اس کے شایان شان ہے اس نے وہ معاملہ فرمایا' اور ہر بار میرا بھرم رہ گیا' اور میں امید کرتا ہوں کہ قیامت میں بھی میرا بھرم رہ جائے گا' اپنی ایک ڈیڑھ سال کی بیماری کو میں ایک اور زاویے سے بھی دیکھتا ہوں' ممکن ہے اللہ تعالیٰ میری سوچ میں کوئی تبدیلی لانا چاہتا ہو' مجھے کسی نئے رُخ پر ڈالنا چاہتا ہو' مجھے زندگی کے کسی نئے افق سے آشنا کرنا چاہتا ہو' اس لئے یہ مرحلہ درپیش ہو' اگر اس بیماری سے

Marfat.com

میری فکر کوئی نیا اور پاکیزہ جنم لیتی ہے' اگر میرا دل گداز ہوتا ہے' اگر میری آنکھ نمناک ہوتی ہے' اگر میری روح ایک نئے اضطراب میں ڈھلتی ہے' تو میں شکر کا کلمہ پڑھوں گا کہ معمولی مشقت سے بڑی نعمت ہاتھ آ گئی ہے۔

قارئین عزیز' بس اتنی توانائی تھی' سو اسے لفظوں میں ڈھال دیا' میں آپ سے طالب دعا ہوں' میں کسی آزمائش کے قابل نہیں یہ بیماری آزمائش ہے تو خداتعالیٰ اس کو دور کر دے' میرے گناہوں کی معافی کا ذریعہ بنا دے' میں لحہ بہ لحہ آپ کی دعاؤں کا محتاج ہوں' بشرط زندگی اور صحت پھر کسی قابل ہوا تو حاضری بھروں گا' کچھ عرصہ کے لئے اجازت' دعا کی درخواست کے ساتھ!

(5 اگست 1999ء)

مارچ میں اسلامی نظام نافذ ہو جائے گا

اے اہل وطن' آپ کو مبارک ہو کہ مارچ ۲۰۰۰ء میں اسلامی نظام نافذ ہو جائے گا' یہ خوشخبری وفاقی اور صوبائی سطح کے سرکاری عمائدین اور مسلم لیگی قائدین ایک سے زائد مرتبہ عوام کو دے چکے ہیں' صرف انہی پر موقوف نہیں ایوب خاں سے لے کر آج کے حکمرانوں تک سبھی یہی کہتے چلے آرہے ہیں' اگرچہ ان بیانات کے پیچھے کوئی مقصدیت' گہرائی اور سنجیدگی نہیں ہوتی پھر بھی لوگوں کو دلاسے دینے اور منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ہر عہد کا حاکم اور اس کے حکم بردار گاہے گاہے اس طرح کا بیان داغ دیتے ہیں' لیکن کوئی ان سے پوچھے کہ اسلام کے نافذ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اور اس کے نافذ ہونے سے کیا ہو جائے گا؟ تو اس کا مفہوم خود ان کے ذہنوں میں بھی واضح نہیں ہوتا' ان بیانات کا مقصد یہ ہے کہ مارچ ۲۰۰۰ء میں سینٹ کے الیکشن ہوں گے اور مسلم لیگ کو متوقع اکثریت حاصل ہو جائے گی اور یوں ایک عرصے کا زیر التواء شریعت بل پاس ہو جائے گا' اور اس کا معنی ہے' کہ اسلام نافذ ہو جائے گا' حالانکہ اسلام کسی قانون کے لاگو اور بل کے پاس ہو جانے کا نہیں طرزِ حکومت' اور اسلوبِ سیاست بدل جانے کا نام ہے' کیونکہ جس اسلوبِ سیاست کے بانی اور جس طرزِ حکومت کے عادی ہمارے حکمران ہیں' اسلام کا نفاذ انہیں کسی صورت "وارا" نہیں کھاتا' ہمارے حکمران آج تک اپنا ظاہر نہیں بدل پائے' جبکہ اسلام تو ظاہر کے ساتھ باطن کی تبدیلی کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ ہماری نصف صدی کی سیاسی اور حکومتی پالیسیاں شاہد ہیں کہ یہ تل کبھی تیل دینے والے نہیں' جس طرح مسور کی دال کھانے کو منہ درکار ہے' اسلام کے نفاذ کے لئے بھی دل گردہ درکار ہے' اور جس طرح نماز عشق کے لئے جگر کا گرم لہو چاہئے ہوتا ہے اسی طرح اسلام کے نفاذ کے لئے بھی بڑا حوصلہ مطلوب ہوتا ہے' سوادِ کوئے جاناں کے لئے قدم قدم بلاؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے' ہمارے حکمرانوں کا فہم اسلام بالعموم اس طرح کا ہوتا ہے' کہ قومی اسمبلی کوئی قانون سامنے لے آئے اور سینٹ ایک بل پاس کر دے اور لوگ مان لیں کہ اسلام نافذ ہو گیا ہے اور بس' یعنی ہینگ اور پھٹکڑی لگائے بغیر رنگ چوکھا آنے کی آرزو کا دوسرا نام حکمرانوں کا فہم اسلام ہے۔

ہمارے جملہ حکمران' سیاستدان اور افسران نہ اپنا زاویہء زندگی بدلنے پر آمادہ ہیں' نہ طرزِ سیاست تبدیل کرنے پر راضی اور نہ' قرینہء حکومت درست کرنے کے لئے تیار' اور خواہش یا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام نافذ ہو جائے'

Marfat.com

ذرا کھلے لفظوں میں یوں کہئے کہ ہر حکومت یہ چاہتی ہے کہ لوگ از خود ٹھیک ہو جائیں نیک بن جائیں' اور اندر باہر سے بدل جائیں۔ رہ گئے حکمران اور ان کے حواری' ان کے عیش کدے برابر روشن رہیں' ان کے بنگلے سدا سلامت رہیں' ان کی جاگیریں محفوظ رہیں' اور ان کی فیکٹریاں چالو رہیں' نہ ان کی مراعات ختم ہوں' اور نہ ان کے اختیارات کم ہوں' جب کہ اسلام خزانے سے مراعات لینے کا نام نہیں جسم و جان اور مال کی زکوٰۃ دینے کا نام ہے' بندوں پر اختیار چلانے کا نام نہیں' خدا اور قانون کے سامنے بے اختیار ہو جانے کا نام ہے' اور یہ وہ کام ہے جو ہمارا کوئی حکمران اور سیاستدان کرنے کو تیار نہیں کیونکہ ایسا کرنا پڑے تو پھر سیاست کا مزہ اور حکومت کا کیا ٹھکا؟ جبکہ ہمارے یہاں سیاست حکومت کے لئے کی جاتی ہے اور حکومت حصول دولت اور طاقت کے لئے لی جاتی ہے' اس کے باوجود حکمران طبقہ کہتا ہے کہ عنقریب اسلام نافذ ہو جائے گا' بھلا آج تک کسی بھولے انسان نے بھی اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے جو سیانے حکمران یہ غلطی کریں گے؟ مارچ ۲۰۰۰ء تک اسلام کے نفاذ کی نوید سنانے والے لوگوں سے کیا ہم یہ توقع رکھیں' کہ وہ اس کے بعد اپنے لئے بیس ارب روپے کے صوابدیدی فنڈ سے دستبردار ہو جائیں گے؟ بائیس مرسڈیز گاڑیوں کا فلیٹ سر عام نیلام کر کے رقم داخل خزانہ کر دیں گے؟ خصوصی ہوائی جہاز کے ہلکورے لینا بند کر دیں گے؟ ان کی فیکٹریاں بڑھنے کی بجائے گھٹنا شروع ہو جائیں گی؟ ان کے اہالی موالی پھرے اڑانا چھوڑ دیں گے؟ ان کے عزیز و اقارب سرکاری افسروں پر دھونس جمانا ترک کر دیں گے؟ وہ ایکڑوں پر محیط بنگلوں سے نقل مکانی کر لیں گے؟ سرکاری خرچ پر علاج معالجے کرانے سے باز آجائیں گے؟ بنکوں کے اربوں روپے واپس کر دیں گے؟ اپنے اوپر اور عوام پر قانون کا اطلاق یکساں کر دیں گے؟ اپنے لاڈلوں اور صاجزادوں کی خرمستیوں پر روک لگا دیں گے؟ پوری ایمانداری سے ٹیکس ادا کریں گے؟ جو کچھ عوام کھاتے ہیں وہی کچھ کھائیں گے؟ جس طرح لوگ رہتے ہیں اسی طرح رہیں گے؟ اور جیسے پبلک جی رہی ہے ویسے جئیں گے؟ اگر ایسا ہو جائے تو یہ نفاذِ اسلام ہو گا' لیکن جو کچھ آج ہو رہا ہے اس کے بعد بھی وہی کچھ ہوتا رہا تو ایسا اسلام نے قرآن و حدیث میں ہے اور نہ خلافت راشدہ کے دور میں نافذ رہا ہے' رہ گیا' "مغل اعظم" اور "بادشاہ معظم" بننے کا شوق' تو وہ ایسے پورا کر لیا جائے براہ کرم اسلام کو معاف رکھا جائے' یہ نہ ہو کہ اسلام کا قانون پاس ہوتے ہی حکمران خود کو "امیر المومنین" قرار دے لیں اور اسکا مطلب یہ سمجھ لیں کہ اب ہم جو کچھ کہیں گے "اسلامی قانون" ہو گا اور جو کریں گے وہ "اسلامی نظام" بن جائے گا۔

(18 اکتوبر 1999ء)

Marfat.com

غالب "ندیم دوست" سے آتی ہے بوئے دوست

ہر شخص ان دو زاویوں اور زندگی کے دو رویوں سے آگاہ ہے' ایک یہ کہ "کیا ہے؟" اور دوسرے یہ کہ "کیا ہونا چاہئے؟" ان دو زاویوں کے قائل اور دو رویوں کے حامل لوگوں کے بارے میں بھی رائے قائم کرنے میں بہت زیادہ باریک بینی کی ضروری محسوس نہیں ہوتی بلکہ واضح سی بات ہے کہ "کیا ہے" کے قائل لوگ وہ ہوتے ہیں جن کی نظر پیٹ سے آگے نہیں جاتی' جو ہر چلتی چیز کو گاڑی اور ہر چمکتی شئے کو سونا سمجھتے ہیں' جن کو جو ہاتھ آجائے اس پر قناعت ہی نہیں کرتے اسے اپنے لئے سعادت سمجھتے ہیں اور جو مل جائے اسے غنیمت ہی نہیں جانتے بہت بڑی نعمت تصور کرتے ہیں اور ان کے لئے حاضر و موجود ہی سب کچھ ہوتا ہے' فکر و دانش کا یہی سب سے بڑا المیہ ہے' جس سے دنیا ہمیشہ دوچار رہی رہے' "جو کچھ ہے" پر کفائت کرنے والا بہت محدود نظر اور ممولا صفت ہوتا ہے' جو آسانی سے ہاتھ آنے والے چند دانوں پر راضی ہو جاتا ہے جب کہ "کیا ہونا چاہئے" شہباز فلک سیر کا منشور ہے' جو رزق کے ہر اس ٹکڑے پر اکتفا نہیں کرتا' جو آنکھوں کے سامنے ہے اور فوراً مل رہا ہے' وہ کسی کا مارا ہوا شکار اس لئے نہیں کھاتا کہ اس میں اس کے دست و بازو کا کوئی کمال شامل نہیں ہوتا' وہ کسی کا جھوٹا نہیں کھاتا کہ یہ اس کی غیرت کے منافی ہے' وہ جھک کر زمین پر اپنی روزی تلاش نہیں کرتا کہ اس سے طائر لاہوتی کی پرواز میں کوتاہی کا تاثر ابھرتا ہے' یہ چند باتیں لکھنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ایک عرصے سے مسلسل میرے غائبانہ دوست اور میرے ہم نام برادرم "خورشید احمد ندیم" یہ موضوع چھیڑے ہوئے ہیں کہ دینی سیاست بہت بڑا مغالطہ ہے' دینی رہنماؤں کو سیاست سے دُور رہنا چاہئے' دینی علماء کسی دور میں برسر اقتدار نہیں آئے وغیرہ' ان سارے مضامین کا "مقطع" ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے کہ جو لوگ سیاست میں ہیں ان سے مفاہمت کرلی جائے' جو اب تک اقتدار میں آتے رہے ہیں انہیں اس کا جائز مالک مان لینا چاہئے' اور جو کچھ اب تک ہوتا آیا ہے وہی اصل حقیقت اور منشائے کتاب و سنت ہے' یہ بحث ایک اعتبار سے علمی اور فنی بھی ہے اور واقعاتی اور علمی بھی ہے اور اخبار کے صفحات ظاہر ہے اس بحث کے متحمل نہیں ہو سکتے' اس لئے اشاروں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے' ۲۰ ستمبر ۹۹ء کو

Marfat.com

ایک معاصر روزنامے میں ان کا مضمون چھپا عنوان تھا۔

"عنوان سیاست کا ایک مغالطہ" مغالطے کی اصلاح تو اچھی بات ہے مگر اس کے پردے میں اس سے بڑا مغالطہ دینا بہرحال درست نہیں' وہ لکھتے ہیں "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام دین اور دنیا کی کسی تقسیم کا قائل نہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ مذہب اور سیاست کی دلچسپی کے دائرے الگ الگ ہیں مذہب کی تگ و دو کا محور اخروی زندگی ہے مذہب یہ بتاتا ہے کہ وہ کون سا رویہ ہے جس کو اختیار کر لینے سے ایک آدمی اپنے پروردگار کی نظر میں پسندیدہ شمار ہوتا اور نجات کا مستحق قرار پاتا ہے مذہب کا اصل موضوع فرد ہوتا ہے اجتماع نہیں۔"

میں بہرحال اپنی فکری بے بسی اور علمی کوتاہی کا اقرار کرتے ہوئے اس ایک پیراگراف کی دو متضاد باتوں میں مطابقت پیدا کرنے سے قاصر ہوں کہ اسلام دین و دنیا کی تقسیم کا قائل بھی نہیں۔ اور مذہب اور سیاست (دنیا) کی دلچسپی کے دائرے الگ الگ بھی ہیں' معلوم نہیں ان دو باتوں میں سے کون سی درست ہے؟ اور ان کا یہ کہنا کہ "مذہب کا اصل موضوع فرد ہے اجتماع نہیں۔" اگر یہ کہنا صحیح ہے تو پھر یورپ نے کیا قصور کیا ہے جسے آج تک ہم نے معاف نہیں کیا کہ اس نے ریاست اور کلیسا کو الگ کیا' قیصر کا حصہ قیصر اور خدا کا حصہ خدا کو دینے کی بات کی' اور مذہب کو فرد کا پرائیویٹ معاملہ قرار دیا' اگر یورپ کا یہ فلسفہ سیکولرازم' رہبانیت اور بے خدا تہذیب کا مظہر ہے تو پھر اسلام اور عیسائیت میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ ندیم صاحب بھی تو یہی کہہ رہے ہیں کہ مذہب کا موضوع فرد ہے اجتماع نہیں' یہ سیکولرازم نہیں تو کیا ہے؟ یہ دین و دنیا کی تقسیم نہیں تو کیا ہے؟ یہ مغربی فلسفۂ سیاست نہیں تو کیا ہے؟ اور یہ رہبانی طرزِ فکر نہیں تو اور کیا ہے؟

دینی جماعتوں کی سیاسی امور میں غیر معمولی دلچسپی لینے' دینی لوگوں کو غلط حکمت عملی' علماء کے سیاسی رویے اور فرقہ وارانہ دینی سیاسی جماعتوں کے قیام وغیرہ پر تنقید کرنا اور اصلاحی مشورے دینا اور چیز ہے اور سرے سے دنیا پرستوں کو سیاستدان مان لینا اور انہیں حکومت کرنے کا واحد اہل قرار دینا بالکل دوسری بات ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ راقم کم از کم محض علماء کی حکومت کا قائل نہیں' لیکن دینی علم و شعور سے آراستہ' اور اسلامی احکام کے مطابق حکومت چلانے کے اہل لوگوں کو سیاست اور امورِ حکومت میں دلچسپی لینے اور خود آگے بڑھ کر زمام اقتدار سنبھالنے کا پوری طرح حامی اور قائل ہے۔ وہ اس لئے کہ ایسے لوگ اپنی حکمرانی کے نہیں کتاب و سنت کی حکمرانی کے

خواہاں ہیں' یہ حکومت کو دولت و طاقت کے حصول کا نہیں ظلم کے خاتمے' عدل کے قیام' عوام کی خدمت خدا اور رسول کے احکام کے نفاذ اور آخرت میں سرخروئی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

میں کسی تھیوکریسی کا قائل نہیں ہوں کہ کوئی مفتی اور مُلا خدائی منصب سنبھال بیٹھے' اور اس کا فرمودہ قرآن و حدیث قرار پائے' مجھے صرف اس پر اصرار ہے کہ دنیا پرست سیاستدان اپنی دنیا سنوارنے کا ہدف رکھتے ہیں اور دین دار سیاستدان (اس سے محض مولوی مراد نہیں۔) عوام کی دنیا سنوارنے اور دین کا چہرہ نکھارنے کا نصب العین رکھتے ہیں۔ "یہ مسٹر" اور "مولوی" کا شاخسانہ تو انگریزی دور کا ہے' ورنہ یہ تقسیم بے معنی ہے' کیونکہ اسلام میں کسی پروہت اور پادری کا عہدہ نہیں جو الگ سے خدائی اختیارات رکھتا ہو ہر وہ شخص جو اپنی زندگی اللہ و رسول کے احکام کے تابع کرتا اور ان احکام کا علم رکھتا اور ان احکام کو اپنے لئے واجب الاتباع سمجھتا ہے وہ دین دار اور عالم دین ہے ہاں اگر کوئی فقیہ' متکلم' محدث ہے تو وہ ایسے ہی ہے جیسے ڈاکٹر' انجینئر' وغیرہ یہ صرف شعبوں کا تخصص ہے کوئی "خدائی منصب" نہیں۔

سیاستدان ہونا نہ کوئی تخصص ہے نہ کوئی خدائی منصب' نہ یہ کوئی پیشہ ہے اور نہ کوئی ہنر' سیاست تو امورِ معاشرت میں دلچسپی لینے اور معاشرے کو منظم بنانے اور سوسائٹی کو اصول و قواعد پر استوار کرنے کی خواہش کا نام ہے اور یہ ہر سنجیدہ' متین مخلص اور باشعور آدمی کا فریضہ ہے' سیاست کو ایک باقاعدہ شعبہ قرار دینے' اسے جوڑ توڑ سے منسلک کرنے' اس میں مخصوص داؤ پیچ آزمانے' اور مکر و فریب کا فن سکھانے کا فلسفہ من گھڑت اور بیہودہ ہے' اور یوں اسے خاص لوگوں کا مشغلہ سمجھنا اپنے اندر کوئی علمی دلیل نہیں رکھتا' وکیل بھی سیاستدان ہو سکتا ہے۔ اور پروفیسر بھی' انجینئر بھی سیاست کر سکتا ہے اور فقیہ و محدث بھی' خطیب بھی اس میدان میں اتر سکتا ہے اور زمیندار بھی' یہ کہنا کہ صوفی اور عالم کا یہ میدان نہیں تو یہ بر خود غلط بات ہے' یہ سیاستدان ہونا آخر کونسا الگ پیشہ اور شعبہ ہے؟ ظاہر ہے مختلف شعبوں اور پیشوؤں کے لوگ سیاست کرتے ہیں' یعنی زمیندار' وکیل' علماء' پروفیسر' ڈاکٹر' انجینئر' تاجر' صنعتکار' وغیرہ اگر صوفی و عالم سیاست میں نہیں آسکتے کہ یہ ان کا میدان نہیں تو باقی لوگ کیسے آسکتے ہیں اور کس اصول کے تحت آتے ہیں؟ پہلے یہ ثابت کیا جائے کہ سیاست "بھی صنعت و حرفت' تجارت' طب' تعلیم' انجینئرنگ" اور وکالت کی طرح الگ شعبہ اور پیشہ ہے" کہ تجارت صرف تاجر کریں' وکالت صرف وکیل کریں اور سیاست صرف سیاستدان کریں' ہاں یہ الگ بات ہے کہ آج سیاستدان صرف وہی ہوتے ہیں جو

Marfat.com

مفت کی کھاتے ہیں' کام کوئی نہیں کرتے' خدا اور انگریز کا دیا سب کچھ ان کے پاس ہے اور مزید کمانے اور وقت گزارنے کے لئے سیاست کرنے اور حکومت میں آتے ہیں' ورنہ یہ کوئی الگ سے فن اور پیشہ نہیں۔

رہ گئی ندیم صاحب کی یہ بات کہ علماء آج تک حکومت میں نہیں آئے تو یہ محض طعنہ ہے کوئی قاعدہ اور کلیہ نہیں' صرف علماء ہی حکومت میں نہیں آئے' بلکہ جو بھی حلال و حرام میں' تمیز کرنے والا ہے' اصولوں کی پاسداری کرنے والا ہے' کسی ضابطے کا پابند ہے' علم و شعور رکھتا ہے' وہ کبھی حکومت میں نہیں آیا' اگر کبھی آیا ہے تو ناکام ہوا ہے' یہ مروجہ سیاست کی بدنصیبی ہے شرافت' علم' دین اور شعور کی ناکامی نہیں' آخر اسے کیا نام دیا جائے' کہ علامہ اقبالؒ تو ایوان حکومت میں نہ پہنچیں' اور ہر دوسرا وڈیرا' سمگلر' خائن' رسہ گیر' چودھری' جام' اور لوٹا ہر بار کامیاب ہو' یہ دینی سیاست کی ناکامی اور علم و شعور کی نالائقی نہیں' لوگوں کی بدقسمتی اور سوسائٹی کا ذہنی و فکری زوال ہے' جس کا مرثیہ الگ سے پڑھنا چاہئے' کیا خیال ہے اگر حکومت یزید' مروان' چنگیز' ہٹلر' اکبر' رنجیت سنگھ' نیرو' حجاج' مارکوس اور رضا شاہ' کے بجائے امام مالکؒ' امام اعظم' امام ابن تیمیہؒ' سقراط' افلاطون' ابن خلدون' علامہ اقبالؒ' مجدد الف ثانیؒ' شاہ ولی اللہ محمد علی جوہرؒ' مولانا حسرت موہانیؒ اور سید جمال الدین افغانیؒ کے ہاتھ میں ہوتی تو کیا دنیا کا نقشہ یہی ہوتا جو آج ہے؟ کیا ظلم' جہالت' دنیا پرستی' ہوس زر اور آمریت کا یہی رنگ ہوتا جو آج ہے؟ ظاہر ہے ایسا نہ ہوتا دنیا میں علم ہوتا' تقویٰ ہوتا' شعور ہوتا' دین ہوتا' انصاف ہوتا' خدا کا خوف ہوتا' اور آخرت کا احساس ہوتا' موضوع یہ نہیں ہونا چاہئے' کہ جو کچھ موجود ہے اسی کو کوئی سمجھو' اہل علم اس کی وکالت نہ کریں یہ تو ان کی وکالت کے بغیر بھی ہو رہا ہے' زورِ علم و قلم تو اس پر صرف ہونا چاہئے کہ "مطلوب کیا ہے؟" آخر اس کے پیچھے کون سی دلیل اور علم کار فرما ہے اور کس کتاب کی تائید دستیاب ہے کہ سکندر مرزا' شیخ مجیب الرحمٰن' جام صادق علی' آصف زرداری' نواز شریف' وٹو' کھر' ملک امیر محمد خاں اور الطاف حسین تو ضرور سیاست کرنے کے اہل ہیں اور مولانا شبیر احمد عثمانی' مولانا مودودی' اے کے بروہی' شاہ احمد نورانی' مولانا نیازی' مولانا داؤد غزنوی' مولانا ابو الکلام' سید عطاء اللہ شاہ بخاری' مولانا سندھی' مولانا اصلاحی' جاوید غامدی اور طاہر القادری کو اس میدان میں نہیں آنا چاہئے کہ یہ اس کے اہل نہیں' آخر کس اصول کے تحت؟ اگر علم' سنجیدگی' متانت' دیانت' فہم اور دین داری سیاست کے لازمی اجزاء ہیں تو یہ لوگ اہل ہیں اگر دغا' فریب' ناجائز دولت' ظلم' جوڑ توڑ' رشوت

Marfat.com

اور غیر ملکی حمائت سیاسی اصول ہیں تو یہ لوگ فی الواقع اس شعبے میں نہیں آنے چاہئیں' بات صاف کی جائے' خواہ مخواہ چلمن تاننے کی ضرورت نہیں' اصل چہرے کی جھلک سامنے آہی جاتی ہے' ندیم صاحب کی یہ تحریر فی الاصل ''دوست'' کی تصویر ہے ''ندیم دوست'' تو ذریعہ ہیں' مسلم لیگ میڈیا سیل یہی کچھ لکھوا سکتا ہے اور کیا؟ اب تو ندیم صاحب' ماشاء اللہ سرکاری سپیچ رائٹر بھی بن گئے ہیں۔

(1 اکتوبر 1999ء)

Marfat.com

گردابِ بلا

یا اللہ ہماری قوم سے وہ کون سی خطا سرزد ہو گئی ہے جو کسی صورت معاف ہونے میں نہیں آرہی' اور ہر نیا لمحہ اس کے لئے صدمہ اور ہر نئی ساعت اس کے لئے شامت لا رہی ہے' بار الٰہی! عوام کا وہ کون سا قصور ہے جس کا کفارہ آج تک ادا نہیں ہو رہا کہ وہ ایسے لیڈروں میں گھر گئے ہیں جن کی قیادت ان کے لئے آفت اور جن کی رہبری ان کے لئے راہزنی بن کر رہ گئی ہے' خداوندا! پاکستانیوں سے وہ کس طرح کا جرم صادر ہوا ہے' جس کی سزا بھگتتے برسوں گزر گئے ہیں کہ وہ ایسے سیاسی مہاشوں کے ہتھے "چڑھ گئے ہیں جن کے ہاتھ میں اگر سیاسی پیشوائی آئی ہے تو پاکستانیوں کے حصے میں رسوائی آئی ہے اگر اقتدار آیا ہے تو لوٹ مار کا بازار گرم ہوا ہے اور اگر وہ محروم حکومت ہوئے ہیں تو پاکستان کے لئے داغ ندامت چھوڑ گئے ہیں' خدایا! یہاں کے باسیوں سے وہ کیا غلطی ہوئی ہے' جس کا خمیازہ ختم ہونے میں نہیں آرہا' کہ ان کے مقدر میں ایسے رہبر آئے ہیں کہ بڑے بڑے راہزن اپنا پیشہ چھوڑنے پر آمادہ نظر آتے ہیں کیونکہ اب ان کی دال کم از کم یہاں نہیں گل سکتی' ان رہبروں کی "فنی مہارت" کے مقابلے میں راہزنوں کی "پیشہ ورانہ ذہانت" کند ہو کر رہ گئی ہے۔

میرے مولا! اہل وطن سے وہ کس نوع کا گناہ ہوا ہے جو دھل نہیں رہا کہ ان کا ایسے رہنماؤں سے پالا پڑ گیا ہے جو راہ دکھانے سے تو قاصر ہیں مگر تباہ کرنے میں ماہر نکلے ہیں' اور ان کے اسلوبِ قیادت نے قوم کے لئے سامان ملامت فراہم کیا ہے۔

یہ آہ سرد اور یہ نالۂ گرم اس لئے بلند ہوا ہے کہ آج کل اخبارات میں وزیر اعظم کی مبینہ کرپشن کے چرچے ہیں جن کا ماخذ برطانیہ کا اخبار "آبزرور" ہے' حکومت وضاحتیں کر رہی اور اپوزیشن قیامتیں اٹھا رہی ہے' اور اس رپورٹ کو حکومت کے نہلے پر اپوزیشن کا دہلا قرار دیا جا رہا ہے' قارئین کو یاد ہو گا کہ قبل ازیں بے نظیر بھٹو بھی بعض برطانوی اور امریکی اخبارات کی اس نوع کی مہم کی زد میں آچکی ہیں' مسٹر آصف زرداری کی کرپشن کی داستانیں بھی انہی اخبارات کے

Marfat.com

ذریعے عالمی شہرت اختیار کر چکی ہیں' ان اخبارات میں "سنڈے ٹائمز" "سنڈے ایکسپریس" "نیو یارک ٹائمز" "نیوز ویک" اور "واشنگٹن پوسٹ" شامل ہیں۔

حقیقت حال کیا ہے؟ ابھی سارے مراحل تحقیق و تفتیش سے گزر رہے ہیں اور یہ مراحل خالصتاً فنی اور قانونی ہیں' لیکن واضح رہے کہ ہمارے یہ کرپٹ "فنکار" اپنے ہنر میں اتنے راسخ اور پختہ ہیں کہ کوئی فنی مرحلہ ان کے لئے کوئی دشواری پیدا نہیں کر سکتا اور موجودہ سٹراند زدہ قانونی نظام ان بڑے آدمیوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

تاہم عوام اس بارے میں یکسو ہیں کہ ملک کو بھی لوٹا گیا ہے اور ہمیں بھی نوچا گیا ہے' ہمارے لیڈروں کا یہ رویہ بہت حیران کن بلکہ مضحکہ خیز ہے کہ ان پر جب بھی کرپشن کا کوئی الزام لگا' کوئی سٹوری چھپی' کوئی انکوائری ہوئی' کوئی عدالتی کارروائی ہوئی اور کوئی سکینڈل اُچھلا' تو ان کی نہ یہ خواہش سامنے آئی اور نہ انہوں نے اس پر کوئی توجہ دی کہ وہ اپنی پاک دامنی ثابت کریں اور الزامات کا ازالہ کریں بلکہ ان کا سارا زور اپنے فریق مخالف کو کرپٹ ثابت کرنے پر صرف ہوتا ہے' خواہ فریق مخالف حکومت میں ہو یا حزبِ اختلاف میں! گویا اگلے کو یہ پیغام دینا مقصود ہوتا ہے کہ ہم اگر چھلنی ہیں تو چھاج تم بھی نہیں ہو' اس لئے دونوں گھروں کی خیر اور دونوں فریقوں کی عافیت اسی میں ہے کہ تم ہمیں چھیڑو نہیں ورنہ ہم تمہیں چھوڑیں گے نہیں' اور ایک طرح سے عوام کو بھی قائل کرنے کی یہ مہم ہوتی ہے کہ اگر تم انہیں گوارا کر رہے ہو' تو ہمیں بھی برداشت کر لو' ورنہ اس دھرتی پہ فرشتے اترنے سے تو رہے؟ سانڈوں کی اس لڑائی میں مینڈک (عوام) برسوں سے خواہ مخواہ کچلے جا رہے ہیں' سابق صدر فاروق خان لغاری بیسیوں بار یہ کہہ چکے ہی کہ سابق اور موجودہ حکمران ڈیڑھ ڈیڑھ ارب ڈالر ہضم کر چکے ہیں اور ایک بار تو ہمارے ساتھ ملاقات میں انہوں نے کہا کہ "اگر عدالت میری قسم پر اعتبار کرے تو میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر یہ کہنے کو تیار ہوں کہ دونوں بڑے لیڈروں نے کروڑوں ڈالر کھائے ہیں' مگر قانونی طور پر میں یہ کرپشن ثابت نہیں کر سکتا اس لئے کہ ان کے "فن" کے سامنے "قانون" بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔" لیکن ہمیں لغاری صاحب کی اس بات سے اس بناء پر اتفاق نہیں کہ وہ خود اقتدار کی چوٹی پر فائز رہے ہیں' آخر ان کا صدارت جیسا بڑا منصب اس "غارت" کا مداوا کیوں نہ کر سکا؟ دوسرے یہ کہ خود انہوں نے عبوری دورِ حکومت میں "ڈیفالٹ ایکٹ" واپس لے کر ہر کرپٹ آدمی کے لئے الیکشن لڑنے کا راستہ کھولا اور آج "مشتے بعد از جنگ" کا کیا فائدہ؟ تیسری بات یہ ہے کہ سب کچھ ثابت ہو سکتا ہے

Marfat.com

بشرطیکہ وہی طریقہ استعمال کیا جائے جو عوام سے اعتراف جرم کے لئے استعمال ہوتا ہے یہاں تو بظاہر پاکستانی سپریم کورٹ کے جج اور برطانیہ اور سوئٹرز لینڈ کے عدالتی کمیشن بے بس نظر آتے ہیں' حالانکہ ان لوگوں کے لئے ایک خرانٹ تھانیدار کافی ہے' جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے دکھا سکتا ہے' مگر جہاں کرپشن کے خاتمے کا ''جہاد'' نہیں بلکہ کرپشن پر ''اتحاد'' کا فارمولا زیر غور رہتا ہو وہاں فی الواقع قانون بھی بے بس ہو جاتا ہے اور ریکارڈ بھی جواب دے جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے لیڈر ایک دوسرے کے سکینڈل اچھال کر آخر دنیا کو کیا بتانا چاہتے ہیں؟ یہی نا' کہ ہماری سیاست خیانت پر استوار ہے' ہمارا سلوگن ''کرپشن ہے' اور ہمارا مقصود لوٹ کھسوٹ ہے' کسی کے منہ پر کالک ملنے سے اپنا چہرہ تو چاند جیسا نہیں ہو جاتا' مگر بار بار یہی مشق ہو رہی ہے' یعنی نہلے پہ دہلا' بے نظیر ۸۸ء سے ۹۰ء تک اقتدار میں رہیں' وہ نواز شریف کا احتساب کر سکتی تھیں کیونکہ میاں صاحب ۸۵ء سے ۸۸ء تک وزیر اعلیٰ رہے اور پلاٹوں اور پرمٹوں کی شہ بخشیاں مشہور رہیں' پھر نواز شریف' ۹۰ء سے ۹۳ء تک وزیر اعظم رہے مگر بے نظیر اور آصف زرداری کا کچھ نہ بگاڑ سکے' بعد ازاں بے نظیر ۹۳ء سے ۹۶ء تک حکومت کرتی رہیں' وہ بھی نواز شریف کو ''ایکسپوز'' نہ کر سکیں' اب پھر نواز شریف وزیر اعظم ہیں' ڈیڑھ سال تو گزر گیا' باقی کے ڈیڑھ دو سال غالباً پرانی مشق کے تحت گزر جائیں گے' اور عوام اسی گردابِ بلا میں غوطے کھا کھا کر اپنی آنکھوں اور ناک سے پانی بہاتے رہیں گے' اور یہ ''جبر جنگ'' لیڈر بدستور باری باری حکومت فرماتے رہیں گے۔''

(6 اکتوبر 1998ء)

امریکہ اِن ٹربل

ایسا ہوتا آیا ہے کہ نمرود کا تمرد توڑنے کے لئے قدرت ایک چھوٹی سی چیونٹی کو اس کی ناک میں گھسیڑ دیتی ہے اور کبھی نیچی نہ ہونے والی ناک میں بالآخر نمرود کا دم آجاتا ہے یہ بھی ہوا ہے کہ ابرہہ کے ہاتھی گرانڈیل ہونے کے باوجود معمولی سے ابابیل کے ہاتھوں ذلیل ہو کر رہ گئے' ہمارے علامہ اقبالؒ بھی ممولے کو شہباز سے لڑانے کی آرزو کرتے رہے۔

دراصل جس شخص' ملک یا تہذیب کو کبریائی کا گھمنڈ ہوا قدرت نے کسی نہ کسی طور پر اس کے اس پاکھنڈ کا پردہ چاک کر دیا' فرعون "انا ولاغیری" کا شکار ہوا تو دریا کی موجوں نے اس کا سارا نشہ اتار کر رکھ دیا' قارون کی دولت نے اُسے گستاخ بنایا تو زمین تڑاخ سے کھل گئی اور اسے خزانوں سمیت اپنے اندر سمو لیا' شداد نے غرور میں آکر زمین پر جنت بنا ڈالی موت نے اسے قدم رکھنے کی مہلت نہ دی' ابوجہل کی جاہل حمیت جب حد سے بڑھی تو معاذؓ اور معوذؓ جیسے کمسن مجاہدوں نے اس کی درگت بنا ڈالی' خسرو پرویز نے ترنگ میں آکر مکتوبِ رسالت پھاڑ ڈالا خدائے بے نیاز نے اس کا تختِ شاہی جڑ سے اکھاڑ دیا' کل تک روس اپنی عظمت کا ناقوس بجاتا پھرتا تھا' آج بین الاقوامی برادری میں اپنی ناموس بچاتا پھر رہا ہے بڑے بڑے قتال جہاں اٹھے اور ہر ایک کے لئے وبال جاں بنے رہے لیکن اللہ الصمد نے ہر ایک کے لئے ایک حد مقرر کر رکھی ہے' جو اس سے آگے بڑھے گا وہ آخرالامر منہ کے بل گرے گا' امریکہ نے بھی کچھ برسوں میں فرعون و نمرود اور شداد و قارون کی گدی سنبھال رکھی ہے' روس کی ہر محاذ پر پسپائی کے بعد امریکہ کو ایک نئی توانائی ملی لیکن اس نے لشکر کے بجائے تکبر کا راستہ اختیار کر لیا' ورنہ صدیوں میں امریکہ کو یہ موقع ملا تھا کہ وہ واحد بڑی طاقت کے طور پر سامنے آیا' ایسے میں اس پر لازم تھا کہ وہ دنیا میں ایک توازن قائم کرتا' اجتماعی انصاف کا اہتمام کرتا' کمزور قوموں کو سہارا دیتا' دوسروں کے دلوں میں اپنے لئے محبت کے جذبات ابھارتا اور ایک نئے عالمی نظام کی نیو اٹھاتا' ایک ایسا عالمی نظام جس کی معیشت استحصال سے پاک ہوتی' جس کی سیاست سازشوں سے معرا ہوتی' جس کا سماج جبر سے آزاد ہوتا اور جس کے

Marfat.com

تمام فیصلے میزان عدل میں درست اور صحیح ہوتے مگر امریکہ کو وہی چاٹ لگی جو قرون وسطیٰ کی طاقتوں کو لگی ہوئی تھی' آج اگر عالمی سطح پر گیلپ پول سروے ہو تو یہ نتیجہ سامنے آئے گا کہ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کا ہدف امریکہ ہے' مشرق وسطیٰ میں بھی یہی رائے سامنے آئے گی' جنوبی ایشیا کی سوچ بھی اس سے مختلف نہیں ہو گی مشرق بعید کا بھی یہی خیال ہو گا' قلب یورپ سے بھی یہی صدا اٹھے گی اور افریقہ کے ریگزار بھی یہی پکار دیں گے۔

ایسا نہیں ہوا کہ ایشیا' یورپ' افریقہ' مڈل ایسٹ اور فار ایسٹ نے کہیں مل بیٹھ کر یہ طے کیا ہے اور کسی مشترکہ اجلاس میں فیصلہ کیا ہے بلکہ ہر جگہ امریکہ کی دھونس نے کسی کے دل میں اونس بھر بھی ہمدردی اور محبت کے جذبات نہیں رہنے دیئے' گزشتہ چند برسوں سے چند منفی قسم کے لوگوں نے امریکہ کے جاہ و جلال کو پامال کیا ہوا ہے' ایک نابینا شیخ عمر عبدالرحمان' امریکہ کے لئے دردِ سر ہے' اوسط درجے کے قدبت کے آدمی یوسف رمزی نے امریکہ کو پھرکی کی طرح گھمائے رکھا' ایمل کانسی کل تک امریکہ کو باؤلا بنائے رہا آج کل اسامہ بن لادن امریکہ کے سر پر سوار ہے' پھر میرے بدن کا یہ صوفی آدمی ایک سپرپاور کے لئے چیلنج بنا ہوا ہے' تنزانیہ اور کینیا کے امریکی سفارتخانوں میں بم دھماکوں کے بعد امریکہ بہت حد تک حواس باختہ ہو چکا ہے' پاکستان پر اپنا دباؤ بڑھا رہا ہے' افغانستان کو آنکھیں دکھا رہا ہے' اپنے شہری واپس بلا رہا ہے' کمانڈو ایکشن کے منصوبے بنا رہا ہے وغیرہ۔ بم دھماکوں کا واقعہ تو نیروبی اور دارالسلام میں ہوا لیکن آفت پاکستان اور افغانستان پر ٹوٹ پڑ رہی ہے' بندر کی بلا طویلے کے سر آخر کیوں؟ جو بات ہماری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ۲۸ مئی کے پاکستان کے ایٹمی دھماکے کے بعد امریکہ کا سارا پلان بکھرتا ہوا نظر آ رہا ہے امریکہ تو اشارۂ ابرو کے زور پر دنیا کے فیصلے کرنے کا عادی رہا ہے کجا کہ پانچ بار براہ راست صدر امریکہ فون کر کے اپنا فیصلہ سنائے پھر بھی جواب میں ------ نہ ------ سن پائے' اس سے امریکہ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا تو چھائے گا اس نے پاکستان کو سزا تو دینی ہے خواہ اقتصادی پابندیوں کے بہانے' سیاسی افراتفری کی آڑ میں' یا اسامہ بن لادن کو ڈھال بنا کر' اسی طرح افغانستان میں بھی امریکہ کی ساری گیم الٹ گئی ہے طالبان کی حیران کن پیش رفت اور پے بہ پے فتوحات نے وہ نقشہ پلٹ دیا ہے جو امریکہ تیار کیئے بیٹھا تھا' امریکہ کے ایجنڈے میں تو افغانستان کی تقسیم شامل تھی' لسانی بنیادوں ہر دو ریاستوں کا وجود! ایک پختون اور ایک تاجک' مگر ایسا نہیں ہو سکا' امریکہ کے لئے اب بھی موقع ہے کہ وہ ہر جگہ فتور نہ ڈالے شعور سے کام لے' وہ دنیا بھر کے ضمیر سے کب تک لڑے

Marfat.com

گا؟ وہ مظلوموں کی آہوں کا کب تک سامنا کرے گا؟ وہ نفرتوں کی فصل کب تک بوئے گا؟ اور وہ ہاتھوں کی گرہیں ناخنوں سے کب تک کھولے گا؟

"عالمی بادشاہت" کا یہ مطلب تو نہیں کہ مشرق بعید کو مصنوعی معاشی بحران میں مبتلا کر کے من پسند فیصلے تھوپے جائیں، مشرق وسطیٰ میں اکیلے اسرائیل کو پوری عرب دنیا کا "ہیڈ ماسٹر" بنا دیا جائے، عراق کو اپاہج بنا کر دوسروں کو ڈراوا دیا جائے، پاکستان کو ایٹمی دھماکہ کرنے کے جرم میں اقتصادی تنہائی کا نشانہ بنایا جائے، فطرت اگر اٹل حقیقت ہے تو اس کی تعزیر یکساں ہوتی ہے خواہ روس ہو یا امریکہ، کل تک روس کا یہ دعویٰ اور لوگوں کے دماغوں پر ہوا تھا کہ وہ جہاں قدم رکھتا ہے وہاں سے پلٹتا نہیں ہے دنیا نے اسے پلٹتے بھی دیکھا، پلٹتے بھی دیکھا اور ٹوٹتے بھی دیکھا، کہا جاتا ہے کہ یہ سارا کارنامہ امریکہ کا ہے مانا کہ ایسا ہو گا لیکن جن ہاتھوں سے یہ ہوا وہ تو سلامت ہیں زیادہ سے زیادہ گال بدل جائیں گے تھپڑ تو وہی رہے گا۔

(22 اگست 1998ء)

سرِ دلبراں ------ لیکن ------ در حدیث دیگراں

میرا ایک عرصے سے معمول ہے کہ شب آٹھ بجے بی بی سی کی اردو نشریات سنتا ہوں' عالمی خبریں' سیربین' مختلف موضوعات پر رپورٹیں' خطوط اور تبصرے اپنے اندر ضیافت فکر و نظر کا بہت سا سامان رکھتے ہیں' ۱۳' اور ۱۴ اگست ۹۸ء کی درمیانی رات بی بی سی نے میرے وطن عزیز پاکستان کے ۵۱ ویں یوم آزادی پر خصوصی رپورٹ پیش کرتے ہوئے جب ریڈیائی لہروں پر حرف و لفظ نشر کرنے شروع کئے تو میرے دل و دماغ کا سارا الف و نشر بے ترتیب ہونے لگا' ایک ایک حرف پگھلے سیسے کی طرح قطرہ قطرہ کان میں گرنے لگا اور ایک ایک لفظ زہر زقوم کی مانند حلق سے اترنے لگا' سماعت میں خراش اور ذائقے میں تلخی آتی چلی گئی' ایک بار تو کان بج اٹھے اور دماغ کا ناریل چٹخنے پہ آگیا اور قریب تھا کہ انگلیاں ریڈیو کے سوئچ کی طرف بڑھتیں اور اسے آف کر دیتیں لیکن جی کڑا کر کے کڑوا گھونٹ نگلنے پر طبیعت کو آمادہ کر ہی لیا' ہرچند کہ یہ حدیث دیگراں تھی لیکن تھا تو سر دلبراں' مفر ہو تو کیسے؟

بی بی سی نے کہا "اگرچہ کسی بھی ملک کی اکاون برس کی عمر تاریخی لحاظ سے کچھ بھی نہیں لیکن پاکستان نے سیاست' معیشت اور سفارت کے میدان میں آنکھ کھولتے ہی وہ زخم کھائے کہ اس وقت یہ ملک اس مشقت زدہ شخص کی طرح لگتا ہے جس کے چہرے پر ۵۱ برس کی عمر میں ہی بے کیف زندگی نے جھریاں ڈال دی ہوں' آنکھوں کے ارد گرد سیاہ حلقے پڑ چکے ہوں اور سر کے بال بھی اڑ چکے ہوں۔"

یہ الفاظ سنتے ہی میں بدمزہ تو بہت ہوا لیکن زبان پر بے اختیار یہ مصرع آگیا۔

؎ یہ واقعہ بھی خوب ہے تہمت بھی خوب ہے

اس تبصرے کو اپنے ایک سابق آقا اور نظریاتی دشمن ملک کی فضا میں موجود نفسیاتی زہرناکی سے تعبیر کیا جائے تو تہمت معلوم ہوتی ہے لیکن کھلی آنکھوں سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا جائے تو واقعہ معلوم ہوتا ہے' پچاس برس کے عرصے میں ایک ہی قابل فخر کارنامہ ہے کہ ہم --- ایٹمی

قوت ----- بن گئے ہیں' باقی کی فردِ عمل چنداں قابل رشک نہیں' ان برسوں میں ہماری سیاست کے اندر ایسا گند بھرا گیا ہے کہ کوئی شاعر سیاست پر نظم کہنا چاہئے تو اسے بجز منافقت' شقاوت' کثافت' دہشت' دناءت' اور شماتت کے اور کوئی قافیہ میسر نہیں آئے گا' پچاس برسوں میں پچّیس برس مارشل لاء میں گزرے' کچھ عرصہ عبوری اور نگران حکومتوں میں بسر ہوا' چند سال شورشوں اور تحریکوں کی نذر ہوئے' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آدھا ملک گنوا دیا گیا' ان پچاس برسوں میں بعض مواقع پر لسانی اور صوبائی لڑائیاں اس انداز میں ہوئیں' کہ پانی پت کے معرکے یاد آ گئے اور آج کل پھر وہی فضا بن رہی ہے' یہاں فرقہ وارانہ تشدد بھی اس پیمانے پر ہوا کہ بھارت میں ہونے والے مسلم کش فسادات کی ہولناک تصویریں آنکھوں میں پھر گئیں' سیاسی لوٹے پن کے وہ مظاہرے سامنے آئے کہ طوائفوں کی کہہ مکرنیاں کسی کو یاد ہی نہ رہیں' راتوں رات پارٹیاں بنیں' پل بھر میں ماسک اترے اور چڑھے' آنکھ جھپکتی دیر میں پیمان بندھے اور حلف ٹوٹے اور اگلے ہی لمحے غدار یارِ غار اور فداکار آنکھوں کا خار بن کر رہ گئے۔

یہی صورت معیشت کے فیلڈ میں ہوئی' اور آج نوبت یہ آ گئی ہے کہ قرض نہیں قرض کا سود اتارنے کے لئے مزید قرض ملنے میں تاخیر ہو جائے تو دیوالیہ ہونے کا ڈھنڈورا پٹ جاتا ہے' وہ کون سا بااثر آدمی ہے جس نے گدھ بن کر اس ملک کو نہیں نوچا اور پیل ہشت پا بن کر ملک کے وسائل کو نہیں روندا گزشتہ دنوں ملک غلام مصطفےٰ کھر سے ایک تفصیلی ملاقات ہوئی انہوں نے بتایا کہ جب میں سابقہ حکومت میں پانی اور بجلی کا وزیر تھا تو اس حوالے سے بعض غیر ملکی کمپنیوں کے وفود سے میرے مذاکرات ہوئے اور انہوں نے بجلی کے شعبے میں سرمایہ کاری کا عندیہ دیا اور ساتھ ہی بتایا ہمارے انڈین افسروں اور سیاستدانوں سے بھی مذاکرات ہوئے اور اب آپ کے ملک میں آئے ہیں' دونوں ملکوں کے افسروں اور پہنچنے والے لوگوں کے مزاج میں یہ فرق پایا کہ بھارتی لوگ آخر دم تک بجلی کے ریٹ کم سے کم رکھنے پر ہم سے لڑتے رہے کہ اتنی شرح پر ہم معاہدہ کریں گے' جب بحث و تمحیص کے بعد ہم نے کم سے کم شرح پر آمادگی ظاہر کر دی تو پھر انہوں نے ہم سے اپنے کمیشن کا مطالبہ کیا ہم نے انہیں کہا اب بھی کمیشن کی گنجائش ہے؟ تو انہوں نے کہا جناب یہ تو ہو گا اور یہاں مذاکرات کے دوران یہ کیفیت رہی کہ ساری لڑائی کمیشن ریٹ پر ہوئی خواہ بجلی کے نرخ آسمان پر پہنچے ہوئے ہوں یہاں کے افسروں اور سیاسی بزرجمہروں کو اس سے کوئی غرض نہ تھی' کہ قوم کو سستی بجلی مہیا ہو' اگر کم نگہی اور خود غرضی کا یہ عالم ہو تو معیشت کا حال کیسے

Marfat.com

سدھرے اور کیوں کر سنبھلے؟ بی بی سی نے یہ بھی کہا "پاکستان اپنے ۵۱ویں جنم دن کے موقع پر ایک دائرے میں گھوم رہا ہے یہ فرض کرکے کہ سفر جاری ہے گھر کا چولہا مانگے کے ایندھن سے جل رہا ہے' پرانے قرض خواہ دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں اور پچھلا دروازہ بھی ایک بند گلی میں کھلتا ہے۔" یہ الفاظ تیر نہیں تو اور کیا ہیں جو سیدھے دل میں کھبے جاتے ہیں' مگر کیا کریں کہ قوم نے جب بھی پیچھے مڑ کر کمیں گاہ کی طرف دیکھا تو۔

اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

کوئی باہر کے ڈاکو ہمارے بنکوں پر آکر ڈاکہ ڈالتے تو شائد اور بات ہوتی اگر اپنے ہی سارا سرمایہ لوٹ کر باہر کے بنک بھر دیں تو آدمی کس سے گلہ کرے؟ ہم بی بی سی سننا بند کر دیں وائس آف امریکہ کا بائیکاٹ کر دیں یا وائس آف جرمنی کا سوئچ آف کر دیں اس سے کیا فرق پڑے گا؟ قرض خواہ تو دروازہ کھٹکھٹاتے رہیں گے اور پچھلے دروازے سے نکلنے کی صورت میں بھی جائے فرار نہیں کیوں کہ ایک تو گلی بند ہے اور دوسرے اندھی بھی! کیا یہ خوشگوار توقع کی جاسکتی ہے کہ اگلے برس یوم آزادی مناتے وقت یہی بی بی سی رپورٹ نشر کر رہا ہو کہ چہرے کی جھریاں غائب ہو کر وہاں بشاشت آگئی ہے' سر کے بال اُگ آئے ہیں اور آنکھوں کے حلقے اب روشن دائرے بن چکے ہیں ایٹمی دھماکہ تو ہو چکا' اب ذہانت' محنت اور دیانت کے بل بوتے' پر "معاشی دھماکہ" بھی کر دیا جائے۔

(18 اگست 1998ء)

Marfat.com

شہید محبت

علامہ اقبالؒ کا ایک مصرعہ ہے۔

؎ طے شود جادہ صد سالہ باآہے گاہے

یعنی بعض اوقات ایک آہ کے فاصلے پر منزل ہوتی ہے یا لمحے بھر میں سو سال کا سفر طے ہو جاتا ہے' یہ مصرعہ زبان پر آتے ہی ذہن بے اختیار شہید ناموس نبیؐ غازی علم الدینؒ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے' اس نے صدیوں کا سفر اس تیزی اور کامیابی سے طے کیا اور اربابِ زہد و تقویٰ اور اصحاب منبر و محراب بس دیکھتے ہی رہ گئے' اس نے ایک قدم انار کلی ہسپتال روڈ پر اٹھایا اور دوسرے قدم پر جنت الفردوس میں پہنچ گیا۔

؎ یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اسی جنت کی تلاش میں زاہدوں اور عابدوں کے نجانے کتنے فاصلے سرگرداں رہے' کیسے کیسے لوگ غاروں کے ہو کر رہ گئے' کئی پیشانیاں رگڑتے اور سر پٹختے رہے' ہزاروں سربگریباں' چلہ کش اسی آرزو میں دنیا سے اٹھ گئے' لاکھوں طواف و سجود میں غرق رہے' بے شمار صوفی و ملا وقف دعا رہے' ان گنت پرہیزگار خیال جنت میں سرشار رہے' خدا ان سب کی محنت ضرور قبول کرے گا' لیکن غازی علم الدینؒ کا مقسوم دیکھیے نہ چلہ کیا نہ مجاہدہ' نہ حج کیا' نہ عمرہ کیا' نہ دیر میں قشقہ کھینچا نہ حرم کا مجاور بنا' نہ مکتب میں داخلہ لیا نہ خانقاہ کا راستہ دیکھا' نہ کنز قدوری کھول کر دیکھی نہ رازی و کشاف کا مطالعہ کیا' نہ حزب البحر کا ورد کیا نہ اسم اعظم کا وظیفہ پڑھا' نہ علم و حکمت کے خم و پیچ میں الجھا نہ کسی حلقہ تربیت میں بیٹھا' نہ کلام و معانی سے واسطہ رہا نہ فلسفہ و منطق سے آشنا ہوا' نہ مسجد کے لوٹے بھرے نہ تبلیغی گشت کیا' نہ کبھی شیخی بگھاری نہ کبھی شوخی دکھائی' اسے پاکبازی کا خبط نہیں محبوب حجازیؐ سے ربط تھا' وہ تسبیح بدست نہیں مست مئے الست تھا' وہ فقیہ مسند آراء نہیں فقیر سرراہ تھا' نجانے ہاتف غیب نے چپکے سے اس کے کان میں کیا بات کہی کہ پل بھر میں دل کی کائنات بدل گئی۔

Marfat.com

پروانے کا حال اس محفل میں' ہے قابل رشک اے اہل نظر
اک شب میں ہی یہ پیدا بھی ہوا' عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

خدا معلوم کتنی ریاضت سے آغوش۔ سطام نے بایزیدؒ کی پرورش کی' خاک بغداد نے جنیدؒ کو جنم دیا' شہر قونیہ نے مولانا رومؒ کو بنایا' دہلی نے شاہ ولی اللہؒ کو پیدا کیا اور ادھر علم الدینؒ بڑھئی کی دکان سے اٹھا اور ایک ہی جست میں زمان و مکان طے کر ڈالے۔

علامہ اقبالؒ کو جب غازی علم الدینؒ کے بارے میں بتایا گیا کہ ایک اکیس سالہ ان پڑھ اور مزدور پیشہ نوجوان نے گستاخ رسول ﷺ راج پال کو بڑی جرات اور پھرتی سے قتل بلکہ واصل جہنم کر دیا تو حضرت علامہؒ نے گلوگیر لہجے میں فرمایا۔

"اسی گلاں ای کردے رہ گئے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا۔"
(ہم باتیں ہی بناتے رہے اور بڑھئی کا بیٹا بازی لے گیا)

حضرت علامہؒ نے غالباً اسی موقع کے لئے کہا ہے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسمان کو بے کراں سمجھا تھا میں نے

جس زمانے میں یہ رسوائے زمانہ کتاب لکھی اور چھاپی گئی' شہر لاہور میں ظاہر ہے حق ہو کے زلزلے ہوں گے' علم و فضل کے چرچے ہوں گے' تقریر و تحریر کے ہمہمے ہوں گے' وعظ و نصیحت کے غلغلے ہوں گے' ادیبوں اور خطیبوں کے طنطنے ہوں گے' لیکن شاتم رسول کو اسفل السافلین میں پہنچانے کی سعادت کسی صوری با صفا' کسی امام ادب و انشاء' کسی خطیب شعلہ نوا' اور کسی سیاسی رہنما کے حصے میں نہیں آئی بلکہ ایسے مزدور کو ملی جو ممتاز دانشور نہیں معمولی کاریگر تھا' جس کی پیشانی پر علم و فضل کے آثار نہیں ہاتھوں میں لوہے کے اوزار تھے' خدا معلوم وہ نمازی تھا یا نہیں لیکن صحیح معنوں میں غازی نکلا' وہ کلاہ و دستار کا آدمی نہیں تھا مگر بڑے کردار کا حامل بن گیا۔

غازی علم الدین شہیدؒ کو دیکھ کر کم از کم یہ یقین ضرور ہو جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی کی عبادت کے طول و عرض پر نہیں جاتا بلکہ کسی کے جذبے بے غرضی کو شرف قبولیت بخشتا ہے' اس کے ہاں شب زندہ داری سے زیادہ دل بیقراری کام دیتی ہے' وہ کسی کے ماتھے کا محراب نہیں دیکھتا نہاں خانہ قلب کا اضطراب دیکھتا ہے' اسے نیکیوں کے سفینے نہیں گوشہ چشم پر آنسوؤں کے نگینے درکار ہوتے ہیں' اسے کسی کی خوش بیانی متاثر نہیں کرتی کسی کی بے زبانی پہ پیار آجاتا ہے' اسے بوعلی کی حکمت

Marfat.com

کے مقابلے میں کسی بڑھئی کی غربت پسند آجاتی ہے' اگر یہ بات نہ ہوتی تو غازی علم الدینؒ کبھی مقام شہادت سے سرفراز نہ ہوتا۔

کسی غزوے کے دوران ایک شخص حضورؐ کے دست مبارک پر مسلمان ہوتا ہے' اور ساتھ ہی جہاد کی اجازت مانگتا ہے' چند لمحے قبل وہ سیاہ کفر میں شامل تھا' دو ساعتوں کے بعد وہ مجاہدین اسلام کا ساتھی بن جاتا ہے' دولت اسلام سے بہرہ مند اور جذبہ جہاد پر سرشار ہو کر میدان میں اترتا ہے اور تھوڑی دیر بعد جام شہادت نوش کر جاتا ہے' جنگ کے خاتمے پر حضور ﷺ شہداء کی لاشوں کا معائنہ فرما رہے تھے جب ثابت بن اصیرم رضی اللہ عنہ کی لاش پر پہنچے تو آپ نے صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا "اس شخص کو دیکھو جس نے اسلام قبول کیا مگر نہ نماز پڑھی' نہ اس نے روزہ رکھا' نہ اسے حج کرنے کا موقع ملا' مگر سیدھا جنت میں پہنچ گیا۔"

یہی حال غازی علم الدین شہیدؒ کا ہے' نہ اس نے فن تجوید و قرات سیکھا' نہ عربی فارسی پڑھی' نہ رومیؒ کی مثنوی دیکھی نہ زمخشری کی کشاف پڑھی' نہ دین کے اسرار و رموز سمجھے مگر ایک راز اس پر ایسا کھلا' کہ مقدر کے بند کواڑ کھل گئے' قسمت کا دریچہ کیا کھلا کہ جنت کے دروازے کھل گئے' یہ عقل خودبیں کا کرشمہ نہیں عشق خدابیں کا معجزہ تھا' کل تک دکان پر ٹھک ٹھک کرنے والا علم الدینؒ آج کروڑوں مسلمانوں کے سینے میں دل بن کر دھک دھک کر رہا ہے۔

غریب باپ کو کیا علم تھا کہ اس کی گود میں شہر محبت کا امیر پل رہا ہے' کچے گھروندے کو کیا خبر تھی کہ اس کے احاطے میں پکے عقیدے کا بچہ چل پھر رہا ہے' سنسان حویلی کو کیا پتہ تھا کہ ایمان کی دولت اس کے دامن میں بھری ہوئی ہے' محلہ چابک سواراں کا علم الدینؒ میدان عشق کا شہسوار نکلا۔

؎ یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

غازی علم الدین شہیدؒ ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے اور ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو تعزیر جرم عشق میں پھانسی پا کر ہمیشہ کے لئے گستاخان رسول کے گلے کی پھانس بن گئے۔

۲۱ برس کی عمر میں صدیوں کا سفر اس خوبی سے طے کیا کہ اس کی گرد سفر کا ایک ایک ذرہ کاروان شوق کے لئے نشان منزل بن کر رہ گیا ہے' نجانے عشاق کے اور کتنے قافلے اس راہ سے گزریں گے لیکن ان پر لازم ہو گا کہ وہ علم الدینؒ کے نقش کف پا کو چوم کر اپنی منزل کی بو سونگھیں۔

Marfat.com

لوگ زندہ جاوید ہونے کی آرزو میں مر مر کر جیتے اور جی جی کر مرتے ہیں انہیں جینے کا فن تو آجاتا ہے مرنے کا ڈھنگ نہیں جانتے وہ غازی علم الدینؒ کی روح سے پوچھیں کہ مر کر امر ہو جانے کا کیا راز ہے؟ فنا کے گھاٹ اتر کر لافانی بننے کا کیا طریقہ ہے؟ گمنام ہو کر شہرت دوام پانے کا کیا نسخہ ہے؟ کسی کے نام پر مٹ کر انمٹ ہونے کی رمز کیا ہے؟ جام شہادت کے ذریعے آب حیات پینے کا کیا گر ہے؟

غازیؒ کو میانوالی جیل میں پھانسی دی گئی' اور وہیں دفن بھی کر دیا گیا' انگریز کا خیال تھا کہ اگر لاش بر سر عام لاہور لائی گئی' تو ضبط کے سب بندھن ٹوٹ جائیں گے' مگر مسلمان کا احتجاج پورے برصغیر میں شدید سے شدید تر ہو گیا' حکیم الامت علامہ اقبالؒ' سر محمد شفیع' میاں عبدالعزیز مالواڈہ اور مولانا غلام محی الدین قصوری گورنر سے ملے اور غازیؒ کی لاش مسلمانوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا' بالآخر ۱۴ نومبر کو لاش لاہور پہنچی' جنازہ چوبرجی جناز گاہ میں پہنچا' وہاں جنازہ کیا پہنچا پورا لاہور پہنچ گیا' اس اعزاز و تکریم کو شہنشاہ ہند ظہیر الدین بابر مغل اعظم' شاہجہان' غیاث الدین بلبنؒ اور دوسرے سلاطین جہاں آج تک ترستے ہوں گے' جو اکرام و اعزاز ''ترکھاناں دے منڈے'' کو نصیب ہوا۔

؎ عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

غازیؒ آج قبرستان میانی صاحب میں آسودہ خاک ہے اس خاک کا ہر ذرہ سرمہ چشم عشاق ہے' لوگ بقائے دوام پانے کے لئے خضر کی تلاش میں ہیں جو انہیں چشمہ حیواں تک پہنچا سکے وہ سمجھتے ہیں کہ آب حیات کے دو گھونٹ انہیں حیات جاودانی بخشش دیں گے لیکن انہیں معلوم نہیں کہ حضور ﷺ کے تلووں کا دھوون ہی آب حیات ہے' اس کا ایک قطرہ حیات ابد عطا کر دیتا ہے' علم الدینؒ اپنے دم خم سے نہیں انہی کی خاک قدم بن کر زندہ و پائندہ ہے۔

؎ ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

(4 نومبر 1997ء)

❁❁❁

دوپٹہ اتارو مہم

قرض اتارو مہم تو سرے نہ چڑھ سکی' ملک سنوارو مہم بھی نعروں' نغموں اور ترانوں سے آگے نہیں بڑھ پائی' منڈا پاکستانی جیسے گیت کو غالباً اس مہم کا نقطۂ عروج سمجھ لیا گیا ہے' اب خیر سے وفاقی وزیر سماجی بہبود بیگم عابدہ حسین نے "دوپٹہ اتارو مہم" شروع کر دی ہے' نتائج تو اس مہم کے بھی باقی مہمات سے مختلف نہیں ہوں گے تاہم آئیڈیا خوب ہے' یادش بخیر! بائیس چوبیس سال پہلے بھٹو صاحب نے برقعہ اتارو مہم کا آغاز کیا تھا' جب بلوچستان کے ایک شہر میں جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے ترنگ میں آکر روائتی بلوچ خواتین سے کہا تھا کہ یہ پردہ نشینی اور برقعہ پوشی کیا ہے یہ سب چھوڑ چھاڑ کر میدان میں آجائیں' کاش آج بھٹو صاحب زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ ان کی صاحبزادی کس طرح چادر پوش بن کر اور ہمہ وقت تسبیح ہاتھ میں لے کر اپنے مرحوم والد کی بے جا آزاد روی کی نفی کر رہی ہیں۔

بیگم عابدہ نے فرمایا ہے کہ دوپٹہ اوڑھنا منافقت ہے' مجھے اس سے سو فیصد اتفاق ہے کہ اگر جھنگ میں جا کر چادر اوڑھ لی جائے اور اسلام آباد اور لاہور وارد ہوتے ہی اسے اتار پھینکا جائے تو اس سے بڑی منافقت اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن جنہیں بیگم صاحبہ طعنہ دے رہی ہیں وہ خواتین دوپٹہ فیشن کے طور پر نہیں لیتیں بلکہ نسوانی لباس کا حصہ اور تہذیبی شرافت کا تقاضا سمجھ کر اوڑھتی ہیں' ایسی لاکھوں کروڑوں خواتین کو نہ تو سیاسی نمائش کرنا آتی ہے نہ سماجی استحصال ان کا شیوہ ہے اور نہ ہی فکری ژولیدگی کا مرض انہیں لاحق ہے' یہ بحث تو خیر اہل دانش و مذہب کے ہاں چلی آرہی ہے کہ برقعہ پہننا لازمی اور منہ ڈھانپنا ضروری ہے یا بڑی اوڑھنی لے کر نکلنا کافی ہے مگر یہ فتویٰ پہلی بار سامنے آیا ہے کہ سرے سے دوپٹہ لینا ہی منافقت ہے۔ بیگم عابدہ جیسی شخصیات کے اس طرح کے بیانات اور فرمودات پڑھ کر خیال آتا ہے کہ کہاوت سازوں نے بڑے عمیق مشاہدے اور گہرے مطالعے کے بعد کہاوتیں وضع کی ہیں اور اس موقع پر یہ کہاوت یاد آرہی ہے کہ "جنہاں دے گھر دانے انہاں دے کملے وی سیانے" موصوفہ چونکہ ایک سے زائد بار وزیر رہ چکی ہیں'

Marfat.com

امریکہ میں سفارت کر چکی ہیں' قومی اسمبلی کی ممبر بھی رہی ہیں' اور جھنگ کی بڑی زمین دار بھی ہیں اگر وہ اپنی ہر بات میں فلسفہ نہ بگھاریں تو کیا کریں؟

سوال یہ ہے کہ عورت اگر بڑی چادر لے کر گھر سے باہر نکلے سر ڈھانپ کر چلے' نگاہیں نیچی کر کے قدم اٹھائے' شریفانہ لہجے میں بات کرے' ہر ایک سے کھلکھلا کر نہ ملے' اور اپنے وقار اور احترام کو ملحوظ رکھے تو یہ ہو گئی' منافق' لیکن اگر وہ سڑکوں پر گنگناتی پھرے مخلوط محفلوں میں چہچہاتی نظر آئے' کھلے بال لہراتی رہے اور بات بے بات ٹھٹھے مارے تو اس ادا کو کیا نام دیا جائے گا؟

اگر تو موصوفہ کی بات کا مفہوم یہ ہے کہ دوپٹہ اتارتے ہی ملکی قرضہ اترنا شروع ہو جائے گا' معیشت کا گراف بڑھنا شروع ہو جائے گا' شرح خواندگی میں اضافہ ہونے لگے گا' سماجی انصاف کا دروازہ کھل جائے گا' اور ترقی کے راستے کا ہر روڑا ہٹ جائے گا' تو پھر کھل کر دلائل سے بات کریں کوسنے دینے اور ہر گھریلو خاتون کو منافق ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

ہزاروں امیر خواتین ہیں جو سب آسائشیں ملنے کے بعد بھی دوپٹہ اوڑھ کر رکھتی ہیں بے شمار وزراء سفار تکاروں' ججوں' افسروں اور بڑے تاجروں کی بیگمات پورے پردے میں رہتی ہیں' سینکڑوں خواتین پروفیسرز اور ڈاکٹرز چادر لے کر اپنے اپنے کام پر جاتی ہیں انہیں تو نہ چادر کھٹکتی ہے اور نہ دوپٹہ ستاتا ہے چند خواتین نے اسے کروڑوں ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کے لئے خواہ مخواہ کس لئے آزار بنایا ہوا ہے؟ اور یہ وہ خواتین ہیں جن کا روزگار آزاد ہے' وہ محنت کر کے کھاتی ہیں' اور کسی عیاری اور استحصال سے انہوں نے جائیداد نہیں بنا رکھی' مگر بیگم عابدہ حسین کا تو سارا "ٹکر پانی" ایک روحانی درگاہ اور مذہبی حوالے کا مرہون منت ہے موصوفہ کی ساری دولت' جائیداد' خدا و رسولؐ کا صدقہ اور مذہب کا وسیلہ ہے الٹا وہی کہتی ہیں کہ کہاں کی چادر اور کہاں کا دوپٹہ؟ ظاہر ہے جب بیگم صاحب کے بڑوں نے خانقاہ قائم کی ہو گی اور لوگوں کو اللہ و رسولؐ کی باتیں بتا کر حلقہ عقیدت وارادت قائم کیا ہو گا تو وہ یہ تو نہیں کہتے ہوں گے کہ اسلام میں نماز روزے کی ضرورت نہیں اور پردے اور حجاب کی پابندی نہیں' تبھی لوگوں نے ان کی طرف رجوع کیا ہو گا' پھر نذرانے بھی جمع ہوئے ہوں گے' ہدیے بھی ملے ہوں گے' لوگوں نے لنگر کے لئے زمینیں بھی وقف کی ہوں گی' غرضیکہ یہ سارا شاہی طمطراق مذہب کے توسط سے بنا ہے یہ عجیب نفسیاتی کیفیت ہے کہ جب روٹی روزگار کی فکر دور ہو گئی' تو پسماندگان نے اسی مذہب کو ہدف بنا لیا جو بڑوں کے لئے ذریعۂ عزت بھی تھا' اور وسیلۂ معیشت بھی! میں یہ کبھی بھی نہیں کہتا کہ ساری شرافت اور مذہبیت فقط

Marfat.com

دوپٹہ اوڑھنے میں ہے لیکن یہ بات بھی ماننے کے قابل نہیں کہ ساری ترقی اور کامیابی عورت کے کھلے بالوں کا صدقہ ہے' اس کے لئے کوئی دلیل چاہئے۔

دوپٹہ علامت ہے عورت کے مزاج کی شائستگی اور تہذیب مشرق سے وابستگی کی' اس علامت کے خلاف مہم چلانے کی آخر افادیت کیا ہے؟

اور کرنے والے تھوڑے کام ہیں کہ انہیں مؤخر کرکے دوپٹہ اتارو مہم کا آغاز کردیا جائے جس مہم سے نہ دینی خیر وابستہ ہے اور نہ معاشرتی بھلائی' جب کہ موصوفہ تو سماجی بہبود کی وزیر ہیں۔ "بہبودی" اور "بیہودگی" میں زمین آسمان کا فرق ہے کم از کم ایک وزیر کو اسے ملحوظ رکھنا چاہئے۔

(20 ستمبر 1997ء)

Marfat.com

تواضع زگردن فرازاں نکوست

روز و شب حکومت اور حکومت کے ابلاغی ادارے معاشی بدحالی اور ملکی خزانے کے خالی ہونے کی جو ہولناک تصویر پیش کر رہے ہیں' اسے دیکھ دیکھ کر دل ہول کھاتا ہے کہ آخر ہوا کیا ہے؟ کیا بادلوں نے برسنا بند کر دیا ہے؟ زمین نے کھیت اگانے سے انکار کر دیا ہے؟ دریا پانی کا بہاؤ بھول گئے ہیں؟ پوری دنیا نے ہمارا معاشی مقاطعہ کر رکھا ہے؟ ایسی غربت اور ایسا افلاس جو قحط کی حدوں کو چھونے لگا ہے اس کا سبب کیا ہے؟ ہم جیسے کم فہم لوگوں کو جواب دینے اور بے صبرے عوام کا منہ بند کرنے کے لئے ہر حکومت کے پاس ایک ہی جواز ہوتا ہے کہ پچھلی حکومت نے معیشت کا بیڑا غرق کر دیا تھا' لیکن یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے' کہ اس قدر اقتصاری زبوں حالی کے باعث کسی حکومت کے عیش و عشرت میں کیا کمی واقع ہوئی ہے؟ پروٹوکول کتنا کم ہوا؟ دوروں کا کروفر کتنا گھٹا؟ دفتروں کی شان و شوکت کس قدر ماند پڑی؟ پرسنل سٹاف کی کیا چھانٹی ہوئی؟ گاڑیوں کی ریل پیل کا کیا بنا؟ اور شاہانہ ضیافتوں کے بجٹ میں کتنی کٹوتی ہوئی؟ ممکن ہے شلغم کی مٹی جھاڑنے کے برابر کچھ اصلاحات ہوئی ہوں لیکن صورتحال کسی اشک شوئی کی نہیں ایمرجنسی کا تقاضا کر رہی ہے' بین الاقوامی ادارے اور عوام کے جائزے نہیں بلکہ خود حکومت جو اعداد و شمار پیش کرتی ہے' انہیں دیکھ کر تو خیال آتا ہے کہ حکمرانوں کی نیندیں اچاٹ ہو گئی ہوں گی' انہوں نے پلنگ الٹ دیئے ہوں گے' بڑے بڑے ایوانوں میں بلیک آؤٹ کا سماں ہو گا' کھانا پینا دال چٹنی تک محدود ہو گیا ہو گا' اور اوڑھنا بچھونا بس نام کا ہو گا' لیکن امر واقعہ اس سے بالکل مختلف ہے' اخباری بیانات اور عوامی تقاریر سے ہٹ کر غور کیا جائے اور حکمرانوں اور افسروں کی بود و باش دیکھی جائے' تو قطعاً اندازہ نہیں ہوتا' کہ خزانہ خالی ہے' قرضوں کا بوجھ اونٹ کی کمر پر آخری تنکے کے برابر ہے ہر چیز ادھار کی ہے' تنخواہیں دینے کے لئے نوٹ چھاپنے پڑتے ہیں' سود کی قسط ادا کرنے کے لئے مزید قرض لیا جاتا ہے اور روز مرہ اخراجات کے لئے اپنے ہی بنکوں سے ادھار مانگا جاتا ہے' ممکن ہے ہمارا دماغ چل گیا ہو اور گرمیوں کے باعث سرکا ناریل چیخ گیا ہو' مگر اس کا کیا علاج کہ ایوان صدر اور

Marfat.com

وزیر اعظم ہاؤس ان دو گھروں پر سالانہ ایک ارب ستر کروڑ روپیہ خرچ اٹھتا ہے' ہم کیسے مان لیں کہ یہ انتہائی مفلس اور مقروض ملک کا ایوان صدر اور وزیر اعظم ہاؤس ہے' عوام کو سادگی کا درس دینے کے بجائے گردن فرازوں سے سادگی اچھی لگتی ہے کوئی فقیر چیتھڑے اوڑھ لے تو اس کی سادگی سے کون متاثر ہو گا؟ ہاں صدر مملکت ناگزیر سرکاری فرائض پر اٹھنے والے اخراجات کے علاوہ باقی تمام آسائشوں سے دستبردار ہو جائیں' اور ان کی دستبرداری نظر آئے تو اسے شان سادگی کہا جائے گا' وزیر اعظم "فقیر اعظم" بن کر دکھائیں تو لوگوں کو اعتبار آئے گا کہ ہاں ملک کی معاشی حالت ناگفتہ بہ ہے' جب کہ بڑوں کا اندازِ زیست یہ ہے کہ ان کی ذاتی جائیداد کسی شاہی خانوادے کی چغلی کھاتی ہے' ان کی شاپنگ مغلیہ دور کو مات دیتی ہے' اور ان کی گاڑیاں کسی غریب کی نظر پڑنے سے میلی ہو جاتی ہیں' صدر مملکت سرکاری خرچ پر ہفتے میں تین روز اپنے آبائی قصبے میں چھٹیاں مناتے ہیں' وزیر اعظم ہفتے میں ایک دو روز ضرور لاہور گھر کا چکر لگاتے ہیں حالانکہ کلنٹن جیسے صدر بھی مہینوں بعد باقاعدہ چھٹی لے کر اپنے آبائی علاقے یا کسی تفریحی مقام پر جاتے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ جب چاہا پوری حکومت مری پہنچ گئی یا پورا ایوان صدر فورٹ مزو منتقل ہو گیا' دراصل جب سے حکومت اور شان و شوکت کو منتھی کیا گیا ہے اس دن سے یہ خرابی پیدا ہوئی ہے' حالانکہ صدر ہر جا کہ بہ نشیند صدر است' صدر ہوں' وزیر اعظم ہوں' گورنر ہوں یا وزیر اعلیٰ یہ لوگ جھونپڑے میں رہیں تو بھی انہیں اختیارات کے مالک رہیں گے' کھدر پہن لیں تو بھی عہدے کی شان و شوکت برقرار رہے گی' حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ رات کو کام کے دوران تھک جاتے ہیں' وزیر اعظم بھی ساتھ بیٹھے ہیں سونے کے لئے اٹھتے ہیں تو خود ہی جا کر چراغ بجھاتے ہیں' وزیر اعظم نے کہا کسی ملازم سے فرمایا ہوتا آپ نے ارشاد فرمایا جب میں کام کر رہا تھا تو بھی امیر المومنین تھا' چراغ بجھانے اٹھا تو بھی وہی رہا اور اب سونے لگا ہوں تو بھی خلیفتہ المسلمین ہوں اس سے کیا فرق پڑتا ہے' وہ عمر بن عبدالعزیزؒ تھے جنہیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن ہمارے حکمرانوں کو یقیناً فرق پڑتا ہے تبھی تو وہ اپنا انداز شاہانہ رکھنا چاہتے ہیں' وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ بڑا آدمی اچھے اور قیمتی لباس سے بنتا ہے' اونچے گھر میں رہنے سے قد بڑھتا ہے' لمبی گاڑی ہی اختیارات کا سرچشمہ ہے' یہ لپکا تیسری دنیا کے حکمرانوں اور بالخصوص ہمارے حکمرانوں کو کچھ زیادہ ہی ہے' ترقی یافتہ ممالک کے صدر' گورنر جنرل' وزیر اعظم بہت حد تک ان چیزوں سے بے نیاز ہوتے ہیں چین کے ہمہ مقتدر وزیر اعظم' ماؤ کے معتمد اعلیٰ اور دانشور اور مدبر چو این لائی کا کوٹ پتلون پیوند لگا ہوتا تھا انہیں کبھی

احساس کمتری لاحق نہیں ہوا' ان کا وہ کوٹ وہ پتلون اور بوٹ آج بھی بیجنگ کے میوزیم میں موجود ہیں' پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خاں نواب تھے' لیکن ان کی شیروانی بھی ہمیشہ پیوند آشنا رہی' شہادت کے وقت ان کی جیب سے صرف تیرہ روپے نکلے اور بنک میں ایک دھیلہ بھی نہیں' آج حکمران اور افسر اپنا بنک بیلنس ملاحظہ کر سکتے ہیں اور دل کڑا کرکے عوام کو بتادیں کہ بیرون اور اندرون ملک ان کے جمع شدہ زر کثیر کا کیا عالم ہے؟ تیسری دنیا میں بھی بعض حکمران رہے ہیں جو احساس کمتری کے مریض نہیں تھے الجزائر کے بن بیلا فرانس کے استعماری دور کے شاہی محل کے بجائے چھوٹے سے کوارٹر میں رہتے تھے اور برملا کہتے تھے کہ محل میری ضروریات سے بہت زیادہ ہے' یہاں پولو گراؤنڈ بنوائے بغیر ہمارے حکمرانوں کی تسلی نہیں ہوتی' ہمارا دشمن ملک ہی سہی بھارت کو دیکھ لیا جائے' کیا وہاں پجیرو کی کھیپ نظر آتی ہے؟ مرسڈیز گاڑیوں کی قطاریں ہیں؟ وہاں کے افسروں کی سج دھج ہمارے افسروں جیسی ہے؟ ہرگز نہیں' آج بنگلہ دیش معاشی اعتبار سے ہم سے بہتر پوزیشن میں ہے اس کے فارن ریزروز ہم سے زیادہ ہیں' جب کہ بنگلہ دیش تو بھارت کے نرغے میں رہا' ہمیشہ آفات کی زد میں رہتا ہے' اس کے باوجود وہ ہم سے بہتر ہے اس کی شرح خواندگی ہم سے زیادہ ہے' ہمارا سارا زور نمود و نمائش پر ہے' ہمیں ہر ماہ گاڑی کا ماڈل بدلنے کا چسکا ہے' ہمیں دولت مند نظر آنے کا ہوکا ہے' ہمیں "مختار کل" دکھائی دینے کا لپکا ہے' ہمیں قرون وسطیٰ کے "شہنشاہ" بن کر دوسروں سے منوانے کا نشہ ہے' جب تک یہ لپکا نہیں اترے گا اور نشہ نہیں ٹوٹے گا' ہم معاشی استحکام حاصل نہیں کرپائیں گے' اس میں کیا حرج ہے کہ حکومت کو دو سال کے لئے معاشی ایمرجنسی کا اعلان کردے کفاف اور ضرورت سے زائد ہر چیز پر پابندی لگادے' قوموں پر ایسے وقت آتے رہتے ہیں' اور گزر بھی جاتے ہیں' گدائی کے زور پر شاہی کے مزے لوٹنا حماقت اور شقاوت نہیں تو اور کیا ہے؟

(5 اگست 1997ء)

اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش!

ہم بچپن میں بڑے بوڑھوں سے یہی سنتے تھے کہ اگر کہیں خون ناحق ہو' تو پورا افق سرخ ہو جاتا ہے' کالی آندھی آجاتی ہے اور ایک عرصے تک لوگ بارش کی ایک بوند کو ترس جاتے ہیں' لیکن ہماری دھرتی نہ معلوم کن ذراتِ خاک سے مرکب ہے کہ یہاں درجن بھر لوگ ایک ہی شنجون میں مارے جاتے ہیں' اور ایک ہفتہ نہیں ہو پاتا کہ پھر اسی طرح ایک کارروائی میں سرزمین وطن خون سے لتھڑ جاتی ہے مگر نہ تو افق سرخ ہوتا ہے' نہ سیاہ آندھی آتی ہے اور نہ ہی بارش میں کوئی وقفہ اور ناغہ! کجا کہ لوگ پانی کی بوند بوند کو ترسیں' یہ خوں فشانی اور حیات ارزانی ایک معمول سا بن چلا ہے' لیکن حال ہی میں دو واقعات نے ہر اس شخص کو لرزا کر رکھ دیا ہے جس کی آنکھوں میں پتلیاں ابھی گردش کرتی ہیں' سینے میں دل کی جگہ پارۂ سنگ نصب نہیں ہوا اور سرخ خون پر سفیدی غالب نہیں آگئی' ایک کراچی میں سپاہ صحابہ کی ریلی پر وحشیانہ فائرنگ اور دوسرے میلسی میں مجلس عزا پر گولیوں کی بارش' ان دونوں واقعات میں لگ بھگ تیس افراد جان ہار گئے ہیں اور درجنوں کے حساب سے مفلوج و معذور ہو گئے ہیں' ان دونوں واقعات کے سیاق و سباق میں سپاہ صحابہ اور سپاہ محمد کا نام آرہا ہے اور انتظامیہ نے بھی انہیں کا نام لیا ہے' لیکن ہم آج بھی اس بات پر مصر ہیں' کہ یہ اور اس سے ملتی جلتی تمام کارروائیاں اُس ''خفیہ ذہن'' کی منصوبہ بندی اور ''پوشیدہ ہاتھ'' کی حرکت ہے' جو ایسی ''کرامات'' دکھانے میں ماہر ہے کہ جو قتل تو کرتا ہے مگر نہ تو خنجر پر کوئی دھبہ لگنے دیتا ہے اور نہ دامن پہ کوئی چھینٹ چھوڑتا ہے' نیز اس انسانیت سوز واقعے میں وہ ہاتھ بھی پوری طرح ملوث ہے جو نہیں چاہتا کہ جہادِ کشمیر اپنے منطقی انجام سے ہمکنار ہو' جونہی کشمیر میں تحریکی لے تیز ہوتی ہے یہاں وطن عزیز میں تخریبی لے بھی تیز ہو جاتی ہے۔ تاہم یہ سارا پس منظر ذہن میں رکھنے کے باوجود لوگوں کی ایک بڑی تعداد جن کا سارا مبلغ علم اخبار بینی' اور غیر ملکی نشریات کی انٹ شنٹ خبریں ہے وہ بہرحال سپاہ صحابہ اور سپاہ محمد کا نام درمیان میں آتے ہی اس پراپیگنڈے کا ضرور شکار ہو جاتے ہیں' جو اس وقت بین الاقوامی ٹی وی چینلز' پر زوروں پر ہے' کہ ہر وہ شخص جو خود کو مذہب سے مختص کرتا ہے' اسلام کے نفاذ کی بات کرتا ہے' داڑھی رکھتا

Marfat.com

ہے' اور شعائر اسلامی کا پابند ہے وہ انتہا پسند' جنگجو' بنیاد پرست اور دہشت گرد ہے' آج برطانیہ ہو' جرمنی ہو' فرانس ہو' یا امریکہ' ہر اس شخص کے لئے وہاں رہنا' جینا' اور کام کرنا محال کر دیا گیا ہے جو باریش ہو' یا کہیں نماز پڑھتا ہوا' پکڑا جائے' اس پراپیگنڈے کی کراہت اپنی جگہ' لیکن کچھ مواقع یقیناً ہم نے بھی انہیں فراہم کئے ہیں جن کے باعث وہ تہمت دھرنے میں بے باک ہو گئے ہیں' اسی لئے رسول صادق و مصدوق ﷺ نے فرمایا ہے۔ اتقوا مواقع التہم (تہمت کی جگھوں سے بچو) ایک شخص پر دوسرے چوتھے روز چنڈوخانے سے نکلتا ہوا ملے' یا روزانہ سنیما گھر کے سامنے ٹہلتا ہوا نظر آئے' خواہ وہ چنڈوخانے میں تبلیغ کرنے جاتا ہو اور سنیما گھر کے سامنے محض ہوا خوری کے لئے گزرتا ہو' لیکن وہ اپنا دامن آلودگی تہمت سے کبھی بھی نہیں بچا سکے گا' ہر شخص کے ذہن میں کسی بات کی ایک ہی مراد نہیں ڈالی جا سکتی' "جتنے منہ اتنی باتیں" جیسے محاورے ایسے ہی پس منظر میں وضع ہوتے ہیں' چونکہ ماضی میں فریقین کے کچھ افراد اس طرح کے خونیں واقعات میں ملوث پائے گئے اور وہ افراد خواہ دونوں تنظیموں کے قائدین کی نظر میں کتنے ناپسندیدہ کیوں نہ ہوں بہرحال ان کا تعلق ان سے رہا ہے اس لئے دونوں گروہ لاکھ اخباری تردیدی بیان جاری کریں' پبلک اس پر اعتماد نہیں کرتی اور لامحالہ یہ تنظیمیں اندرون اور بیرون ملک قتل و دہشت کے حوالے سے معروف ہو گئی ہیں' یہ کوئی قابل فخر تمغہ نہیں جسے ضرور سینے پر سجا کر رکھا جائے' آخر اسی ملک میں دوسری دینی تنظیمیں (اور جو فعال سیاسی جماعتیں بھی ہیں) موجود ہیں ان کی طرف کوئی انگلی نہیں اٹھاتا' ہمیں صرف ایک بات سے دلچسپی ہے کہ اس طرح کے واقعات میں چونکہ منبر و محراب کی آبرو لٹ رہی ہے اور بچا کچھا مذہبی وقار اجڑ رہا ہے اس لئے ہر اس موقع سے گریز ضروری ہے جو تہمت کا موجب بن سکے' ایک تیسری شرپسند قوت اگر ان دونوں تنظیموں کی دبی ہوئی باہمی نفرت کی چنگاریوں کو ہوا دے کر شعلہ بنا رہی ہے تو بھی انکے لئے غور طلب مقام ہے کہ اس وطن دشمن قوت کو اپنے لئے نرم گوشہ (Soft Corner) انہی میں کیوں نظر آتا ہے کہ وہ ان کا نام استعمال کرتی ہے؟

دونوں فریق چونکہ مذہبی حوالے سے مشخص اور متعارف ہیں اس لئے ان سے یہ گزارش بیجا نہ ہو گی کہ خدارا' اس بین الاقوامی سازشی قوت کا ادراک کیجئے' جو اسلامی قوتوں اور تحریکوں اور شخصیات کے خلاف اپنا گھیرا روز بروز تنگ کرتی جا رہی ہے اور اہل اسلام کو دنیا کے ہر میدان میں ـام کرنے پر تلی ہوئی ہے' وہ قوت دنیا کے ہر گوشے میں ان واقعات کے ذریعے یہ تاثر دنیا اور

Marfat.com

ثابت کرنا چاہتی ہے کہ اسلام ہے ہی ایک "جنگجو مذہب" اور اس کے پیروکار دہشت گرد اور تشدد پسند! کل کلاں ان کے ہاتھ میں اگر سیاسی قیادت آگئی تو یہ ہر ایک سے آزادی ضمیر و عقیدہ چھین لیں گے' یہ اپنے اوپر ہر ایک کا خون مباح قرار دے دیں گے' اور دنیا کے چار کونے فساد اور تشدد سے بھر دیں گے' کہیں ایسا تو نہیں ہو رہا کہ ان کارروائیوں کی مجرم بھی وہی دشمن اسلام قوت ہو لیکن بعد میں وہ خود ہی مدعی بھی بن جائے' گواہ بھی اور عادل و منصف بھی! ایسے میں ہم اہل اسلام کہاں کھڑے ہوں گے؟ اور تاریخ ہمارے لئے کیا مقام متعین کرے گی؟ یہ باتیں علماء اسلام ہی اپنی تقریروں میں لوگوں کو بتاتے ہیں' کہ ہم اس نبیؐ کے نام لیوا ہیں جن کے ہاتھ پر عمر بھر کسی دشمن جاں کے لہو کا داغ نہیں لگا' جن کی تلوار کسی سے انتقام کی غرض سے نیام سے نہیں نکلی' جن کے ہاتھوں برپا ہونے والا انقلاب دارِ ارقم سے فتح مکہ تک کا سفر اس شان سے طے کرتا ہے کہ کم سے کم خون بہانے کی نوبت آئی' جس رسول رحمت نے نجران کے عیسائی وفد کو اپنا ذاتی مہمان بنا کر مسجد نبوی میں ٹھہرایا تھا' اور انہیں ان کے عقیدے کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت دی تھی' جس پیغمبر امن آشتی نے فتح مکہ کے دن عفو عام کا اعلان کیا تھا' اور اپنے اور اسلام کے بدترین دشمن کے گھر کو "دار الامن" قرار دیا تھا۔

یہ ساری باتیں علماء ہی نے لوگوں کو سنائی اور ذہن نشین کرائی ہیں لیکن جب عوام ان باتوں کے برعکس اہل مذہب کا طرز عمل دیکھتے ہیں تو انصاف کے ہر تقاضے کے مطابق عوام کو سنگین سے سنگین بدگمانی رکھنے کا حق دینا پڑتا ہے' اول تو اس کا بھی کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے فرقے کے علماء اور رہنماؤں کو عقیدے کے اختلاف کی بناء پر قتل کرتا پھرے لیکن ایک عوامی ریلی اور ایک عوامی مجلس پر اندھا دھند فائرنگ کا ارتکاب تو صرف وہی کر سکتا ہے' جو چاروں کھونٹ دائرہ انسانیت اور حلقۂ اسلام سے خارج ہو' اور جسے آخرت میں اپنے کندھے پر خون ناحق کے لدے ہوئے بوجھ کی رتی بھر پروانہ ہو' اگر وہ اتنا ہی بے باک اور جری ہے' تو ایسے شخص یا اشخاص سے کھلی برأت کا اظہار کرنے میں کیا تامل ہو سکتا ہے؟ اور دونوں فریق مل کر ایسے افراد کی سرکوبی کریں جو ہر اعتبار سے ننگ انسانیت اور مذہب کے دامن پر داغ ملامت ہیں۔

اگر کوئی فرد یا گروہ یہ حرکت حضرت ابو بکرؓ کی محبت میں سرشار ہو کر کرتا ہے تو کل قیامت میں حضرت ابو بکرؓ اس سے سب سے پہلے اظہارِ برأت کرنے والے ہوں گے اور اگر کوئی حب علیؓ سے مغلوب ہو کر ایسا کرتا ہے۔ تو اسے حضرتِ علیؓ کے جھنڈے کا سایہ کبھی نصیب نہیں ہو سکے گا

Marfat.com

اس لئے کہ یہ تمام حرکتیں اسوۂ ابو بکرؓ و علیؓ کے منافی ہیں' امت کے ابھرتے ہوئے مستقبل کو ڈبونے والے' اسلامی احیائی تحریکوں کی پیش رفت کو پسپائی میں بدلنے والے' اسلام کے روشن چہرے کو پر چھائیوں سے ڈھانپنے والے' اہل کفر کی مشکلات کو آسان کرنے والے' جہادی جذبوں سے سرشار افراد کو دنیا بھر کے سامنے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے کرنے والے' اور غریب الغرباء رجال دین کو اور بھی تنہا کرنے والے ابو بکرؓ و علیؓ کی محبت سے سرشار نہیں کسی بین الاقوامی سازش میں گرفتار معلوم ہوتے ہیں۔

دونوں تنظیمیں اگر کھلے عام اسلام کے نام پر اور اہل اسلام کے ناموس کے لئے یہ اعلان کر دیں کہ ہماری آپس میں کوئی جنگ نہیں ہے' ہمارا میدان جنگ صرف علمی میدان ہے' ہمارے ہتھیار صرف دلائل ہیں اور ہمارا اسلحہ صرف ہماری کتابیں ہیں' تو زیر نقاب چہرہ فوراً سامنے آجائے گا صرف ان تنظیموں نے اپنی اپنی اوٹ ہٹانے کا کام کرنا ہے' ان کی اوٹ میں جو کھیل کھیلا جا رہا ہے' یہ کسی سنی شیعہ کا کھیل ہو ہی نہیں سکتا' یہ کھیل صرف وہی طاقتیں کھیل رہی ہیں جن کی نفسیات میں آج بھی صلیبی جنگیں گڑی ہوئی ہیں' اور ان کے بدلہ لینے کی نفسیات انہیں نت نئی اکساہٹیں دیتی رہتی ہیں' دین تو بقول پیغمبرؐ دانائی (الحکمتہ) کا دوسرا نام ہے اور آج رجال دین کی دانائی کا امتحان ہے۔

(27 اگست 1996ء)

ہماری صحافت اور شکوۂ اربابِ وفا

واقعہ یہ ہے کہ صحافت آج کے دور میں محض لکھت پڑھت کا نام نہیں رہا بلکہ یہ قصر والدین سے لے کر خاک افتادگان تک کی سیاسی و سماجی ضرورت بن چکی ہے اس لئے اس کے اثرات ہمہ گیر بھی ہیں اور دور رس بھی! اور اسی باعث اس شعبے کی ذمہ داریاں بھی بہت بڑھ گئی ہیں' لاکھوں مربع میل پر پھیلی ہوئی دنیا اور اربوں انسانوں پر مشتمل آبادی نے جب سے خود کو "گلوبل ویلج" میں تبدیل کیا ہے اسی لمحے سے ابلاغ اور اس کے ذرائع کو بے حد اہمیت حاصل ہو گئی ہے' اب یہ ممکن نہیں رہا کہ کوئی "مغل اعظم" کسی "انار کلی" کو دیوار میں چنوادے' اور کسی کو خبر تک نہ ہو' اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کوئی تخت نشین ایک شاہی فرمان کے ذریعے اپنے پالنا جھولتے نور چشم کو اپنا وارث سلطنت اور جانشین نامزد کر دے اور رعایا پر اس کی اطاعت واجب اور شیر خوار بچے کا حق حکمرانی ثابت ہو جائے یہ صحافت کا بہت بڑا کنٹری بیوشن ہے کہ اس نے رائے عامہ کی آنکھوں سے پٹی اتاری ہے اور کانوں سے کاگ نکال دیئے ہیں اب کو رات کے اندھیرے میں چکنے سیاہ پتھر پر رینگنے والی چیونٹی نظر بھی آجاتی ہے اور اس کی آہٹ بھی سنائی دیتی ہے' اگلے وقتوں میں تو ہاتھی کسی کو روند کر چلا جاتا تھا نہ کوئی اس کی چنگاڑ سن پاتا اور نہ اس کی لتاڑ دیکھ پاتا تھا آج صحافت لوگوں کی بصارت اور سماعت کا مترادف بن چکی ہے' ہماری جمہوری مملکت کے تین ستون جس زبوں حالی کا شکار ہیں اہل دانش و بصیرت اس سے بخوبی آگاہ ہیں چوتھے ستون یعنی صحافت کی بدحالی کے اسباب بھی وہی ہیں جنھوں نے انتظامیہ کو کام چور اور بد عنوان' مقننہ کو بازیچۂ اطفال اور میوزیکل چیئر اور عدلیہ کو زیر بار اور روبہ زوال کر رکھا ہے' صحافت پہلے تین ستونوں کی کمزوری سے پیدا ہونے والی صورتحال کا تنہا کیسے مقابلہ کر سکتی ہے' تاہم گناہوں کے سمندروں میں نیکیوں کے جزیرے ہر دور میں پائے اور ہر شعبے میں موجود ہوتے ہیں' سنجیدہ صحافت آج بھی خون جگر سے مثبت اقدار اور حیات بخش پیغام کے بوٹے پال رہی ہے' اور باکردار صحافی آج بھی ضمیر کا علم اٹھائے فراعنۂ مصر کے سامنے کلمۂ حق کہنے میں مصروف ہیں قلم کی حرمت کے لئے سر قلم

کرانے کی مثالیں ابھی باقی ہیں' یا ضمیر صحافی سچ اور پورے سچ کی خاطر اپنی ترقیوں اور ملازمتوں کو خطرے میں ڈال لیتے ہیں' جری اور بے باک مالکان جرائد حکومت سے اشتہارات کی بندش اور ڈیکلریشن کی منسوخی تک کے خطرات مول لے لیتے ہیں اسی طرح جرأت منداور پیشہ ورانہ امانت کے حامل رپورٹر بھی صحیح خبریں لانے کے لئے جنگ زدہ علاقوں میں بے خوف و خطر گھس جاتے ہیں جان سے جانے یا زخم کھانے کو خاطر میں نہیں لاتے محکمانہ بدعنوانیوں اور اخلاقی سکینڈلوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش میں خاموشی سے کسی "حادثے" کا شکار ہو جانے کی پروا بھی نہیں کرتے۔

لیکن صحافتی تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے کاش وہ بھی رخ زیبا ہوتا اس وقت ہمارا معاشرتی نظام اور ہمارا سیاسی استحکام جس گردابِ بلا میں ہے سب سے زیادہ اس کا اندازہ اہل خبرو نظر یعنی اربابِ صحافت کو ہے اور ہونا چاہئے لیکن کیا ہمارا مجموعی صحافتی کردار اپنی معاشرتی و سیاسی تنظیم کو اس بھنور سے نکالنے کے لئے ادا ہو رہا ہے' یا دو چار اور غوطے دینے میں لگا ہوا ہے؟

ہمارے خیال میں جس شخص کو پہلی بار کوئی خبر یا اطلاع دینے کی سوجھی ہو گی اس کے سامنے ایک مشنری سوچ ہو گی مگر جب سے صحافت نے ترقی پا کر خود کو انڈسٹری کی سطح پر پہنچایا یوں معلوم ہوتا ہے کہ ترجیحات بالکل الٹ کر رہ گئی ہیں' ماضی قریب میں صحافت کے حوالے سے کتنے عظیم الشان اور لائق احترام نام ہیں جب بھی لب پر آتے ہیں بے اختیار سر تعظیم کو جھک جاتے ہیں' جمال الدین افغانیؒ "العروۃ الوثقیٰ" کے مدیر' ان کا پرچہ کیا تھا' ایک شعلۂ جوالہ تھا۔

سرسید احمد خانؒ نے "تہذیب الاخلاق" کے ذریعے نسل نو کی ذہنی نشوونما کا کام لیا' محض تفریح طبع ان کا مقصد نہیں تھا۔

مولانا ابو الکلام آزادؒ کا "الہلال" اور "البلاغ" صور اسرافیل کی طرح برصغیر ہند میں گونجا' مولانا ظفر علی خانؒ کا "زمیندار" محض صحافتی و سیاسی مجلہ نہیں ایک للکار اور ایک پکار تھا' لیکن یہ سبھی لوگ اس مشن میں فاقے لے کر کال کوٹھڑی تک پہنچے لیکن اب اس راستے میں کوئی فاقہ نہیں آتا' اور کال کوٹھڑی کی جگہ طویل و عریض کوٹھی میسر آجاتی ہے۔

ایک زمانہ تھا اور وہ بہت زیادہ دور کا بھی نہیں' جب کوئی مالک اور مدیر کسی عورت کے اغوا کی خبر چھاپنا جرم سمجھتا تھا' اب یہی خبریں اخبارات کے دو تہائی اور انتہائی اہم حصوں پر غالب ہوتی ہیں خبر کی آڑ میں پوری منظر کشی اور الفاظ کے پردے میں کامل ہیجان انگیزی اس پر مستزاد! آخر یہ انقلاب معکوس کیوں کر برپا ہوا؟ بعض صحافتی سیانے یہ کہتے ہیں کہ جب سے "پروفیشنل جرنلزم"

Marfat.com

کی اصطلاح وضع ہوئی ہے تب سے صحافت ایک پیشہ بن گئی ہے' اور پیشے میں پیسے کو دیکھا جاتا ہے' کسی بات کے ایسے ویسے ہونے کا خیال نہیں کیا جاتا' خبر بس خبر ہے اگر چٹ پٹی ہے تو اسے ہر حال میں شائع ہونا چاہئے' خواہ کسی کے آئینہ عزت میں بال آئے یا کسی کے دل پاک باز میں ملال اترے۔

اس سوال کا جواب غالباً یہی ہو گا اور دیا جاتا ہے کہ ہم کیا کریں قارئین جو پڑھنا اور دیکھنا چاہتے ہیں ہم تو دراصل ان کی رائے کا عکس اور پسند کا مظہر ہیں' اور زیڈ اے سلہری جیسے بزرگ صحافی تک یہ کہتے ہوئے پھسل جاتے ہیں کہ "اخبارات" کے لئے کوئی ضابطۂ اخلاق ہونا چاہئے اور نہ کوئی قدغن' سرکولیشن ہی معیار کی ضمانت ہے" اگر واحد معیار یہی ہے تو کل کو ہیروئن فروش بھی کہہ سکتے ہیں کہ عوام کی ڈیمانڈ نہ ہو تو ہمیں ہیروئن بیچنے کی کیا پڑی ہے؟ اتنی قدغنوں' بندشوں اور سزاؤں کے باوجود روز بروز یورپ ہو یا ایشیا نشے کی ڈیمانڈ بڑھ رہی ہے' تو کیا اس پیشے کو جواز عطا کیا جاسکتا ہے؟ ظاہر ہے کوئی بھی معقول اور ہوش مند آدمی اس کی حمائت نہیں کر سکتا' عوام کی ڈیمانڈ واحد معیار اور معیار کی ضمانت نہیں بلکہ یہ صحافت کا فرض ہے کہ وہ اپنے قارئین کا مذاق سنجیدہ اور مزاج پاکیزہ بنائے' ورنہ جو چیز بازار میں دستیاب ہو گی لوگ وہی لیں گے' اس لئے کہ اونچائی چڑھنے کے لئے زور لگتا ہے نیچے لڑھکنے کے لئے صرف ہاتھ پاؤں ڈھیلے کرنے پڑتے ہیں باقی سارا کام کشش ثقل خود کر لیتی ہے' اسی طرح اخلاقی تربیت میں زور لگتا ہے' بگاڑنے میں کسی کوشش کی نہیں صرف چشم پوشی درکار ہوتی ہے باقی مراحل انسان کی حیوانی جبلت خود طے کرا دیتی ہے' تمام علما اور نفسیات دان اس پر متفق ہیں۔

بعض اوقات پورے کا پورا رنگین صفحہ کسی نوخیز ایکٹرس کی تصویر کے لئے وقف ہوتا ہے' کسی بڑے سے بڑے سائنس دان اور مخلص سیاستدان اور ماہر تعلیم کے نصیبوں کبھی اس طرح پورا صفحہ نہیں آتا' آخر یہ طرز صحافت کس کی ڈیمانڈ ہے؟ اور کون سی قومی ضرورت کا حصہ؟ اگر رفتار یہی رہی اور لوگوں کا مزاج اسی طرح بگڑتا رہا تو کل کو "پیپر جرنلزم" کی جگہ صرف "ویڈیو جرنلزم" رہ جائے گی اس لئے اخبار پڑھنے کو کوئی قاری نہیں بچے گا' صرف تصویر دیکھنے والے ناظرین رہ جائیں گے' اس کے اثرات اب آہستہ آہستہ ظاہر ہو رہے ہیں کہ نسل نو کے لئے خالد بن ولیدؓ محمد بن قاسمؒ طارق بن زیادؒ' صلاح الدین ایوبیؒ' نور الدین زنگیؒ' سراج الدولہؒ' سلطان ٹیپوؒ' اقبالؒ' قائداعظمؒ' حسرت موہانیؒ' ظفر علی خانؒ' محمد علی جوہرؒ اور دوسرے اکابر اجنبی بنتے جا رہے ہیں اور محض کھلاڑی اور ایکٹر ہیرو کی جگہ لے رہے ہیں۔

سیاسی خبر اور پالیسی کے حوالے سے تو مالکان اور مدیران پر حکومتی دباؤ ہو سکتا ہے لیکن سنسنی خیزی اور فلمی ماحول پیدا کرنے کے لئے تو کسی حکومت اور بااثر طبقے کا دباؤ نہیں ہے' ہمارے نزدیک ایک ضابطۂ اخلاق انتہائی ضروری ہے اور مالکان و مدیران اس کی پابندی کریں اور اپنے عملے سے پابندی کرائیں' تاکہ کوئی بھی ایسی تصویر جو سفلی جذبات ابھارے اور اخلاقی پستی کا ماحول پیدا کرے اس کی اشاعت سے گریز کیا جائے' اسی طرح لسانی' اور مذہبی گروہوں کو "ہائی لائٹ" کرنے سے گریز برتا جائے خبر نہیں ہو گی تو وہ لوگ خود بخود غارِ فراموشی میں اتر جائیں گے جب انہیں اپنے کارناموں کے صلے میں چمکتی دمکتی سرخیاں ملتی ہیں تو ان کے حوصلے بڑھنے اور ارمان انگڑائی لینے لگتے ہیں' آخر شہرت کس کو اچھی نہیں لگتی۔

اسی طرز کے کسی سنگین واقعہ اور جرم سے ہٹ کر معمول کے جنسی جرائم اور وارداتوں کو کم سے کم کوریج ملنی چاہئے اور جس علاقے میں وقوعہ ہو صرف اسی کے ایڈیشن میں اس کا تذکرہ ہو اور اخبار میں "کرائم کارنر" الگ اور غیر نمایاں ہو' پورے اخبار پر جرائم حاوی اور غالب نظر نہ آئیں اخبار کے قارئین کا ایک مخصوص حلقہ نہیں اخبار سمندر پار بھی جاتا ہے' غیر ملکی سفیر بھی پڑھتے ہیں' اور گھروں میں مائیں' بہنیں اور بیٹیاں بھی پڑھتی ہیں' بالغ مزاج اور کچے ذہن سبھی اپنی اپنی سطح پر اس کا اثر لیتے ہیں' اور یہ اثر ہر مشکل میں منفی ہوتا ہے مثبت ہرگز نہیں۔

صحافت کو فی الواقع تربیت گاہ کا درجہ حاصل ہو' نمائش گاہ کا نہیں کہ ہر چیز سٹال کی زینت بنے اور اس کے خریدار پیدا کئے جائیں' یہ فریضہ قومی بھی ہے اور دینی بھی! معاشرتی بھی ہے اور اخلاقی بھی! اور شخصی بھی ہے اور اجتماعی بھی!

(26 جون 1997ء)

ہم نے جو طرز سخن کی تھی نفس میں ایجاد

فرزانوں کے ہجوم میں چند دیوانے ایک عرصے سے چیختے چلے آرہے ہیں، کہ موجودہ سیاسی نظام بذاتِ خود ایک بہت بڑا مسئلہ اور بے شمار سنگین مسائل پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، لیکن اربابِ عقل و ہوش ہمیشہ اس قدر خود فریب واقع ہوئے ہیں کہ۔

؎ سمجھے نہ جس کی بات اُسے دیوانہ کہہ دیا

ہر بار اہل دانش نے اس چیخ پکار کو محض واویلا قرار دے کر مسترد کر دیا مگر اب وزیر اعظم میاں نواز شریف ایک سے زائد بار کہہ چکے ہیں کہ موجودہ نظام برقرار رہا تو خطرہ ہے شائد ملک برقرار نہ رہ سکے، نیز موجودہ نظام ہی مسائل کی جڑ ہے، جب تک انقلابی تبدیلیاں نہیں لائی جائیں گی، مسائل جوں کے توں، بلکہ روز افزوں رہیں گے۔

یہ بیان کسی دلبرداشتہ دانشور، کسی محروم فلسفی، کسی راندۂ درگاہ سیاست کسی ڈپریشن کے شکار کارکن اور حزبِ مخالف کے کسی فدائی کا نہیں بلکہ ملک کے سب سے بڑے انتظامی کارکن اور حزبِ مخالف کے کسی فدائی کا نہیں بلکہ ملک کے سب سے بڑے انتظامی عہدے پر فائز شخصیت کا ہے جو اس نظام کی پیداوار اور اسی نظام کی برکات کے طفیل وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر پہنچنے والی شخصیت ہے، وزیر اعظم نے یہ بیانات کیوں دیئے؟ جب کہ اسی نظام نے انہیں اس عہدۂ جلیلہ پر پہنچایا، اور اسی نظام کے طفیل انہیں تاریخی مینڈیٹ ملا، ہمارے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ غالباً انہوں نے پہلی بار سنجیدگی سے کچھ کرنے کا ارادہ کیا ہے اور محض وزارتِ عظمیٰ انجوائے کرنا ان کے پیش نظر نہیں، جب بھی کوئی شخص سنجیدگی سے اس نظام کا نوٹس لے گا وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا، کہ موجودہ نظام اب اصلاح کے نہیں تبدیل کرنے کے لائق ہے، اس نظام میں اتنی بار پیوند کاری ہوئی ہے اور اس کی اصلاح کی کوشش ہوئی ہیں، کہ اگر اسے ایک دو چیتھڑے اور ٹانکے گئے تو یہ فقیر کی گدڑی رہ جائے گا۔

اسے یکسر بدل دینے میں عافیت اور عزت ہے، یہ نظام چند سال اور چلا تو نہ صرف یہ کہ کسی کو حکومت کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا، بلکہ اس ملک کی معیشت، سیاست، عزت، اور حمیت سب کچھ راکھ ہو کر رہ جائے گی۔

اس نظام کی پیداوار وزیر اعظم نے جب احتساب کی بات کی اور کچھ اوروں کو چھیڑا تو

Marfat.com

انہیں پتہ چلا' کہ یہاں آوے کا آوا ہی نہیں بلکہ آوے کا باوا بگڑا ہوا ہے' تب انہیں احساس ہوا کہ یہ نظام سوائے کرپشن کے فروغ کے اور کوئی قومی و ملکی خدمت سرانجام نہیں دے رہا۔

گیس اینڈ آئل کارپوریشن کو ہاتھ لگایا' تو رفعت عسکری جیسے لوگ سامنے آئے' بحریہ کو دیکھا ایڈمرل منصور سے پالا پڑا' سٹیل ملز کے معاملات کو پرکھا تو عثمان فاروقی کا مکروہ چہرہ ابھر آیا' مختلف محکموں کو جانچا تو سلمان فاروقی جیسے غلیظ لوگ نشان زد ہوئے یہی حال بینکوں' کارپوریشنوں' وزارتوں اور دیگر ایجنسیوں کا ہے۔

کرپشن کے جواز کے لئے یہ دلیل اب عالمی دلیل بنتی جا رہی ہے اور ہمارے دانشور بڑے زور شور سے اس دلیل کو پیش کرتے ہیں کہ بیروزگاری ہو گی تو کرپشن بھی ہو گی تنخواہ تھوڑی ہو گی تو پھر کرپشن تو ہو گی' مہنگائی ہوگی تو یقیناً کرپشن ہو گی وغیرہ سوال یہ ہے کہ کرپشن کے حوالے سے اب تک جتنے کیس چیف احتساب کمشنر کو پہنچے ہیں' اور انہوں نے جتنے مقدمات ہائی کورٹ کو بھیجے ہیں' اور اب تک اخبارات میں جس کرپشن کی دہائی مچی ہوئی ہے اور جو "پری چہرے" جلوہ افروز ہوئے ہیں ان میں کون سے بیروزگار ہیں؟ کون ہیں جن کی تنخواہیں تھوڑی ہیں؟ کون ہیں جو مراعات سے محروم ہیں؟ اور کون ہیں جنہیں کوئی مجبوری کرپشن کی طرف دھکیلتی ہے؟

مسٹر اکبر لاسی اب تک دو قسطوں میں ایک کروڑ ستانوے لاکھ جمع کرا چکے ہیں' ورنہ قید اور قرقی کا خطرہ تھا لاسی صاحب کو یہ کرپشن کرنے کی کون سی مجبوری لاحق تھی؟ ٹکا اقبال اور ناظم شاہ صوبائی وزراء تھے یہ بیچارے نان جویں کو ترس رہے تھے کہ انہیں خورد برد کرنی پڑی؟ آئی بی کے ڈائریکٹر' جنرل مسعود شریف' کو کیا "عذر شرعی" درپیش تھا کہ وہ بھی غبن اور کرپشن سے باز نہ آئے؟ اس طرح کے بے شمار لوگ خبروں کی زینت بن چکے ہیں' قارئین نے سب کچھ پڑھ لیا ہو گا' کرپشن کی اس دلدل میں وزراء' سفیر' جرنیل' ارکان اسمبلی' بائیس گریڈ کے آفیسرز' بینکوں کے چیئرمین' محکموں کے سربراہ' اور کارپوریشنوں اور ضلع کونسلوں کے مدار المہام سبھی گھٹنوں دھنسے ہوئے ہیں۔ ان کی کرپشن کا کیا جواز ہے؟

دراصل یہ اس مکروہ نظام کا شاخسانہ ہے جس میں حرام کے سرچشمے ابل رہے اور حلال کے سوتے خشک ہو چکے ہیں۔

یہ نظام پہلے عوام کو لتاڑتا' چباتا' اور ڈکارتا رہا ہے' اب اس نے خود مقتدر طبقوں کو ڈسنا اور کاٹنا شروع کر دیا ہے' اس نظام کے سب سے بڑے مبلغ' حامی اور محافظ خود چیخ اٹھے ہیں' کہ یہ رہا تو پھر کچھ بھی نہیں رہے گا' نظام بدلنے کا مقصد یہ ہے کہ برسوں سے جو لکیر پیٹی جا رہی ہے اسے مسلسل پیٹتے چلے جانا کوئی دانش مندی نہیں اور ہر بار یہ کہہ دینا کہ چونکہ ایسا ہوتا چلا

Marfat.com

آرہا ہے اس لئے اب بھی ایسا ہونا چاہئے۔

ہر دوسرے تیسرے سال الیکشن کرا دینا' اور کوئی بھی بنیادی تبدیلی کئے بغیر ہر ایک کو اکھاڑے میں اترنے کی اجازت دے دینا' اور ایک ہی انداز میں ایک ہی خاندان اور ایک ہی قماش کے لوگوں کو وزارتیں سونپ دینا اور ایک ہی انداز میں نظام حکومت چلاتے رہنا آخر یہ کب تک ممکن ہوتا ہے؟ اخلاقی پہلوؤں کو یکسر نظرانداز اور امانت و دیانت کے تقاضوں کو پامال کر کے ملکی و قومی مزاج بگاڑا تو جا سکتا ہے سنوارا نہیں جا سکتا' ہم لوگ احتساب کی بات کرتے تھے تو سارے بااثر طبقات بول اٹھتے کہ الیکشن سب سے بڑا احتساب ہے سوال یہ ہے کہ الیکشن تو ہو چکا گویا احتساب بھی ہو چکا اب یہ احتساب چہ معنی دارد؟

مسٹر آصف زرداری دیوان بالا کے رکن منتخب ہو چکے ہیں' گویا وہ احتساب کی بھٹی سے گزر چکے اگر وہ جنرل الیکشن لڑتے تو بھی وہ جیت جاتے اب ان کا احتساب کیوں ہو رہا ہے؟ ذوالفقار کھوسہ الیکشن جیت کر وزیر بھی بن چکے ہیں ان کے خلاف ریفرنس کا کیا مطلب؟ اسی طرح دوسرے لوگ ہیں' ہر سیاسی جماعت ایک ہی انداز میں خود کو منظم کرتی اور الیکشن لڑتی ہے' برادری تعصبات کا سہارا' دولت کو زینہ بنایا' جاگیرداروں اور صنعتکاروں کو ساتھ ملایا اور الیکشن کا کھیل شروع کر دیا' یہی چیز پچاس سالوں سے دہرائی جا رہی ہے۔

ہماری گزارش یہ ہے کہ اس سے ہٹ کر اور اُٹھ کر کچھ سوچا جائے علم و فضل کو زیر غور لایا جائے' امانت و دیانت کو اہمیت دی جائے' کسی کی ذاتی شرافت اور متعلقہ شعبے میں اس کی اہلیت کو دیکھا جائے' اور نئے قوانین اور نئے رولز بنائے جائیں۔

آخر موجودہ نظام نے اتنے بھاری مینڈیٹ کے باوجود کوئی ایسی رکاوٹ تو کھڑی کی اور تکلیف پہنچائی ہے کہ وزیراعظم تک اسے بدلنے کی بات کرتے ہیں' عام آدمی جو اس نظام کی نحوستوں کا شکار ہے وہ تو اسے بدلنے کی بات کرے وزیراعظم کیوں تنگ ہیں؟ جبکہ اس نظام کی اگر کوئی برکت ہو سکتی ہے تو وہ انہیں مل چکی ہے' گوشۂ قفس کی تنہائی میں دن بسر کرنے والوں نے درد سے کراہ کر جو آہ کی تھی بالآخر

؎ آج گلشن میں وہی طرز فغاں ٹھہری ہے

(23 مئی 1997ء)

Marfat.com

تبدیلیٔ نظام

آج کل تبدیلی نظام کی بات پھر اونچے سروں میں ہو رہی ہے اور جنرل تنویر نقوی نے بڑے صاف لہجے میں اس کا ذکر کیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ کہنے کو تو نو آبادیاتی نظام ختم ہو گیا ہے' لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہوا' انگریزی استعمار نے برصغیر میں اپنے دور حکومت میں جس طرز سیاست کو فروغ دیا' جس تہذیب کو رائج کیا اور حکومت کے جو اصول وضع کئے وہ سب کے سب پوری قوت اور آب و تاب کے ساتھ آج بھی نہ صرف موجود ہیں بلکہ ان کے ساتھ کچھ اور لاحقے بڑھ گئے ہیں' یہاں انگریز کی براہ راست حکومت تو نہیں لیکن Rule By Proxy کا مشاہدہ ہر شخص کر رہا ہے۔

عہد استعمار میں جس طرز سیاست کو رواج دیا گیا اس کا بنیادی ستون ---- جاگیردار قبیلہ ---- تھا' فرنگیوں نے ایک خاصے طبقے کو مخصوص خدمات کے عوض اتنا مضبوط' خوشحال اور مستحکم بنا دیا کہ وہ ریاست اور سیاست کے لئے ناگزیر ہو گیا' اور اس کی ناگزیریت تا ایں دم قائم و دائم ہے' ۱۹۵۱ء کے انتخابات سے لے کر ۱۹۹۷ء کے انتخابات وہی قبیلہ چہرے بدل بدل کر اسمبلیوں میں پہنچتا رہا اور موجودہ نظام سیاست میں اگلے جو بھی الیکشن ہوں گے اسی طبقے کے لوگ پارلیمنٹ پر قابض رہیں گے۔

جس طرح کسی چودھری کے مرنے پر "مصلی" کے بیٹے نے اپنے باپ سے پوچھا تھا کہ اس کے بعد کون چودھری بنے گا؟ باپ نے جواب دیا' چودھری کا بیٹا' سادہ لوح بیٹے نے پھر سوال کیا اگر وہ بھی مر جائے تو پھر کون ہو گا؟ باپ نے کہا' اس کا بیٹا' بیٹے نے ایک بار پھر بھولپن سے استفسار کیا' اور اس کے بعد؟ باپ نے قدرے خفا ہو کر کہا۔ "اس کے بعد کم از کم تم چودھری نہیں بنو گے تم نے مصلی کا بیٹا ہی رہنا ہے۔"

اسی سادہ لوحی کا شکار ہمارا سیاسی ورکر دانشور اور دینی طبقہ ہے جو اس خوش فہمی کا شکار ہے کہ اگر ہم اس نظام کا حصہ بنے رہے' اس نظام کی فکری رہنمائی کرتے رہے اور اس نظام میں

Marfat.com

سرگرمی سے کام کرتے رہے تو ہم بھی بالآخر حاکموں کے قبیلے میں شامل ہو جائیں گے' اسے ہماری کوتاہ نظری کہیے' نارسائی سمجھ لیجئے یا اسرار و رموزِ سیاست سے بے خبری پر محمول کر لیجئے ہماری رائے میں موجودہ سیاست تاریک راہوں کے سفر کے علاوہ کچھ نہیں' نصف صدی سے ان راہوں میں متاعِ دین و دانش لٹ رہی ہے' فلسفہ و منطق کے کئی قافلے غبارِ ناقہ میں گم ہو کر رہ گئے ہیں' سازش ہے' یہ تین قسم کے لوگ سلیمانی ٹوپی پہن کر نہیں پھر رہے کہ کسی کو نظر نہ آئیں یہیں رہتے' بستے اور سیاست کرتے ہیں' لیکن اس نظام نے ان کی حوصلہ شکنی کرنے کے بجائے انہیں خریدنی و فروختنی عمل کا حصہ بنا کر سیاست کا ناگزیر عنصر قرار دے رکھا ہے' کسی کی نیت اور ایمان جانچنے کی ضرورت نہیں لیکن آنکھوں دیکھی بات سے انکار کیسے کیا جائے کہ جو لوگ قومی سلامتی کے فیصلے امریکہ سے پوچھ کر کریں' معاشی پالیسیاں ورلڈ بنک کے مشورے سے بنائیں' یہاں کی تہذیب کو انگریزی کلچر کے قالب میں ڈھالنے کا عزم ظاہر کریں۔ اور اپنی رقوم غیر ملکی بنکوں میں رکھیں اور جائیدادیں دوسرے ملکوں میں خریدیں ان کی وفاداری کا مرکز آج پاکستان کیسے ہے؟ کبھی امریکی صدر' برطانوی وزیراعظم اور جرمن چانسلر نے بھی اپنے نجی اثاثے کسی دوسرے ملک میں منتقل کئے ہیں؟

اسی طرح جو لوگ کھلے عام پاکستان کے اسلامی تشخص کا انکار کرتے اور اپنی پارٹی پالیسی کو--- اسلام--- سے پاک رکھنے کا عذر ظاہر کرتے ہیں' حتیٰ کہ پارلیمنٹ میں رکنیت کا حلف اٹھاتے وقت اس حصے کو اپنی زبان سے ادا نہیں کرتے جس میں اسلام اور نظریۂ پاکستان سے وابستگی اور وفاداری کا عہد شامل ہوتا ہے وہ لوگ کیسے ہمارے "اماماں سیاست" اور "نمائندگان قوم" ہو سکتے ہیں؟

اور بعینہ وہ لوگ جو صرف اور صرف دولت اور جاگیر کے زور پر ہر بار اسمبلی میں اپنی سیٹ محفوظ رکھتے ہیں انہیں اس ملک کے مقدر کا مالک کیوں کر بنایا جا سکتا ہے؟ ایسے لوگوں کو سیاسی نصب العین بجز دولت جمع کرنے اور جاگیر کے ذریعے انتظامی اثر و رسوخ بڑھانے کے اور کیا ہو سکتا ہے؟

نظام کی تبدیلی کا مقصد ایسے لوگوں کو بے اثر کرنا اور ان کے جبڑے توڑنا ہے' جبکہ موجودہ نظام ان کو ریاستی مشینری میں انتہائی مؤثر بناتا اور ان کے جبڑے اور پنجے مضبوط کرتا ہے موجودہ سیاسی نظام اس وقت ان لوگوں کے ہاتھوں بازیچۂ اطفال بلکہ یرغمال بنا ہوا ہے' جن کی ساری سیاسی

تگ و تاز کا واحد اور آخری مقصد عوام پر اپنی شخصی گرفت مضبوط' اور سرکاری اداروں کے ذریعے ذاتی و معاشی مفادات حاصل کرنا ہے۔

ان لوگوں سے سیاست کو آزاد کرانا دوسرے لفظوں میں نظام کی تبدیلی ہے' شخصی کردار و عزیمت کے نقوش ایک ایک قدم پر داستان عبرت بن کر بکھرے پڑے ہیں' اور دستار ہائے فضیلت کے کئی پرزے آج بھی سیاست کی تند و تیز' آندھی میں اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں' ان سب کا حاصل؟ فقط خون آرزو!

وہ اس لئے کہ یہ بساط سیاست جن لہروں کے لئے بچھائی گئی ہے آگے چلنے کا موقع صرف انہیں کو میسر آتا رہے گا' باقی لوگ پٹتے چلے جائیں گے اور مٹتے چلے جائیں گے۔

سادہ سی بات ہے کہ مریض کا کھانا اگر صحت مند آدمی کھائے گا تو کمزور ہو جائے گا' اور تندرست آدمی کی غذا مریض کھائے گا تو ہضم نہیں کرپائے گا' سیاست کے جو اصول انگریز وضع کر گیا ہے اور کامیابی کی جو شرائط وہ طے کر گیا ہے' ان اصولوں پر صرف انگریز کی معنوی اولاد ہی عمل کر سکتی ہے اور ان شرائط کو صرف انگریز کی سیاسی جانشین ہی پورا کر سکتے ہیں' جو دو چار لوگ اِدھر اُدھر سے پارلیمنٹ میں پہنچ جاتے ہیں' اُسے عجوبہ ہی کہا جا سکتا ہے' اسے کلیہ قرار دے لینا انتہا درجے کی سادگی ہے۔

ہمارے دانشور اس عجوبے کو ایک سیاسی کلیے کے طور پر منوانا چاہتے ہیں' اور پوری قوم کو اس راہ پر لگانا چاہتے ہیں' جب کہ پچاس سال سے ان تاریک راہوں کا کوئی مسافر اپنی پونجی بچا کر منزل مقصود تک نہیں پہنچ پایا۔

یہ صورتحال اس وقت تک رہے گی جب تک اس نظام سیاست کو نہیں بدلا جائے گا' نظام سیاست بدلنے سے قطعاً یہ مراد نہیں کہ پارلیمانی طرزِ حکومت کے بجائے صدارتی طرزِ حکومت رائج کیا جائے' وفاق توڑ کرون یونٹ بنایا جائے' ووٹر کی عمر کم یا زیادہ کی جائے' انتخابات بالغ رائے دہی یا متناسب نمائندگی پر کرائے جائیں' چناؤ مخلوط کے بجائے جداگانہ ہو' یا اس کے برعکس' نشستوں کی تعداد بڑھ جائے' صوبوں کی تقسیم نئے سرے سے کی جائے' وغیرہ۔

یہ سب کچھ بخیہ گری اور داغ دوزی ہوگی' کوئی بڑا نتیجہ برآمد ہونے کا امکان نہیں' نظام کی تبدیلی کا مقصد یہ ہے کہ ملک کو اور اس کے تمام اداروں اور مناصب کو ان لوگوں سے پاک کر دیا جائے جن کی وفاداری کا مرکز اس ملک کے بجائے کہیں اور ہے' جنہیں ملک کے اساسی نظریے سے

Marfat.com

اختلاف ہے' جن کی سیاست کا سارے کا سارے اندوختہ زر' جاگیر اور یہ لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں اس کے جواز میں عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ آئین اس کی اجازت دیتا ہے' فلاں چیز قانون کے مطابق ہے' یہ استحقاق انہیں پارلیمنٹ' نے عطا کیا ہے' لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اول تو آئین انہی لوگوں نے بنایا' اسے اکثریت سے منظور کروایا' دوسرے لوگوں کو بھی اپنا ہمنوا بنایا' اور اپنے لئے کچھ حقوق مختص کر لئے' مثلاً آئین میں ہے کہ صدر' وزیراعظم' گورنر اور وزرائے اعلیٰ عدالتی کٹہرے میں کھڑے ہونے اور احتساب سے مستثنیٰ ہیں' آخر کیوں؟ ریفرنڈم کرالیا جائے اور براہ راست عوام سے پوچھ لیا جائے کہ کیا لوگ ان عہدیداروں کو یہ رعائت دینے کے لئے تیار ہیں؟ ہماری ابھی سے رائے ہے کہ عوام کبھی بھی ان اعلیٰ شخصیات کو یہ حق اور رعائت دینے کے لئے تیار نہیں' اگر رسول اکرم ﷺ کسی الٰہی فیصلے اور قرآنی قانون سے مستثنیٰ اور ماوراء نہیں تو یہ لوگ کس باغ کی مولی ہیں؟

اسی طرح مختلف قوانین یہ لوگ اپنی پسند' اور مفاد کے مطابق بنا لیتے ہیں' اور پھر اسے کوئی چیلنج کرے تو جواب میں قانون کا حوالہ دیا جاتا ہے' مثلاً ڈیوٹی فری مرسڈیز گاڑی منگوانے کی رعائت' بال بچوں سمیت بیرون ملک اور اندرون ملک سفر اور علاج کی سہولت وغیرہ اس پر بھی استصواب رائے کرا لیا جائے ساری حقیقت سامنے آجائے گی واضح سی بات ہے کہ یہ لوگ خود ہی اسمبلیوں میں بیٹھے ہوتے ہیں خود ہی قرارداد مرتب اور پیش کرتے ہیں' اسمبلی میں بل لاتے ہیں اور خود ہی منظوری دے کر اسے قانون کا درجہ دے لیتے ہیں' یہی معاملہ تنخواہوں' الاؤنسوں' اور دیگر سہولیات کا ہے' نظام کی تبدیلی کا مطلب یہ ہے کہ اس روش اور اس طریق کار کو تبدیل کیا جائے۔

(3 اکتوبر 1998ء)

Marfat.com

فرزندان قوم۔ "حقیقی ماں" کی تلاش

سیاسی اور مذہبی قیادت ابنائے وطن کے لئے "ماں" کا درجہ رکھتی ہے۔ ماں کی آغوش ہی بچے کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے' ماں کا انداز گفتگو ہی بچے کا لہجہ بنتا ہے۔ اور ماں کی تربیت ہی بچہ کی شخصیت بناتی ہے۔ بشرطیکہ وہ حقیقی ماں ہو۔

حقیقی ماں عمر بھر دکھ سہہ کر بچے کے لئے سکھ ڈھوتی رہتی ہے اپنا خون جگر دے کر اولاد کا رخ نکھارنے میں لگتی رہتی ہے۔ اپنا سنگھار قربان کر کے بچے کا مستقبل سنوارنے کا ہر جتن کرتی ہے اور اگر وہ ماں سوتیلی ہو تو وہ اولاد کے آلام پر ہمیشہ اپنے آرام کو ترجیح دے گی۔ دکھاوے کو لوری بھی دے گی' منہ میں چوسنی بھی ڈالے گی اور دل رکھنے کو بانہوں میں بھی لے گی لیکن اسے حقیقی پیار سے محروم رکھے گی۔ یہی کچھ ہمارے قائدین نے ملک اور قوم کے ساتھ کیا ہے۔ اس میں سیاسی لیڈروں اور دینی رہبروں کی کوئی تخصیص نہیں۔

سیاستدانوں نے خوش کن منشور دیئے' دلربا نعرے لگائے' اپنے اردگرد ہجوم عاشقاں جمع کیا' تقریروں سے مسحور کیا' دل رکھنے کو عوام زندہ باد کہا' اپنے مخالفین کے لئے کارکنوں کے دماغوں کو زہر آلود کیا' جیتے جی جنت کے نقشے کھینچے' دن دیہاڑے خواب دکھائے' الہ دین کا چراغ جلانے کا وعدہ کیا' سب دلدر دور کرنے کا عہد کیا اور ایک ساتھ جینے اور مرنے کا پیمان باندھا لیکن یہ طے کئے رکھا کہ یہ سب کچھ حصول اقتدار کے لئے ہے مقصود نہ تو منشور پر عملدرآمد ہے' نہ چاہنے والوں کی دلداری ہے' نہ ملک کو خوشحال دیکھنا ہے' نہ قوم کی عزت نفس کو بحال کرنا ہے۔ اور نہ ہی وطن کا اعتماد و اعتبار بڑھانا ہے۔

اسی طرح مذہبی رہنماؤں نے اپنے پیروکاروں میں اپنے فرق کے لئے لڑنے مرنے کا جذبہ ابھارا' فقہی جزئیات پر مناظرہ کرنا سکھایا' فروعات پر الجھنے اور بگڑنے کا درس دیا' مسلکی اختلافات رکھنے والوں کی گردن دبوچنے اور سر لینے کو دارین کی فلاح بتایا۔ گیارہویں شریف اور رفع یدین پر الگ مسجد کھڑی کرنے کا فتویٰ دیا' اور بات بات پر مذہبی اختلاف کو ہوا دی' لیکن جو کرنے کا کام تھا وہ

Marfat.com

ہنوز تشنہ اور نامکمل ہے' مذہبی کام تو یہ تھا کہ چہار دانگ عالم میں اہل اسلام کی اخلاقی ساکھ کا شہرہ ہوتا' چہرہ دیکھ کر ہر شخص پکار اٹھتا کہ یہ امت محمدیہ کا فرد جا رہا ہے' دنیا بھر کو سورج کے طلوع و غروب کے نظام الاوقات بدل جانے کا یقین تو ہو جاتا مگر ایک مسلمان کے اپنے وعدے سے پھرنے اور موقف سے ہٹنے کا کبھی گمان بھی نہ گزرتا کعبے کی طرح ہر مسجد "دارالامن" ہوتی' ہر کلمہ گو کے ہاتھ اور اس کی زبان سے دوست تو کجا دشمن تک محفوظ ہوتے۔

اسلام کو ماننے والا ہر شخص اپنے معاملات میں اتنا واضح' راست اور پختہ ہوتا کہ جان کا دشمن بھی کوئی معاہدہ کرتے ہوئے نہ ہچکچاتا۔

ہمارے دینی و سیاسی زعماء اگر فی الواقع فرزندان کے لئے "حقیقی ماں" کا رول ادا کرتے' تو قوم کی تربیت اور افراد کی شخصیت کا یہ نمونہ دنیا کے سامنے آتا' ہر دو قسم کے زعماء نے قوم کے بجائے خود کو نکھارنے اور سنوارنے کا کام لیا۔ اگر کسی سیاسی لیڈر کا گھر ملک اجاڑ کر بھرتا ہے تو اس نے اس سے دریغ نہیں کیا۔ اگر وہ ملک کو بکھیر کر اپنے اردگرد مجمع اکٹھا کرا سکتا ہے تو اس نے یہ بھی کیا۔ اسی طرح کسی مذہبی رہنما کے "قائدانہ چہرے" کو نکھارنے کے لئے اپنے مخالف کے خون سے غازہ کشید ہوتا تھا تو ایسا کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی گئی۔ اگلی صف میں رہنے کا شوق میں اگر مسجدوں کی صفیں درہم برہم کرنا پڑیں تو بھی کر گزرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا گیا۔ آج فرقہ وارانہ آگ جس پیمانے پر بھڑکی ہوئی ہے اور سیاسی منافرت جس عروج پر ہے وہ اسی ذہنیت کا شاخسانہ ہے۔ اگر "ماں" کا انداز یہ ہو تو اولاد کے اطوار پر تعجب کیسا؟

چند بچے ہوں یا پوری قوم' انہیں بگاڑنا کونسا مشکل کام ہے' کٹھن فریضہ تو انہیں سنوارنا اور ڈھب پر لانا ہوتا ہے۔

صحیح مسلم کی ایک روایت ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس دو عورتیں لڑتی جھگڑتی حاضر ہوئیں۔ اور ان کے ہاتھ میں ایک بچہ تھا اور دونوں اس کی ماں ہونے کی دعویدار تھیں' حضرت داؤد علیہ السلام نے دونوں کا موقف سنا' دونوں ہی اپنی جگہ جذباتی اور اپنے دعوے پر مصر تھیں۔ اور آپ کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ بچے کی وارث اور ماں کسے قرار دیں؟ ابھی ان کی تکرار جاری تھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے والد کے پاس حاضر ہوئے آپ نے عورتوں کی تکرار کا سبب پوچھا۔ حضرت داؤد نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام بھی دونوں کی باتیں سن کر پریشان ہو گئے۔ بالآخر آپ کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ حضرت سلیمانؑ نے دونوں کا موقف سن کر فیصلہ دیا اور

Marfat.com

فرمایا' میں چھری سے بچے کے دو ٹکڑے کرتا ہوں' اس طرح دونوں ایک ایک ٹکڑا لے جائیں اس کے علاوہ کوئی حل نہیں۔ جب دونوں عورتوں نے آپ کی زبان سے یہ فیصلہ سنا تو ان میں سے ایک عورت تڑپ اٹھی اور بولی "اے خدا کے پیغمبر یہ بچہ میری حریف کی گود میں دے دیں' اللہ مجھے اور دے گا۔ کسی طرح میرا لال سلامت رہے۔" اس عورت کی یہ پیشکش سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے فوراً کہا "ابا جان" یہ بچہ اس عورت کا ہے اور یہ اس کی حقیقی ماں اور سچی دعویدار ہے" اس روایت کی روشنی میں ہمارے سیاسی و مذہبی قائدین کے کردار کا بخوبی ادراک اور اندازہ ہو جاتا ہے۔

ہمارے یہ پیشوا اپنے کسی دعوے سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں خواہ ملک لخت لخت ہو جائے۔ پاکستان کی اینٹ سے اینٹ بج جائے' اسلام دنیا بھر میں رسوا ہو جائے' امت کا وقار خاک میں مل جائے اور فرزندان توحید ٹکڑوں میں بٹ جائیں' یہ سب کچھ انہیں گوارا ہے۔ لیکن پیشوائی کی مسند سے اترنا اور رہبری کے خول سے نکلنا ان کے لئے سخت دشوار ہے۔

اگر یہ لوگ فی الواقع مخلص ہوتے تو اس حقیقی ماں جیسا جذبہ اپنے سینے میں پالتے کہ چلو اس مرتبہ اقتدار پر کوئی اور فائز ہو جائے لیکن ملکی سالمیت اور معیشت کو گزند نہ پہنچے اور کسی دوسری فقہ کو برتری مل جائے انگریز کے قانون سے کسی طرح جان چھوٹے' مگر اس کے لئے دل بڑا اور حوصلہ کڑا درکار ہے۔

(27 جنوری 1997ء)

Marfat.com

بیا تا کار ایں امت بسازیم

اگر روحانی و مادی وسائل کے اعتبار سے امت بہت زیادہ مالا مال ہے تو واقعہ یہ ہے کہ مصائب و مسائل کے حوالے سے بھی حد سے بڑھ کر بدحال اور نڈھال ہے۔

اگر امت یہ دعویٰ کرے کہ ایک زندہ' توانا' قابل عمل' آفاقی اور جامع نظام حیات اس کے پاس ہے جو نہ بوسیدہ ہوا ہے اور نہ باسی' تو کوئی مورخ اور مفکر اس کے دعوے کو جھٹلانے کی پوزیشن میں نہیں اور اگر افراد امت یہ کہیں کہ قدرت نے سب سے زیادہ ہمیں ذہنی و فکری' فنی و' تکنیکی' زمینی و مالی اور موسمی و جغرافیائی نعمتوں سے سرفراز کیا ہے تو بھی اس بات میں تعلّی اور مبالغہ ڈھونڈھنا بہت مشکل ہو گا۔

قدرتی طور پر تمام مسلمان علاقے ایک دوسرے سے تقریباً جڑے ہوئے ہیں بہت سے سمندروں کی گزر گاہ مسلم علاقہ ہے' خام مال سب سے زیادہ مسلم ممالک پیدا اور مہیا کرتے ہیں' ہر نوع کے پھل' سبزیاں' اجناس اور اشیاء خوردونوش زیادہ تر مسلم خطوں میں اگتی ہیں' افرادی قوت اور فنی ہنر میں بھی مسلم ریاستیں تہی دامن نہیں' اس سب کے باوجود جو "امتہ وسطیٰ" کا کردار اسلامیان عالم کو ادا کرنا چاہئے تھا' بدقسمتی سے وہ کردار ادا کرنے سے قاصر و محروم نظر آتے ہیں۔

دنیا آج جس عدم توازن کا شکار ہے اور جس طرح خوف کے سائے میں زندگی گزار رہی ہے' اور قدم قدم پر دوہرے معیار کے باعث مبتلائے آلام ہے' ان تمام شکایات کا ازالہ دائیں' اور بائیں بازو کی تفریق میں الجھی ہوئی طاقتوں' یورپ اور ایشیا میں تقسیم مملکتوں اور نسلوں و علاقائی خانوں میں بٹی ہوئی طاقتوں' یورپ اور ایشیا میں تقسیم مملکتوں اور نسلی و علاقائی خانوں میں بٹی ہوئی قیادتوں کے بس کی بات نہیں۔ "امتہ وسطیٰ" ہی اس ریزہ ریزہ انسانیت کو جوڑنے اور بکھری ہوئی دنیا کو پرونے کا کام سرانجام دے سکتی ہے لیکن مقطع میں پھر وہی سخن گسترانہ بات آجاتی ہے۔ کہ

ع خضر کیوں کر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے؟

Marfat.com

امت اگر خود اپنا نصب العین بھول یا بدل چکی ہو' تو وہ عالم انسانی کو کیا واضح سمت اور مربوط لائحہ عمل دے پائے گی؟

امت وسطیٰ در حقیقت الٰہی قاصد کی تکمیل کے لئے اٹھائی گئی تھی اور انسانی فلاح اور ہدایت کا پروگرام لے کر اٹھی تھی' بقول حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ۔

"اللہ نے ہمیں بندوں کی غلامی کو چھوڑ کر اپنی بندگی کے لئے اٹھایا اور ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف گامزن فرمایا۔

آج جو ہر انسان دوسرے انسان کا آقا بنا ہوا ہے اور ہر ایک کو اپنا غلام بنانے پر تلا ہوا ہے' اس زنجیر غلامی کو توڑنے کا فریضہ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو سونپا تھا اور آج عالم انسانی اپنے تراشیدہ نظاموں کے ناکام تجربوں کے باعث جس ظلمت میں گھرا ہوا ہے' اسے نور بداماں کرنے کا منصب اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو عطا فرمایا تھا' مگر گردوپیش یہ پتہ دیتا ہے کہ امت کو باقی تو ہر بات یاد رہ گئی لیکن اپنا فرض منصبی لوح یادداشت سے محو کر بیٹھی ہے' دنیا کی خدا فراموشی نے پہلے ہی کیا کم غضب ڈھار کھا تھا کہ امت کی خود فراموشی نے اس ستم کو اور دوبالا کر دیا ہے۔

دنیا کے اس راکھ کے ڈھیر میں اب بھی اگر کوئی دبی ہوئی چنگاری ہے تو وہ امت مسلمہ ہے۔ عہد گل کے خاتمے اور ساز چمن کے لوٹنے کے باوجود اگر کوئی بلبل محو ترنم ہے تو وہ یہی امت ہے' جس ذرے میں بیابان بننے' جس غنچے کے گلستان ہونے اور جس قطرے کے ہنگامہ طوفان میں ڈھل جانے کی صلاحیت آج بھی موجود ہے وہ ذرہ' وہ غنچہ اور وہ قطرہ بحمد اللہ امت مسلمہ ہے' بس کہیں سے وہ قوت عشق فراہم کر لے پھر دیکھئے ہر پست کس طرح بالا اور دہر میں کس طرح اسم محمد ﷺ سے اجالا ہوتا ہے' امت کے ذہین و فہیم عناصر کا فرض ہے کہ وہ اس ایجنڈے کی ایک ایک شق کو واضح کریں تاکہ امت کو اپنا اصل کام یاد آجائے اور گردش ایام کو اپنے دائرے میں لانے پر قادر ہو سکے' امت مسلمہ کو چند ایک کام کرنے چاہئیں تاکہ اس کا عالمی کردار ایک بار پھر واضح اور موثر طور پر نظر آنے لگے' اس امت کے ذریعے قدرت نے اپنی طرف سے اتمام حجت کر دیا' اب اس کے بعد فلاح انسانی کے لئے کوئی اور امت مبعوث نہیں ہوگی' صرف قیامت ہی برپا ہوگی۔

رسول اکرم ﷺ خاتم الانبیاء اور امت مسلمہ خاتم الامم ہے' جس طرح پیغمبر ﷺ نے رہبری کا حق ادا کر دیا ہے اسی طرح امت کو بھی دیدہ وری کی روشن مثال قائم کرنی چاہئے' اس لئے کہ وہ راز حیات جو خالق کائنات نے پیغمبر اعظم و آخر ﷺ کو سمجھایا تھا وہ امت کو منتقل ہوا ہے'

Marfat.com

اب اس کی نقاب کشائی امت کے ذمے ہے۔

بدقسمتی سے امت کو حکومتی قیادت نے بہت مایوس کیا ہے اب امت کو اپنے اجتماعی شعور سے مسئلہ کا حل پیش کرنا ہے' اور اپنے اندر سے ایک ایسی قیادت کو ابھارنا ہے' جو امت کو کسی طاقت کا میمنہ اور میسرہ اور ہراول دستہ بننے کے بجائے خود اسے قطب نما اور پرکار (کمپاس) بنادے جس سے دنیا اپنی جہت اور سمت متعین کرنے میں مدد حاصل کرے۔

امت کو اب اجتماعی طور پر درج ذیل امور سرانجام دینے چاہئیں۔

۱۔ نظریاتی جہت کا تعین

جب سے امت بے مرکز (ڈی سنٹرلائز) ہوئی ہے اس دن سے بے جہت بھی ہو گئی ہے' جس کے نتیجے میں اس کے اندر وہی جاہلی تعصبات اور جراثیم پیدا ہو گئے ہیں' جنہیں اس امت کے امام اول ﷺ نے بڑی حکمت اور بصیرت سے ختم اور بڑی قوت و شدت سے کچل دیا تھا' عالم عرب کو پھر سے "عربیت" کی گدگدی ہونے لگی' اور ترک "زکتازیاں" کرنے لگے' ایران کو سائرس اعظم یاد آنے لگا اور سندھ کو موہنجوڈرو ستانے لگا' اس سوچ نے امت میں فاصلے بڑھانے اور رشتے مٹانے شروع کر دیئے' اور اسی طرح دوسری نوع کی تفریق و تقسیم نے امت کے درمیان دیواریں اٹھانی شروع کر دیں' آج پھر سے اہل عرب کو طے اور برملا اعتراف کرلینا چاہئے کہ

؎ محمدؐ عربی سے ہے عالم عربی

اگر درمیان سے حضور ﷺ کی ذات نکال لی جائے' تو پھر سارا عرب یا تو کالے اور گنجے پہاڑوں کی سرزمین رہ جائے گا یا پھر بدوؤں کی کمین گاہ بن جائے گا۔

یہ تہذیب و تمدن' یہ اعزاز و وقار' یہ رونق اور یہ بہار سب اس کے طفیل ہے جس نے صرف عرب و عجم ہی نہیں خود انسان کو شناخت اور شخصیت عطا کی اور اسی طرح ارباب عجم بھی ملت میں اس طرح گم ہو جائیں کہ

؎ نہ افغانی رہے باقی نہ ایرانی نہ تورانی

امت کا دائرہ ان سب دائروں سے بڑا اور ان سب کو محیط ہے۔

؎ تو ابھی رہ گزر میں ہے قید مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر' پارس و شام سے گزر

واقعہ یہ ہے کہ عرب کسی بوجہل و بولہب کا نہیں ابن عبدالمطلب (حضور ﷺ) کا ہے'

Marfat.com

فارس' (ایران) مجوسیوں کا ورثہ نہیں سلیمان الفارسی رضی اللہ عنہ کی یادگار ہے' مصر ابوالہول کا نہیں بلال رضی اللہ عنہ کا ہے' اور عراق اب بابل و نینوا کو بھول جائے اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو اپنی شناخت بنائے۔

۲۔ استعمار شکنی

امت اپنے آئندہ لائحہ عمل میں استعمار دوستی کی جگہ استعمار شکنی کو شامل کرے' اس لئے کہ اسلام اور استعمار میں کبھی بنی نہیں بلکہ ہمیشہ ٹھنی رہی' استعمار کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو اپنا غلام بنائے اور اسلام کی روایت یہ رہی ہے کہ وہ ہر نوع کی غلامی سے انسان کو نجات دلائے' صرف خدا کی غلامی کا ڈھنگ سکھائے۔

جہاں امتیاز من و تو' تفریق بندہ و صاحب اور محتاج و غنی ختم ہو کر صبغۃ اللہ کا رنگ غالب آجاتا ہے اور کہتری و بالاتری کے سارے آثار معدوم ہو جاتے ہیں' استعمار کے قدیم نمائندے نمرود کا سر توڑا تو ملت حنیف کے بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توڑا' اپنے دور کی استعماری طاقت؟ فرعونیت---- کو غرقاب کیا تو دین اسلام ہی کے صاحب کتاب پیغمبر موسیٰ علیہ السلام نے کیا اور قیصر و کسریٰ کا سر پرغرور جھکایا اور حالیہ تاریخ میں روسی استعمار کو ریزہ ریزہ کیا تو ملت افغاناں نے کیا' یوں ہر عہد میں استعمار شکنی کا فریضہ امت مسلمہ نے سرانجام دیا' اور آج بھی استعمار سے پنجہ آزما ہونے اور اسے للکارنے کی روایت کسی کے ہاں ہو سکتی ہے تو اسلام کے ہاں پنپ سکتی ہے' تو امت کو استعمار کے ہر دام ہمرنگ زمین سے ہوشیار رہ کر اس سے جڑنے کی بجائے اسے توڑنے کی فکر کرنی چاہئے اس کے بغیر نہ سیاسی آزادی ممکن ہے اور نہ معاشی خود انحصاری۔

۳۔ عادلانہ نظام حکومت کا قیام

امت کو فرنگی طرز سیاست سے ہٹ کر اور بچ کر "جو سوائے جنگ زرگری اور حصول طاقت" (پاور سٹرگل) کے اور کچھ نہیں ایک عادلانہ نظام حکومت کے قیام پر اپنی توجہ صرف کرنی چاہئے' اس وقت عالم اسلام میں قائم تقریباً تمام حکومتیں اعلیٰ اسلامی اصولوں پر استوار عادلانہ تو کجا بنیادی انسانی حقوق کے حوالے سے بھی چنداں قابل رشک نمونہ پیش نہیں کر رہیں۔

ملوکیت ہے تو مسلم ریاستوں میں' آمریت ہے تو انہیں علاقوں میں مارشل لاء نافذ ہوتا ہے' تو انہیں ملکوں میں' ہر دوسرے چوتھے دن بحران اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو انہی خطوں میں' یہ سب اس لئے کہ امت کے اندر عادلانہ نظام جڑ نہیں پکڑ رہا' ظاہر ہے جہاں عدل نہیں ہوگا وہاں ظلم ہوگا اور ظلم ہی سے یہ ساری خرابیاں پھوٹتی ہیں' پشتینی حکومتیں قائم ہوتی ہیں' ننگی آمریت مسلط ہوتی ہے' فوجی مہم جوئی کو راہ ملتی ہے اور عدم استحکام کی فضا بنتی ہے اگر ہر

Marfat.com

شعبے میں عدل کارفرما ہو' تو کسی کے ہاتھ میں اختیار اور دولت کا ارتکاز نہیں ہو پاتا' یہ نہ ہو تو پھر کسی کو احساس محرومی بھی لاحق نہیں ہوتا' قرآن حکیم نے امت کو ہر جگہ اور ہر حال میں میزان عدل مستقیم رکھنے کا حکم دیا ہے اور عدل کو تقویٰ کے سب سے زیادہ قریب قرار دیا ہے دنیا کے کسی حصے میں اگر غیر عادلانہ نظام برپا ہے تو امت اجتماعی طور پر اس نظام کو بدلنے کی کوشش کرے اور غیر عادل قوتوں کی مزاحمت کرے' نہ یہ کہ خود امت اس غیر عادلانہ نظام کے ساتھ اپنے آپ کو منسلک رکھے۔

۴۔ مظلوم طبقات کی حمایت

دنیا بھر میں جہاں بھی مظلوم طبقات ہیں' امت ان سے یکجہتی اور ان کی دلجوئی کا اہتمام کرے یہ دیکھے بغیر کہ مظلوم عیسائی ہے' ہندو ہے' بدھ ہے یا کوئی اور' اور مظلوم کی مدد اسلام کی رو سے غیر مشروط اور ہر امتیاز سے بالا ہوتی ہے' دنیا کے مختلف خطوں میں مظلوم اپنی زندگی' آزادی' عزت نفس اور بنیادی حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں امت ان کی پشت پناہ بن جائے' حکومتیں ممکن ہے اپنا حلیف یا حریف دیکھ کر فیصلہ کریں لیکن امت کو ان نزاکتوں اور مصلحتوں سے ہٹ کر صرف یہ دیکھنا ہے کہ ایک انسان خواہ وہ عربی ہے یا عجمی' کالا ہے یا گورا' افریقی ہے یا ایشیائی' مسلمان ہے یا غیر مسلم' وہ حق زندگی کے لئے لڑ رہا ہے' وہ آزادی مانگ رہا ہے' وہ دنیا بھر سے اپنی عزت نفس کا تحفظ چاہ رہا ہے اور وہ بنیادی انسانی حقوق کا مطالبہ کر رہا ہے' تو امت کو اپنا اجتماعی وزن اس مظلوم کے پلڑے میں ڈال دینا چاہئے' بانی امت ﷺ نے بھی یہی کام کیا تھا' آپ ﷺ نے مکہ کے ابوجہل اور ابولہب کو چھوڑ کر روم کے صہیب رضی اللہ عنہ' حبش کے بلال رضی اللہ عنہ اور فارس کے سلیمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ یکجہتی کا اظہار فرمایا۔ ہم نے اپنے وسائل غیروں کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں' یہ وسائل مظلوموں کی امداد کی بجائے ظالموں کے لئے ہتھیار کا کام دے رہیں ہیں' کہ وسائل امت کو سرفراز بنانے کے بجائے اسے سرنگوں کرنے پر صرف ہو رہے ہیں' پیسہ عالم اسلام کا ہے بنک یہودیوں کے چل رہے ہیں' تیل امت کا ہے لیکن چراغ دشمنان امت کے جل رہے ہیں' ہنر افراد امت کا ہے لیکن اس سے استفادہ امت کے علاوہ ہر ایک کر رہا ہے۔

امت اس کے بارے میں ایک مربوط لائحہ عمل بنائے' تاکہ اس کی افرادی قوت' اس کا ہنر' اس کا سرمایہ اور اس کے جملہ مواصلاتی وسائل خود اس کے لئے استعمال ہوں اور دنیا کے بگڑے ہوئے معاشی و اقتصادی توازن میں ٹھہراؤ اور جماؤ پیدا ہو۔

۵۔ بین الاقوامی اسلامی اتحاد

امت کو اپنے اندر سے تنگ نظری گروہی عمائدین اور ہنگامی سیاسی قائدین ابھارنے کے

Marfat.com

بجائے اقبالؒ اور جمال الدین افغانیؒ جیسے لوگ پیدا کرنے چاہئیں، جن کا ایک ایک لمحہ چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ سے جڑا ہوا اور اس فضا میں رچا ہوا تھا' جنہوں نے امت کو دوبارہ وہی خواب دکھایا جس کی ایک بار تعبیر پاکر امت نے عرب و عجم کی امامت کا تاج سر پر سجایا تھا۔

امت آج مختلف اداروں سے وابستہ اور مختلف اتحادوں کا حصہ نظر آتی ہے' جب کہ وہ خود ایک بین الاقوامی اتحاد قائم کرنے کی پوزیشن میں ہے' اس لئے کہ امت کی شاخیں تمام براعظموں میں ہیں' ایشیا' افریقہ' یورپ سبھی جگہ مسلم ریاستیں قائم ہیں اور تقریباً تمام قوموں' علاقوں' نسلوں' زبانوں اور تہذیبوں کی نمائندگی امت مسلمہ کے اندر ملتی ہے اور ان سب کے لئے نقطہ اتحاد۔ عقیدہ توحید و رسالت --- اپنی پوری معنویت اور شان کے ساتھ موجود ہے' اگر امت اس طرح کے بین الاقوامی اتحاد کے لئے اپنا پلیٹ فارم تشکیل دے جو موثر بھی ہو اور فعال بھی اور صحیح معنوں میں خود مختار بھی تو اسے اپنا کوئی مسئلہ کسی دوسرے ادارے میں لے جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہو گی لاکھ زمینی فاصلے حائل ہوں لیکن لا اِلٰہ اِلااللہ ایک ایسا کلمہ ہے جو ان تمام فاصلوں کو چشم زدن میں مٹا دیتا ہے کچھ ہی دیر میں اہل فلسطین' کشمیریوں کی زبان سمجھنے لگ جائیں گے اور کشمیری بوسنی لہجے سے آگاہ ہو جائیں گے' اگر یورپی پارلیمنٹ بن سکتی ہے تو اسلامی پارلیمنٹ کیوں نہیں بن سکتی؟ اگر یورپی برادری کی سرحدیں مٹ سکتی ہیں اور ویزے کی پابندی ٹوٹ سکتی ہے تو امت کے لئے ان باتوں کو------ خواب محض ------کیوں قرار دیا جائے؟

ایسا ماحول بنانے کے لئے جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے' کہ امت میں ایک ایسی لیڈر شپ ابھرے جس کا اندیشہ افلاکی اور پرواز لولا کی ہو جو جرات نمو اور گرم لہو رکھتی ہو' جو بخارا اوبدخشاں کی نمائندہ نہیں بلکہ دنیا کے سامنے اللہ کی برہان نظر آئے' ایسی قیادت وہ تمام خار دار زنجیریں توڑ سکے گی' جو بدقسمتی سے گزشتہ دو صدیوں سے امت کے پاؤں میں پڑی ہوئی ہیں۔

؎ ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغ دیدہ افلاک ہے تو
ترے صید زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہین شہ لولاک ہے تو

(12 اکتوبر 1996ء)

اتاترک، سوئیکارنو، خمینی یا عمر بن عبدالعزیزؒ

ہمارا سماج ایک طرح سے "درد زہ" کی کیفیت میں مبتلا ہے، اور کچھ نہ کچھ جنم دے گا، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بہت جلد کوئی "اتاترک" آنے والا ہے جو پاکستان کو انارکی اور طوائف الملوکی سے نجات دلا دے گا، بعض کسی "سوئیکارنو" کے انتظار میں ہیں، جو اپنی سحرانگیز شخصیت کے ذریعے قوم کو ایک اکائی میں بدل دے گا، ایک بڑا طبقہ "خمینی" کی راہ تک رہا ہے جو بڑے بڑے گردن فرازوں کو سرنگوں کر دے گا۔

حالیہ دنوں میں اس طرح کی بات ائیر مارشل اصغر خان نے بڑے شد و مد اور بڑے وثوق کے ساتھ کہی ہے۔

یہ تو خیر امر واقعہ ہے کہ ہمارا موجودہ سیاسی نظام، تہذیبی ڈھانچہ، معاشی سیٹ اپ اور مذہبی رویہ اس قابل نہیں رہا کہ انحطاط پذیر معاشرے کو یکسر بدل کر توانا اور صحت مند بنا دے، جس ملک کا ہر حکومتی ادارہ بدعنوانی، سفارش اور لاقانونیت، کے بوجھ تلے دب چکا ہو، جس کا تہذیبی تانا بانا بکھر رہا ہو، جس کی پوری اقتصادیات بین الاقوامی امداد اور قرضوں کے سہارے چل رہی ہو اور جس کے مذہبی رویے میں برداشت اور رواداری روز بروز بڑھتی گھٹتی چلی جا رہی ہو اس کو موجودہ نظام کوئی سہارا نہیں دے سکتا، اب تو نئی شخصیت، نئی قیادت اور نیا نظام ہی لوگوں کا "رومانس" بن سکتا ہے۔

جہاں جنرل رینک کے لوگ اور اعلیٰ بیوروکریٹس اپنا ذہنی توازن برقرار رکھ نہ پا رہے ہوں وہاں گھسا پٹا نظام کیا کرے گا؟ اسمبلیوں کی موجودگی میں نظام حکومت آرڈیننسوں کے سہارے چلے منتخب اداروں کے ہوتے ہوئے ٹیکس اور کرنسی ویلیو ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کی سفارش بلکہ صحیح تر الفاظ میں "حکم" پر طے ہو، غیر منتخب مشیر اور فیملی فرینڈز پوری کابینہ کو بائی پاس کریں اور ملک کا چیف ایگزیکٹو منہ بھر کر عوام کے بجائے امریکہ اور فوج کو اپنا حامی اور "بیس" قرار دیتا پھرے، وہاں معمول کا سیاسی نظام گوبھی کا پھول نہیں توڑ سکتا کجا کہ خارجی جارحیت کا منہ موڑ اور داخلی فتنوں کا سر پھوڑ سکے، یہ سارے اسباب ایک بڑی تبدیلی کا پتہ دے رہے ہیں، اس صورتحال میں ہماری اجتماعی بصیرت کا امتحان ہونے والا ہے، اس نازک لمحے میں سب کچھ "دھڑن" بھی ہو سکتا ہے اور

ہمارا مقدر بھی بن سکتا ہے۔

یہ ناامیدی ہے جو ہم سے کہلوا رہی ہے کہ اتاترک آیا چاہتا ہے' سوئیکارنو پر وہ اٹھنے کا منتظر ہے' اور خمینی دہلیز پر کھڑا ہے' اگرچہ یہ نام "سمبالک" ہیں' پھر بھی یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ گویا بارہ کروڑ کے اس آزاد اور خود مختار ملک اور عاقل و بالغ آبادی میں کوئی "رجل رشید" نہیں جو اس صورتحال کو کنٹرول کر سکے۔

حزب اقتدار کو زعم ہے کہ عوام کے دلوں میں بس وہی ہے اور حزب اختلاف اس خمار میں ڈوبا ہوا ہے' کہ عوام اس کے اشارہ ابرو پر سب کچھ نچھاور کرنے پر تیار ہیں' اگر دونوں کے دعوے درست ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ عوام کا دل پھوڑا کیوں بنا ہوا ہے' کہ ذرا ٹھیس لگتی ہے اور وہ پھٹ پڑتا ہے' اور کسی اتاترک اور خمینی کی دہائی مچ جاتی ہے۔

اتاترک بڑا معتبر نام ہے لیکن مثبت حوالہ نہیں' تبدیلی کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہئے' کہ رفوگری کی بجائے قبائے خلافت ہی چاک کر دی جائے۔ عربوں سے ناراض ہو کر قرآن حکیم کے عربی متن پر پابندی لگادی جائے آل عثمان سے نفرت کے نتیجے میں اذان بند کردی جائے' خلافت کے حساب سے نفرت کے نتیجے اسلامی حجاب پر ہاتھ صاف کر دیا جائے' پاکستان کسی "اترترک" کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

سوئیکارنو نے انڈونیشیا کو ولندیزی استعمار سے نجات دلائی لیکن جاتے جاتے ایسی فوجی آمریت دے گئے کہ وہ خود اتنا عرصہ اقتدار میں نہیں رہے' جتنی مدت آمریت کو ہو گئی ہے۔ لاکھوں کے جلسے سے خطاب کا مقصد اگر عوام کے درد کا مداوا نہیں بلکہ اپنی خوبرو بیگم کو خوش کرنا ہو تو ایسا لیڈر "جادوگر" ہو سکتا ہے۔ "رفوگر" ہرگز نہیں' ان لوگوں نے بڑی تبدیلی تو برپا کی مگر مثبت تبدیلی نہ لا سکے۔

؎ شیخ میخانے میں آنے کو مسلماں آیا
کاش' میخانے سے نکلے تو مسلماں نکلے

آیت اللہ خمینی نے بلاشبہ قصر شاہی کو ایک ناپاک وجود سے پاک کیا' ایک امریکی گماشتے کا بستر گول کیا' علاقے میں امریکی خیموں کی طنابیں کاٹیں' بیک وقت ماسکو اور واشنگٹن کے فیصلوں کو مسترد کیا اور خطے میں پھیلی ہوئی استعماری آلودگی سے ماحول کو صاف کیا' مگر یہ انقلاب ابھی عرصہ امتحان میں ہے' تاریخ نظر غائر سے اس کا مطالعہ کر رہی ہے فیصلے میں کچھ وقت لگے گا' دوسرے یہ

کہ اس انقلاب نے ایک مرتبہ پورے ایران کا انجر پنجر ہلا کر رکھ دیا۔

ایسے میں ہم کیوں نہ کسی "عمر بن عبدالعزیزؒ" کی راہ دیکھیں' بلکہ اس کی راہ میں آنکھیں بچھائیں وہ یوں کہ نہ ملک کی سلامتی داؤ پر لگے' نہ جغرافیائی اکھاڑ پچھاڑ ہو' نہ قومیت کے نام پر طوفان برپا ہو' نہ صوبائی فتنے سر اٹھائیں' اور نہ ہی امریکہ کے تیار گھوڑے سرپٹ دوڑیں بلکہ وہ قیامت سامنے لائیں' جو قیامت پہ نظر رکھنے والی ہو اور قوم کے لئے شامت ثابت نہ ہو' کوئی کہتا ملکی آئین میں ایسا سقم رہ گیا ہے کہ یہاں کے حالات اصلاح پذیر نہیں ہو رہے کسی کی رائے ہے کہ نظام قانون بہت پیچیدہ ہے' کسی کی نظر میں جمہوریت کو پنپنے کا موقع نہیں ملا' کسی کے نزدیک مسئلے کی جڑ بار بار مارشل لاء کا لگنا ہے' کوئی انتخابی نظام میں تبدیلیوں کی بات کرتا ہے لیکن کوئی بھی یہ نہیں سوچتا کہ ہم نے لیڈر کے لئے آکسفورڈ کی ڈگری ضروری سمجھی ہے' اس کا ارب پتی ہونا لازمی قرار دیا ہے' اس کا سردار اور وڈیرا ہونا ناگریز گردانا ہے' جبکہ ضرورت نگاہ بلند' سخن دلنواز اور جاں پرسوز کی تھی۔

اگر یہ متاع میسر ہو تو ایک سال نہیں ایک رات میں سو سال کی بگڑی ہوئی ملوکیت خلافت راشدہ میں بدل جاتی ہے' بدقسمتی یہ ہے کہ ہمیں "دیدہ ور" وہ ملے جو نہ دید کے قابل تھے اور نہ شنید کے' راہبر وہ چنے جو خود راہ راست پر نہیں تھے' رہنما انہیں سمجھا جو مرغ بادنما تھے۔ اور خواجگی انہیں بخشی جو روش بندہ پروری سے آگاہ نہ تھے۔

سچی بات یہ ہے کہ آج پاکستان ہی کو نہیں پورے عالم اسلام کو "عمر بن عبدالعزیزؒ" درکار ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ ایک فرد کا نام نہیں ایک کردار ہے اور ایک شخصیت نہیں ایک خصوصیت ہے' ہمارے ہاں عالم یہ ہے کہ زکوٰۃ کمیٹی کی ممبری کے لئے بڑے بڑے طرہ طراز ہلکان نظر آتے ہیں۔ میونسپلٹی کی رکنیت کے لئے اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہتی ہے' جبکہ عمر بن عبدالعزیزؒ گورنر ہیں انہیں شک پڑتا ہے کہ شائد خلیفہ سلمان انہیں اپنا جانشین نامزد کرنے والا ہے تو بھاگ کر وزیر اعظم رجاء بن حیواۃ کے پاس جاتے ہیں' کہ اگر ایسی کوئی تجویز ہے تو میں فوراً استعفیٰ دے کر ادھر ادھر ہو جاتا ہوں تاکہ بار خلافت اٹھانے سے بچ جاؤں۔

یہاں کسی وزارت کا سیکشن افسر بننے کے لئے ہر حربہ استعمال ہوتا ہے ادھر عمر بن عبدالعزیزؒ وصیت کے ذریعے امیر المومنین نامزد ہو جاتے ہیں ساٹھ لاکھ مربع میل سے بھی زیادہ رقبے پر پھیلی ہوئی مملکت کی سربراہی کوئی معمولی بات نہیں مگر مسلمانوں کا بہت بڑا اجتماع طلب کر کے فرماتے ہیں

Marfat.com

کہ یہ عہدہ میری اور آپ کی مرضی اور رائے کے برعکس مجھے سونپا گیا ہے میں اس سے دستبردار ہوتا ہوں تم لوگ جسے چاہو اپنا امیر بنالو اس کے ہاتھ پر سب سے پہلے میں بیعت کروں گا' لوگوں کے بہت بڑے ہجوم نے جواباً کہا کہ آپ سے زیادہ امارت و خلافت کا اور کون مستحق ہو سکتا ہے جو اس کی سرے سے خواہش نہ رکھتا ہو۔

علماء و ارباب منبر و محراب نے حسب معمول اپنے خطبوں میں آپ پر درود و سلام بھیجنا شروع کیا' آپ نے فرمایا' یہ سلام تمام مسلمان مردوں اور عورتوں پر بھیجا جائے' اگر میں مسلمان ہوا تو اس رحمت کی دعا سے محروم نہیں رہوں گا۔

آج ٹاؤن کمیٹی کا ممبر بننے پر قصبے اور پورے علاقے میں چراغاں ہوتا ہے جشن برپا ہوتا ہے' ایک دھماچوکڑی ہوتی ہے اور مبارک سلامت کی گونج ہوتی ہے مگر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ متفکر اور پریشان گھر میں پہنچے' خادمہ نے کہا' آج مبارکباد وصولنے کا دن ہے آپ اس قدر مغموم اور حیران کیوں ہیں؟ آپ نے فرمایا

"آج مجھ پر فرض عائد کیا گیا ہے کہ میں ہر فرد کا بغیر اس کے مطالبے کے حق ادا کر دوں آج میں مشرق و مغرب کے ہر یتیم و مسکین کا' اور بیوہ اور مسافر کا جواب دہ بنایا گیا ہوں پھر مجھ سے زیادہ مظلوم اور قابل رحم اور کون ہو سکتا ہے؟

آج کے تیز رفتار اور مشینی دور میں دس برسوں کے اندر بے محابا اداروں اور دفتری نظام کے باوجود اتنے فیصلے نہیں ہو پاتے جتنے اہم بنیادی اور دور رس فیصلے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے صرف چوبیس گھنٹوں میں صادر اور نافذ فرمائے۔

پاکستان ۹۷ء میں اپنی گولڈن جوبلی منانے والا ہے مگر زرعی اصلاحات ابھی تک نہیں ہو پائیں۔ مزارع پچاس سال سے چودھری کے رحم و کرم پر ہیں' حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک ہی نشست میں وہ تمام جاگیریں اور زمینیں ان کے اصل مالکوں (کاشتکاروں) کو واپس کر دیں جو دور ملوکیت میں حکمرانوں نے اپنے اہل و عیال' عزیزوں دوستوں اور ذاتی وفاداروں کو عطا کی ہوئی تھیں' آج کے دور کی طرح اس دور میں بھی ریاستی جبر ایک معمول تھا' انتظامی اہلکار ہر مسئلے کا حل سزا میں ڈھونڈتے تھے' آپ نے فرمایا عدل و انصاف کا ترازو نہ جھکنے دو' امن قائم ہو جائے گا' انتظامی افسروں نے کہلا بھیجا' یا امیر' اگر ہم تعزیر اور تعذیب سے کام نہیں لیں گے تو وارداتیں بند نہیں ہوں گی۔" آپ نے فرمایا' صرف حکم شریعت کے مطابق مؤاخذہ کیا جائے' اگر حق و عدل پر عمل کرنے سے واردات نہیں رکتی تو اسے جاری رہنے دیجئے۔

Marfat.com

اس کا مطلب بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ معاشرے میں عدل و انصاف بھی ہو اور پھر بھی جرائم ہوں یہ ناممکن ہے' کسی بھی معاشرے میں ظلم آتا ہی اس وقت ہے جب وہاں سے عدل رخصت ہو جاتا ہے۔

آج ہم سخت مایوسی کے عالم میں چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا مرد آئے جو سب کی ٹھکائی کرے جب کہ ضرورت ایسے شخص کی جو دانائی سے کام لے۔ ڈاکو کو خنجر نہیں ڈاکٹر کا نشتر درکار ہے جو صرف فاسد خون جسم سے نکال دے اور صحت مند حصوں کو اپنی جگہ پر رہنے دے' اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنا معیار قیادت بدلیں' قائد وہ نہیں ہوتا جو اچھی انگریزی بولے بلکہ قائد ایسا ہو جو اپنی ذات کو میزان حق میں تولے' لیڈر کا یہ مطلب نہیں کہ خوبصورت چشمہ لگائے بلکہ اس کی نگاہ میں عقابی شان ہو اور قیادت کا یہ معیار نہیں کہ دیکھ کر آدمی دنگ رہ جائے گا بلکہ معاشرے کا رنگ بدل جائے۔

ہم نے یہ کیوں فرض کر لیا کہ ہماری دھرتی بانجھ ہو گئی ہے اب کوئی عادل اور حق پرست جنم نہیں لے سکتا' ہم نے یہ کیوں سمجھا ہوا ہے کہ ہارورڈ اور کیمبرج پلٹ ہی ہماری کایا پلٹ سکتا ہے ہم نے کیوں طے کر رکھا ہے کہ ہم فطری قوتوں کے بجائے "مینی پولیٹڈ لیڈر شپ" ہی اپنے اوپر مسلط کئے رکھیں گے۔

امت کے سمندر کی تہہ میں بے شمار موتی ہیں انہیں صرف اچھل کر کنارے پر آنے کی دیر ہے' کئی گدڑی پوش ہیں جن پر گدا ہونے کا گمان گزرتا ہے' مگر وہ دراصل شاہان کجکلاہ ہیں' کئی ایسے فقیر سرراہ ہیں جو خود بین اور خدا آگاہ ہیں' ہم یہ آرزو بھی کریں اور اس کے لئے تیاری بھی کریں' کہ خدا ہمیں وہ لیڈر نصیب کرے اور ہم بھی اسے اپنا رہبر مانیں جس کے دامن پر غریبی کا پیوند تو ہو سامراج کی ذہنی غلامی کا دھبہ نہ ہو' ماتھے پر داغ سجدہ تو ہو دل پر داغ ملامت نہ ہو' چہرے پر سلوٹ تو ہو ذہن میں کوئی گرہ نہ ہو اور بے شک اس کا گھر سازوسامان سے محروم ہو مگر اس کا سینہ نور ایمان سے معمور ہو۔

(28 نومبر 1995ء)

Marfat.com

دل بدست آور کہ حج اکبر است

صوفیانہ لٹریچر میں ایک روایت ملتی ہے کہ ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے کہا کہ جبل طور تو وہ جگہ ہے جہاں تجھ سے صرف ہمکلامی کا شرف حاصل ہو سکتا ہے کیا کوئی ایسا مقام بھی ہے جہاں میں تجھے پاسکوں اور مل سکوں؟ اللہ تعالیٰ نے جواباً ارشاد فرمایا ہاں! انا عبد منکسرۃ القلوب "میں اجڑے اور ٹوٹے ہوئے دلوں میں بستا اور ملتا ہوں۔" اس بحث سے قطع نظر کہ یہ روایت کس قدر مستند ہے؟ کون اس کا راوی ہے؟ کس کتاب میں منقول ہے؟ اور اس کی صحت الفاظ کا کیا عالم ہے؟ بات بہرحال سولہ آنے درست اور دل لگتی ہے' اہل دنیا کا طرز زیست اس سے مختلف رہا ہے ان کے نزدیک عزت کے لائق وہ ہے جس کا دینوی اور سرکاری مرتبہ فائق ہے' وہ قابل توجہ اسے سمجھتے ہیں جس کی جیب گراں ہے' وہ عقیدت اس سے ظاہر کرتے ہیں جس سے کوئی گراں ہے' وہ عقیدت اس سے ظاہر کرتے ہیں جس سے کوئی ضرورت پوری ہوتی ہو' ان کا مرکز محبت وہ ہوتا ہے جس سے ان کی حاجت وابستہ ہو' وہ قابل قدر اسے جانتے ہیں' جو اہل زر ہو' رہ گیا کوئی محتاج اور غریب تو اہل دنیا کے لئے یہ بڑا عجیب ہو گا کہ وہ اسے قریب آنے دیں یا خود اس کے قریب ہوں اور لطیفہ یہ کہ یہی اہل دنیا نمازیں پڑھیں گے' روزے رکھیں گے' حج کریں گے' چلے کاٹیں گے' تسمے کھینچیں گے' کہ شاید ہمیں خدا کا قرب نصیب ہو' جبکہ خدا کا مسکن نہ دیر و حرم ہے اور نہ مکتب و خانقاہ' بلکہ وہ اپنی تمام تر شان لامکانی کے ساتھ اگر کہیں رہتا ہے اور کہیں ملتا ہے تو کسی شکستہ دل میں' کسی صد پارہ سینے میں' کسی غریب کے اجڑے دیار میں' کسی محتاج کے ویران نگر میں' کسی یتیم کی آہ نارسا میں' کسی مسکین کے خالی دامن میں اور کسی بے وسیلہ کی تشنہ داد فریاد میں' لیکن عجیب ماجرا ہے ایک شیشہ ٹوٹے تو غل مچ جاتا ہے لیکن کسی غریب کا پیمانہ دل ٹوٹ کر بکھر بھی جائے' تو کوئی ترچھی نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتا' جب کہ اہل دل کہہ گئے ہیں----

ع اک بندے دا دل نہ توڑیں رب دلاں وچ رہندا

Marfat.com

بات کسی پیشہ ور بھکاری' کسی عادی مانگت' کسی شئی گداگر' کسی کاہل اور کام چور اور پیشہ ور بھکاری' کسی بہروپیئے سوالی کی نہیں ہو رہی اس یتیم کی ہو رہی ہے جسے باپ کی گرمی محبت اور ماں کی لوری نصیب نہ ہو سکی اور وہ زمانے کی ٹھوکروں پر آ گیا' اس محتاج کی ہو رہی ہے جو ہڈ چم چلا کر بھی اپنی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنے میں ناکام رہتا ہے' اس مسکین کی ہو رہی ہے جو چہرے پر مسکینی کا اشتہار سجا کر ہر روز باہر نہیں نکلتا اور اپنی عزت نفس کے دام نہیں لگواتا' اس ضرورت مند کی ہو رہی ہے جسے دامن پھیلاتے حیا آتی ہے' ہونٹ کھولنے پر وہ ڈوب مرنے کو ترجیح دیتا ہے' وہ زبان بلانے کو دم ہلانے کے مترادف سمجھ کر اپنا تالو مقفل کر کے رکھتا ہے اور وہ ہاتھ بڑھانے پر پھانسی کا پھندا پانے کو ترجیح دیتا ہے' یہ وہ لوگ ہیں جن پر زمانہ بہت نامہربان سہی ان کا دل خدا کا میزبان ہوتا اور خدا ان کا مہمان بنتا ہے' یہی وہ لوگ ہیں جن کی دلجوئی فرض ہی نہیں فرض عین ہے' ان لوگوں کے دل نہ ٹوٹنے پائیں' ان کی آرزوئیں نہ مرنے پائیں اور ان کی سانسیں نہ اکھڑنے پائیں' جہنم کے شعلوں کا بڑا چرچا ہے' مگر کسی غریب کی آہ خدا نہ کرے کبھی سلگ پڑے ورنہ ہر شے بھسم کر دیتی ہے اور سات سمندروں کا بڑا شہرہ ہے مگر ان کے پانیوں اور ان کی موجوں اور لہروں میں وہ شور کہاں جو کسی یتیم کے آنسوؤں میں زور ہوتا ہے' ان کے سامنے عرش الٰہی بھی بند نہیں باندھ سکتا' یہ باتیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں کتنی بہن بیٹیوں کے سر ہیں جو محتاج چادر ہیں' کتنے بیمار ہیں جو محروم علاج ہیں' کتنے پیٹ ہیں جو روٹی سے خالی ہیں' کتنے ہاتھ ہیں جو بیروزگار ہیں' کتنے گھر ہیں جو بے سہارا ہیں اور کتنے خاندان ہیں جو بے وسیلہ ہیں' کیا ہماری زمین بنجر ہو گئی ہے کہ فصلوں نے اگنا بند کر دیا ہے؟ یا دریا خشک ہو گئے ہیں کہ وہ زمینوں کو سیراب نہیں کر پا رہے؟ کیا بازاروں میں روزانہ ہڑتال ہوتی ہے کہ اشیائے صرف نایاب ہیں؟ کیا ملوں نے کپڑا بننا چھوڑ دیا ہے کہ مائیں بہنیں برہنہ سر ہیں'؟ نہیں اصل مسئلہ یہ ہے کہ نظام جابرانہ اور وسائل کی تقسیم غیر منصفانہ ہے' بعض ایسے محل ہیں جو رشک فردوس و ارم ہیں اور کچھ محلے ایسے ہیں جو کلبہ حزن و غم ہیں' زمین ایک' ملک ایک اور شہر ایک مگر طرز بود و باش مختلف بلکہ متضاد' کروڑوں روپے پتنگ بازی کے شغل کی نذر ہوتے ہیں' کروڑوں شادی بیاہ کی بے ہودہ رسمیں کھا جاتی ہیں' اور کروڑوں ہی دیگر نمائشی اقدامات اور فضولیات میں اڑ جاتے ہیں' اور تو اور گزشتہ دنوں یہ رپورٹ سامنے آئی کہ عمرے' نفلی حج اور حج بدل پر سالانہ دس ارب روپے صرف ہوتے ہیں' ظاہر ہے کہ یہ کام حصول ثواب اور خدا کے قرب کے لئے ہوتا ہے' پتنگ بازی' رسم مہندی اور سالگرہ

پر اٹھنے والی رقم یقیناً ہر ایک کے نزدیک عبث اور بیکار ہے مگر نفلی حج اور عمرہ تو محض خوشنودی رب کے لئے کیا جاتا ہے اور حاجی اور عمرائی نیت بھی نیک ہی رکھتا ہے' اگرچہ یہ سارا سرمایہ غریبوں' محتاجوں' بیماروں' اور یتیموں پر خرچ ہو اور اجتماعی نظام کے تحت ہو اور اس سلسلہ میں ایک قومی مہم کا آغاز ہونا چاہیئے تاہم نفلی حج اور عمرہ پر خرچ ہونے والی رقم جو خالصتاً نیکی اور فلاح اُخروی کے جذبے کے تحت صرف ہوتی ہے ضرور ناداروں پر خرچ ہونی چاہیئے' سوچ اور ہزار عمرے ایک طرف۔ اگر اس رقم سے کوئی بیمار شفایاب ہو جائے تو اس کی دعا ایک طرف نفلی حج اور عمرہ قبول ہوتا ہے یا نہیں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر کسی بیمار کی دعا کے رد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' یہ دس ارب روپے جو سال میں خرچ ہوتے ہیں ایک ارب روپیہ ماہانہ اوسط نکلتی ہے اور تین کروڑ روپے روزانہ' اگر یہ تین کروڑ روپے روزانہ ان مریضوں کے علاج پر خرچ ہوں جو ایک مہلک مرض میں مبتلا ہوں اور دوسرے جو ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کا بل ادا کرنے سے قاصر ہوں تو اس سے بڑا حج اور عمرہ کیا ہو سکتا ہے؟ وہ اصحاب دولت و ثروت جو ہر سال حج اور سال میں دو چار بار عمرہ کرنے کے شوقین ہیں یہی رقم خود اپنے ہاتھوں سے مریضوں پر خرچ کریں' ہسپتالوں میں جا کر ایسے نادار مریضوں کا حال معلوم کریں اور ان کے بل ادا کر دیں تو سچی بات یہ ہے کہ جس خدا کو ملنے وہ کعبے کا رخ کرتے ہیں وہی خدا انہیں اپنے گھر پر مل جائے گا' کسی سسکتے مریض' کسی کراہتے بیمار اور کسی زندگی سے مایوس شخص کے پارہ پارہ دل پر پھاہا رکھنے سے بڑھ کر "حج اکبر" اور کیا ہو سکتا ہے؟ مولانا رومؒ نے کہا ہے---

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
کعبہ بنگاہ خلیل آزر است
دل گزرگاہ جلیل اکبر است

(کسی کی دلجوئی کرو کہ یہی حج اکبر ہے اور ہزار ہا کعبے سے ایک دل افضل ہے' کعبہ حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر ہے جبکہ دل اللہ تعالیٰ کی گزر گاہ ہے۔)

(10 نومبر 1998ء)

Marfat.com

پاکستانی سیاستدان ایسا نہیں کر سکتے؟

دو ہم عمر اور ہم عصر ممالک--- پاکستان اور بھارت ------ اپنے جغرافیائی محل وقوع' سیاسی کلچر' معاشی سیٹ اپ اور انتظامی ڈھانچے کے اعتبار سے چنداں مختلف نہیں' تاہم سیاسی حوالے سے بھارت کی روایات ہم سے مختلف ہیں اور بھارتی سیاستدان ہمارے سیاستدانوں سے کچھ مختلف---- ہم نے ویسے قومی طور پر یہ طے کر رکھا ہے کہ دوسروں کی نقالی جب بھی کریں گے تو منفی پہلو میں کریں گے مثبت انداز میں نہیں۔ بھارت کا کوئی حصہ ابھی تک اس سے ٹوٹ کر الگ نہیں ہوا' ہمارا ایک اکثریتی بازو الگ ہو چکا ہے' بھارت میں کبھی مارشل لاء نہیں لگا' ہم پچاس سال میں سے پچیس برس مارشل لاء کے سائے میں گزار چکے ہیں' اور بھارت ابھی "غدار سازی" کی فیکٹری نہیں بنا سکا ہم ایک سے زائد صنعتیں لگا چکے ہیں اور ہر دوسرے آدمی کو غدار قرار دے چکے ہیں' بھارت کی سیاسی زندگی کا ایک پہلو اس لائق ہے کہ ہمارا سیاستدان اس پر نہ صرف غور کرے بلکہ اپنی سیاسی تربیت اسی نہج پر کرے تو شاید سیاسی استحکام یہاں بھی رونما ہو' اس کے اثرات ملک کا ہر باشندہ محسوس کرے۔ بھارت کی سیاسی صورتحال پر نظر رکھنے والا شخص گذشتہ پچاس سال میں تین باتیں بطور خاص نوٹ کرتا ہے اور نوٹ کرنی چاہئیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ بھارت میں اس بات پر قومی اتفاق رائے ہو چکا ہے اور پایا جاتا ہے کہ بھارت کی کوئی سیاسی پارٹی خواہ رائٹ کی ہو یا لیفٹ کی' مرکز پسند ہو یا صوبائی خودمختاری کی حامی' کٹر ہو یا معتدل کانگرس ہو یا بی جے پی آج تک کسی پارٹی کے لیڈر نے ---- قومی یکجہتی ---- کے خلاف نہ کوئی بیان دیا ہے' نہ کسی ایسی تحریک کو سپورٹ کیا ہے اور نہ کسی ایسے مطالبے کی حمایت کی ہے' مسئلہ سکھ تحریک کے خالصتان کا ہو' آسام کا ہو' کشمیر کا' کسی بھارتی سیاستدان نے قومی موٴقف سے ہٹ کر کوئی بات نہیں کی' ملکی سلامتی اور یکجہتی کے حوالے سے وہاں کی سیاست سے کوئی دوسری رائے نہیں پائی جاتی' جبکہ ہمارے ہاں بات شروع بھی ملک توڑنے سے ہوتی ہے اور ختم بھی ملک ٹوٹنے کے ذکر پر' کشمیر ہی کو لے لیا جائے یہاں کی ہر پارٹی کا موٴقف مختلف ہے' کالا باغ ڈیم پر قومی سلامتی کے حوالے سے

قطعاً ایک رائے نہیں چار صوبے ہیں تو چاروں صوبوں کے لیڈروں کی مختلف رائے ہو گی جب مشرقی پاکستان کا بحران تھا تو اس وقت بھی اتفاق رائے سامنے نہ آسکا' ملک کے راز اچھالنے ملک کے مفادات بیچنے اور ملک کی قیمت پر اپنی سیاست چمکانے کا رواج یہاں عام ہے ادل بدل کر حکومت میں آنے والے لیڈروں کے حکومت اور اپوزیشن کے دنوں کے بیانات اس پر دلالت کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بھارتی سیاست میں اس پر بھی قومی اجماع ہو چکا ہے کہ کچھ ہو جائے سیاستدانوں نے کبھی غیر جمہوری اور غیر دستوری قوت کو اپنے سیاسی تنازعات میں الجھنے کی اجازت نہیں دینی' یہی وجہ ہے کہ بھارت آج تک مارشل لاء سے محفوظ چلا آرہا ہے' کئی بار بھارتی لوک سبھا میں دنگا ہوا صوبائی اسمبلیوں میں کرسیاں چلیں' عدم اعتماد کی تحریکیں آئیں' حکومتی بدنیتی سیاسی اکھاڑ پچھاڑ رہی مگر کسی فریق نے کسی دوسری طاقت کو مدعو نہیں کیا ابھی حال ہی میں اترپردیش اسمبلی میں ہنگامہ ہوا' ڈیسک ٹوٹے کرسیاں چلیں' مائیک مارے گئے بہت کچھ ہوا حتی کہ صدر کو مرکزی حکومت نے اسمبلی توڑنے اور صدر راج نافذ کرنے کی درخواست دی لیکن اترپردیش اسمبلی نے دوبارہ متحد ہو کر اس عمل کو روک دیا اور مرکزی حکومت کو اپنی تجویز اور درخواست واپس لینی پڑی جبکہ ہمارے ہاں کا اخباری ریکارڈ اٹھا کر دیکھ لیا جائے تو ہر پارٹی اور سیاستدان نے ہر موقع پر فوج کو مداخلت کی دعوت دی ایوب خاں سے لے کر جنرل جہانگیر کرامت تک کونسا آرمی چیف ہے جس کی خدمت میں حکومت برطرف کرنے کی عرضی پیش نہیں کی گئی تھی' کبھی اسے رد کر دیا گیا اور کبھی بصد شوق شرف قبولیت بخشا گیا' اس کے باوجود ہم کہتے ہیں کہ سیاسی استحکام پیدا نہیں ہو رہا-----؟ تیسری بات یہ ہے کہ بھارتی سیاستدانوں کا اس نکتے پر بھی اجماع ہو چکا ہے کہ وہ وہ ---- وعدوں ---- کی سیاست نہیں کریں گے اگر وفا نہ ہوئے تو اس سے سیاست میں بے چینی اور بد اعتمادی پیدا ہو گی' بھارت میں بھوک شاید ہم سے زیادہ ہو' بمبئی' کلکتہ' اور دہلی کے فٹ پاتھ بے گھر لوگوں کے ڈیرے بنے ہوئے ہیں' فاقوں سے اموات کی شرح وہاں زیادہ ہے لیکن اس کے باوجود کوئی سیاستدان دودھ کی نہریں بہانے اور شہد کے چشمے رواں کرنے کا وعدہ کر کے ووٹ نہیں مانگتا جو مسائل حل طلب ہیں ان کی بات تو ہوتی ہے انہیں حل کرنے پر زور بھی دیا جاتا ہے مگر ہماری طرح نہیں کہ ایک ٹاؤن کمیٹی کا کونسلر بھی اپنے ووٹروں سے وہ وعدے کر لیتا ہے۔ جو شاید صدر مملکت بھی پورے نہ کر سکیں اس روش سے لوگوں میں سیاست کے لئے جھوٹ مکاری دغابازی اور وعدہ خلافی کا تاثر ابھرتا ہے اور پھر یہ جملہ زبان زد عام ہو جاتا ہے کہ سیاست ایک گند

Marfat.com

ہے، شریف آدمی کو اس گند میں نہیں پڑنا چاہئے۔

اگر وعدوں اور دعووں کے بجائے ہر سیاستدان اپنے اپنے دورِ حکومت میں دھیرے دھیرے عوامی مسائل حل کرتا چلا جاتا تو شاید آج مسائل کا اس قدر انبار نہ ہوتا جو نہ حکومت سے اٹھ رہا ہے اور نہ عوام کے کندھوں میں اسے اٹھانے کی سکت ہے جس کے نتیجے میں حکومت کا ہر شعبہ ان مسائل کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا ہے، کوئی ٹیلی فون کنکشن کے ایک مسئلے کو ذرا چھیڑتا ہے تو مسائل کے عفریت اس کے گلے سے لپٹ جاتے ہیں اور سانس لینا دشوار کر دیتے ہیں۔

(28 اکتوبر 1997ء)

Marfat.com

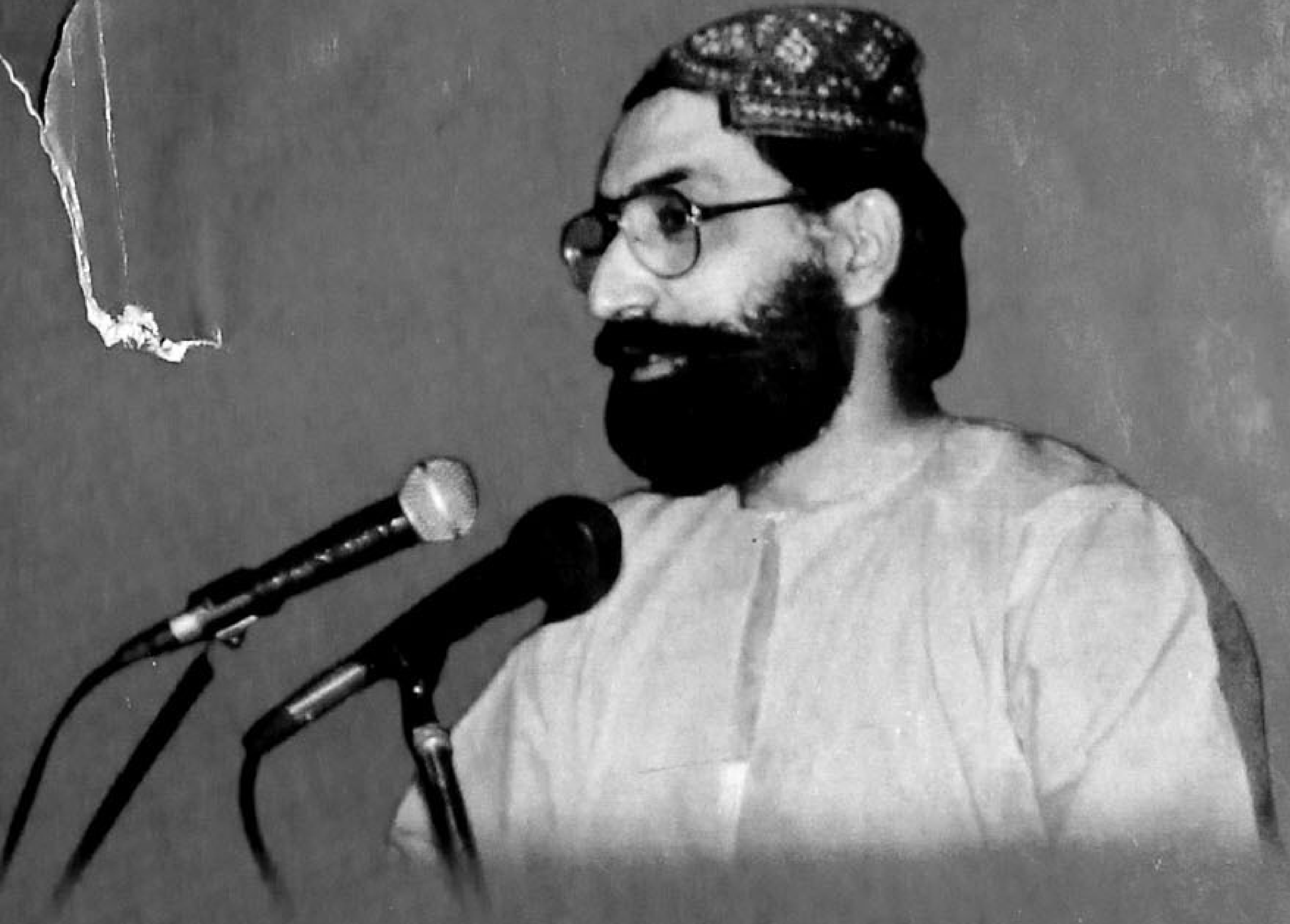

صاحبزادہ سیّد خورشید گیلانی کی دیگر تصانیف

☆ خون جگر ہونے تک ☆ روح انقلاب ☆ روح تصوف

☆ تاریخ کی مراد ☆ الہدیٰ

خورشید گیلانی ٹرسٹ

H/22 مرغزار کالونی، ملتان روڈ لاہور

Marfat.com

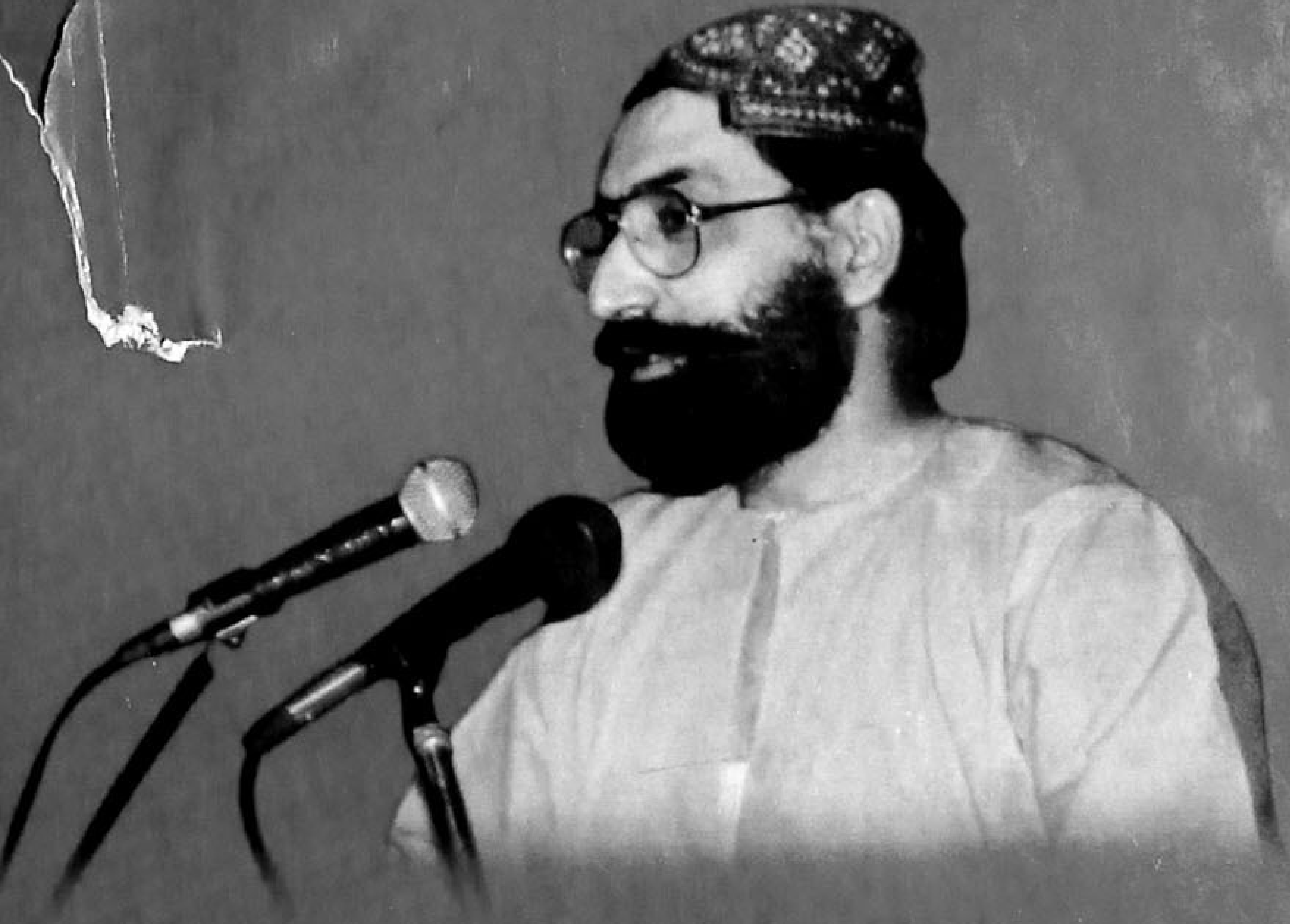

صاحبزادہ سیّد خورشید گیلانی کی دیگر تصانیف

☆ خون جگر ہونے تک ☆ روح انقلاب ☆ روح تصوف

☆ تاریخ کی مراد ☆ الہدیٰ

خورشید گیلانی ٹرسٹ

22/H مرغزار کالونی' ملتان روڈ لاہور

Marfat.com

صاحبزادہ سیّد خورشید گیلانی کی فکر انگیز تحریروں کا مجموعہ

قلم برداشتہ

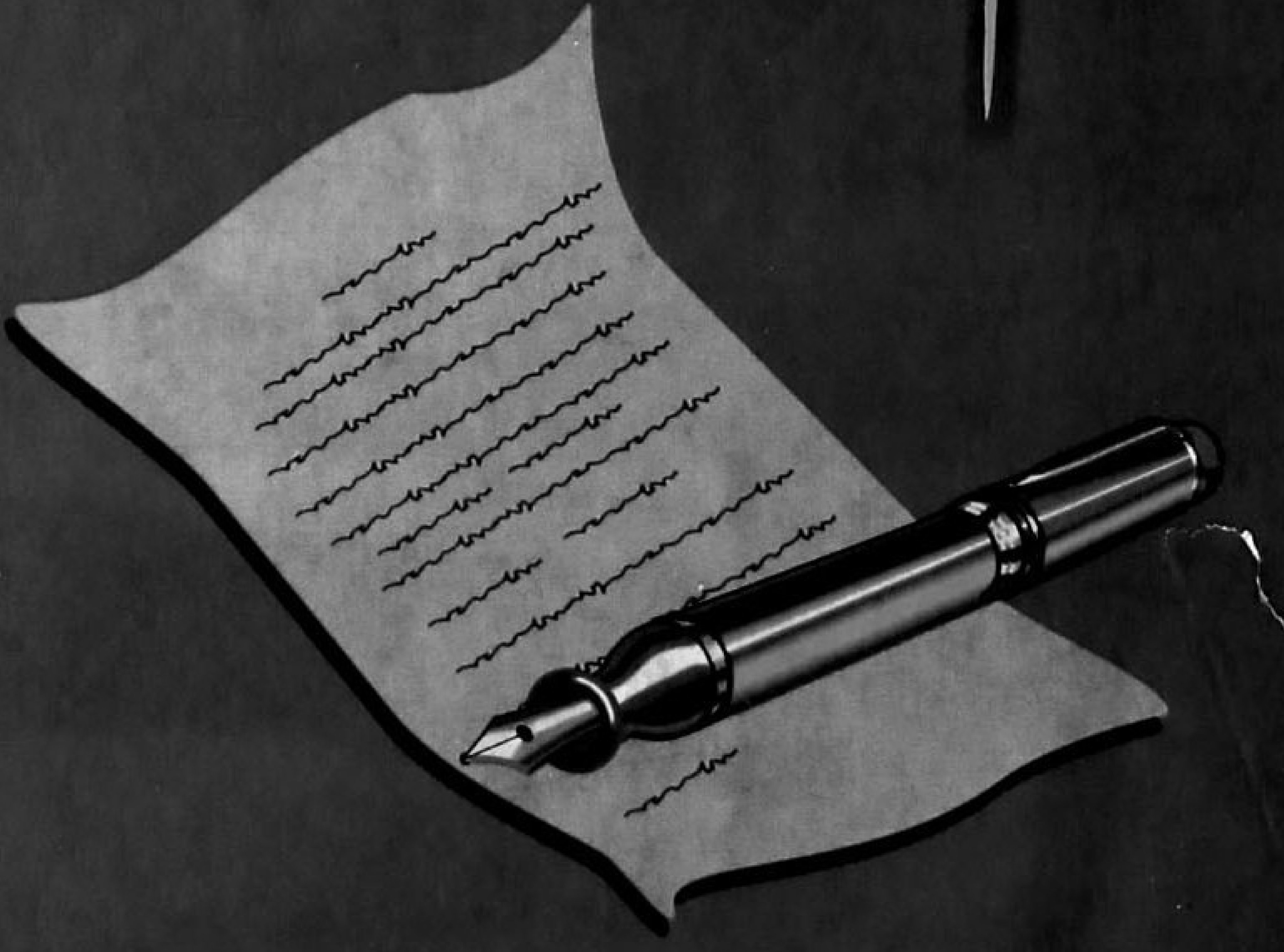

صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی

Marfat.com